فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۱۳۵

جنوری ۱۹۸۵ء تا جون ۱۹۸۵ء

بہ ترتیب حروف تہجی

فہرست مضامینِ معارف

جلد ۱۳۵

ماہ جنوری ۱۹۸۵ء تا ماہ جون ۱۹۸۵ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جنوری ۱۹۸۵ء

معارف

مجلس دار المصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

قیمت تیس روپے سالانہ

دفتر دار المصنّفین اعظم گڈھ

مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

تاریخ ہندوستان کا سلسلہ اب تک بیس کتابوں تک پہنچ چکا ہے، اسی کے ضمن میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس کی اب تک تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں

جلد اول

اس میں مغل دور سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری فراخ دلی اور انسان دوستی کے دلچسپ واقعات مستند ماخذوں کی مدد سے پیش کئے گئے ہیں۔ قیمت:- [illegible] روپے

جلد دوم

اس میں مغل فرمانروا بابر، ہمایوں، سوری خاندان کے شیر شاہ، اور اسلام شاہ، پھر مغل شہنشاہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی، انسان دوستی کے سبق آموز واقعات لکھے گئے ہیں۔

قیمت:- [illegible] روپے

جلد سوم

اس میں اورنگ زیب عالمگیر اور اس کے بعد کے مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی اور انسان دوستی کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ زیر طبع

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

جلد ۱۳۵ ماہ ربیع الثانی ۱۴۰۵ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۸۵ء عدد ۱

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد

ایک ضروری اعلان

معارف کا زر سالانہ جنوری ۱۹۸۵ء سے تیس روپئے ہے، اس لیے براہ کرم اب تیس روپے زر سالانہ روانہ فرمائیں، اور پرانے خریداروں سے گذارش ہے کہ ان کا چندہ ختم ہو گیا ہو تو اپنا زر سالانہ فوراً بھیجیں اور اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر کریں۔ "منیجر"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

گذشتہ دسمبر میں ملک کا جو عام سیاسی انتخاب ہوا، اس کے نتیجہ میں اندرا کانگریس کی بے مثال فتح و کامرانی پر پورا ہندوستان نشاط و انبساط کا جشن منا رہا ہے۔

انتخاب میں ایسی کامیابی نہ اس ملک کے بہت ہی ہر دلعزیز وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور نہ اندرا گاندھی جیسی کارگذار اور قد آور لیڈر اور نہ جنتا پارٹی کو اپنی مقبولیت کی بے پناہ لہر کے زمانہ میں ہوئی، موجودہ وزیر اعظم راجیو گاندھی کی یہ طالع سکندری اور بخت یاوری کی دلیل ہے کہ پوری قوم نے ان کو یہ موقع دیا ہے کہ وہ اپنی جوان ہمتی اور سیاسی ہوشمندی سے ملک کی خدمت گذاری میں اپنے کردار کا سونا پگھلائیں، اس انتخاب کے نتیجہ کی بے پایاں مسرت میں لوگ فرقہ وارانہ فسادات کی خونریزیوں، امرتسر کے سورن مندر کی تلخیوں، اندرا گاندھی کے قتل کی المناکیوں اور اس کے بعد کے ہنگاموں کی سفاکیوں کو بھول گئے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملک تازہ دم ہو کر آگے بڑھنے کیلئے جاگ اٹھا ہے۔

ملک از سر نو جاگا ہے تو اب اس کی سب سے بڑی اقلیت یعنی مسلمانوں کو بھی سوچنا ہے کہ آئندہ ان کا کیا رول ہو، اس انتخاب کے ہنگاموں میں وہ ایک موثر اور جاندار قوت کے ساتھ کہیں نظر نہیں آئے، بلکہ کوئی سیاسی پارٹی ان سے خوش گمان نہ رہی حتی کہ اندرا کانگریس بھی برملا یہ کہنے میں گریز کریگی کہ مسلمانوں کے بھی ساتھ دینے کی وجہ سے انکی یہ شاندار جیت ہوئی، یہ اس لیے کہ انھوں نے کہیں متحد ہو کر انتخاب کی مہم میں حصہ نہیں لیا، وہ ہر جگہ منتشر رہے، ۱۹۴۷ء کے بعد یک طرز فکر یہ ابھرا کہ مسلمانوں کی اپنی کوئی علحدہ سیاسی جماعت رہی تو وہ فرقہ وارانہ جماعت قرار دیدی جائیگی، اس سے اور سیاسی جماعتیں تعاون نہ کریں گی، اسی خیال سے مسلمان ملک کی مختلف سیاسی جماعتوں میں شریک ہونے لگے، مگر گذشتہ ۳۷ برس کا تجربہ یہ رہا کہ مختلف پارٹیوں میں ان کی شرکت محض ضمیمہ کی رہی، وہ کسی پارٹی میں موثر قوت نہ بن سکے، وہ مسلمانوں کے مفاد کے ترجمان بننے کے بجائے پارٹیوں کے وفادار بن کر رہنے ہی پر اکتفا کرتے رہے، اس سے عام مسلمان احساس زیاں اور احساس محرومی کے شکار ہو کر ان پارٹیوں سے بدظن ہوتے گئے، اور ساکت و صامت بن کر سیاسی زندگی گذارنا پسند کیا، بلوے اور فسادات کے موقع پر ان کی چیخ ضرور

سنائی دیتی ہے لیکن یہ چیخ بے بسی مجبوری اور بیچارگی کی ہوتی ہے، مسلمان قائد اگر کہیں ہیں تو ان کو مقتدی کے نہ ہونے کی شکایت ہے، اور مقتدی صحیح قائد کے نہ ہونے کا شکوہ کرتے ہیں، اسی شکوہ و شکایت میں انکی قیادت معطل ہے، اس کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے کہ مسلمانوں کی قیادت کیسی ہو؟ مسلمان عوام اپنی تمام مصیبتوں اور بیچارگیوں کے باوجود ابھی تک اپنے ظرف میں سونے کی طرح کھرے ہیں، وہ کھوٹے نہیں ہوئے ہیں، ان کا ظرف اس وقت زنگ آلود ضرور ہو گیا ہے، اس کو کھرچنے کی ضرورت ہے، پھر وہ کندن کی طرح چمکتے نظر آئیں گے۔

مسلمان کیا چاہتے ہیں، اس کا مطالعہ کرنے کی بھی ضرورت ہے، مولانا ابوالکلام آزاد نے اسلام اور قومیت کی بحث میں اپنی طرف سے یہ کہہ کر ان کے جذبات کی ترجمانی کی تھی کہ "میں ایک مسلمان ہوں، اور اس خیال سے مجھ کو فخر محسوس ہوتا ہے کہ گذشتہ تیرہ سو برس کی جو اسلامی روایات ہیں وہ میری وراثت ہیں، میں اس کو بال برابر بھی چھوڑنے کو تیار نہیں، اسلامی تاریخ، اسلامی تعلیم، اسلامی آرٹ، اسلامی سائنس اور اسلامی کلچر میری دولت کے اجزاء ہیں، اور ایک مسلمان کی حیثیت سے میرا یہ فرض ہے کہ میں اس کو محفوظ رکھوں، اور یہ میں برداشت نہیں کر سکتا ہوں کہ میرے اس روحانی ورثہ میں کوئی مداخلت کرے، ان جذبات کے ساتھ میں ایک اور چیز کا بھی مالک ہوں، جو میری خارجی زندگی کے حقایق ہیں، اسلام کی روح میرے اس عقیدہ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتی، بلکہ اسلام مجھ کو اس کی طرف مائل کرتا ہے، مجھ کو فخر ہے کہ میں ہندوستانی ہوں، میں یہاں کی متحدہ قوم کا ضروری جزء ہوں، اس قوم کی شوکت میرے جیسے قیمتی جزء کے بغیر نامکمل ہے"۔

مولانا ابوالکلام کی زبان سے جو بات نکلی ہے، وہی ہندوستان کے عام مسلمانوں کے دبے ہوئے جذبات ہیں، جن کو ابھار کر ان کو ملک کی قومی بہاؤ کا شریک بنایا جا سکتا ہے، کیا مسلمان سچے مسلمان بن کر سچے ہندوستانی نہیں ہو سکتے ہیں؟ مولانا محمد علی جوہر نے اپنی زندگی میں یہ تربیت دینے کی کوشش کی تھی کہ مسلمان ایک قوم پرور، ایک محب وطن اس لیے ہے کہ اسلام نے نہایت کشادہ دلی سے حقوق جار کو تسلیم کیا ہے، اور جس مذہب کے قانون نے غیر مسلموں کو بھی حق شفعہ دے کر پڑوسی کے بعض حقوق کو سگے بھائی اور مسلمانوں کے حقوق پر بھی

ترجیح دی وہ قومیت مشترکہ کے خلاف نہیں ہوسکتا، ہر حالت میں غیر مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی اسلام اور ایمان کے منافی ہے، حقیقتاً ایک مسلمان کے لیے حب الوطن من الایمان ہے۔

کیا ہندوستان کے مسلمان حب الوطن من الایمان پر عمل پیرا نہیں ہوسکتے ہیں؟ ضرور ہوسکتے ہیں بشرطیکہ ان کے صحیح جذبات کی پامالی نہ کی جائے، ڈاکٹر ذاکر حسین خان نے کاشی ودیا پیٹھ کے اپنے خطبہ میں کہا تھا کہ "ہندوستانی مسلمانوں کو اپنا دیش کسی اور سے کم عزیز نہیں ہے، وہ ہندوستانی قوم کا جزو ہونے پر فخر محسوس کرتے ہیں، مگر وہ ایسا جزو بننا کبھی گوارا نہ کریں گے جس میں انکی اپنی حیثیت بالکل مٹ چکی ہو" مسلمان عوام اب ایسی ہی قیادت کے منتظر ہیں کہ جو ان کے ملی وجود اور تمدنی ہستی کو برقرار رکھ کر اور سچا محب وطن بنا کر ان کو ملک کے قومی بہاؤ کے ساتھ لے چلے، جن کے ہاتھوں میں اس ملک کی قسمت ہے، ان کو بھی کھلے ذہن کے ساتھ یہ سوچنا ہے کہ ملک کی یہ سب سے بڑی اقلیت کس طرح مطمئن رہ سکتی ہے، اعصابی جنگ، ذہنی ارتداد اور بلوے فساد سے ان کو رام کیا جاسکتا ہے یا ان کے صحیح جذبات کا صحیح ازالہ کر کے ان کے دلوں کی تسخیر کی جاسکتی ہے۔

یہ نعرہ پرفریب اور سراسر گمراہ کن ہے کہ پہلے ہندوستانی، پھر بعد میں ہندو یا مسلمان، ایسے نعرے لگانے والے عموماً فریبی اور ریاکار ہوتے ہیں، وہ کبھی صحیح معنوں میں محب وطن نہیں ہوتے، چاہے وہ اپنے کو خالص ہندوستانی ہونے کا ڈھنڈورا کیوں نہ پیٹتے رہیں، اچھے ہندو ہی اچھے محب وطن، اور سچے مسلمان ہی سچے وطن دوست ہوسکتے ہیں، مولانا محمد علی کی سیاسی تربیت یہی تھی کہ جو شخص اپنے نفس کی حفاظت اور تربیت سے غافل ہے وہ اپنے خاندان کو کیا نفع پہونچا سکتا ہے، جو اپنے خاندان والوں کے سود و بہبود سے غافل ہے وہ ملت کے سود و بہبود کیلئے کیا کرسکے گا، اور جو ملت کیلئے کچھ نہیں کرسکتا ہے، وہ بھلا قوم اور ملک کے لیے کیا کرسکے گا۔

مسلمانوں کا یہی سیاسی شعور ان کے تحت الشعور میں مردہ ہو کر پڑا ہوا ہے، اگر اس میں صحیح قیادت کے ذریعہ سے جان ڈالی گئی تو وہ متحرک اور فعال ہو کر قومی بہاؤ کے لیے مفید اور جاندار ہوسکتے ہیں، ورنہ وہ شاید منجمد اور جامد ہی رہ کر اپنی سیاسی زندگی بسر کرنا پسند کریں گے۔

مقالات

تاریخ ارض القرآن اور مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات

از:- حافظ محمد عمیر الصدیق دریا آبادی ندوی رفیق دار المصنفین

مسکن اول سے ہجرت اس عنوان کے تحت سید صاحب نے عرب سے نکل کر دوسرے علاقوں کی طرف امم سامیہ کی ہجرت پر بحث کی ہے، اور اس ضمن میں ولیم راجرس، سموآل لے انگ اور فرانسیسی مورخ ہوآرٹ اور شریڈر کی تشریحات کو اپنی تائید میں پیش کیا ہے لیکن اس بحث کی ابتدا انھوں نے جس عبارت سے کی ہے، اس کی ادبی لطافت کا تقاضہ ہے کہ قارئین معارف ایک بار پھر اس سے شادکام ہوں اور تحقیق و ادب کی خوشگوار آمیزش سے لطف حاصل کریں سید صاحب لکھتے ہیں:

"عرب کے ملک میں پانی کا دریا نہیں، لیکن وہاں انسانوں کا دریا ہے تاریخ نے چار بار اس دریا میں طوفان آتے دیکھا ہے، ایک مسیح سے ڈھائی ہزار یا تین ہزار برس پہلے، جب یہاں سے قبائل کا سیلاب موجیں مارتا ہوا بابل و سیریا، مصر اور فینیشیا (کنعان) میں پھیل گیا، اس سیلاب کا زور کم ہو رہا تھا کہ ۱۵۰۰ ق م میں ایک اور طوفان، آرمی، موابی اور مدیانی قبائل کا اٹھا، اور پاس کے ملکوں میں پھیل گیا

لیکن اسکا دائرہ پہلے سے کم تھا، تیسری بار معینی، سبائی وغیرہ اٹھے اور پھیلے، لیکن سب سے آخری طوفان جو پہلی صدی ہجری میں مسیحؑ سے چھ سو برس بعد اٹھا، وہ سب سے زیادہ وسیع الاثر تھا، جو ایک طرف گنگا کے دہانے سے مل گیا، اور دوسری طرف بحر محیط سے۔"

(تاریخ ارض القرآن۔ جلد اول صفحہ ۱۱۶)

اس کے بعد سید صاحبؒ نے امم سامیہ سے متعلق ایک طویل بحث کی ہے، عاد کے ذکر میں بعض مستشرقین کی رائے یہ ہے کہ یہ نام صرف ایک فرضی اور مذہبی داستان کے عنوان کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن سید صاحبؒ اس کو ایک انتہائی غلطی تصور کرتے ہیں، اور جدید تحقیقات کی روشنی میں یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ عرب کے تمام قدیم باشندے (امم سامیہ) ایک ایسی بڑی اور باعظمت جمعیت تھے، جنہوں نے بابل، مصر، شام میں بڑی بڑی حکومتیں قائم کیں، اب اگر عرب والے اپنی زبان میں ان قدیم باشندوں اور ان کی جماعت کے افراد کو عاد، ثمود، طسم، جدیس کہتے ہیں، تو کیا ان ناموں کے وضع کرنے کے جرم میں حقیقت اور نفس واقعہ مٹ جائے گا، وہ لکھتے ہیں:۔

"کوئی قوم جب برسر اقتدار ہوتی ہے، تو حقیقت میں اس کل کے ضمن میں کوئی جزو ممتاز ہوتا ہے، اور اس کے انتساب سے مجموعی قوم مقتدر اور ممتاز تسلیم کرلی جاتی ہے، امم سامیہ کی کثیر الافراد جمعیت میں ضروری ہے کہ کوئی خاص جزو، قوت حاکمہ کا مالک ہو اور بقیہ اجزا اس کے اشارہ پر حرکت کرتے ہوں، اس جزو کا حقیقی نام کچھ ہو لیکن اہل عرب اس کا نام عاد بتلاتے ہیں، ولا مشاحۃ فی الاصطلاحات" (ج ۱ ص ۱۲۶)

اس کے علاوہ سید صاحبؒ سب سے مستند ذریعہ قرآن کو سمجھتے ہیں، جس نے عاد کی حقیقت بیان کرتے ہوئے کہا کہ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ اِرَمَ، ایک جگہ اور آتا ہے، وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ، تو قوم نوح کی بربادی کے بعد عرب میں جو سب سے پہلی مقتدر اور حکمران

جماعت ظہور میں آئی، قرآن کی زبان میں اس کا نام عاد ہے، اور یہی قدیم و ابتدائی امم سامیہ کی حقیقت ہے، فرانس کے مشہور مورخ موسیو سیدیو، نے اپنی تاریخ عرب میں عاد کی حکمرانی کو ایک مفروضہ قرار دیا ہے، لیکن سید صاحب کی رائے یہ ہے کہ "امم سامیہ کی حقیقت سمجھنے کے بعد یہ "فرض" یقین سے بدل سکتا ہے" (تاریخ ارض القرآن - جلد اصفحہ ۱۲۰)

سید صاحب نے اس حقیقت کو صفحہ ۱۲۸ سے صفحہ ۱۰۵ تک جس انداز میں واضح کیا ہے، وہ اعلیٰ تحقیق کی ایسی مثال ہے جس پر خود تحقیق کو ناز ہے، تورات، تاریخ قدیم، تحقیقات جدیدہ اور قرآن مجید کے بے شمار ماخذ سے انھوں نے جس طرح اس بحث پر داد تحقیق دی ہے، اس کی قدر صرف اس حصہ کے مطالعہ سے ہی ہو سکتی ہے، ایک انتہائی خشک موضوع پر لکھتے ہوئے بھی سید صاحبؒ کے قلم کی شگفتگی میں کمی کا احساس نہیں ہوتا، مثلاً تحقیقات جدیدہ کی بحث میں وہ رکھتے ہیں کہ:

> "آرکیالوجی کی اعانت سے بابل کے حجریات و آثار نے قدامت کے پردہ کو چاک کر دیا ہے، اب نئے سرے سے بابل کا تمدن زندہ ہو رہا ہے اور علم الآثار کے چراغ طلسمی میں اب نظر آتا ہے کہ بابل و اسیریا کا ہر پتھر درحقیقت ان کی تاریخ کا صفحہ ہے" (جلد اصفحہ ۱۳۵)

عاد کی بحث میں شہر عدن پر بھی گفتگو کی گئی ہے، فارسٹر، عدن کو عدنان سے نسبت دیتے ہیں لیکن سید صاحبؒ اس رائے کو قطعی غلط مانتے ہیں، کیونکہ عدنان کا مسکن تو شمالی عرب تھا، عدن جنوبی یمن میں ہے، اس لیے دونوں میں کوئی تعلق نہیں، سید صاحب کی تحریر میں استدلال کا پرزور انداز ملاحظہ ہو۔

> "عہد قدیم میں عموماً سامی مذاق یہ رہا ہے کہ شہر کا نام بعینہ بانی شہر کے نام پر رکھتے تھے،"

لیکن اسکا دائرہ پہلے سے کم تھا، تیسری بار معینی، سبائی وغیرہ اٹھے اور پھیلے، لیکن سب سے آخری طوفان جو پہلی صدی ہجری میں مسیحؑ سے چھ سو برس بعد اٹھا، وہ سب سے زیادہ وسیع الاثر تھا، جو ایک طرف گنگا کے دہانے سے مل گیا، اور دوسری طرف بحر محیط سے"

(تاریخ ارض القرآن ۔ جلد اول صفحہ ۱۱۶)

اس کے بعد سید صاحبؒ نے امم سامیہ سے متعلق ایک طویل بحث کی ہے۔ عاد کے ذکر میں بعض مستشرقین کی رائے یہ ہے کہ یہ نام صرف ایک فرضی اور مذہبی داستان کے عنوان کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن سید صاحبؒ اس کو ایک انتہائی غلطی تصور کرتے ہیں، اور جدید تحقیقات کی روشنی میں یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ عرب کے تمام قدیم باشندے (امم سامیہ) ایک ایسی بڑی اور باعظمت جمعیت تھے، جنہوں نے بابل، مصر، شام میں بڑی بڑی حکومتیں قائم کیں، اب اگر عرب والے اپنی زبان میں ان قدیم باشندوں اور ان کی جماعت کے افراد کو عاد، ثمود، طسم، جدیس کہتے ہیں، تو کیا ان ناموں کے وضع کرنے کے جرم میں حقیقت اور نفس واقعہ مٹ جائے گا، وہ لکھتے ہیں:۔

"کوئی قوم جب برسر اقتدار ہوتی ہے، تو حقیقت میں اس کل کے ضمن میں کوئی جزو ممتاز ہوتا ہے، اور اس کے انتساب سے مجموعی قوم مقتدر، اور ممتاز تسلیم کرلی جاتی ہے، امم سامیہ کی کثیر الافراد جمعیت میں ضروری ہے کہ کوئی خاص جزو، قوت حاکمہ کا مالک ہو اور بقیہ اجزا اس کے اشارہ پر حرکت کرتے ہوں، اس جزو کا حقیقی نام کچھ ہو لیکن اہل عرب اس کا نام عاد بتاتے ہیں، ولا مشاحۃ فی الاصطلاحات" (ج ا ص ۱۲۶)

اس کے علاوہ سید صاحبؒ سب سے مستند ذریعہ قرآن کو سمجھتے ہیں، جس نے عاد کی حقیقت بیان کرتے ہوئے کہا کہ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ اِرَمَ، ایک جگہ اور آتا ہے، وَاذْكُرُوْا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ، تو قوم نوح کی بربادی کے بعد عرب میں جو سب سے پہلی مقتدر اور حکمران

جماعت ظہور میں آئی، قرآن کی زبان میں اس کا نام عاد ہے، اور یہی قدیم و ابتدائی امم سامیہ کی حقیقت ہے، فرانس کے مشہور مورخ موسیو سیدیو، نے اپنی تاریخ عرب میں عاد کی حکمرانی کو ایک مفروضہ قرار دیا ہے، لیکن سید صاحب کی رائے یہ ہے کہ "امم سامیہ کی حقیقت سمجھنے کے بعد یہ "فرض" یقین سے بدل سکتا ہے"۔ (تاریخ ارض القرآن - جلد ۱ صفحہ ۱۲۰)

سید صاحب نے اس حقیقت کو صفحہ ۱۰۸ سے صفحہ ۸۵ تک جس انداز میں واضح کیا ہے، وہ علمی تحقیق کی ایسی مثال ہے، جس پر خود تحقیق کو ناز ہے، تورات، تاریخ قدیم، تحقیقات جدیدہ اور قرآن مجید کے بے شمار ماخذ سے انھوں نے جس طرح اس بحث پر داد تحقیق دی ہے، اس کی قدر صرف اس حصہ کے مطالعہ سے ہی ہو سکتی ہے، ایک انتہائی خشک موضوع پر لکھتے ہوئے بھی سید صاحبؒ کے قلم کی شگفتگی میں کمی کا احساس نہیں ہوتا، مثلاً تحقیقات جدیدہ کی بحث میں وہ رکھتے ہیں کہ :-

"آرکیالوجی کی اعانت سے بابل کے حفریات و آثار نے قدامت کے پردہ کو چاک کر دیا ہے، اب نئے سرے سے بابل کا تمدن زندہ ہو رہا ہے اور علم الآثار کے چراغ طلسمی میں اب نظر آ رہا ہے کہ بابل و اسیریا کا ہر پتھر درحقیقت ان کی تاریخ کا صفحہ ہے"۔ (جلد ۱ صفحہ ۱۳۵)

عاد کی بحث میں شہر عدن پر بھی گفتگو کی گئی ہے، فارسٹر، عدن کو عدنان سے نسبت دیتے ہیں لیکن سید صاحبؒ اس رائے کو قطعی غلط مانتے ہیں، کیونکہ عدنان کا مسکن تو شمالی عرب تھا، عدن جنوبی یمن میں ہے، اس لیے دونوں میں کوئی تعلق نہیں، سید صاحب کی تحریر میں استدلال کا پر زور انداز ملاحظہ ہو۔

"عہد قدیم میں عموماً سامی مذاق یہ رہا ہے کہ شہر کا نام بعینہ بانی شہر کے نام پر رکھتے تھے،

عرب کے شہر رقیم، سبا، حضرموت، عمان، مدین، اوفر، حویلہ، تیما، وغیرہ کے اسمائے قسم کے نام ہیں، اس بنا پر اگرین کے قدیم شہر "عدن" کہ جس کے قریب وہ تمام عمارات واقع ہیں جن کو عرب، عادیات کہتے ہیں، اور تاریخ جس کے قریب عاد کی آبادی کا نشان باقی ہے، اگر ہم عادین کا مخفف سمجھیں تو کیوں غلط ہوگا؟ عادین کی جمعیت پر اعتراض نہ کرو کہ قبیلہ کے نام کے پیچھے نیو (فرزندان) کا اضافہ کرنا شمالی عرب کی زبان ہے، عموماً قدیم طریقہ یہی ہے کہ پدر قبیلہ کے نام کی جمعیت سے قبیلہ کا نام پیدا کر لیتے ہیں، مثلاً لودیم، مصرایم، جرایم وغیرہ، عربی میں جمع مکسر میں اب تک یہ قاعدہ جاری ہے، مثلاً منذر سے مناذرہ غسان سے غساسنہ، ارقم سے اراقم" (تاریخ ارض القرآن ص ۱۸۴)

مستشرق نیوبھر نے عدن کو (نیم) کے دو ان کے ساتھ تطبیق دینے کی کوشش کی ہے، لیکن سید صاحبؒ ایک خاص انداز میں اس کا رد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

"شاید نیوبھر کو حزقیال کے اس درس کی خبر نہیں جس میں عدن اور دوان ایک ساتھ واقع ہیں" (ج ۱، ص ۵۴)

ایک موقع پر یارح، یعرب اور جرہم کی بحث میں فارسٹر کا ذکر پھر آیا ہے، فارسٹر نے یارح، یعرب اور جرہم کو ایک ہی نام ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، سید صاحب لکھتے ہیں کہ

"یارح اور یعرب کا اتحاد تو ظاہر ہے، لیکن یارح اور جرہم میں باہم کیا تعلق ہے؟ یہ غلطی اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ یونانی تلفظ میں جس کی تمام السنہ یورپ میں تقلید ہے "ی" "ج" سے بدل کر یرح کا جیرح ہو گیا، واقعہ یہ ہے کہ جرہم خاص سامی التلفظ نام ہے، یونانی نہیں، کیونکہ اسمائے قدیم کے متعلق عربوں کے معلومات براہ راست یہودیوں سے ماخوذ ہیں، جن کی زبان ... تھی وسریانی تھی اور یا خود ان کے عربی موروثی روایات ہیں اور

ان دونوں کے لحاظ سے س اور ح کا مبادلہ غیر مسلم ہے، یہ مبادلہ سامی (عبری و عربی)
اور غیر سامی (یونانی و لاطینی) زبانوں کے مابین ہوتا ہے، ورنہ خود سامی زبانوں کے
اندر اس قسم کا مبادلہ کبھی نہیں ہوتا۔" (ج ۱ ص ۲۲۶)

بالوے کا اعتراض | حمیر و سبا کی بحث میں، سید صاحبؒ نے بالوے کی ایک بحث کا جائزہ لیا ہے جنھوں نے کتبات کے اصول کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ شاہان سبا و حمیر کا آئین تحریر یہ تھا، کہ وہ کتبات میں عام طور سے لفظ ملک (شاہ) کے بعد قلعہ حکومت کا اور پھر اپنے شہر حکومت کا ذکر کرتے تھے، جنانچہ "ملک حمیر و ریدان و سبا و سلحین" میں سبا و سلحین میں جو تعلق ہے یعنی پہلا شہر ہے اور دوسرا قلعہ ہے تو یہی تعلق حمیر و ریدان میں بھی ہے، اس بنا پر حمیر قوم کا نام نہیں، بلکہ قلعہ شاہی کا نام ہے، رفتہ رفتہ اس نے حکومت کا اور پھر تمام قوم کا نام اختیار کر لیا، (ج ۱ ص ۲۰۴)

سید صاحب کو متعدد وجوہ سے اس تحقیق سے انکار ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:-

"اس تاریخ کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ سامی قوموں میں شخص کے نام پر ملک کے نام رکھنے کا رواج عام تھا، لیکن ملک کے نام پر قوم کا نام کبھی نہیں رکھا گیا، اس کی متعدد مثالیں گزر چکی ہیں، سبا، ایک قوم کا اصل میں نام ہے، لیکن چونکہ اس قوم کا پایہ تخت شہر مارب تھا، اس لیے خود شہر مارب کو سبا کہنے لگے، جیسا کہ شاہ اذینہ حبشی کے کتبہ سے معلوم ہوتا ہے، اس کے علاوہ قاعدہ یہ ہے کہ لفظ مذکور اگر کسی مقام کا نام ہوتا ہے تو اس کے پہلے لفظ "ذو" (مالک)، یا لفظ "حضر" (شہر)، یا لفظ "بیت" (قلعہ) آتا ہے جیسا کہ ذو ریدان و ذو سلحین" کہ یہ دونوں مقامات کے نام ہیں "حضر موت و بیت ابین" یعنی شہر عدن و قلعہ سلحین و شہر مارب، لیکن اس قسم کا استعمال لفظ حمیر کے ساتھ کہیں نظر نہیں آتا مزید براں اب تک کتبات میں جس قدر شہروں اور قلعوں کے نام ملے ہیں وہ تمام تر عربی

جزیروں میں مذکور ہیں، لیکن حمیر کا بحیثیت قلعہ یا شہر کے کہیں ذکر نہیں ہے"۔

(تاریخ ارض القرآن جلد ۱ صفحہ ۲۲۵)

حضرت ایوب اور فارسٹر | حضرت ایوب کے ذکر میں بھی حسب سابق، سید صاحب نے حضرت ایوب کے خاندان، قبیلہ اور ان کے زمانہ کی تعیین میں حد درجہ تحقیق سے کام لیا ہے، دوران بحث وہ فارسٹر کا ذکر کرتے ہیں، جنہوں نے اس بحث پر کئی صفحے سیاہ کیے ہیں، کہ ایوب عرب تھے، اور نسل ادوم سے تھے، سید صاحب لکھتے ہیں کہ یہاں تک تو صحیح ہے، لیکن فارسٹر یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ ایوب کا شہر دنابا تھا، اور یہ غلطی ان سے اسلئے ہوئی کہ ان کی نقل کردہ ایک عبارت میں یہ تحریر ہے۔

والملوك الذی ملكوا فی ادوم	اور جو سلاطین پہلے ادوم پر حکمراں ہوئے
الذی كان ملك علی تلك الارض	تھے وہ بالق بن باعور تھے اور ان کے
من قبل بالق بن باعور واسم	پایہ تخت کا نام دنابا تھا اس کے بعد یوباب
مدینتہ دنابا ومن بعدہ یوباب	بادشاہ ہوئے،

(ارض القرآن جلد دوم صفحہ ۳۱)

سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ یہ عبارت عربی قواعد کی رو سے بھی غلط ہے، اور مدینۃ کی ضمیر یوباب کی طرف راجع کرنے سے فارسٹر کو غلطی ہوئی، یہ صریحاً غلط ہے، جس کو ہر عربی داں سمجھ سکتا ہے۔　　(جلد دوم صفحہ ۳۲)

فاران کی بحث | وادی فاران کے سلسلہ میں مستشرقین میں باہمی اختلاف رائے ہے، ان کو حقیقی طور سے یہ نہیں معلوم ہے کہ فاران کس مقام کا نام ہے، بعض نے جزیرہ نمائے سینا کے مغرب میں مصر سے متصل علاقہ کو فاران قرار دیا ہے، بعض نے کوہ سینا کے دامن میں اس کو

جگہ دی ہے، لیکن اجماعی طور سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان مستشرقین کے خیال میں فاران کوہ سینا میں واقع ہے، سید صاحبؒ نے ان کی رائے کی غلطی اور اسلام کے دعوی کی صحت کو متعدد طریقوں سے واضح کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ

"سب سے اول یہ سمجھنا چاہئے کہ عرب، حجاز، مکہ، کعبہ، یہ جتنے الفاظ واسماء ہیں اُس وقت تک پیدا ہی نہیں ہوئے تھے، لفظ عرب دسویں صدی ق۔م میں پیدا ہوا ہے، حجاز کا لفظ اس سے بھی زیادہ مستحدث ہے، مکہ کا نام دوسری صدی مسیحی میں بطلیموس کے ہاں سب سے پہلے مکاربا کی شکل میں نظر آتا ہے اسی لیے توراۃ نے اس مقام کا نام اولاً صرف مدبار رکھا ہے، اور قرآن نے اسی کو وادی غیر ذی زرع (بن کھیتی کی زمین) کہا کہ اس کے سوا اس کا اسوقت کوئی دوسرا نام نہ تھا، مدبار، وادی غیر ذی زرع اور عرب ہم معنی لفظ ہیں اسی لیے توراۃ کا یہ کہنا کہ اسماعیل نے بادیہ میں سکونت کی، اس کے بالکل یہ معنی ہیں کہ اس نے عرب میں سکونت کی۔

دوسری بات یہ ہے کہ ممالک عرب میں سے سب سے پہلا نام توراۃ میں مدیان (مدین) نظر آتا ہے، فاران کی طرح مدین غیر معروف نہیں ہے، شہر مدین تحقیقی اور یقینی طور سے حجاز میں ساحل بحر احمر (عقبہ کے سرے پر) واقع تھا، اور اب تک اسی نام سے وہ موجود ہے، قدیم تاریخ میں جہاں کہیں بھی مدیانی لوگوں کا ذکر ہے، ساتھ ہی اتحادِ نام کے ساتھ اسماعیلیون کا ذکر ہے، بلکہ توراۃ نے اکثر دونوں کو ایک سمجھا ہے، یہ اتحاد حضرت ابراہیمؑ کی ایک ہی پشت کے بعد توراۃ میں نظر آتا ہے (ایضاً ص۷۵)

اس کے سید صاحبؒ نے توراۃ کی مختلف عبارتوں کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے، کہ

ان عبارتوں میں جو اختلاط اور تشابہ ہے کیا اس کا حل بغیر اس کے ہو سکتا ہے، کہ ان لوگوں کو نسلاً اسماعیلی اور وطناً مدیانی یعنی حجازی فرض کیا جائے! اس کے علاوہ سید صاحبؒ نے توراۃ کے دوسرے حوالوں سے بھی یہ ثابت کیا ہے کہ فاران سے مراد ملک حجاز ہے اور مستشرقین کے شکوک وشبہات ناروا ہیں، (جلد ۲ صفحہ ۲۹)

سید صاحب، مستشرقین کی محض غلط بیانیوں کی ہی تصحیح نہیں کرتے ہیں، بلکہ ان کی تحقیق اور تحریر میں اگر کہیں کوئی نقص یا کمی نظر آتی ہے تو اس کی جانب بھی اشارہ کرتے ہیں، مثلاً شاہان انباط کے سلسلہ میں تاریخ و آثار نے جو انکشاف حال کیا، اس کی اعانت سے ڈوسے نام ایک فرانسیسی مستشرق نے بادشاہوں کے ناموں کی ایک فہرست تیار کی، یہ فہرست سنہ ۱۶۹ ق م سے شروع ہو کر سنہ ۱۰۶ء پر ختم ہوتی ہے، سید صاحبؒ نے اس فہرست کو نقل کیا ہے، اور اس میں ایک نام "مالک اول" کا اضافہ کیا ہے، یہ اضافہ انھوں نے مشہور یہودی مورخ یوسیفوس کے حوالے سے کیا ہے!

(جلد ۲ صفحہ ۶۲)

<u>قریش کی وجہ تسمیہ</u> | خاندان قریش کے بانی کا نام فہر تھا، اور لقب قریش تھا، قریش کے معنی متعدد ہیں، اس کا ایک ماخذ تقریش و تقرش ہے، جس کے معنی "اکتساب و تحصیل" کے ہیں، چونکہ اس خاندان کا اصلی پیشہ تجارت تھا، اس لیے خیال ہوتا ہے کہ یہ قریش کے نام سے موسوم ہوا، لیکن قریش کا لفظ ایک .... دریائی درندہ جانور کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، فہر نے ممکن ہے، اپنے غلبہ واستیلا اور طاقت وقوت کے اظہار کے لیے اس لقب کو اختیار کیا ہو، مستشرقین (مارگولیوتھ) نے اسی دوسری رائے کو پسند کیا، سید صاحبؒ کہتے ہیں کہ یہ قبول روایت اس بنا پر نہیں ہے کہ وہ روایۃً صحیح تر ہے، بلکہ یہ اس لیے قبول کی گئی کہ اس سے طوطمیت (ٹوٹمزم) کے ثبوت کے لیے سند ہاتھ آتی ہے، (لائف آف مارگولیوتھ) حالانکہ اس کی تردید کے لیے اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ اس خاندان میں قریش کے نام کی نہ پوجا ہوتی تھی نہ ا

نام کا دیوتا پوجا جاتا تھا۔ (جلد ۲ صفحہ ۹۰)

نولدیکی سید صاحبؒ نے ارض القرآن میں مستشرق نولدیکی کے لیے داد و تحسین کے الفاظ استعمال کیے ہیں، مثلاً اس کو یورپ کا سرمایہ ناز محقق، محقق ترین مستشرق محقق کبیر اور موجودہ یورپ میں مشرقی زبان و تاریخ کا سب سے بڑا فاضل وغیرہ وغیرہ کہا ہے، تاہم انھوں نے نولدیکی کی غلطی کی سخت گرفت کی ہے، ایک جگہ انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ عاد و ثمود وغیرہ امم بائدہ کی زبان عربی آرامی تھی، شمالی عرب کے جن مقامات میں ثمود کی سکونت ثابت ہوتی ہے، وہاں ایک خاص خط کے بہت سے کتبات پائے گئے ہیں جن کی زبان آرامی عربی ہے، زیادہ تر لوگ اس زبان کو ثمودی کہتے ہیں لیکن تھیوڈر نولدیکی، ان کتبات کی زبان کو ثمودی کہنا پسند نہیں کرتا، ان کی دلیل یہ ہے۔

" بہت قدیم زمانہ میں..... شمالی عرب اپنی زبان کو قید تحریر میں لائے ..... ان کتبات کا نام ثمودی ہے، کیونکہ وہ ثمود کے مقامات پر پائے گئے ہیں، لیکن یہ وصف مشکل ہی مناسب معلوم ہوتا ہے، کیونکہ جس زمانہ میں ثمود پوری ترقی پر تھے، اور وہ مکانات جن کو قرآن نے بیان کیا ہے، کہ پہاڑوں کو کاٹ کر بنا رہے تھے، اس ملک کی زبان نبطی تھی (ج ۲ صفحہ ۱۳۳)

سید صاحب اس کے جواب میں لکھتے ہیں کہ :۔

" اس کی دلیل غالباً نولدیکی کے پاس یہ ہوگی کہ حجر جو عام طور پر ثمود کا دار الحکومت سمجھا جاتا ہے، وہاں کے عمارات کے کتبات کی زبان نبطی ہے ..... لیکن اس خیال کی غلطی ہم انباط کے ذکر میں بیان کر چکے ہیں، ہم نے اس کو تسلیم نہیں کیا ہے کہ حجر کے کتبات جو نبطی ہیں وہ ثمود کے ہو سکتے ہیں، بلکہ ہم نے بیان کیا ہے کہ وہ انباط کی یادگار ہیں۔

اس کو کون صاحب عقل تسلیم کر سکتا ہے کہ ایک طاقت ور قوم اپنے شباب اور ترقی کے عہد میں اپنی یادگاروں کے لیے غیر قومی زبان اختیار کرے گی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ

... جب اپنی پوری ترقی پر تھے تو ملک کی زبان نبطی نہ تھی۔ (جلد ۲ صفحہ ۱۳۲)

ڈوزی کی ایک رائے میں ترمیم | سید صاحبؒ نے اسلام سے پہلے، عرب کے مذاہب پر جو بحث کی ہے، اس میں تفصیل کے ساتھ اہم سامیہ کا مذہب، شہروں، اور ہر شہر کے معبودوں کے نام، سورج، چاند کی دیوتائی حیثیتیں اور پھر ان میں بھی بڑھنے والے اور گھٹنے والے چاند کی مختلف شکلوں میں ان کی معبودانہ حیثیت، تمام قبائل عرب کے ممتاز معبودان کے علاوہ دیگر مذاہب کی عجیب و غریب تفصیل بیان کی گئی ہے اور اس میں جابجا انسائیکلوپیڈیا کے ایک مولف، الیف جوئل کی تحریر کے اقتباسات دیے ہیں اور ان کے خیالات سے تعرض بھی نہیں کیا ہے، تاہم پروفیسر ڈوزی کے ایک نظریہ میں سید صاحب نے ذرا ترمیم کی ہے، پروفیسر ڈوزی نے مکہ میں بنی اسرائیل کے عنوان سے ایک رسالہ لکھا، جس میں یہ ثابت کیا ہے کہ بنی اسرائیل، شام سے بھاگ کر حجاز کے شہر میں آکر آباد ہو گئے، اور کعبہ ان کا ہی بنایا ہوا معبد ہے، جس کو انھوں نے ہبعل (بعل) دیوتا کے نام سے تعمیر کیا تھا، عربوں میں اسی دیوتا کا نام ہبل تھا اور جو (حضرت) محمدؐ کے زمانہ تک خانہ کعبہ میں نصب تھا، سید صاحب ڈوزی کی اس رائے کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں،

"پروفیسر موصوف کے اس نظریہ نے گو جرمنی کے اکثر یہودی علماء میں برافروختگی پیدا کر دی لیکن ہم مسلمانوں کا جہاں تک تعلق ہے، اس رائے میں صرف اتنی ترمیم چاہتے ہیں کہ مکہ میں بنی اسرائیل نہیں بلکہ اسرائیل کے عم زاد بھائی بنی اسماعیل آکر آباد ہوئے تھے، اس گھر کو بنی اسرائیل نے نہیں بلکہ ان کے دادا ابراہیمؑ نے تعمیر کیا تھا، وہ ہبل کے نام سے نہیں بلکہ "خدائے عزوجل" کے نام سے بنایا گیا تھا، (ج ۲ ص ۱۸۳)

عرب میں عیسائیت | عیسائیت کے زیر عنوان سید صاحبؒ نے ایک بحث کی ہے، اس کے آخر میں وہ مستشرقین کے تضاد رائے پر لطیف طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

"عرب میں عیسائیوں کا کون سا فرقہ آباد تھا، خود عرب میں تو عیسائی، حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ سے ناپید ہیں، اس لیے عیسائیوں کا ہر فرقہ مدعی ہے کہ وہ ہمارے ہم مذہب تھے، ابو الفرج ملطی جو چھٹی صدی میں ایک یعقوبی العقیدہ، عرب عیسائی مورخ تھا، پر ثوق تمام کہتا ہے، کہ عرب تمامتر یعقوبی (جاکوبائیٹ) تھے اس کی تاریخ کا عیسائی محشی جو بیروت کا ایک مشہور کیتھولک فاضل ہے، دعوی کرتا ہے، کہ نہیں وہ کیتھولک تھے، کیونکہ کیتھولک رومیوں کے ساتھ ان کے تعلقات تھے، ڈر پیر کا منشا معلوم ہوتا ہے، کہ وہ نسطوری تھے، ہم کو حافظ کا یہ فیصلہ پسند ہے ع

بیا کاین داوری ہارا بہ پیش داور اندازیم (ایضاً ج ۱ ص ۱۸۹)

دین حنیف عرب کے مذاہب میں عیسائیت اور یہودیت کے ساتھ ساتھ سید صاحب نے مجوسی اور صابی وغیرہ الفاظ سے بھی بحث کی ہے، اور آخر میں ملت حنیف پر روشنی ڈالی ہے حنیف کا لفظ، حنف سے مشتق ہے، اور حنف کے معنی ہٹنے اور ٹیڑھے ہونے کے ہیں، حالانکہ اسلام دین حق ہے، اس لیے اس کے معنی سیدھے کے ہونا چاہیئے تھا، مستشرقین کو اعتراض کا عمدہ موقع ملا، چنانچہ مارگولیوتھ لکھتے ہیں کہ

"سریانی میں اس کے (حنیف) معنی کافر کے اور عبرانی میں منافق کے ہیں، مقدس پیروان محمد نے اس کی لفظی تحقیق کی پروا نہیں کی۔"

(لائف آف محمد، مارگولیوتھ بحوالہ ایضاً ص ۲۰۹)

مارگولیوتھ کا یہ بھی مشورہ ہے کہ

"مسلمان، قبیلہ بنو حنیفہ کے چھوٹے پیغمبر مسیلمہ کے نام کو اس لفظ کا ماخذ بنائیں، یعنی یہ کہ مسیلمہ سے مسلم اور حنیفہ سے حنیف لیا گیا ہے۔" (ایضاً ص ۲۰۹)

سید صاحبؒ نے اس علمی بد دیانتی پہ پہلے تو سخت رائے کا اظہار کیا کہ

"یورپ کے مشرقی تبحر کا ظرف باین ہمہ ادعائے وسعت بہرحال تنگ ہے اس لیے اس کی ہم کو شکایت نہیں کہ مایۂ ناز فرنگ، نہ صرف آغاز تاریخ اسلام سے ناآشنا بلکہ آئین زبان عرب سے بھی آگاہ نہیں، دنیا میں کس نے اپنا امتیازی لقب دشمن کے نام و خاندان پہ رکھا ہے، اصل یہ ہے کہ نری عربی دانی اور بات ہے، اور اسلامی واقفیت اور چیز ہے،

عشق بازان دیگرند و عشق سازان دیگرند آنچہ در فرہاد می بینم در پرویز نیست

(ایضاً ص ۲۰۹)

اس کے بعد سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ :-

اہل عرب کے نزدیک حنیف حضرت ابراہیم کا لقب تھا اس لیے ان کے مذہب کا نام ملت حنیف رکھا گیا، عرب کے بعض نیک دل لوگ جو عرب کے تمام موجودہ مذاہب بت پرستی، یہودیت اور عیسائیت کے مفاسد سے گھبرا کر تلاش مذہب میں نکلتے تھے، وہ آخر اسی آستانہ دین حنیف پر آکر تسلی اور اطمینان پاتے تھے۔ (ایضاً ص ۲۰۹)

اس کے بعد سید صاحب نے آٹھ صفحات پر حنیف کے لغوی معنی کی تحقیق کی ہے، اور زبان و قرآن کے حوالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ حق کے متلاشی اور دین ابراہیم کے متبعین کے لیے یہ لفظ عرب میں عام طور سے رائج تھا، جہاں تک اس کے لغوی معنی کا معاملہ ہے، وہ لکھتے ہیں کہ

"حنیف، حنفؔ سے مشتق ہے، عربی میں اس کے معنی مڑنے اور جھکنے کے ہیں، اس لیے حنیف، وہ شخص ہے جو ایک طرف سے جھک کر اور مڑ کر دوسری طرف جائے، یہ لفظ اچھے اور برے دونوں معنوں میں مستعمل ہو سکتا ہے، اگر یہ فرض

کیا جائے کہ اس نے اچھی بات کو چھوڑ کر بری بات اختیار کی تو حنیف کے وہ معنی ہو سکتے ہیں، جس میں عبرانی و سریانی میں وہ مستعمل ہے یعنی کافر و منافق، اور اگر یہ سمجھا جائے کہ برے کام کو ترک کر کے اس نے کوئی اچھا کام پسند کیا ہے تو اس کا وہ مفہوم ہو گا جس میں

اہل عرب اس کو بولتے ہیں، یعنی دین دار اور خدا پرست، اس بنا پر اس لفظ کے اچھے یا برے مفہوم کی تعیین موقع استعمال اور حرف صلہ سے ہو گی، اصل میں اس کا ابتدائی استعمال للہ یا للدین کی تخصیص کے ساتھ ہوتا تھا، یعنی الحنیف للہ، خدا کی طرف جھکنے والا اور الحنیف للدین، سچے مذہب کی طرف جھکنے والا، کثرت استعمال اور زباں زدگی عام سے اس قید کی ضرورت نہیں رہی اور مطلق حنیف کے معنی بھی حنیف للہ اور حنیف للدین کے سمجھے جانے لگے، چنانچہ قرآن مجید میں دونوں طرح سے اس کا استعمال ہوا، حنفاء للہ، اور مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ۔ (ایضاً ۲۱۰)

اس انداز سے سید صاحبؒ نے مستشرقین کے اعتراض، بلکہ طنز کا مسکت جواب دیا اور ان کے علمی ظرف کی وسعت کو بھی ظاہر کر دیا۔

آخر میں مذکورہ بالا بحث کے دوران عرب میں شرک، بت پرستی اور دہریت کے بارہ میں ایک مفصل مضمون ہے، جس میں عرب کے بتوں اور ان کے ناموں کی لغوی و معنوی تحقیق ہے، سید صاحب نے لات بت کی بحث کے موقع پر مستشرقین اور خصوصاً سیل اور مارگولیوتھ کے اس الزام کا ذکر کیا ہے کہ :۔

" اللہ اور اللات ایک ہی لفظ کی دو صورتیں ہیں، اللہ مذکر دیوتا کیلئے قریش میں مستعمل تھا اور اللات یعنی دیوی، اس لفظ اللہ کی قریش نے تانیث بنائی تھی۔" (ایضاً ص ۲۲۶)

سید صاحب لکھتے ہیں کہ :۔

"ان عقلمندوں سے پوچھنا چاہئے کہ اللہ کی تانیث، عربی قواعد کے موافق اللات کیوں کر ہو سکتی ہے، اس کی تانیث اگر ممکن ہو تو اللّٰہتہ ہونا چاہئے یا آلاہتہ، اللہ کی ہائے اصلی کیونکر تانیث سے ساقط ہو گئی، اگر ہمارا مشورہ سخن قبول ہو تو اس زمانہ لفظ کی پیدائش کے لیے عرب کی خشک سرزمین کے بجائے ملک شام کا سر سبز علاقہ مناسب ہو گا، کیونکہ عرب کے اکثر دیوتا ملک شام ہی کے باشندے تھے، یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ہیروڈٹس مورخ نے مسیح سے چار سو برس پہلے عرب کا ایک دیوتا کا نام لیلات بتایا ہے، حالانکہ اس وقت قریش کا وجود نہیں تھا، اس لیے ان کی زبان کا لفظ بھی اسوقت موجود نہیں ہو سکتا۔" (ایضاً ص ۲۲)

اس کے بعد انھوں نے اس لفظ کی لغوی و تاریخی تحقیق میں یہ ثابت کیا کہ لات، لَتّ سے مشتق ہے، جس کے معنی گھولنے کے ہیں (اردو میں اسی سے لتنا یا لت کرنا بنا ہے)، واقعہ یہ ہے کہ عرب میں ایک شخص تھا، جو زمانہ حج میں ایک چٹان پر بیٹھ کر ستو گھول گھول کر حاجیوں کو پلاتا تھا، اس کے مرنے کے بعد لوگوں نے اسی چٹان کو پوجنا شروع کر دیا، اور اس کا نام لات یعنی گھولنے والا رکھا۔

(ایضاً صفحہ ۲۲)

اس کے علاوہ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ :۔

قدیم سامی زبانوں میں خدائی کے لیے اِل یا ایل کا لفظ عام طور سے موجود تھا، تائے تانیث لگنے سے ایلت ہو گیا، جس کے معنی دیوی کے ہوں گے، عربوں نے جب اس لفظ کو اختیار کیا تو اپنا الف لام تعریفی، اسپر اضافہ کیا، اور پہلے الف کو اپنے قاعدہ کے مطابق جیسا کہ اللہ میں ہوا ہے، گرا کر اللّٰت بنا لیا، اور اس سے اللات ہو گیا، اللات کا

نام نبطی کتبات میں ایلات کی صورت میں ملا ہے۔ (ایضاً ص ۲۲۶)

اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ کیا اس فیالوجی کو ہمارے یورپین محققین پسند کرتے ہیں؟

لفظ اللہ کے متعلق مار گولیوتھ کی تحقیق یہ ہے کہ:۔

"یہ اصل میں قریش کے خاندانی دیوتا کا نام تھا، اس لیے محمدؐ کی توحید پرستی کے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے دوسرے قبائل کے دیوتاؤں کو مٹا کر اپنے خاندانی دیوتا کو منوایا"۔ (ایضاً ص ۲۲۹)

اس اعتراض کی لغویت اور زہرناکی عبارت سے ہی ظاہر ہے، سید صاحب ہربات کو تحقیق کی میزان و معیار پر رکھتے تھے، اس لیے اس بے سروپا دعویٰ سے ان کے جذبہ تحقیق کو ٹھیس لگنا ضروری تھا، چنانچہ وہ کہتے ہیں:۔

"یہ یورپ کے مشرقی تبحر علمی کی شرمناک مثال ہے"۔ (ایضاً ۲۲۰)

اور پھر جواب دیتے ہیں:۔

پہلا سوال یہ ہے کہ اس عظیم الشان عربی زبان میں "حقیقی خدا" کے مفہوم کے لیے کوئی لفظ موجود نہیں تھا، تم کہتے ہو کہ محمدؐ سے پہلے عرب میں موحدین موجود تھے،

بہتر ہے، لیکن کیا وہ اپنے خدا کے لیے اللہ کے سوا کوئی اور لفظ پیش کرتے تھے؟ موجودہ عیسائی ادبائے عرب کے بیان کے مطابق، عرب میں بکثرت عیسائی شعرا پیدا ہوئے ہیں، ہاں سچ ہے، لیکن کیا ان کی زبان سے لفظ اللہ تم نے نہیں سنا؟ قرآن نے اللہ تعالےٰ کی صفات، خود مشرکین کے اقرار کے مطابق جو بیان کیے ہیں وہ کیا کسی دیوتا پر صادق آسکتے ہیں، وسب سے آخر یہ کہ اللہ کی اصل تو الالٰہ ہے۔ الٰہ تو صرف عربی میں نہیں بلکہ تمام سامی زبانوں میں خدا تعالےٰ ہی کے لیے مستعمل ہے، کم از کم الوۃ اور الوہیم سے تو نا واقفیت نہیں ہوگی،

قریش اپنے دیوتاؤں کے مجسمے بناکر پوجتے تھے، کیا اس سب سے بڑے قریشی دیوتا کا بھی کہیں مجسمہ تھا، (ایضاً ۲۲۸)

ہم یہیں اس مضمون کو ختم کرتے ہیں، سید صاحب نے بالقصد مستشرقین کے جواب نہیں دیئے، بلکہ سرزمین قرآن کے متعلق تحقیق میں اگر کسی مستشرق کی غلطی، غلط بیانی اور غلط انگاری نظر آئی تو تسلسل مضمون کے ساتھ اس کا بھی جواب آگیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے مستشرقین کی رایوں کی بنیاد پر ضرب پڑی ہے، اور اس کے بعد وہ ساری عمارت ہی ناقص اور مہمل ہو کر رہ گئی، جو انھوں نے اسلام اور تاریخ اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف بلند کی، مستشرقین کے اعتراضات کو سید صاحب نے حوالوں کے ساتھ نقل کیا ہے، لیکن اس مضمون میں صرف تاریخ ارض القرآن کے صفحات کے حوالوں کو دینا ہی مناسب سمجھا گیا ہے۔

سلسلہ مقالات سلیمان

مولانا سید سلیمانؒ ندوی نے متعدد بلندپایہ تصانیف کے علاوہ بہت سے علمی ومذہبی فقہی وتاریخی اور ادبی تنقیدی مقالات بھی لکھے ہیں جو الندوہ اور معارف کے ہزاروں صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں ان میں سے بعض بعض تو مستقل رسالوں کا درجہ رکھتے ہیں، ان کی اعلیٰ تحقیقات اور مواد کی تلاش وجستجو پر یورپ کے مستشرقین اور ہندوستان کے علماء و محققین نے ان کو داد بھی دی ہے، ان مضامین کو کتابی صورت میں اب تک تین، جلدوں میں مرتب کر کے پیش کیا جاچکا ہے، پہلی جلد تاریخی مقالات پر ہے اور دوسری جلد علمی وتحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے تیسری جلد قرآنی مباحث سے متعلق بیش قیمت مقالات پر مشتمل ہے۔

قیمت۔ جلد اول ۲۶ روپیہ، جلد دوم ۲۳ روپیہ، جلد سوم ۲۳ روپیہ۔

منیجر

علامہ شبلی نعمانیؒ کی المامون پر ایک نظر

از سید صباح الدین عبد الرحمن،

علامہ شبلی نعمانیؒ جب ام۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کے استاذ تھے، تو اس زمانہ یعنی ۱۸۸۷ء میں انھوں نے المامون لکھی، اس کے قلمبند کرنے میں ان کے ملے جلے جذبات کارفرما تھے، یورپین مصنفین مسلمان حکمرانوں پر حملے کرکے اسلام کے خلاف جو زہر پھیلا رہے تھے، اس کا وہ تریاق پیش کرنا چاہتے تھے، اسی کے ساتھ ان کو خیال ہوا کہ اسلام کو تیرہ سو برس سے کچھ اوپر ہوئے، اس وسیع مدت میں مسلمانوں کی فتوحات کہاں سے کہاں پہنچیں، کبھی بنو امیہ کا عروج ہوا، کبھی عباسیہ کا ستارہ چمکا، کبھی دیلم نے تاج حکومت سر پر رکھا، کبھی سلجوقیوں کا علم اقبال بلند ہوا، کبھی ایوبیوں نے روم و شام کے دفتر الٹ دیے، کبھی مسلمان یورپ کو پامال کر آئے، گو یہ حکومتیں مختلف ملکوں میں مختلف نسلوں کے قبضہ میں رہیں لیکن اسلام کا نام لینے سے وہ سب ایک قوم کی سمجھی گئیں، ان ہی کے رزم و بزم کے کارنامے مسلمانوں کی قومی تاریخ بن گئے، لیکن مولانا کو دکھ تھا کہ اردو زبان میں ان کی تاریخ ڈھونڈھی جائے، تو کہیں نہیں مل سکے گی، پھر ان کو یہ خیال بھی پیدا ہو گیا تھا کہ دیکھتے دیکھتے اردو زبان ایک علمی زبان بن رہی تھی، مگر اس کی کم مایگی کی وجہ یہ تھی کہ علماء کا وہ گروہ جو عربی زبان اور تصنیفات کا مرکز بنا ہوا تھا، اس زبان میں کچھ لکھنا عار سمجھتا تھا، اب تک وہ صحرائے عرب اور بہارستان فارس کا خواب دیکھ رہے تھے، نئی نسل اردو کے

ماحول میں پرورش پارہی تھی وہ اپنی اس زبان کو اعلیٰ رتبہ پر پہونچانے کی خواہاں تھی، اس لئے اس میں انشاپردازی کا ایک جوش پھیلا ہوا تھا، مگر وہ عربی سے ناواقف تھی، اس لئے قومی تاریخ کی اصل خوبی اس کی آنکھوں سے پیچھے رہ گئے، جبکی وجہ سے وہ تذکروں اور ناولوں کے لکھنے کی طرف مائل ہوگئے اس سے اردو کا ایک قدم آگے تو ضرور بڑھا، لیکن عربی اور فارسی کے ذخیرے سے وہ محروم رہی، ان ہی خیالات کی بنا پر مولانا کا ارادہ ہوا کہ وہ اسلامی حکومتوں کی ایک نہایت مفصل اور بسیط تاریخ لکھیں یہ بہت بڑا کام تھا، اس لئے پھر ارادہ بدل کر تاریخ بنو عباس لکھنی شروع کی، خلیفہ معتصم کے حالات تک پہونچے تھے کہ یہ کام بھی لمبا نظر آیا، اس کو چھوڑ کر ہر حکمران خاندان کے ایک ایک ہیرو کی تاریخ لکھنے کا قصد کیا، اور اس کو نامور فرمانروایان اسلام کے سلسلہ سے موسوم کیا، بنو عباس میں ہارون رشید کے نامور فرزند مامون رشید کی طرف ان کی نظر اٹھی، اس لئے المامون لکھی، اور اردو میں شاید یہ پہلی کتاب ہے، جس میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کے لیے مستند مآخذ کے حوالے دیے گئے ہیں،

اس کے لکھنے سے پہلے انھوں نے یورپین مصنفوں میں گبن، کارلائل، بکل، اور ہیگل وغیرہ کی تحریریں پڑھی تھیں، وہ ان کی فلسفیانہ نکتہ سنجی کے ساتھ تاریخی نتائج کے مستنبط کرنے سے متاثر تھے، اسی کو علم تاریخ کی جان اور روح سمجھتے تھے، اس کے برخلاف وہ ایشیا کے مورخین کی تاریخ نویسی سے بدظن تھے، وہ لکھتے ہیں کہ ان کی تاریخوں سے یہ معلوم کرنا چاہو کہ فلاں عہد میں طریق تمدن کیا تھا، فوجی قوت کس قدر تھی، ملکی عہدے کیا کیا تھے، حکومت اور فصل معقدمات کے کیا آئین تھے، لوگوں کے عام اخلاق وعادات کیا تھے تو ان کا پتہ چلانا مشکل ہوگا، وہ ہزاروں صفحات تخت نشینی، خانہ جنگی، فتوحات ملکی، اندرونی بغاوتوں، عمال کے عزل ونصب پر صرف کر دیتے ہیں، ان سے کسی قسم کے دقیق تاریخی نتیجے مستنبط نہیں کرتے، گو مولانا کا یہ بھی خیال ہے کہ ایک بڑی غلطی یہ ہے کہ ہم آج موجودہ طرز سلطنت کو پچھلی ایشیائی حکومتوں کے اندازہ کرنے کا پیمانہ بنائیں، اور ان کو بے اعتباری کی نگاہ سے نہ دیکھیں۔

اچھی طرح چلے جذبات اور بلند حوصلوں کے ساتھ مولانا نے المامون لکھنی شروع کی مگر جب ختم کی تو لکھتے ہیں کہ ہم کو جس قدر لکھنا چاہئے تھا، اس کا دسواں حصہ بھی ہم نے نہیں لکھا۔ (صفحہ ۲۲۲) پھر بھی اس کے دو حصے کئے پہلے حصے میں مامون رشید کی ولادت، تعلیم تربیت، ولی عہدی، تخت نشینی، خانہ جنگی، فتوحات ملکی اور وفات کے حالات ہیں، دوسرے حصے میں ان مراتب کی تفصیل ہے، جس سے اس عہد کے ملکی حالات اور مامون رشید کے تمام اخلاق وعادات کا اندازہ ہو سکتا ہے، پھر ان تمام کارناموں کی تفصیل ہے، جن کی وجہ سے مامون رشید کا عہد عہد تا شاہانِ عالم کے عہدوں سے علمی حیثیت سے ممتاز تسلیم کیا گیا ہے،

اس کتاب کا مطالعہ کرتے وقت عام ناظرین کو کئی باتیں کھٹکتی ہیں، مولانا نے اس کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ وہ خلفاء راشدین میں حضرت عمرؓ، بنو امیہ میں ولید بن عبدالملک، بنو عباس میں مامون الرشید، اندلس کے بنو امیہ میں عبدالرحمٰن ناصر، بنو حمدان میں سیف الدولہ، سلجوقیون میں ملک شاہ، نوریہ میں نورالدین زنگی، ایوبیہ میں سلطان صلاح الدین، موحدین اندلس میں یعقوب بن یوسف اور ترکان روم میں سلیمان اعظم کو ہیرو تسلیم کرتے ہیں، اس طرح ان کو یہ سلسلہ حضرت عمرؓ سے شروع کرنا چاہئے تھا، ان پر وہ ایک پوری کتاب لکھنے کا ارادہ کر چکے تھے، اس لئے ان کو چھوڑنے کا تو جواز ہو سکتا ہے، لیکن ان کا قلم ولید بن عبدالملک پر پہلے چلنا چاہئے تھا، مگر یکایک مامون رشید پر چل پڑا، اس کی معذرت وہ اس طرح کرتے ہیں۔

"اس بات کا مجھکو افسوس ہے کہ چند مجبوریوں کی وجہ سے اس سلسلہ میں ترتیب کی پابندی نہ کرسکا، اور خلفاء راشدین و بنو امیہ کو چھوڑ کر پہلے اس خاندان کو لیا جو ترتیباً تیسرے نمبر پر تھا، آیندہ بھی شاید میں ترتیب کی پابندی نہ کرسکوں، لیکن یہ قطعی ارادہ ہے کہ اگر زمانہ نے مساعدت اور عمر نے وفا کی تو اس سلسلہ کے کل حصے

جس طرح ہو سکے گا پورا کر دوں گا۔" (صفحہ ۵ مطبوعہ معارف پریس)

زمانے نے مساعدت نہیں کی، اور یہ سلسلہ پورا نہ ہو سکا، دوسری بات یہ کھٹکتی ہے کہ بنو عباس میں ہارون رشید کو چھوڑ کر مولانا نے مامون رشید کا کیوں انتخاب کیا، ان کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ہارون رشید سے بے حد متاثر تھے، انھوں نے اپنے ایک پیراگراف میں اس کے متعلق جو کچھ لکھدیا، وہ دوسروں کی ساری تفصیلات پر بھاری ہے، رقمطراز ہیں۔

"ہارون رشید بڑی عظمت و شان کا خلیفہ گذرا، شاہزادگی کے زمانے میں روم پر لشکرکشی کی، پے در پے فتحیں کرتا ہوا قسطنطنیہ تک پہونچ گیا، سریرِ خلافت پر بیٹھا تو اسلام کے ملکی حدود اس قدر وسیع کر دیے کہ دولت عباسیہ میں کبھی نہیں ہوئے تھے، قیصر روم نے چند بار خراج دینے سے انکار کیا، مگر اس نے ہر بار شکست دی، قیصر کے پایہ تخت ہرقلہ کو برباد کر دیا اور بزور یہ شرط لکھوائی کہ پھر کبھی آباد نہ کیا جائے گا، شاہانہ شان و شوکت اور علم و ہنر کی سرپرستی نے ہارون رشید کی شہرت کو اور بھی چمکایا، اس کی قدر دانی کی ندائے عام نے دلوں میں وہ شوق اور حوصلے پیدا کر دیے کہ زمانے کے تمام اہل کمال دربار میں کھنچ آئے، اور آستانۂ خلافت علوم و فنون کا مرکز بن گیا، خود بھی نہایت طباع اور قابل تھا، اس کی علمی مجلسیں ادبی تصنیفات کی جان ہیں" (ایضاً صفحہ ۱۹)

اس کے باوجود مولانا اس کو اپنا ہیرو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے، اس کی وجہ یہ بتائی کہ

"اگر اس کا دامن انصاف برامکہ کے خون سے رنگین نہ ہوتا تو ہم اس کے ہوتے عباسیوں میں سے کسی اور فرمانروا کو انتخاب کی نگاہ سے نہ دیکھ سکتے" (ایضاً ص ۲۰-۱۹)

مگر عام ناظرین کو یہ بات بھی کھٹکتی ہے کہ خود مامون رشید کا دامنِ انصاف بہت سے

خون سے رنگین تھا، باہمی معاہدہ سے امین ہارون رشید کا جانشین ہوا، مامون کو خراسان اور ہمدان کے علاقے دیے گئے، لیکن دونوں بھائیوں میں اختلاف ہوا تو خانہ جنگی شروع ہوگئی جس میں مامون کے فوجی عہدیدار طاہر نے امین کو قتل کرایا، اور اس کا سر ایک سپر پر رکھ کر مامون کے سامنے پیش کیا، اس کے بعد کی تفصیل مولانا نے یہ لکھی ہے، کہ اس غیر متوقع نتیجے کی خوشی نے مامون جیسے رقیق القلب شخص کو ایسا سنگدل بنا دیا کہ اس نے اپنے بھائی کے خون آلود سر کو مسرت کی نگاہ سے دیکھا، اور خوشی میں سجدۂ شکر ادا کیا، قاصد کو مژدۂ فتح کے صلہ میں دس لاکھ درہم انعام دیے، پھر ایک بڑا دربار منعقد کیا، اور تمام ارکین دولت و افسران فوج مبارکباد دینے حاضر ہوئے، ہر طرف سے مبارک مبارک کا غل اٹھا، مولانا اتنا کچھ لکھنے کے بعد مامون کی مدافعت میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ اگرچہ اسوقت اتنی خوشیاں منائی گئیں مگر اس خمار کے اتر کے بعد برادرانہ جوش و محبت بے اثر نہیں رہا مامون کو اس کا نہایت افسوس رہا، طاہر کی تمام کوششیں اس کی آنکھ میں بے قدر ہوئیں، اور جب امین کی ماں نے اپنے غم کا اظہار عربی اشعار میں کرکے اس کے پاس بھیجا تو ان کو پڑھ کر رو دیا، اور کہا کہ میں خود اپنے بھائی کے خون کا عوض لونگا، پھر مامون کا دامن ہرثمہ ذوالریاستین، ابن عائشہ مالک اور رزیق وغیرہ کے قتل سے بھی داغدار ہوا، مولانا نے مامون کی رنگ رلیوں کا بھی ذکر بہت تفصیل سے کیا ہے، وہ اس کے مذہبی عقائد سے بھی خوش نہیں ہیں، رقمطراز ہیں کہ سنی مورخ اس کے محاسن و فضائل کا علانیہ اعتراف کرکے بڑی حیرت سے لکھتے ہیں، کہ افسوس شیعی تھا، شیعہ سخت ناراض ہیں کہ اس کا تشیع بالکل فریب تھا، جس کے ذریعہ سے اس نے حضرت علی رضا علیہ السلام پر قابو حاصل کیا، اور پھر زہر دلوا دیا، (صفحہ ۲۱۲) مولانا یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ مذہبی جوش ایک بڑی طاقت ہے، اور ہمیشہ دنیا میں اس سے عجیب عجیب اثر ظاہر ہوئے ہیں، مگر افسوس ہے، کہ مامون نے اس قوت سے کوئی عمدہ کام نہیں لیا، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ جس چیز نے اس کی تمام خوبیاں

خلاف کردیں وہ بھی مذہبی جنون تھا۔ (ایضاً صفحہ ۲۸)

مامون کی ان تمام کمزوریوں کے باوجود مولانا نے اسی کو اپنا ہیرو قرار دیا، اس سے بظاہر تعجب ضرور ہوتا ہے لیکن اس کی کمزوریوں کو نظر انداز کر دیا جائے، تو اس کی اچھائیوں کا پلہ بھاری ہو جاتا ہے، اس کی وسعت سلطنت، خراج کا نظام، عشر و زکوٰۃ کی وصولی فوج کی تنخواہ، اس کو مطمئن رکھنے، سلطنت کی آبادی میں امن و امان، عدل پروری، غیر قوموں کے حقوق کے احترام، اس کے ذوق علمی، اس کی نگرانی میں رصد خانے کی ترقی، فلسفے کے ترجمے، علوم کی اشاعت، فضل و کمال کی قدردانی، علمی بزم آرائی، اس کی خوش بیانی، برجستہ گوئی، فصاحت، بلاغت، شاعری، نیک خوئی، سادگی، سخاوت، حب رسول، اور محبت آل رسول وغیرہ کی اتنی گوناگوں تفصیلات مولانا کی نظر سے گزریں کہ عباسیوں میں اس سے بہتر اور برتر ان کے خیال میں کوئی اور نہ تھا، کوئی ان کی اس رائے سے اتفاق نہ کرے لیکن ان کو اپنی بصیرت سے جو رائے قائم کرنے کا حق تھا، اس سے کوئی ان کو محروم بھی نہیں کر سکتا تھا۔

مولانا کا قلم مامون کی مدح سرائی میں بالکل نہیں تھکتا لیکن جس طرح اس نے اپنے بھائی امین کا قتل کرایا، یا جن جن رنگ رلیوں میں وہ مبتلا رہا، اس میں جو مذہبی جنون تھا، مولانا نے اس پر پردہ نہیں ڈالا ہے، بلکہ ان کی پوری تفصیل لکھ دی ہے، اس کے غیر معتدل رحم پر یہ لکھ کر نکتہ چینی کی ہے کہ یہ شان خلافت کے شایان نہ تھا، (ایضاً صفحہ ۱۹۵)، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ شخصی حکومت کے اقتدار میں اس سے بعض ایسی بے اعتدالیاں بھی سرزد ہو گئی ہیں، جن کے خیال کرنے سے دل کانپ جاتا ہے، اور دفعۃً اس کی تمام خوبیاں آنکھوں سے چھپ جاتی ہیں، (ایضاً صفحہ ۱۲۸) یہ سب کچھ ان کی مورخانہ غیر جانبداری کا ثبوت ہے، لیکن ان کے قلم کا اعجاز ہے کہ مامون کے ان تمام معائب پڑھنے کے باوجود ناظرین کے لیے اسکے

محاسن سے اسی طرح متاثر ہونا ناگزیر ہے، جس طرح خود مولانا ہوئے۔

پہلے ذکر آیا ہے کہ جب یہ کتاب ختم ہو رہی تھی، تو مولانا نے اعتراف کیا کہ اس میں جتنا لکھنا چاہئے تھا، اس کا دسواں حصہ بھی نہ لکھ سکے تو پھر اس میں تاریخی واقعات کی جو کمی رہ گئی ہے، اس کو صرف نظر کرنے کے بعد یہ دیکھنا ہے کہ مولانا نے جو کچھ لکھا ہے، اس کے لکھنے میں ان کا کون سا انداز بیان ہے، جس سے اردو کی نثر نگاری کو فائدہ پہونچا، ظاہر ہے کہ ایک تاریخ لکھی جا رہی تھی، اس کا اسلوب وہی ہونا چاہئے تھا، جو ایک مورخ کا ہوتا ہے اس میں مولانا کامیاب ہوتے نظر آتے ہیں، مولانا اپنے ہیرو کو یکتائے روزگار قرار دینا چاہتے ہیں اس بات کو منوانے کے لئے اپنا یہ طاقت ور انداز بیان استعمال کرتے ہیں، مثلاً لکھتے ہیں۔

"اس کی دلیرانہ فتوحات نے دنیا کے ممتاز حصوں میں اپنی نامور اور محسوس یادگاریں چھوڑی ہیں، بہادری کے معرکوں میں اس کی تیز دستیاں دیکھ کر یقین نہیں آسکتا کہ ان ہاتھوں نے تلوار کے سوا کبھی قلم بھی چھوا ہے، اس کے ذاتی اخلاق بھی ایسے پاک اور برگزیدہ ہیں، کہ سلاطین تو کیا فقرا اور درویشوں میں بھی وہ ہمارے لیے فرشتہ خو گزرے ہونگے" (ایضاً ص ۱۲۸ - ۱۲۰)

"اسلام کو آج تیرہ سو برس سے زیادہ کچھ اوپر ہوے، اس وسیع مدت میں ایک تخت نشین بھی ایسا نہیں گزرا جو فضل و کمال کے اعتبار سے مامون کی شانِ یکتائی کا حریف ہو سکتا، افسوس ہے کہ سلطنت کے انتساب نے اس کو خلفا و سلاطین کے پہلو میں جگہ دی ورنہ شاعری، ایام العرب، ادب، فقہ اور فلسفہ کون سی بزم ہے، جہاں فخر و فخرت کے ساتھ اس کا استقبال نہ کیا جاتا" (ایضاً ص ۱۰۰)

پھر اس دعوی کے ثبوت میں بہت سی ایسی باتیں لکھی ہیں جنکو قبول کرنے کے علاوہ

کوئی چارہ نہیں، ایک جگہ اس کے بہت سے حکیمانہ اقوال نقل کئے ہیں، جن سے اس کے رموز حکمرانی کا اندازہ ہوتا ہے، اس کا قول تھا کہ شریف وہ ہے جو بڑوں کو دبائے اور چھوٹوں سے خود دبے، اس کا یہ بھی قول تھا کہ عقلوں کی لڑائی دیکھنے سے دنیا میں کوئی اور تماشا عمدہ نہیں، اس کا یہ بھی قول تھا کہ بادشاہ کے لئے لجاجت نہایت نازیبا ہے، اور اس سے زیادہ یہ نازیبا ہے کہ قاضی فریقین کی تسکین نہ کرسکے اور گھبرا جائے۔ ان سب سے زیادہ ناموزوں بوڑھوں کی ظرافت، جوانوں کی کاہلی، سپاہی کی بزدلی ہے، اور سب سے عمدہ مجلس وہ ہے جس میں لوگوں کے حالات سے واقفیت ہو۔

اس قسم کی اور باتوں سے محظوظ کر کے مولانا اپنے ناظرین کو یہ لکھ کر متاثر کرتے ہیں۔

"مامون کی نسبت مورخین کے متفقہ الفاظ یہ ہیں، تمام خلفائے بنی العباس میں کوئی تخت نشیں دانائی، عزم، بردباری، علم، رائے، تدبیر، ہیبت و شجاعت، عالی حوصلگی، فیاضی میں اس سے افضل نہیں گذرا، مامون کا یہ دعا کچھ بے جا نہیں تھا کہ معاویہ کو عمرو بن العاص کا بل تھا، عبدالملک کو حجاج کا اور مجھکو خود اپنا" (ایضاً ۱۹۲)

ان مختصر جملوں میں ساری تفصیلات سمیٹ لی گئی ہیں، اس دعویٰ کو مستحکم کرنے کے لئے لکھتے ہیں کہ

"ہارون رشید اکثر کہا کرتا تھا کہ میں مامون میں منصور کا حزم، مہدی کی خدا پرستی، ہادی کی شان و شوکت پاتا ہوں" (ایضاً ص ۱۹۲)

اس کے بعد فوراً ہی لکھتے ہیں کہ

"ان باتوں پر اگر اس کے عفو و انکسار، بے تکلفی اور سادہ مزاجی کی صفتیں بڑھائی جائیں تو فضیلت کا دائرہ جس کو مورخین نے بنی العباس تک محدود کیا تھا

تمام سلاطین اسلام کو محیط ہو جاتا ہے۔ (صفحہ ۱۴۲)

شاید کسی دیدہ ور مورخ کو ان باتوں سے اتفاق نہ ہو، لیکن مولانا نے اس کے تواضع، حلم، عفو، سادگی، مذہبی رواداری، فیاضی، دریادلی، بلند ہمتی، دلیری، اور فرزانگی کی صفتوں کے اتنے واقعات دلچسپ انداز میں جمع کر دیے ہیں کہ عام ناظرین ان کی جانبداری کا احساس رکھنے کے باوجود ان سے غیر شعوری طور پر متاثر ہوئے بغیر بھی نہیں رہ سکتے، وہ مامون کی عظمت کا سکہ بٹھانا چاہتے تھے اور بٹھا کر رہے، خواہ آج ان کے طرز استدلال پر اعتراضات کتنے ہی کیوں نہ کئے جائیں، ان کو اپنی بات منوانے میں ان کے اسلوب کی قوت زیادہ معاون ہوئی، وہ تاریخی واقعات لکھتے ہیں تو ایسی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں کہ اس سے ناظر محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے، اس کے کچھ نمونے ملاحظہ ہوں، مامون کی عدل پروری کو اس طرح سمجھاتے ہیں۔

"ایک دن کسی سپاہی نے ایک شخص کو بیگار میں پکڑا، وہ دردناک آواز سے چلایا کہ واعمراہ (یعنی ہائے عمر! تم کہاں ہو) مامون کو اطلاع ہوئی، اس شخص کو طلب کیا، اور کہا کہ کیا حضرت عمرؓ کا عدل تجھ کو یاد آیا، اس نے کہا ہاں، مامون نے کہا کہ خدا کی قسم اگر میری رعیت حضرت عمرؓ کی سی رعیت ہوتی تو میں ان سے زیادہ عادل ہوتا، پھر اس کو کچھ انعام دیا، اور سپاہی کو موقوف کر دیا"

(ایضاً صفحہ ۱۵۰)

مامون کی فیاضی کی ایک کہانی مولانا کی زبانی اس طرح ملاحظہ کریں۔

"مامون کی فیاض زندگی پر اگر کچھ نکتہ چینی ہو سکتی ہے تو یہ ہو سکتی ہے کہ اس کا رحم وانصاف اعتدال کی حد سے آگے بڑھ گیا تھا، جس کا یہ اثر تھا کہ اس نے اپنے

وہ تقی عزوں کو بالکل نظرانداز کر دیا تھا، بد زبان خود اس کی ہجویں لکھتے تھے، مگر اس کی
اس کو خبر نہیں ہوتی تھی، خود اس کے خدام گستاخیاں کرتے تھے، لیکن اس کو مطلقاً پروا
نہیں تھی، دعبل نے ایک ہجو میں اس کی نسبت لکھا۔

شاد وبذکر بعد طول خموله   واستنقذ دک من الحضیض الاوہد

یعنی میری فکر نے تیرے نام کو جو بالکل بجھا ہوا تھا، شہرت دے دی، اور تجھکو پستی سے نکال کے
بلندی پر بٹھا دیا۔

مامون نے یہ ہجو سنی تو صرف یہ کہا دعبل کو ایسی بات کہتے ہوئے ذرا شرم نہیں آتی میں گمنام
کس دن تھا، پیدا ہوا تو خلافت کی آغوش میں پیدا ہوا، اور دودھ پیا تو اسی کی چھاتیوں
کا پیا" (المامون ص ۱۵۲)

مامون کی ہمہ دانی کی مرقع آرائی، اس طرح کی ہے۔

"ایک بار عید کے دن مامون کے خوان کرم پر بہت سے معزز مہمان جمع تھے، تین سو سے
زائد مختلف قسم کے کھانے دسترخوان پر چنے گئے۔ مامون ہر ایک کا خاصہ اور اثر بتاتا جاتا تھا،
کہ بلغمی مزاج کو یہ مفید ہے، سوداوی کو وہ نافع ہے، جس کو صفرا کا زور ہو وہ اس خاص
قسم سے پرہیز کرے، جو قلیل غذا کا عادی ہے وہ یہ کھائے، مامون کی ہمہ دانی پر تمام حاضرین
محو حیرت تھے، قاضی یحییٰ بن اکثم سے نہ رہا گیا، بے ساختہ بول اٹھے کہ امیر المومنین آپ کی
کس کس بات کی تعریف کی جائے، طب کا ذکر ہو تو آپ جالینوس وقت ہیں، نجوم
کی بات چھڑے تو ہرمس، فقہ کی بحث ہو تو علی مرتضیٰ، سخاوت میں حاتم، راست بیانی
میں ابوذر، وفا میں سموئل، اس کچی خوشامد سے مامون بھی بھڑک اٹھا، اور کہا کہ ہاں
آدمی کو جو شرف ہے عقل سے ہے ورنہ خون اور گوشت میں کیا خوبی رکھی ہے۔" (ایضاً ص ۱۸۴)

اہل علم کی قدردانی مامون نے جس طرح کی، اس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

اہل علم کے ساتھ مامون کی معاشرت بالکل دوستانہ تھی، اہل کمال کا نہایت ادب کرتا تھا، اور اس کی شاہانہ فیاضیاں ان لوگوں کے لئے بالکل بے روک تھیں، علامہ واقدی نے جو فن سیر کے امام ہیں، ایک بار مامون کو خط لکھا، جس میں ناداری کی شکایت اور لوگوں کا جس قدر قرضہ چڑھ گیا تھا، اس کی تعداد لکھی تھی، مامون نے جواب میں یہ الفاظ لکھے "آپ میں دو عادتیں ہیں، حیا و سخاوت، سخاوت نے آپ کے ہاتھ کھول دیے ہیں کہ جو کچھ تھا، آپ نے سب اڑا ڈالا، حیا کا یہ اثر ہے کہ آپ نے اپنی پوری حاجت ظاہر نہیں کی، میں نے حکم دیا ہے۔ تعداد مطلوبہ کا مضاعف آپ کی خدمت میں پہونچ جائے گا۔ اگر آپ کی اصل ضرورت کے لئے یہ تعداد پوری نہ اترے تو خود آپ کی کوتہ قلمی کا قصور ہے اور اگر کافی ہو جائے تو آئندہ بھی آپ جس قدر چاہیں فراخ دستی سے صرف کریں، خدا کے خزانہ میں کچھ کمی نہیں ہے، آپ نے خود مجھ سے حدیث روایت کی تھی کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زبیرؓ سے فرمایا تھا کہ رزق کی کنجیاں عرش پر ہیں، خدا بندوں کے لئے ان کے خرچ کے مطابق رزق دیتا ہے، زیادہ ہو تو زیادہ اور کم ہو تو کم" علامہ واقدی کو یہ حدیث یاد نہیں رہی تھی، وہ صلہ سے زیادہ اس بات پر خوش ہوئے کہ مامون کے یاد دلانے سے ان کو ایک بھولی ہوئی حدیث یاد آگئی۔ (المامون ص ۱۹۲ - ۱۹۱)

اسی طرح امین اور مامون میں جو خانہ جنگی ہوئی، اس میں لڑائیوں کا ذکر کچھ اس انداز سے کیا ہے کہ اس کو پڑھتے وقت کوئی خشکی یا اکتاہٹ پیدا نہیں ہوتی، مامون کی بیدار مغزی اور امین کی رنگ رلیوں کی تفصیلات مطالعہ کرنے سے ایک دل آویز کہانی کے پڑھنے کا لطف ملتا ہے۔ انشاپردازی ہنر و ادب کی تبصرہ نگاری کے وقت خوب کام دیتی ہے لیکن ان کا اصلی وصف

صورت نمایاں ہوتا ہے، جب ملکی بغاوتوں یا خراج کی وصولی یا بندوبست آراضی یا زمین کی پیمائش وغیرہ جیسے خشک موضوع کا ذکر ہو، تو ان کی تفصیلات بیان کرنے میں انشا پردازی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹتا ہو، مولانا کے یہاں اس کتاب میں ایسی تفصیلات بہت ہیں لیکن ہر جگہ ان کے قلم کی سلاست روی، عبارت کی ہمواری، اور زبان کی دلکشی باقی رہتی ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ تاریخی واقعات لکھتے لکھتے جہاں طرب ونشاط کا موقع آتا ہے، تو ان کی تحریروں میں اور بھی زیادہ رنگینی بلکہ نشاط انگیزی اور طرب آمیزی آجاتی ہے، مثلاً وہ مامون رشید کے جشن شادی کا ذکر کرتے ہیں تو یہ لکھتے ہیں کہ اس شادی کی تقریب جس شان و شوکت سے ادا ہوئی وہ اس عہد کی مسرفانہ فیاضی کا نمونہ ہے، اس مسرفانہ فیاضی سے بیزاری کا اظہار کرکے اس کی تفصیل کو نظر انداز کر دیتے تو یہی ان کے لیے مناسب ہوتا، مگر ایک مورخ کی حیثیت سے وہ اس موقع کی شان و شوکت اور حشمت سے متاثر ہوئے، تو اس سے صرف نظر کرنا بھی صحیح نہیں تھا، اس لیے رقمطراز ہیں کہ عربی مورخوں کا دعویٰ ہے کہ گزشتہ اور موجودہ زمانہ میں اس شادی کی کوئی نظیر نہیں لا سکتا، اور پھر اس کی مدافعت میں وہ یہ لکھ گئے ہیں کہ ہماری محدود واقفیت میں اب تک کسی نے اس فخریہ ادعا پر اعتراض کرنے کی جرأت نہیں کی ہے، پھر ایک دلہن کا تعارف یہ لکھ کر کراتے ہیں کہ یہ خوش قسمت لڑکی جس سے مامون کا نکاح ہوا، حسن بن سہل کی بیٹی تھی جو فضل کے مرنے پر وزیر اعظم مقرر ہوا تھا، اس لڑکی کا نام بوران تھا، اور نہایت قابلہ اور تعلیم یافتہ تھی، اس کے بعد مامون کی بارات کا ذکر اس طرح آتا ہے،

"مامون خاندان شاہی، ارکان دولت، کل فوج، تمام افسران ملکی اور خدام کے ساتھ حسن کا مہمان ہوا، برابر انیس[19] دن تک ایسے فیاضانہ حوصلے سے اس عظیم الشان بارات کی مہمانداری کی گئی کہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی نے بھی چند روز تک

کے یے امیرانہ زندگی بسر کی، خاندان ہاشم، افسران فوج اور تمام عہدہ داران سلطنت پر مشک و عنبر کی ہزاروں گولیاں نثار کی گئیں جن پر کاغذ لپٹے ہوئے تھے اور ہر کاغذ پر نقد، لونڈی، غلام، املاک، خلعت، اسپ، خاصہ اور جاگیر وغیرہ کی ایک خاص تعداد لکھی ہوئی تھی، نثار کی عام لوٹ میں یہ فیاضانہ حکم تھا کہ جس کے حصہ میں جو گولی آئے، اس میں جو کچھ لکھا ہو، اسی وقت وکیل المخزن سے دلایا جائے، عام آدمیوں پر مشک و عنبر کی گولیاں اور درہم و دینار نثار کئے گئے، مامون کے یے ایک نہایت مکلف فرش بچھایا گیا، جو سونے کے تاروں سے بنا یا گیا تھا، اور گوہر و یاقوت سے مرصع تھا، مامون جب اس پر جلوہ فرما ہوا تو بیش قیمت موتی اسکے قدموں پر نثار کئے گئے، جو زرین فرش پر بکھر کر نہایت دل آویز سماں دکھلاتے تھے، مامون نے ابونواس کا یہ مشہور شعر پڑھا، اور کہا کہ ابونواس نے جو لکھا گویا یہ سماں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر لکھا۔

کان صغری وکبری من فواقعها حصباء در علی ارض من الذهب

جام شراب کے چھوٹے بڑے بلبلے ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ گویا سونے کی زمین پر موتیوں کے دانے ہیں۔

زفاف کی شب جب نوشہ اور دلہن ساتھ بیٹھے تو بوران کی دادی نے ہزار بیش بہا موتی دونوں پر نچھاور کئے، اس تقریب کے تمام مصارف کا تخمینہ پانچ کرور درہم کیا گیا ہے" (المامون۔ صفحہ ۲۰۲-۲۰۱)

اس عبارت میں تصنع کہیں نہیں، قدیم ایشیائی طرز کی عبارت آرائی بھی نہیں، لیکن خود بخود تحریر میں رنگینی پیدا ہو گئی ہے، مامون نے اپنی فرمانروائی میں طرب و نشاط کی بزم آرائی خوب دل کھول کر کی، مولانا نے بھی اس کی مرقع آرائی دل کھول کر کی ہے، جس کے

بعض [illegible] ادب و دانش کے اس پیے شاہکار ہو گئے ہیں کہ اس میں مولانا نے شعر و ادب کے نکتوں کو بھی سمیٹنے کی کوشش کی ہے، لکھتے ہیں،

"مغنیوں کے سوا ایک اور طائفہ تھا جس سے مامون کے جلسوں کی زیب و زینت تھی، روم و ایشیائے کوچک کی گل اندام نازنیں جو لڑائی کی لوٹ میں پکڑی جاتی تھیں، دلال ان کو سستے داموں پر خرید لیتے تھے، اور موسیقی، شاعری، ایام العرب، ادب، خوش نویسی، ظرافت اور حاضر جوابی کی تعلیم دلاتے تھے، ان فنون میں کامل ہو کر وہ نہایت گران قیمتوں پر بازار میں بکتی تھیں، مامون کی شبستان عیش میں ان حوروشوں کا ایک بڑا جھرمٹ رہتا تھا، جن کی خریداری اور تربیت نے خزانہ عامرہ کو زیر بار کر دیا تھا، ایک بار ایک لونڈی بکنے آئی جس کے فضل و کمال کی وجہ سے بیچنے والے نے دو ہزار دینار طلب کئے، مامون نے کہا میں ایک شعر پڑھتا ہوں، اگر یہ فی البدیہ اس کے جواب میں دوسرا شعر کہے تو اصل قیمت سے کچھ زیادہ دیتا ہوں شعر یہ تھا۔

ماتقولین فیمن شفه ارق   من جهد حبك حتى صار حيرانا

کنیز نے برجستہ کہا:۔

اذا وجدنا محبا قد اضر به   داء الصبابة اولناه احسانا

(المامون صفحہ ۲۱۰ - ۲۰۹)"

مولانا کو یہ خیال تھا کہ ایسی بزم آرائی مذہبی حیثیت سے صحیح نہیں تھی، مگر پہلے تو ایک مورخ اور شعر و ادب کے فن کے نکتہ شناس کے ملے جلے جذبات کے ساتھ لکھتے ہیں۔

"مامون کے عیش و طرب کے جلسوں میں گو عیاشانہ رنگینی پائی جاتی ہے، مگر

انصاف یہ ہے کہ یہ جلسے علمی مذاق سے بالکل خالی نہ تھے، اس قسم کے جلسے جو شاعرانہ جذبات کو پورے جوش کے ساتھ ابھار دیتے ہیں، اگر متانت و تہذیب کے ساتھ ہوں تو لٹریچر پر نہایت وسیع اور عمدہ اثر پیدا کرتے ہیں، مامون خود سخن سنج اور موسیقی کا بڑا ماہر تھا، یاران مجلس بھی عموماً نازک خیال اور نکتہ شناس تھے، بات بات پر شاعرانہ لطیفے ایجاد ہوتے، کبھی موسیقی کی بحث چھڑ جاتی، کسی وقت مامون کے فی البدیہہ مصرعوں یا شعروں پر شعراء کی طبع آزمائیوں کا امتحان ہوتا، ایک دفعہ بزم عیش آراستہ تھی، بادہ و جام کا دور تھا، بیس عیسائی کنیزیں دیبائے رومی کے لباس پہنے، گردنوں میں سونے کی صلیبیں، کمر میں زرین زنار، ہاتھوں میں گلدستے لئے ہوئے، بزم میں جلوہ آرا تھیں، یہ سماں ایسا نہ تھا کہ مامون دل پر قابو رکھ سکتا، بے ساختہ چند اشعار زبان سے نکلے اور احمد بن صدقہ ایک مغنی کو بلا کر ان شعروں کو گانے کی فرمائش کی، احمد کی نغمہ سرائی کے ساتھ کنیزیں ناچنے کے لیے کھڑی ہو گئیں، ان کی مخمور آنکھیں اور جام شراب مامون کو بدمست کرنے میں یکساں کام دے رہے تھے، وہ بالکل سرشار ہو گیا، اور حکم دیا کہ ان نازنینوں کے قدم پر ہزار اشرفیاں نثار کی جائیں (المامون صفحہ ۲۱۰)

اس سے بحث نہ کی جائے کہ مذہبی حیثیت سے یہ بزم آرائی کہاں تک درست تھی، اور نہ اس پر بحث ہو کہ مولانا جیسے عالم کے قلم سے ایسی باتوں کا نکلنا کہاں تک صحیح تھا، ایک عالم کی حیثیت سے دیکھا یہ گیا تھا کہ لکھتے ہیں کہ "ہمارے ناظرین جنھوں نے مامون کو کبھی فقہ و حدیث کا تذکرہ کرتے دیکھا ہے، کبھی اہل کمال کے ساتھ اس کی عالمانہ بحثیں سنی ہیں، نہایت تعجب سے دیکھیں گے کہ بزم عیش میں وہ رندانہ وضع سے بیٹھا ہے، بے تکلف اور رنگین طبع احباب جمع ہیں،

چھلکا پیکر نازنینوں کا ہجرِ مست ہے، دورِ شراب چل رہا ہے، ساز چھیڑا جا رہا ہے، گل اندام کنیزیں نغمہ سرا ہیں، یاران باصفا بدمست ہوتے جاتے ہیں۔ اس کے بعد مولانا مامون کے بارے میں لکھتے ہیں کہ آغاز خلافت میں بیس مہینے تک وہ نغمہ و سرود سے بالکل محترز رہا مگر چند روز کے بعد شوق پیدا ہوا، گوارا نہ ہی کہ احتیاط کے ساتھ کبھی کبھی سن لیتا تھا، یہ حالت بھی چار برس تک قائم رہی، پھر تو ایسی چاٹ پڑ گئی کہ ایک دن ان صحبتوں کے بغیر بسر نہیں کر سکتا تھا، یہاں تک مولانا نے حقیقت سے کام لے کر مامون کی رنگین طبیعت کی تصویر کھینچ دی ہے، اب وہ ایک عام بات لکھتے ہیں کہ

"اگر انصاف سے دیکھیے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے آزادی، حوصلہ مندی، لطافت طبع، جوش شباب ہمیشہ زہد کی حکومت سے باغی رہتے آئے ہیں، مامون کی تخصیص نہیں"

(المامون صفحہ ۲۰۵)

یہ بالکل حقیقت کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے، جس میں چند استثناء کے سوا دنیا کے تمام فرمانروا مبتلا تھے، لیکن دکھ یہ ہوتا ہے کہ مامون ایک اسلامی حکومت کا سربراہ تھا، اور وہ اپنے کو مسلمانوں کا خلیفہ کہتا تھا، اس کی یہ روش کہاں تک صحیح کہی جا سکتی ہے، مولانا نے دکھ اور درد کے ساتھ لکھا ہے۔

"اس وقت اسلامی سوسائٹیاں عموماً اس رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں"۔ (صفحہ ۲۰۶)

اسلامی سوسائٹیاں سے مراد علماء و فضلا نہیں بلکہ مسلمانوں کا حکمران طبقہ ہی ہے۔

جیسا کہ مولانا کی حسب ذیل تحریر سے ظاہر ہے،

"اس عہد میں امن فراغ تھا، اطمینان زر و مال سب کچھ میسر تھا، پھر کیا چیز تھی جو ان کی زندگی کے پرخطر مقاصد سے روک سکتی، ایک مذہب البتہ در انداز ہو سکتا تھا، لیکن جدت پسند طبیعتیں اس کو بھی کھینچ تان کر اپنے مذہب کا بنا لیتی ہیں"

شراب کی جگہ نبیذ موجود تھی، جس کو عموماً عراق کے مذہبی پیشواؤں سے حلت کی سند مل چکی تھی، لونڈیوں کی عام اجازت نے عیاشی کے سب حوصلے پورے کر دیے تھے، نغمہ و سرود تو قابلیت علمی کے بڑے جزو سمجھے جاتے تھے۔" (المامون ص ۲۰۶)

ان جملوں میں بڑی کسک ہے، کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب کچھ مولانا اپنے ہیرو کی مدافعت میں لکھ گئے ہیں، اگر یہ مدافعت ہے تو پھر اس عہد کی عام معاشرت بلکہ مذہبی پیشواؤں پر طنز و تعریض بھی ہے، جو مولانا ہی ایک عالم اور پھر ایک حقیقت پسند مورخ کی حیثیت سے لکھ سکتے تھے۔

مولانا کے قلم کا اعجاز یہ بھی ہے کہ وہ طرب و نشاط کی مرقع نگاری میں غم کی اور سوگواری بھی پیدا کر دیتے ہیں، مثلاً جس زمانہ میں امین کے خلاف لڑائی ہو رہی تھی، اور مدینۃ المنصور، قصر زبیدہ اور قصر الخلد کا محاصرہ کر لیا گیا تھا تو اسی محاصرہ میں ہارون رشید کا بھائی ابراہیم امین کے ساتھ تھا، وہ فن موسیقی میں یگانۂ روزگار بھی تھا، اس کا بیان ہے کہ

"ایک رات امین دل بہلانے کے لیے محل سے باہر نکلا، اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا، ابراہیم! دیکھئے کیا سہانی رات ہے، چاند کیسا صاف اور روشن ہے، دجلہ پر اس کا عکس پڑتا ہے تو کیا خوشنما معلوم ہوتا ہے، ایسے پُر لطف وقت میں کیا چیز ضرور ہونی چاہیے، شراب! میں نے کہا سمعاً و طاعۃً، غرض شراب آئی، امین نے میری طرف پیالہ بڑھایا، میں نے مزے میں آکر چند اشعار گائے، امین نے کہا نغمہ ہے، تو ساز بھی ہونا چاہیے، حسب الطلب ایک مغنیہ کنیز آئی، امین نے نام پوچھا تو اس نے کہا ضعف، امین اس نام سے متوحش ہوا، پھر کچھ گانے کی فرمائش کی تو وہ یہ شعر گائی۔

کلیب لعمری کان اکثر ناصراً وایسر جرماً منک ضرج بالدم

یعنی اپنی عمر کی قسم، کلیب کے مددگار زیادہ تھے، اور وہ تجھ سے زیادہ مجرم اور عاقل بھی تھا تاہم خون میں لایا گیا،

امین اور رنجیدہ ہوا، دوسری چیز گانے کی فرمائش کی۔ اس نے یہ شعر گایا۔

ابکی فراقہم عینی فارقہا   ان التفرق للاحباب بکاء

یعنی ان لوگوں کے فراق نے میری آنکھوں کو رلایا، اور نیند کھودی جدائی دوستوں کو سخت رلانے والی چیز ہے۔

امین نہایت متنغض ہوا، اور خفا ہو کر کہا کم بخت تجھے اس کے سوا کچھ اور بھی گانا آتا ہے۔ اس نے عرض کیا میں نے وہی اشعار گائے کہ حضور ان کو سن کر خوش ہوں پھر اس نے چند اور ایسے ہی دردناک اشعار گائے، امین نے نہایت غصہ میں آ کر کہا، ملعونہ دور ہو، اٹھی تو ایک بلور کے پیالے سے جو نہایت خوبصورت بنا ہوا تھا، اور امین اس کو دب رباح کہا کرتا تھا، ٹھوکر کھا کر گری، اس کے صدمہ سے پیالہ بھی ٹوٹ گیا، امین میری طرف مخاطب ہوا کہ دیکھتے ہو، آج کیا باتیں پیش آتی ہیں، غالباً اب میرا وقت پورا ہو چکا، اسی گفتگو میں کسی طرف سے آواز آئی۔ قضی الامر الذی فیہ تستفتیان یعنی جس امر میں تم دونوں بحث کرتے ہو طے ہو گیا، امین نے مجھ سے کہا کچھ سنا بھی، امین نے عرض کیا کہ مجھکو تو کوئی چیز سنائی نہیں دی، تاہم اٹھ کر میں نہر کے قریب گیا، وہاں کوئی نظر نہ آیا تو واپس آ کر پھر باتوں میں مشغول ہوا، دوبارہ پھر وہی آواز آئی، امین زندگی سے مایوس ہو کر اٹھا، اس واقعہ کے دو ہی تین دن کے بعد قتل کیا گیا" (المامون ص ۹۰)

طرب و نشاط کی اس مجلس میں کیسی دردناکی پیدا کر دی گئی ہے، مولانا نے یہ سب کچھ عربی کتابوں ہی سے لیا ہے، اگر ان کی ان تحریروں کا موازنہ عربی تحریروں سے کیا جائے، تو شاید مولانا کا انداز بیان بڑھا ہوا ثابت ہوگا۔ طرب انگیز مجلسوں کی مرقع نگاری میں مولانا کا قلم خود مغنی بن جاتا ہے، ان کی تحریر گل اندام کنیز بن کر رقص کرتی نظر آتی ہے، الفاظ پری پیکر

نازنینوں کا مجموعہ معلوم ہوتے ہیں، اور بلاغت سے گلفام لیے صفت جام پھرتی نظر آتی ہے۔

مگر اس کتاب کا مطالعہ اس حیثیت سے بھی کرنے کی ضرورت ہے کہ جب حزن و ملال اور رنج و غم کا موقع آتا ہے تو مولانا کے اسلوب کا کیا رنگ ہوتا ہے، اس کی اچھی مثال وہ ہے جب وہ مامون کی وفات کا ذکر کرتے ہیں، اس میں بھی ان کی انشا پردازانہ قوت ان کا ساتھ دیتی ہے، مامون ایک بے مثال فرمانروا تھا، تو اس کی موت بھی ایک ادنیٰ آدمی کی موت نہ تھی، وہ صرف ۴۸ برس کا تھا کہ لقمۂ اجل ہوا، کس طرح وہ مولانا سے سنئے۔

"مامون نے مرنے سے ذرا پہلے تمام افسران فوج، علما، قضاۃ اور خاندان شاہی کو جمع کیا، اور نہایت موثر لفظوں میں وصیت کی، جس کا مختصر مضمون یہ ہے،

"مجھکو اپنے گناہوں کا اقرار ہے، بیم و امید دونوں مجھ پر حاوی ہو رہے ہیں، لیکن جب میں خدا کے عفو کا خیال کرتا ہوں تو امید کا پلہ گران ہو جاتا ہے، جب میں مر جاؤں تو مجھکو اچھی طرح سے غسل دو، اور وضو کراؤ، کفن بھی اچھا ہو، پھر خدا کی حمد و ثنا کہہ کر مجھکو تابوت پر لٹاؤ، تدفین میں جہاں تک ممکن ہو جلدی کرو، جو شخص کبیر السن اور رشتہ میں سب سے زیادہ قریب ہو وہ نماز پڑھائے، نماز میں تکبیر پانچ بار کہی جائے، قبر میں وہ شخص اتارے جو رشتہ میں قریب ہو، اور مجھ سے محبت رکھتا ہو، قبر میں میرا منہ قبلہ کی طرف رہے، سر اور پاؤں پر سے کفن ہٹا دیا جائے، پھر قبر کو برابر کر کے لوگ چلے جائیں، اور مجھکو میرے اعمال کے ہاتھ میں چھوڑ دیں، کیونکہ تم لوگ مل کر بھی نہ مجھکو آرام پہونچا سکتے ہو، نہ میری تکلیف رفع کر سکتے ہو، ہو سکے تو بھلائی سے میرا نام لو، ورنہ چپ رہو، کیونکہ برا کہنے سے تم پر بھی مواخذہ ہوگا، میرے لیے کوئی شخص چلا کر نہ روئے، شاید میں بھی اس کے ساتھ مواخذہ میں آ جاؤں۔"

(المامون۔ ص ۱۲۴-۱۲۳)

یہ اس شخص کے عالم نزع کی مرقع آرائی ہے جس کی شادی کے جشن کے موقع پر پانچ کروڑ درہم خرچ کئے گئے تھے، مولانا شبلی ؒ نے جس موثر انداز میں اس کے نزع کی تصویر کھینچی ہے، اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ عالم بقا کو نہیں بلکہ کسی سفر میں جا رہا ہے، ندفین کی ساری ہدایتیں دے کر اللہ تعالےٰ کی طرف رجوع کر کے کہتا ہے۔

"تعریف کے قابل صرف خدا کی ذات ہے جس نے سب کی قسمت میں مرنا لکھ دیا ہے، اور بقا میں آپ یگانہ رہا، دیکھو میں کس اوج کا تاجدار تھا، لیکن حکم الٰہی کے سامنے کچھ زور نہ چل سکا، بلکہ حکومت نے میری آئندہ زندگی اور پرخطر کر دی، اے کاش عبداللہ (مامون کا اصلی نام) نہ پیدا ہوتا" (ایضاً ص ۱۲۴)

یہ کسی زاہد مرتاض کی توبۃ النصوح نہیں ہے، بلکہ ایک ایسے تاجدار کی ہے جس کی فضیلت کا دائرہ مولانا شبلیؒ کی رائے کے مطابق تمام عالم اسلام پر محیط تھا، مامون اپنے ولی عہد کو اپنے پاس بلا کر اس سے کہتا ہے،

"ابو اسحٰق میرے سامنے آؤ، اور میرے حال سے عبرت پذیر ہو، خدا نے خلافت کا طوق میری گردن میں ڈالا ہے، تجھ کو اس کی طرح رہنا چاہئے، جو مواخذۂ الٰہی سے ہر وقت ڈرتا رہتا ہے، رعایا کی بھلائی کا جو کام پیش آئے اس کو سب کاموں پر مقدم رکھنا، زبردست عاجزوں کو ستانے نہ پائیں، ضعیفوں سے ہمیشہ محبت اور آشتی سے پیش آنا، جو لوگ تمھارے ساتھ ہیں ان کی خطاؤں سے اغماض کرنا اور سب کے روزینے اور تنخواہیں برقرار رہیں" (ایضاً صفحہ ۱۲۴)

اس سے اندازہ ہوگا کہ وہ اپنے بستر مرگ پر بھی اپنی حکومت کی فلاح و بہبود کا خواہاں رہا، جب وہ یہ ساری باتیں کہہ چکا تو اس نے قرآن کی چند آیتیں پڑھیں جس کے بعد وہ

بیہوش ہوگیا، حاضرین میں سے کسی نے کلمۂ توحید کی تلقین کی، ایک نصرانی حکیم ابن ماسویہ نامی کو اس پر تعجب ہوا، اور وہ حقارت سے بولا کہ اپنی ہدایت رہنے دو، اس وقت مامون کے نزدیک خدا اور مانی یکساں ہیں، اس کے بعد کی مرقع آرائی مولانا شبلیؒ نے اس طرح کی ہے،

"مامون اس آواز سے دفعتہً چونک پڑا، اس قدر غضب ناک ہوا کہ اس کے تمام اعضا تھرانے لگے، چہرہ اور آنکھیں بالکل سرخ ہوگئیں، ہاتھ بڑھا کر چاہا کہ ابن ماسویہ کو پکڑ لے اور اس بدگمانی کی پوری سزا دے، مگر اعضا قابو میں نہ تھے، منہ سے کچھ کہنا چاہا، زبان نے یاری نہ دی، نہایت حسرت سے آسمان کی طرف دیکھا، آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اسی حالت میں خدا نے اس کی زبان کھول دی، وہ خدا کی طرف مخاطب ہوا، اور کہا اے وہ جس کی سلطنت کبھی نہ زائل ہوگی، اس پر رحم کر جس کی سلطنت زائل ہو رہی ہے، اس فقرہ پر اس کے نفس واپسیں نے دنیا کو الوداع کہا اور خدا کے سایہ رحمت میں چلی گئی" (المامون صفحہ ۱۲۵ - ۱۲۴)

مامون کی وفات جس طرح ہوئی محض اسی بنا پر وہ تاجداروں کا میر بننے کا مستحق ہے۔ مولانا نے اس کی وفات کی سوگواری کی جو دردناک تصویر کشی کی ہے، اس میں ان کے قلم کا وہی زور ہے، جو مامون کے شبستان عیش کی مرقع آرائی میں ہے، فرق صرف غمناکی اور نشاط انگیزی کا ہے، مولانا نے اپنے زمانہ کی کم مایہ اردو نثر نگاری میں اپنے قلم کا جو اعجاز دکھایا ہے۔ اس کی مثال اردو کے لکھے معاصر اہل قلم کے یہاں کم ملے گی۔ مولانا نے یہ کتاب اس وقت لکھی جب وہ تیس برس کے جوان تھے، جوانی تمام رعنائیوں کو اپنی آغوش میں لینے کی خواہاں ہوتی ہے، مولانا کی جوانی کی رعنائیاں اس کتاب کی تحریروں میں گل وصنوبر بن کر دکھائی دیتی ہیں، آگے چل کر انھوں نے اور کتابیں بھی لکھیں، لیکن اس کتاب میں قدم قدم پر روش روش پر جو رنگینیاں دکھائی دیتی ہیں،

وہ شعرالعجم کے علاوہ ان کی کسی اور کتاب میں نہیں پائی جاتی ہیں، مگر شعرالعجم حسن وعشق کا صحیفہ تھا، اسکے لکھنے میں قلم کی سرشاریاں خود رہبر بنی رہیں، لیکن المامون میں تاریخ کے خشک واقعات سمیٹے جا رہے تھے۔ اس کو مولانا نے اپنے ادب و دانش کے حسن کا صحیفہ بنا دیا ہے۔

اس کتاب پر سرسید نے جو دیباچہ لکھا ہے، اس میں مولانا شبلیؒ کو ادیب اور مورخ کی حیثیت سے پورا خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی نے یہ اعتراض کیا، کہ دولت عباسیہ میں ہارون رشید ہیرو تسلیم کئے جانے کا مستحق تھا، وہ مامون سے ہر طرح بہتر اور برتر تھا، اس اعتراض میں ہارون اور مامون کا موازنہ کرکے ہارون کی برتری دکھائی گئی، مولانا شبلیؒ نے آزاد لکھنو مورخہ ۲۲ر فروری ۱۸۸۸ء میں اس کا جواب دیا، جس کا لب ولہجہ سخت تھا، وہ لکھتے ہیں ہارون رشید اور مامون کا موازنہ بڑی تحقیق وتدقیق کے ساتھ کیا جاسکتا ہے، اور وہی کر سکتا ہے، جو باریک بیں اور تاریخی اصول کا نکتہ شناس بھی ہو، آخر میں لکھتے ہیں کہ مجھکو کبھی عام لوگوں کی تحسین سے نہ خوشی ہوئی، نہ ان کے اعتراض سے رنج ...... مجھکو چھوڑ دیا جائے کہ رائل ہیروز کے باقی حصے پورے کروں۔

رسی آنکہ بدر دمن کہ چو من   خامہ گیری و حرف بنگاری

لیکن یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس اعتراض اور جواب کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن شیروانیؒ اور علامہ شبلی نعمانیؒ میں جو تعلقات پیدا ہوئے، اس کے بعد یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کون حبیب رہا اور کون محبوب۔

قاضی محسن تنوخی

از

جناب بدر الدین بٹ لکچرر شعبۂ عربی و اسلامیات اسلامیہ کالج سری نگر

نام و نسب اور سنہ ولادت | محسن نام ابو علی کنیت ہے، سلسلۂ نسب اس طرح ہے، ابو علی المحسن بن ابی القاسم علی بن محمد بن ابی الفہم داؤد بن ابراہیم بن تمیم تنوخی،[1] ان کے والد گرامی ابو القاسم علی کا سلسلۂ نسب تنوخ کے بادشاہ عمرو بن الحارث سے جا ملتا ہے،[2] اور وہ اسی مناسبت سے تنوخی کہلاتے تھے۔

قاضی محسن تنوخی بصرہ میں یاقوت حموی کے بقول سنہ ۳۲۹ھ میں پیدا ہوئے[3] لیکن خود قاضی تنوخی کے صاحبزادہ علی نے اپنے والد گرامی کا سنہ ولادت سنہ ۳۲۷ھ بتایا ہے، اور ابن خلکان نے بھی یہی سنہ درج کیا ہے،[4]

والد بزرگوار | قاضی محسن کے والد ماجد ابو القاسم علی انطاکیہ کے باشندہ[5]، اور ایک معروف معتزلی عالم اور ماہر فلکیات تھے، بصرہ اور اہواز میں کئی سال تک قاضی رہے، پھر بغداد سے ناراضگی کے سبب سیف الدولہ کے دربار میں پہنچے، سیف الدولہ نے انکو خوش آمدید کہا، اور دربار بغداد کو لکھا کہ انھیں بحال کیا جائے، جس پر ان کو بحال کر دیا گیا، وہاں وزیر المہلبی جو ادیبوں کی

۱؎ وفیات الاعیان قاہرہ ۱۹۴۸ء ج ۳ ص ۳۰۰ ۲؎ ایضاً ج ۳ ص ۱۰ ۳؎ یاقوت حموی، معجم الادباء قاہرہ ۱۹۲۹ء ج ۱۷، ص ۹۲ ۴؎ وفیات ج ۳ ص ۳۲۳؛ تاریخ بغداد ج ۸ ص ۱۵۵ ۵؎ وفیات ج ۳ ص ۸۱۔

وہ شعر العجم کے علاوہ ان کی کسی اور کتاب میں نہیں پائی جاتی ہیں، گو شعر العجم حسن و عشق کا صحیفہ تھا، جسکے لکھنے میں قلم کی سرشاریاں خود رہبر بنی رہیں، لیکن المامون میں تاریخ کے خشک واقعات تھے، جب بھی اس کو مولانا نے اپنے ادب و انشا کے حسن کا صحیفہ بنا دیا ہے۔

اس کتاب پر سرسید نے جو دیباچہ لکھا ہے، اس میں مولانا شبلیؒ کو ادیب اور مورخ کی حیثیت سے پوا خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی نے یہ اعتراض کیا، کہ دولت عباسیہ میں ہارون رشید بہتر تسلیم کئے جانے کا مستحق تھا، وہ مامون سے ہر طرح بہتر اور برتر تھا، اس اعتراض میں ہارون اور مامون کا موازنہ کرکے ہارون کی برتری دکھائی گئی، مولانا شبلیؒ نے آزاد لکھنؤ مورخہ ۲۲ فروری ۱۸۸۸ء میں اس کا جواب دیا، جس کا لب و لہجہ سخت تھا، وہ لکھتے ہیں؛ ہارون رشید اور مامون کا موازنہ بڑی تحقیق و تدقیق کے ساتھ کیا جا سکتا ہے، اور وہی کر سکتا ہے، جو باریک بین اور تاریخی اصول کا نکتہ شناش بھی ہو، آخر میں لکھتے ہیں کہ مجھکو کبھی عام لوگوں کی تحسین سے نہ خوشی ہوئی، نہ ان کے اعتراض سے رنج...... مجھکو چھوڑ دیا جائے کہ رائی ہیر و ڑ کے باقی حصے پورے کروں۔

رسی آنکہ بار دمن کہ چو من خامہ گیری و حرف بنگاری

لیکن یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس اعتراض اور جواب کے بعد مولانا حبیب الرحمن شیروانیؒ اور علامہ شبلی نعمانیؒ میں جو تعلقات پیدا ہوئے، اس کے بعد یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کون حبیب رہا اور کون محبوب۔

قاضی محسن تنوخی

از

جناب سید بدرالدین بٹ لکچرر شعبۂ عربی و اسلامیات اسلامیہ کالج سری نگر

نام و نسب اور سنہ ولادت | محسن نام ابو علی کنیت ہے، سلسلۂ نسب اس طرح ہے، ابو علی المحسن بن ابی القاسم علی بن محمد بن ابی الفہم داؤد بن ابراہیم بن تمیم تنوخی،[1] ان کے والد گرامی ابو القاسم علی کا سلسلۂ نسب تنوخ کے بادشاہ عمرو بن الحارث سے جا ملتا ہے،[2] اور وہ اسی مناسبت سے تنوخی کہلاتے تھے۔

قاضی محسن تنوخی بصرہ میں یاقوت حموی کے بقول سنہ ۳۲۹ھ میں پیدا ہوئے۔[3] لیکن خود قاضی تنوخی کے صاحبزادہ علی نے اپنے والد گرامی کا سنہ ولادت سنہ ۳۲۷ھ بتایا ہے، اور ابن خلکان نے بھی یہی سنہ درج کیا ہے۔[4]

والد بزرگوار | قاضی محسن کے والد ماجد ابو القاسم علی انطاکیہ کے باشندہ[5]، اور ایک معروف معتزلی عالم اور ماہر فلکیات تھے، بصرہ اور اہواز میں کئی سال تک قاضی رہے، پھر بغداد سے ناراضگی کے سبب سیف الدولہ کے دربار میں پہنچے، سیف الدولہ نے انکو خوش آمدید کہا، اور دربار بغداد کو لکھا کہ انھیں بحال کیا جائے، جس پر ان کو بحال کردیا گیا، وہاں وزیر المہلبی جو ادیبوں کی

---

۱ وفیات الاعیان قاہرہ ۱۹۴۸ء ج ۳ ص ۳۰۰ ۲ ایضاً ج ۳ ص ۱، ۳ یاقوت حموی، معجم الادباء قاہرہ ۱۹۲۹ء ج ۱، ص ۶، ۴ وفیات ج ۳ ص ۳۳۳ ۵ تاریخ بغداد ج ۱ ص ۱۵۵ ۶ وفیات ج ۳ ص ۸۱۔

سرپرستی کے لیے مشہور اور ممتاز تھا، ان کی طرف خاص طور پر ملتفت ہوگیا، اور ناؤ نوش اور شبانہ محفلوں میں ان کو شریک کرنے لگا[۱] ابو القاسم حدیث اور فقہ حنفی کے زبردست فاضل تھے، ان کا انتقال ۳۴۲ھ میں ہوا ہے، جب کہ ان کے صاحبزادہ محسن تنوخی پندرہ سال کے تھے[۲]۔

تعلیم و تربیت | محسن تنوخی نے غالباً سب سے پہلے اپنے والد ماجد سے ہی استفادہ کیا، ان کے علاوہ انھوں نے وہب بن یحییٰ مازنی، ابو العباس الاثرم، محمد بن یحییٰ، بصولی، حسن بن محمد بن عثمان نسوی، ابو بکر بن داسہ اور ماحر بن عبید الصفار سے حدیث کی تعلیم حاصل کی، یہ حضرات اس وقت بصرہ کی اہم علمی شخصیات میں شمار ہوتے تھے[۳]۔

عہدۂ قضا پر تقرری | بصرہ میں تعلیم و تربیت کے مرحلے سے فارغ ہونے کے بعد محسن تنوخی ۱۶ برس کی عمر میں ۳۴۳ھ میں بغداد کے سوق الاہواز میں محکمۂ ناپ تول کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے نظر آتے ہیں[۴]، ۳۶۳ھ میں اپنے والد ہی کی طرح وہ عدلیہ سے وابستہ ہوئے[۵] اور واسطہ کے قاضی مقرر کئے گئے، اور اسی عہدہ پر انھوں نے مختلف اوقات میں جزیرہ ابن عمر، اہواز اور بغداد میں بھی کام کیا[۶]، ۳۵۹ھ میں تبدیلی وزارت کے نتیجہ میں ان کو اس منصب سے علحدہ کر دیا گیا، ان کی ساری جائداد قرق ہوگئی، مگر تین سال کے بعد پھر اپنے عہدہ پر بحال کر دیے گئے، اس عرصہ مین انھوں نے مصر کا بھی سفر کیا[۷]، امیر الامرار عضد الدولہ سے ان کے دوستانہ مراسم تھے مگر ۳۷۱ھ میں وہ عضد الدولہ کے عتاب میں آگئے، اور امام شافعی اور ان کے متبعین کی ہجو کی پاداش میں ان کو جیل بھیج دیا گیا، مگر تجارب الامم کے مؤلف ابو شجاع لکھتے ہیں کہ ۳۷۱ھ میں تنوخی کو معزول کر کے ان ہی کے مکان میں نظر بند کر دیا گیا، جس کی وجہ یہ تھی کہ تنوخی، عضد الدولہ کے ساتھ ایک

۱؎ وفیات ج ۳ ص ۱۴۹، ۲؎ ایضاً ج ۳ ص ۳۰۱، ۳؎ تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۱۵۵، ۴؎ وفیات ج ۳ ص ۳۰۲، ۵؎ معجم ج ۶، ص ۹۲ ۶؎ وفیات ج ۳ ص ۳۰۲ ۷؎ دائرۃ المعارف ج ۶، ص

ہم میں شریک سفر تھے، ہمدان میں قیام تھا، ایک دن وہ اپنے دوست ابن شاہویہ کے پاس گئے، اور یہ معلوم ہوا کہ عضد الدولہ، صاحب بن عباد کی گرفتاری کا منصوبہ بنا رہا ہے، تنوخی نے یہ بات، صاحب بن عباد تک پہنچادی، عضد الدولہ کو جب اس افشائے راز کا علم ہوا، تو اس نے سرزنش کی، تنوخی کی طرف سے اس الزام سے انکار کے باوجود، عضد الدولہ کے دل میں یہ بات بیٹھ چکی تھی، اس نے ہمدان سے واپسی کے بعد ایک دن تنوخی کو قیمتی کپڑوں میں ملبوس پایا، ان کی سواری کی زین بھی بیش قیمت تھی، عضد الدولہ نے تنوخی سے اس قیمتی لباس کو زیب تن کرنے کی وجہ پوچھی تو انھوں نے جواب دیا کہ یہ لباس صاحب بن عباد کا تحفہ ہے، عضد الدولہ نے کہا کہ "یہ تحفہ اس عنایت سے فرو تر ہے جو تم نے اس پر کی ہے"۔ ابو شجاع لکھتے ہیں کہ صاحب بن عباد نے تنوخی کو، اس کے علاوہ سات ہزار درہم اور ۲۰ عدد پارچے بھی تحفے میں دیئے تھے، عضد الدولہ کی بیٹی خلیفہ طائع کے عقد میں تھی، اس کے بارے میں عضد الدولہ کو یہ معلوم ہوا کہ وہ اپنے حقوق سے محروم کر دی گئی ہے، چنانچہ اس نے تنوخی کو حکم دیا کہ وہ خلیفہ کو اس کی بیٹی پر زیادہ التفات مندول نے کی ترغیب دیں، تنوخی اپنے گھر آئے، جب اس مہم پر روانہ ہوئے تو راہ میں گر گئے، پاؤں میں چوٹ آگئی، انھوں نے امیر الامرا، عضد الدولہ کو معذرت لکھ بھیجی، جس پر عضد الدولہ ان سے ناراض ہو گیا، اور تنوخی کو ان کے گھر ہی میں قید کئے جانے کا حکم دیا، کسی کو ان سے ملنے یا کہیں الگ ہونے کی اجازت نہ تھی، عضد الدولہ کی موت ۳۷۲ھ تک تنوخی اسی قید و بند میں رہے۔[1]

قید سے رہائی، بحالی اور انتقال | عضد الدولہ کی موت کے بعد تنوخی کو رہائی ملی، اس کے بعد تنوخی کی مصروفیات کا ہمیں زیادہ علم نہیں، البتہ خطیب بغدادی کے بیان سے اتنا معلوم ہوتا ہے، کہ وہ محرم ۳۸۴ھ تک مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے،[2] اور محرم ۳۸۴ھ ہی میں بغداد میں انکا

---

[1] ذیل تجارب الامم، قاہرہ ۱۹۱۶ء صفحہ ۲۱ [2] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۱۵۶۔

نتقال ہوا، اور وہیں دفن کیے گئے۔[1]

اولاد | محسن تنوخی کے صرف ایک فرزند شیخ ابوالقاسم علی کا مورخین نے شاندار لفظوں میں تذکرہ کیا ہے، وہ ۲۵ شعبان ۳۶۵ھ میں بصرہ میں پیدا ہوئے اور ۴۴۷ھ میں بیالیس[42] سال کی عمر میں انتقال کر گئے[2] خطیب بغدادی ان کے جنازہ میں شریک تھے، انھوں نے لکھا ہے کہ محسن کے بیٹے ابوالقاسم علی کو جو ان عمری میں بھی ثقہ سمجھا جاتا تھا، اور انتقال تک وہ اعتبار و استناد کی نظروں سے دیکھے گئے[3] مدائن، آذربائیجان، بردان، کرمسین وغیرہ میں قاضی کی حیثیت سے کام کیا[4] محدث بھی تھے، خطیب نے ان سے کئی حدیثیں روایت کی ہیں[5]

شاعری | محسن تنوخی کی تصنیفات کا جائزہ ہم بعد میں لیں گے، وہ تاریخ و ادب کے ایک بلند پایہ عالم ہونے کے علاوہ شعر و سخن سے بھی دلچسپی رکھتے تھے، اگرچہ ان کا دیوان اب کہیں بھی دستیاب نہیں، مگر ثعالبی نے لکھا ہے کہ تنوخی کا دیوان، ان کے والد کے دیوان سے بڑا تھا، اس کی عدم موجودگی میں اب ہم ان کی شاعری پر تفصیلی تبصرہ تو نہیں کر سکتے، البتہ یہاں نمونہ کے طور پر ان کے چند اشعار ہی پر اکتفا کریں گے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک بار، ایک شیخ نماز استسقا کے لئے لوگوں کو ایک میدان میں لیکر نکلے اس وقت آسمان ابر آلود تھا، ان کی دعا ختم ہوئی تو بادل غائب ہو چکے تھے، اس موقع پر تنوخی نے طنزیہ اشعار کہے[6]

خرجنا لنستقی من دعا شہ ۔۔۔ وقد کاد ھدب الغیم ان یبلغ الارضا

فلما ابتدا یدعو تقشعت السماء ۔۔۔ فما تم الا و الغمام قد انقضا

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۳، ص ۱۵۶ وارشاد الاریب ج ۶، ص ۲۵۱ [2] وفیات ج ۳، ص ۳۳۴ [3] ایضاً، تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۱۵۶

[4] وفیات ج ۳ ص ۳۰۴ [5] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۱۵۵ [6] یتیمۃ الدھر ج ۲ ص ۳۴۲۔

۱۔ ہم باہر نکلے تاکہ ان کی دعا کی برکت سے پانی حاصل کریں، جب کہ بادل زمین پر برسنے کے بجائے راہ فرار اختیار کرنے ہی والے تھے۔

۲۔ انھوں نے دعا شروع کی تو آسمان صاف ہو گیا، اور جلد ہی بادل چھنٹ گئے۔

ایک اور موقع پر تنوخی نے یہ شعر کہے[1]

لئن اشمت الاعداء صرفی و رحلتی	فما صرفوا فضلی ولا راء تحمل المجد
مقام و ترحال و قبض و بسط	کذا عادة الدنیا واخلاقها النکد

۱۔ دشمنوں کو اگر وطن سے میرے ہٹنے اور سفر کرنے پر خوشی ہوئی تو کوئی حرج نہیں اس لئے کہ وہ مجھ سے میرے امتیاز کو جدا نہیں کر سکتے ہیں، اور ان کی خواہش پر میری عزت بھی رحلت نہیں کرے گی۔

۲۔ قیام و سفر اور قبض و بسط کی حالتیں تو اس دنیا کی سرشت میں ہمیشہ موجود رہی ہیں۔

تنوخی کا اسلوب تحریر:۔۔۔۔۔۔۔ تنوخی کا اسلوب بیان دلکش ہے جس کی وجہ سے دوسری زبانوں میں بھی ان کی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا، وہ طرز تحریر میں جاحظ سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں، جاحظ ہی کی طرح انھوں نے سماج کے مختلف طبقوں، اور سیاسی سماجی، اخلاقی اور ادبی ماحول کا جائزہ لیا ہے، وہ بادشاہوں، ادیبوں، علماء، شعراء اور وزراء کے ساتھ ہی نافہموں، چوروں، ٹھگوں، عورتوں، مردوں، بخیلوں اور سخی افراد کا بھی ذکر کرتے ہیں، انھوں نے فلسفیوں پر اظہار خیال کرنے کے ساتھ نجومیوں، رقاصوں، مشہور گانے والوں، اور معروف اطباء کا تذکرہ بھی کیا ہے، وہ مویشیوں کی اقسام اور پتھروں کی مختلف خصوصیات پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں، جاحظ ہی کی طرح ان کے یہاں ایک موضوع سے دوسرے موضوعات

---

[1] یتیمة الدہر ج ۲ ص ۱۳۳۔

انتقال ہوا، اور وہیں دفن کئے گئے۔[۱]

اولاد | محسن تنوخی کے صرف ایک فرزند شیخ ابو القاسم علی، کا مورخین نے شاندار لفظوں میں تذکرہ کیا ہے، وہ ۲۵ شعبان ۳۶۵ھ میں بصرہ میں پیدا ہوئے اور ۴۴۷ھ میں بیالیس[۴۲] سال کی عمر میں انتقال کر گئے[۲] خطیب بغدادی ان کے جنازہ میں شریک تھے، انھوں نے لکھا ہے کہ محسن کے بیٹے ابو القاسم علی کو جوان عمری میں بھی ثقہ سمجھا جاتا تھا، اور انتقال تک وہ اعتبار و استناد کی نظر وں سے دیکھے گئے[۳]، مدائن، آذربائیجان، بردان، قرمسین وغیرہ میں قاضی کی حیثیت سے کام کیا[۴] وہ محدث بھی تھے، خطیب نے ان سے کئی حدیثیں روایت کی ہیں[۵]

شاعری | محسن تنوخی کی تصنیفات کا جائزہ ہم بعد میں لیں گے، وہ تاریخ و ادب کے ایک بلند پایہ عالم ہونے کے علاوہ شعر و سخن سے بھی دلچسپی رکھتے تھے، اگرچہ ان کا دیوان اب کہیں بھی دستیاب نہیں، مگر ثعالبی نے لکھا ہے کہ تنوخی کا دیوان، ان کے والد کے دیوان سے بڑا تھا، اس کی عدم موجودگی میں ہم ان کی شاعری پر تفصیلی تبصرہ تو نہیں کر سکتے، البتہ یہاں نمونہ کے طور پر ان کے چند اشعار ہی پر اکتفا کریں گے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک بار، ایک شیخ نماز استسقا کے لئے لوگوں کو ایک میدان میں لیکر نکلے، اس وقت آسمان ابر آلود تھا، ان کی دعا ختم ہوئی تو بادل غائب ہو چکے تھے، اس موقع پر تنوخی نے یہ طنزیہ اشعار کہے۔[۶]

خرجنا لنستسقی من دعا شیخ	وقد کاد ھدب الغیم ان یبلغ الارضا
فلما ابتدا یدعو تقشعت السماء	فما تم الا و الغمام قد انفضا

---

[۱] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۱۵۵ و ارشاد الادیب ج ۶ ص ۲۵۱ [۲] وفیات ج ۳ ص ۲۲۳ [۳] ایضاً، تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۱۵۶ [۴] وفیات ج ۳ ص ۳۰۴ [۵] تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۱۵۵ [۶] یتیمۃ الدھر ج ۲ ص ۲۴۲۔

۱۔ ہم باہر نکلے تاکہ ان کی دعا کی برکت سے پانی حاصل کریں، جب کہ بادل زمین پر برسنے کے بجائے راہ فرار اختیار کرنے ہی والے تھے۔

۲۔ انھوں نے دعا شروع کی تو آسمان صاف ہوگیا، اور جلد ہی بادل چھنٹ گئے۔

ایک اور موقع پر تنوخی نے یہ شعر کہے:[۱]

لئن اشمت الاعداء صرفی ورحلتی　　فما صرفوا فضلی ولا اء تحل المجد

مقام وترحال وقبض وبسطہ　　کذا عادۃ الدنیا واخلاقھا النکد

۱۔ دشمنوں کو اگر وطن سے میرے ہٹنے اور سفر کرنے پر خوشی ہوئی تو کوئی حرج نہیں اس لئے کہ وہ مجھ سے میرے امتیاز کو جدا نہیں کر سکتے ہیں، اور ان کی خواہش پر میری عزت بھی رحلت نہیں کرے گی۔

۲۔ قیام وسفر اور قبض و بسط کی حالتیں تو اس دنیا کی سرشت میں ہمیشہ موجود رہی ہیں۔

تنوخی کا اسلوب تحریر .... تنوخی کا اسلوب بیان دلکش ہے جس کی وجہ سے دوسری زبانوں میں بھی ان کی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا، وہ طرز تحریر میں جاحظ سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں جاحظ ہی کی طرح انھوں نے سماج کے مختلف طبقوں، اور سیاسی سماجی، اخلاقی اور ادبی ماحول کا جائزہ لیا ہے، وہ بادشاہوں، ادیبوں، علماء، شعراء اور وزراء کے ساتھ ہی ناموں چوروں، ٹھگوں، عورتوں، مردوں، بخیلوں اور سخی افراد کا بھی ذکر کرتے ہیں، انھوں نے فلسفیوں پر اظہار خیال کرنے کے ساتھ نجومیوں، رقاصوں، مشہور گانے والوں، اور معروف اطباء کا تذکرہ بھی کیا ہے، وہ مویشیوں کی اقسام اور پتھروں کی مختلف خصوصیات پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں، جاحظ ہی کی طرح ان کے یہاں ایک موضوع سے دوسرے موضوعات

---

[۱] یتیمۃ الدہر ج ۲ ص ۳۴۳۔

انتقال ہوا، اور وہیں دفن کئے گئے[1]

اولاد محسن تنوخی کے صرف ایک فرزند شیخ ابوالقاسم علی کا مورخین نے شاندار لفظوں میں تذکرہ کیا ہے، وہ ۵ شعبان ۳۶۵ھ میں بصرہ میں پیدا ہوئے اور ۴۴۷ھ میں بیالیس سال کی عمر میں انتقال کر گئے[2]۔ خطیب بغدادی ان کے جنازہ میں شریک تھے، انھوں نے لکھا ہے کہ محسن کے بیٹے ابوالقاسم علی کو جو اس عمری میں بھی ثقہ سمجھا جاتا تھا، اور انتقال تک وہ اعتبار و استناد کی نظروں سے دیکھے گئے[3]، مدائن، آذربائیجان، بردان، کرمسین وغیرہ میں قاضی کی حیثیت سے کام کیا[4] وہ محدث بھی تھے، خطیب نے ان سے کئی حدیثیں روایت کی ہیں[5]۔

شاعری محسن تنوخی کی تصنیفات کا جائزہ ہم بعد میں لیں گے، وہ تاریخ و ادب کے ایک بلند پایہ عالم ہونے کے علاوہ شعر و سخن سے بھی دلچسپی رکھتے تھے، اگرچہ ان کا دیوان اب کہیں بھی دستیاب نہیں، مگر ثعالبی نے لکھا ہے کہ تنوخی کا دیوان، ان کے والد کے دیوان سے بڑا تھا، اس کی عدم موجودگی میں ہم ان کی شاعری پر تفصیلی تبصرہ تو نہیں کر سکتے، البتہ یہاں نمونہ کے طور پر ان کے چند اشعار ہی پر اکتفا کریں گے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک بار ایک شیخ نماز استسقا کے لئے لوگوں کو ایک میدان میں لیکر نکلے، اس وقت آسمان ابر آلود تھا، ان کی دعا ختم ہوئی تو بادل غائب ہو چکے تھے، اس موقع پر تنوخی نے یہ طنزیہ اشعار کہے[6]

خرجنا لنستقی من دعا شیخ	وقد کاد ھدب الغیم ان یبلغ الارضا
فلما ابتدا یدعو تقشعت السماء	فما تم الا و الغمام قد انفضا

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۳، ص ۱۵۶ و ارشاد الاریب ج ۶، ص ۲۵۱ [2] وفیات ج ۳، ص ۲۳ [3] ایضاً، تاریخ بغداد ج ۱۳، ص ۱۵۶
[4] وفیات ج ۳، ص ۴۰۳ [5] تاریخ بغداد ج ۱۳، ص ۱۵۵ [6] یتیمۃ الدھر ج ۲، ص ۲۴۲۔

۱۔ ہم باہر نکلے تاکہ ان کی دعا کی برکت سے پانی حاصل کریں، جب کہ بادل زمین پر برسنے کے بجائے راہ فرار اختیار کرنے ہی والے تھے۔

۲۔ انھوں نے دعا شروع کی تو آسمان صاف ہوگیا، اور جلد ہی بادل چھنٹ گئے۔

ایک اور موقع پر تنوخی نے یہ شعر کہے[1]

لئن اشمت الاعداء صرفی ورحلتی فما صرفوا فضلی ولا اء تحل المجد

مقام وترحال وقبض وبسطہ کذا عادۃ الدنیا واخلاقہا النکد

۱۔ دشمنوں کو اگر وطن سے میرے ہٹنے اور سفر کرنے پر خوشی ہوئی تو کوئی حرج نہیں اس لئے کہ وہ مجھ سے میرے امتیاز کو جدا نہیں کر سکتے ہیں، اور ان کی خواہش پر میری عزت بھی رحلت نہیں کرے گی۔

۲۔ قیام و سفر اور قبض و بسط کی حالتیں تو اس دنیا کی سرشت میں ہمیشہ موجود رہی ہیں۔

تنوخی کا اسلوب تحریر .... تنوخی کا اسلوب بیان دلکش ہے جس کی وجہ سے دوسری زبانوں میں بھی ان کی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا، وہ طرز تحریر میں جاحظ سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں جاحظ ہی کی طرح انھوں نے سماج کے مختلف طبقوں، اور سیاسی سماجی، اخلاقی اور ادبی ماحول کا جائزہ لیا ہے، وہ بادشاہوں، ادیبوں، علماء، شعراء اور وزراء کے ساتھ ہی نافہموں چوروں، ٹھگوں، عورتوں، مردوں، بخیلوں اور سخی افراد کا بھی ذکر کرتے ہیں، انھوں نے فلسفیوں پہ اظہار خیال کرنے کے ساتھ نجومیوں، رقاصوں، مشہور گانے والوں، اور معروف اطباء کا تذکرہ بھی کیا ہے، وہ مویشیوں کی اقسام اور پتھروں کی مختلف خصوصیات پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں، جاحظ ہی کی طرح ان کے یہاں ایک موضوع سے دوسرے موضوعات

---

[1] یتیمۃ الدہر ج ۲ ص ۳۴۰۔

کی طرف گریز کی کیفیت پائی جاتی ہے، وہ شاعری پر لکھتے لکھتے کسی ادنیٰ مناسبت سے نثر پر، تاریخی مباحث میں سماجی حالات پر، سنجیدہ موضوعات میں طنز و ظرافت پر خامہ فرسائی شروع کر دیتے ہیں، اس طرح وہ اپنے قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھتے ہیں، ان کے اسلوب کی یہ خصوصیات ان کی کتاب نشوار المحاضرہ میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں، وہ کہیں کہیں روزمرہ کے الفاظ، مثلاً أی شئ کی جگہ ایش، ہاتوا کی جگہ ہاتم وغیرہ بھی بڑی بے تکلفی کے ساتھ استعمال کر جاتے ہیں، زبان و بیان پر بے پناہ قدرت ہی کی وجہ سے وہ عربی زبان کے ایک قادر الکلام اور فصیح اللسان ادیب اور مصنف شمار کئے جاتے ہیں۔

علمی و ادبی شخصیت محسن تنوخی اپنے زمانہ کی علمی شخصیتوں میں شمار ہوتے تھے، وہ ایک شاعر ادیب، اعلیٰ پایہ کے مؤرخ اور معتبر محدث تھے، اپنی وفات تک روایت حدیث بھی کرتے رہے، خطیب بغدادی نے ان سے یہ حدیث روایت کی ہے، من ستر مسلما سترہ اللہ فی الدنیا والآخرۃ، ومن فک عن مکروب فک اللہ عنہ کربۃ من کرب یوم القیامۃ ومن کان فی حاجۃ اخیہ کان اللہ فی حاجتہ[1]

انھوں نے ایک قاضی کی حیثیت سے عدلیہ میں اپنی علمیت اور غیر جانبداری کی وجہ سے ایک اچھی مثال قائم کی چنانچہ ابو عبد اللہ حسین بن حجاج نے ان کی تعریف کرتے ہوئے یہ اشعار کہے[2]

واذا ذکر القضاۃ وھم شیوخ	تخیرت الشباب علی الشیوخ
ومن لم یرض لم اصفعہ الا	بحضرۃ سیدی القاضی التنوخی[3]

ا۔ جب قاضیوں کا تذکرہ انکی موجودگی میں ہوتا ہے، تو میں بوڑھوں کے مقابلہ میں جوانوں کا انتخاب کر لیتا ہوں۔

---

[1] النثر الفنی و اثرہ الجاحظ فیہ مولفہ عبد الحکیم بلبغ، مطبوعہ قاہرہ ۱۹۵۵ء ص ۳۰۱ - ۳۱۳ [2] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۱۵۶ [3] یتیمۃ الدہر ثعالبی قاہرہ ۱۹۳۴ء ج ۲ ص ۱۱۶ وفات ج ۳ ص ۳۰۱۔

۲۔ اور کوئی اس انتخاب سے ناخوش ہو تو میں اس سے اس وقت تک درگذر نہیں کرتا

جب تک کہ وہ میرے سردار قاضی تنوخی پر رضامند نہ ہو جائے۔

تصنیفات محسن تنوخی کی تصنیفات آج بھی عربی ادب کے طلبہ ذوق وشوق کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

یہاں ان کی مطبوعہ کتابوں کا اختصار کے ساتھ تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ المستجاد من فعلات الاجواد، یہ کتاب سخی لوگوں کی دریا دلی کے قصوں پر مشتمل ہے۔

جاحظ نے کتاب البخلاء میں بخیلوں کے واقعات قلمبند کیے تھے، تنوخی نے فیاض لوگوں کی سخاوت

کے واقعات جمع کر دیئے ہیں، یہ کتاب پہلے جرمنی میں ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی، مرحوم کرد علی

نے اسی کو ایڈٹ کر کے ۱۹۴۶ء میں دوبارہ شائع کیا اور ۱۹۷۰ء اس کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا۔

یہ کتاب ایک گلدستہ کی مانند ہے، جس میں طرح طرح کے سخاوت کے قصے درج کیے گئے ہیں۔

جن میں زیادہ تر واقعات کی صداقت بہر حال شبہ سے بالاتر ہے[۱]۔ ان میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم،

حضرت عائشہؓ، حضرت علیؓ، حضرت حسینؓ، حضرت معاویہؓ، یزید، سلیمان بن عبدالملک، مروانؒ

عبدالملک، عبداللہ بن جعفر، منصور، مہدی، ہارون رشید، مامون معتصم، واثق، برامکہ، فضل بن

سہل وغیرہ کے واقعات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

کتاب کا مطالعہ کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اہل بیت رسولؐ سخی ترین افراد تھے،

انھوں نے ضرورت مندوں پر اس کشادہ دلی سے خرچ کیا ہے، جس پر عام حالات میں مشکل ہی سے

یقین کیا جا سکتا ہے، مگر وہ اپنی آخرت سنوارنے کے لیے بے دریغ خرچ کرتے تھے، کتاب کے حصہ اول

میں ۷۵ واقعات ہیں، مگر مولف نے اس کتاب میں ان کی تعداد ۱۰۰ بتائی ہے، جس سے یہ شبہ

ہوتا ہے کہ ۲۵ قصے بعد میں کسی کاتب نے بڑھا دیئے ہیں، قارئین کی دلچسپی کے لیے بطور نمونہ ایک قصہ کا

---

[۱] المستجاد من فعلات الاجواد، دمشق ۱۹۴۶ء، مقدمہ ص ۔ ایضاً ص ۴ ۔

ترجمہ درج کیا جاتا ہے،

مدائنی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن جعفرؓ حج کے لئے روانہ ہوئے، راہ میں خورد و نوش کا سامان ختم ہو گیا، یہ حضرات بھوک اور پیاس سے نڈھال، ایک بڑھیا کے خیمہ تک پہنچے اور پینے کے لیے کوئی چیز طلب کی، اس نے بکری پیش کر دی، انھوں نے اس کو دوہ کر اپنی پیاس بجھائی، پھر کھانے کی فرمائش کی، بڑھیا کے پاس وہی بکری تھی، جس کو اس نے ذبح کرنے کے لیے پیش کیا، اور پھر خود پکا کر دیا، ان تینوں نے شکم سیر ہو کر کھانا کھایا، اور بتایا کہ وہ قریشی ہیں زندہ رہے تو اس بڑھیا کے ساتھ بھی حسن سلوک کریں گے، ان کے جانے کے بعد بڑھیا کا شوہر آیا، اجنبیوں کے ساتھ اس حسن سلوک سے وہ کچھ زیادہ خوش نہ تھا، کچھ عرصہ کے بعد یہ میاں بیوی، مدینہ طیبہ آئے، حضرت حسنؓ کے دولت کدہ کے قریب سے ان کا گزر ہوا، تو انھوں نے پہچان کر بڑھیا کو بلایا، اور اس کے حسن سلوک کی یاد دلائی، اس کو ایک ہزار بکریاں اور ایک ہزار دینار نقد عطا کئے، پھر اس کو حضرت حسینؓ کے پاس بھیجدیا، انھوں نے بھی اسی قدر عنایت فرمایا، اور بڑھیا کو حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کے پاس بھیجدیا، انھوں نے بڑھیا کو دو ہزار بکریاں اور دو ہزار دینار مرحمت فرمائے، اسطرح چار ہزار بکریاں اور چار ہزار دینار لیکر یہ بڑھیا اپنے شوہر کے پاس چلی گئی۔[1]

کتاب کا دوسرا حصہ، ظرافت اور حاضر جوابی سے متعلق ہے، چند مثالیں درج ذیل ہیں، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک روز ہم نے ایک بکری ذبح کی اور اس کا گوشت تقسیم کر دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ اے عائشہ کیا کچھ باقی بچا ہے، انھوں نے جواب دیا کہ

یارسول اللہ! مابقی منھا الا کتفھا	بکری کے دست رہ گئے ہیں اور کوئی حصہ نہیں بچا،
فرمایا کلھا بقی الا کتفھا۔[2]	تمام حصے بچ گئے ہیں، (یعنی ذخیرۂ آخرت ہو گئے یا اجر کا حصہ ہو گئے) سوائے اس کے دست کے،

۱؎ ایضاً ص ۱۲-۱۱   ۲؎ ایضاً ص ۵۰۰

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ یہودی آئے، اور انھوں نے کہا کہ اگر آپ خدا کے رسول ہیں تو حضرت عیسیٰؑ کی طرح آپ نے بھی اپنے گہوارہ ہی میں گفتگو کیوں نہ کی؟ آپ نے فرمایا:

حضرت عیسیٰؑ، بغیر باپ کے پیدا ہوئے وہ اپنے گہوارہ میں بات نہ کرتے تو کنواری مریم کے لیے کوئی عذر نہ بچا تا اور یہ کہا جاتا کہ ان کا تعلق یقیناً کسی مرد سے تھا، میرے والدین کی موجودگی میں کسی معذرت یا معجزہ کی ضرورت ہی نہ تھی۔[۳]

ایک موقع پر مشہور اموی شاعر فرزدق، بصرہ میں اپنے اشعار سنا رہا تھا، کمیت، ابھی نوجوان تھے ان سے فرزدق نے کہا۔ مجھے اپنا باپ سمجھو تو تم کو یقیناً خوشی ہوگی، یسر ک انی ابوک، کمیت نے فوراً جواب دیا، جہاں تک میرے باپ کا تعلق ہے تو مجھے ان کا نعم البدل نہیں چاہیے، البتہ اس بات سے مجھے خوشی ہوگی کہ آپ میری ماں بن جائیں اور میرے باپ آپ کا ذائقہ لیں۔[۴]

اس کتاب میں کچھ ایسے قصے بھی ہیں جن میں کتاب کو محسن کے بجائے ان کے فرزند ابوالقاسم علی کی طرف منسوب کیا گیا ہے، مثلاً

قال القاضی ابوالقاسم علی .... حدثنی ام (المستجاد ص۲۶)

حدث القاضی ابوالقاسم .... فی کتابہ ام (المستجاد ص۳)

قال القاضی ابوالقاسم علی .... فی کتابہ ام (المستجاد ص۱۳۱)

مذکورہ فقروں کی وجہ سے محسن کے ساتھ اس کتاب کی نسبت مشکوک ہوگئی ہے جب کہ کسی بھی تذکرہ نگار نے اس کتاب کو ابوالقاسم علی کی طرف منسوب نہیں کیا ہے، ایک مستشرق عالم پروفیسر کرینکو (Krenkov) کا خیال ہے کہ یہ کتاب نہ محسن کی ہے اور نہ ان کے بیٹے ابوالقاسم علی کی، ابتداءً یہ ایک مجہول مصنف کی کتاب تصور کی جاتی رہی، بعد میں اس وجہ سے کہ اس میں محسن کی الفرج بعد

کے کئی جگہ حوالے ہیں، اس کتاب کو محسن کی طرف منسوب کر دیا گیا۔ ہمارا خیال ہے کہ اس بارے میں ابھی کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جا سکتی ہے، یہ بحث ہنوز تشنہ ہی سمجھی جانی چاہیئے۔

الفرج بعد الشدۃ | یہ تنوخی کی مشہور کتاب ہے، یہ تین جلدوں میں لکھی گئی تھی،[1] مگر اب تک اس کے صرف دو ہی حصے مصر سے ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۴ء میں محمود ریاض کے ذریعہ شائع ہو سکے ہیں، مقصد تالیف یہ تھا کہ جو لوگ مصیبتوں اور سختیوں سے دو چار ہیں ان کے لئے شمع امید روشن کی جائے، اور نامساعد حالات میں بھی انہیں صبر و ضبط اور جد و جہد کے لئے تیار کیا جائے، اس سے قبل ابو الحسن علی بن محمد المدائنی نے پانچ چھ ورق پر مشتمل ایک مختصر رسالہ لکھا تھا، اور اسی کو الفرج بعد الشدۃ والضیق[2] کے نام سے موسوم کیا، ابوبکر عبد اللہ بن محمد بن ابی الدنیا نے بھی ۲۰ ورق کا ایک رسالہ لکھا جس میں دعا اور صبر و توکل کے بارے میں ارشادات نبویؐ، اقوال صحابہؓ اور تابعین کے خیالات یکجا کر دیئے تھے تنوخی کی نظر سے قاضی عمر بن محمد کی بھی پچاس ورق پر مشتمل ایک کتاب اسی موضوع پر ۔۔۔ گزری تھی، ابوبکر قاضی عمر بن محمد نے اپنے پیشرو مدائنی کا ذکر نہیں کیا ہے،[3] یہ تینوں کتابیں اپنے موضوع پر تشنہ ہونے کے علاوہ کچھ زیادہ مرتب شکل میں بھی نہ تھیں، تنوخی نے اس موضوع کے ہر گوشہ کو لیا اور اپنے والد بزرگوار، اساتذہ، قاضیوں اور سکریٹریوں کے بیان کردہ واقعات، اپنے تجربات اور مذہبی، ادبی اور تاریخی کتابوں کے اقتباسات سے ایک اچھی کتاب تیار کر دی، اندازہ یہ ہے کہ ۳۷۳ھ یا اس کے کچھ ہی عرصہ بعد یہ کتاب ترتیب دی گئی۔[4]

باب اول میں تنوخی نے سختی کے بعد راحت کے موضوع پر قرآن کریم کی روشنی میں بحث کی ہے، سورۃ الم نشرح کی وضاحت کے بعد لکھا ہے، کہ مصیبت سے نجات حاصل کرنے کا سب سے بہتر ذریعہ دعا ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی دعا کی تلقین کی گئی ہے، (ج ۱ ص ۸) قرآن کریم کی مختلف

---

[1] Islamic culture, Hyderabad vol 22, 1948, Pg 46

[2] الفرج بعد الشدۃ ج ۱ ص ۳ [3] ایضاً ج ۱ ص ۴ [4] ایضاً ج ۱ ص ۸۔

نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ جب جب نعمان مصیبتوں کا شکار ہوا، خدا نے اسے نجات دی (ص ۹)
انھوں نے حضرات انبیا علیہم السلام، آدمؑ، ابراہیمؑ، نوحؑ، موسیٰؑ، یعقوبؑ، یونسؑ، یوسفؑ وغیرہم
کی مثالیں دی ہیں کہ خدا کے ان برگزیدہ بندوں نے مصیبتوں میں جب دربار الٰہی میں دعا کی تو وہ
کس طرح راحت وکامیابی سے نوازے گئے۔ اس کے بعد تنوخی نے توکل اور خود خدا کے بارے میں رسول
اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بھی نقل کئے ہیں۔ (ص ۲۰)

باب دوم میں تنوخی نے احادیث رسولؐ، صحابہ، تابعین اور دیگر علماء کے اقوال درج کئے ہیں
جن میں تکلیفوں پر صبر کرنے کی تلقین کی گئی ہے، (ص ۲۰-۱۹) باب سوم میں ان لوگوں کے واقعات
بیان کئے ہیں، جو مصائب میں گرفتار ہوئے، اور دعاؤں کے بعد خدا نے ان کو مصیبتوں سے نجات دی
(ص ۴۴، ۶۰، ۷۳، ۸۳) باب چہارم میں ان لوگوں کی کہانیاں جو بادشاہوں کے غیظ وغضب
کا شکار ہوئے، مگر شریفانہ طرز عمل، سچائی اور حسن جواب نے ان کو بچا لیا، (ص ۸۸-۹۰-۹۱-۱۱۶)
باب ہشتم میں ان لوگوں کے واقعات ہیں، جو درندوں کی گرفت میں آگئے، مگر اللہ کی رحمت نے انکی
حفاظت کی، خوف خدا اور انفاق فی سبیل اللہ کی برکت سے وہ محفوظ رہے، (ج ۲ ص ۹۹) بارہویں
باب میں ان لوگوں کے واقعات درج کئے ہیں جنھوں نے ناساعد حالات کی وجہ سے اپنے وطن کو چھوڑا
مگر پھر حالات بہتر ہوگئے، اور وہ بعافیت اپنے وطن لوٹ گئے، تیرہویں باب میں عاشقوں کا ذکر
ہے، عاشق ومعشوق تکلیف دہ زندگی بسر کر رہے تھے، مگر موافق حالات نے ان کے فراق کو وصل
میں تبدیل کر دیا، (ج ۲ ص ۱۲۹) آخری باب میں مختلف شعراء کے کلام کو جگہ دی ہے جس میں
اس موضوع پر اشعار کا ایک اچھا انتخاب یکجا ہوگیا ہے۔[1]

تنوخی کی یہ کتاب بہت زیادہ مقبول ہوئی، اس کا اثر ترکی، یہودی اور فارسی ادب پر بھی پڑا،
ترکی میں اسکا ترجمہ قاسم بن محمد لاہری نے اور فارسی میں سدید الدین محمد عوفی اور حسین بن اسعد مرباری نے کیا ہے۔

[1] الفرج بعد الشدۃ ج ۲ ص ۱۹۰۔

المحاضرہ یا تنوخی کی سب سے زیادہ ضخیم تصنیف ہے، جس کا آغاز تصنیف سنہ ۳۶۰ھ ہے اور بیس سال
کی تکمیل ہوئی، وہ گیارہ جلدوں میں تھی، مگر اس وقت تک صرف دو ہی جلدیں طبع ہو سکی ہیں، پروفیسر
ہوث (Margoliouth) نے پیرس لائبریری میں اس کے قلمی نسخہ کی ایک جلد دریافت کی
...ھ کی کتابت شدہ تھی، یہ جلد سنہ ۱۹۲۱ء میں مصر سے ۳۲۰ صفحات میں شائع ہوئی تھی، پھر
المجمع العلمی العربی دمشق نے اس کی دوبارہ اشاعت کی، پروفیسر مغربی نے اس اکیڈمی سے شائع ہونے
والے محاضرات جلد اول میں اس پر "ہماری سماجی تاریخ کا ایک صفحہ" کے عنوان سے ایک مضمون
... اسی جریدہ میں پروفیسر احمد تیمور نے تفسیر الالفاظ العباسیۃ فی نشوار المحاضرۃ کے عنوان سے ایک
مقالہ لکھا، پروفیسر مارگولیوتھ نے طاقۃ الازہار من کتاب النشوار کے عنوان سے تین مقالے لکھے،
... کو برٹش میوزیم میں اس کتاب کی آٹھویں جلد بھی دستیاب ہو گئی، جس کو دمشق کے المجمع العلمی العربی
نے سنہ ۱۹۳۰ء میں شائع کر دیا۔

نشوار المحاضرۃ میں تاریخی حالات کے ساتھ ہی سماجی ماحول، عام لوگوں کے عادات و اطوار اور
اخلاقی حالات، چوروں، اچکوں، نجومیوں، سازندوں اور گرہ کٹوں تک کے واقعات قلمبند کئے گئے ہیں،
... میں تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے وزراء کی زندگی اور ان کے کردار پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، انھوں نے
دوسری صدی ہجری کے نصف آخر کے بعض اہم واقعات بھی درج کئے ہیں، جن سے وہ اسباب بھی علم میں
آجاتے ہیں، جن کی وجہ سے خلافت کی تاریخ میں بحران آیا، لوگ کس کس طرح اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے
اور چند مخصوص خاندان کس طرح سیاسی اداروں پر قابض ہو گئے، اس بحران کا آغاز متوکل کے قتل سے ہوا
اور دور بویہ پر اس کا اختتام ہوا، وہ اسلامی تہذیب و ثقافت اور اس کی تاریخ سے بھی بحث کرتے ہیں، وہ
تاریخ کی غرض و غایت سے باخبر تھے، چنانچہ واقعات کے پس پردہ محرکات سے بھی انھوں نے بحث کی ہے، طبری

۱؎ معجم ج ۶ ص ۲۵۱، Nishwar, Eng. Tr. Table Talk By Marg...
۲؎ ابن خلکان نے اس کتاب کا نام نشوان المحاضرۃ تحریر کیا ہے، دیکھئے وفیات ج ۳ ص ۳۰۳۔ ...

تنوخی کے درمیان ایک اہم اور بنیادی فرق ہے، طبری نے ترک حاکم اتاکس کے قتل کی خبر دی ہے اور متوکل کو اس کا ذمہ دار قرار دیا ہے، لیکن تنوخی نے لکھا ہے کہ متوکل کے وزیر عبید اللہ بن یحییٰ نے اپنی راہ سے ہٹانے کے لیے اس کے قتل کا منصوبہ تیار کیا تھا[1] وہ قاضیوں کی بے باکی اور خلفاء کی طرف سے عدالتوں کے احترام کے واقعات بھی درج کرتے ہیں، قاضی بن حزم نے مالی سال کے ختم ہونے پر واجب الادا رقم جمع کرنے کا حکم دیا، عامل نے خلیفہ معتضد باللہ سے رقم لینے کی جرأت نہ کی، تب قاضی نے اسکو اصرار کر کے خلیفہ کے پاس روانہ کیا، عامل نے معتضد باللہ کو صورت حال سے باخبر کیا تو خلیفہ کو قاضی کی اس جرأت پر خوشی ہوئی اور اسے مطلوبہ رقم ادا کر دی (ج ۸ ص ۱۵) معتصم کے زمانہ میں سرکاری رقوم میں خیانت کرنے والے سرکاری ملازموں کو کوڑوں کی سزا دی جاتی تھی، (ص ۱۳-۱۴) وزیروں پر بھی جرمانے عائد کئے جاتے، چنانچہ معتصم نے ایک وزیر فضل بن مروان پر چالیس ملین درہم جرمانہ عائد کیا، متوکل کے وزیر عبید اللہ بن خاقان نے آرمینیوں سے ایک معاہدہ کی توثیق پر گراں قدر رشوت لی اگر کسی خلیفہ نے اپنی جائداد میں کسی یتیم کے حصہ کا اضافہ کر لیا تو ایسے موقعوں پر عدلیہ نے اپنے فرائض بخوبی انجام دیئے (ص ۳۵-۳۲) تنوخی نے لوگوں کی تنبیہ اور زجر و توبیخ کیلئے وزیروں کے طور طریق کا بھی جائزہ لیا ہے، (۴۸-۴۹) انھوں نے عام سماجی اور اخلاقی حالات کی بھی منظر کشی کی ہے، نام نہاد صوفیوں سے بھی پردہ اٹھایا ہے، اور عضد الدولہ کے ان اقدامات کو سراہا ہے، جن کے ذریعہ ان درویش صورت مجرموں کا قلع قمع کیا گیا، جو مذہب اور تصوف کے نام سے لوگوں کو فریب دیا کرتے تھے، (ص ۸-۲۲۰) انھوں نے صاحب اقتدار خاندانوں کی بے راہ روی اور اخلاقی پستی کو بھی بے نقاب کیا ہے، اور لکھا ہے کہ مامون کے زمانہ میں بعض وزراء سکریٹریوں اور گورنروں نے بیٹیوں کے ساتھ اخلاقی جرم کے مرتکب ہوئے، اور گرفتار کئے گئے، (ص ۲۱) تنوخی لکھتے ہیں کہ اس

---

[1] نشوار المحاضرہ ج ۲ ص ۴۷۔

زمانہ میں چین کے ساتھ عربوں کے تجارتی تعلقات استوار تھے چین کے دور دراز علاقوں تک عرب اپنا سامان تجارت لیجاتے رہے (۱۶۱)

تنوخی لکھتے ہیں کہ غیر مسلم گو وزارت میں نہ تھے، مگر وہ سرکاری مشینری کو کنٹرول کرتے خلفاء کے درباروں میں سیاسی سودے بازی بھی ہوا کرتی (۹-۲۸۲) معتضد باللہ کے جاسوسی نظام کے بارے میں تنوخی نے حیرت انگیز معلومات فراہم کی ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ جاسوس، معذور بھکاریوں کی صورت بنا کر وزراء وعمال کے گھروں اور دفاتر میں جاتے، اور دن بھر تمام حالات کا مشاہدہ کرنے کے بعد شام کو اپنے افسران مجازی کے یہاں رپورٹ پیش کرتے، کبھی کبھی افشاء راز ہوجانے کی وجہ سے خائن وزیروں کے ذریعہ ان مخبروں کی جانیں بھی خطرہ میں پڑ جاتیں، (ج ۲ ص ۸-۲۵۳)

تنوخی نے اپنی کتاب کی اس جلد میں ہندوستان سے متعلق بھی کچھ واقعات درج کئے ہیں، جن سے یہاں کے سیاسی اور سماجی حالات پر روشنی پڑتی ہے، ذات پات کے بارے میں لکھتے ہوئے یہ بتاتے ہیں، کہ لوگوں کو دوسری نسل کے لوگوں سے میل ملاپ کی اجازت نہ تھی، ہندوستانی ڈاکوؤں کی ایک قسم "بابوانیہ" کے بارے میں لکھا ہے کہ حکومت ان کی تلاش میں رہتی، یہ شکاری ہوتے، کوئی مسلم یا غیر ہندی تاجر مل جاتا تو یہ لوگ اسے گرفتار کرلیتے تاجر، ڈاکو کو پہچان کر بھی خاموش رہتا، کسی کو امداد کے لیے آواز نہ دیتا ورنہ قتل کردیا جاتا، دوسرے لوگ بھی، علم ہوجانے کے باوجود خاموشی کو ترجیح دیتے، کیونکہ وہ جانتے تھے، کہ ان کی مداخلت، تاجر کی ہلاکت کا سبب ہوگی[1]

تنوخی کی یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ غرس النعمہ نے اسی کے طرز پر کتاب الربیع کے نام سے اس کا ذیل (تتمہ) لکھا جس کا انھوں نے ۳۶۲ھ کے واقعات سے آغاز کیا ہے۔

---

[1] نشوار المحاضرہ۔ ج ۸ ص ۱۲۹۔

بابُ التقریظ والانتقاد

مطالعے اور جائزے مرتبہ راجندر ناتھ شیدا پر ایک نظر

از مولانا صلاح الدین ندوی ایم۔ اے الازہر یونیورسٹی

ناچیز ایک طالب علم ہے، اور ازہر یونیورسٹی کے شعبۂ ادب و نقد میں علامہ اقبال کی اسلامی شاعری پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھ رہا ہے، میرے پاس موضوع سے متعلق جو کتابیں زیر مطالعہ ہیں، ان میں سے ایک کتاب کا نام "مطالعے اور جائزے" ہے، جسے اردو کے ایک تنقید نگار راجیندر ناتھ شیدا نے لکھا ہے، اور جو مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی سے شائع کی گئی ہے، اس کتاب پہ بہت سے اہل فکر و نظر کی نظر پڑی ہوگی اور بہت سے اہل علم حضرات نے اس پر اپنے اپنے انداز و اسلوب میں اظہار خیال کیا ہوگا۔ اسی طرح میں نے بھی اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے، اور خاص طور سے اس کے ان مضامین پر جن کا تعلق علامہ اقبال کی شاعری سے ہے۔

فاضل ناقد راجیندر ناتھ شیدا نے اپنی کتاب "مطالعے اور جائزے" میں اقبال کی ذہنی الجھنوں اور ان کے عناصر ترکیبی کا بھی جائزہ لیا ہے، نیز اپنی پختہ تحریر سے جہاں علامہ اقبال کی شاعری اور ان کے علم و فن کی بہت سی ناقابل انکار حقیقتوں اور ادبی خوبیوں کو آشکارا کیا ہے وہاں انھوں نے نقد کرنے میں دانستہ یا نادانستہ، اپنے قلم کو اکثر مقامات پر بیجا طور پر بھی استعمال کیا ہے،

مثال کے طور پر فاضل ناقد شیدا نے جو یہ لکھا ہے کہ

"اقبال کے ناقدوں میں اسلام اور اس کی تعلیمات کو مترادف قرار دینے کا رواج عام ہے، جب کہ یہ واضح کرتا ہے کہ اسلام اور اقبال کی تعلیمات کو بالکل ایک سمجھنا حقیقت کو سرے سے بالکل نظر انداز کر دینے کے مترادف ہے، ایسا تاریخی ارتقا کے عام اصولوں کو نہ سمجھنے سے ہوتا ہے"[۱]

اس سلسلہ میں سب سے پہلے تو ہم یہ عرض کریں گے کہ اقبال اور اسلام دونوں کی تعلیمات کو مترادف قرار دینا اور بات ہے، مگر اقبال کو ایک اسلامی شاعر کی حیثیت دینا دیگر بات ہے، جس کے واضح فرق کو ہم آیندہ بیان کریں گے، بہرحال اگر فاضل ناقد کی مراد یہ ہے کہ اقبال اسلامی شاعر نہیں ہیں، اور ان کی باتوں اور اسلامی تعلیمات میں باہم تضاد ہے، تو اس مقام پر ہم فاضل ناقد سے یہ دریافت کریں گے کہ اکثریت اس بات پر کیوں متفق ہے کہ اقبال ایک اسلامی شاعر ہیں، وکیا اکثریت تاریخی ارتقا کے عام اصولوں سے ناواقف ہے۔
بعض علمائے کرام ایسے ہیں جنھیں اسلامیات پر اچھی خاصی دسترس حاصل ہے، اور انھوں نے عصر حاضر کی تاریخ کی روشنی میں اقبالیات کا بھی مطالعہ کیا ہے، مثال کے طور پر استاذ الاساتذہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی (دامت برکاتہم) نے یہ بات لکھی ہے کہ "اقبال وہ شاعر ہیں، جن سے اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کے مطابق بعض حکم و حقائق کہلوائے ہیں جو کسی دوسرے معاصر شاعر و مفکر کی زبان سے نہیں ادا ہوئے، میرا خیال ہے کہ پیغام محمدی کے بقائے دوام، امت مسلمہ کے استحکام اور اس کی قائدانہ صلاحیت، عصری نظریات، و فلسفہ کی بے مائیگی پر ان کے پختہ عقیدہ سے ان کی فکر میں وضاحت اور پختگی آئی اور ان کی خودی کی تعمیر ہوئی، اس معاملہ میں وہ خاص کر دینی علوم کے ان فضلا سے بھی آگے ہیں، جو مغربیت کی

---

[۱] "مطالعے اور جائزے" راجندر ناتھ شیدا ص ۳۶

حقیقت سے واقف نہیں اور اقبال کو اس کے حقیقی اغراض و مقاصد اور تاریخ سے گہری واقفیت ہے"۔ حضرت مولانا دامت برکاتہم نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ "انھیں میں نے اولو العزمی، محبت اور ایمان کا نوجوان شاعر پایا...... اور جب جب بھی ان کا کلام پڑھا دل جوش سے امنڈنے لگا اور لطیف جذبات نے انگڑائیاں لینا شروع کر دیں، احساسات و کیفیات کی لہریں بیدار ہونے لگیں اور رگوں میں شجاعت اسلامی کی رو دوڑنے لگی"۔[1] اور یہی نہیں بلکہ مولانا عبد السلام ندوی، مولانا عبد الماجد دریا بادی اور مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کی تحریریں بھی ظاہر کریں گی کہ علامہ اقبال کے کلام و فلسفہ کا اسلام کے بنیادی اصول و عقائد سے کوئی اختلاف نہیں بلکہ انکے کلام و پیام میں اسلام اور مسلمانوں کے روشن مستقبل کیلئے سچی تڑپ ملتی ہے جو دلوں پر اثر انداز ہوتی ہے جیسا کہ خود انہی کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے۔

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے   جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے[2]

فاضل ناقد کا یہ کہنا ہے کہ

"اس حقیقت کو کسی منطق سے جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ قرآن کی بہت سی تفسیریں موجود ہیں اور اسکی تعلیمات کی مختلف تعبیروں نے خود اسلام کو آج تک نہ جانے کتنے فرقے اور مکاتب پیدا کئے ہیں، ظاہر ہے کہ انمیں سے کوئی بھی اپنے نقطۂ نظر کو غلط نہیں سمجھتا تھا اور اکثر اوقات یہ اختلافات زندگی کے تصورات میں بعد المشرقین پیدا کر دیتے تھے۔ اختلافات کا یہ سلسلہ خود اقبال کے زمانہ تک جاری رہا، انھوں نے ایک ہم عصر عالم کے متعلق کہا تھا۔

عجم ہنوز نہ داند رموز دیں ورنہ   ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بو العجبی است
سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است   چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است[3]

ان اشعار کی روشنی میں فاضل ناقد کا یہ کہنا ہے کہ

ہمیں اسلامیات کا ماہر ہونے کا دعویٰ نہیں ہے لیکن انسانی امور سے عام دلچسپی رکھنے والے انسان کی حیثیت سے کچھ شکوک و شبہات ذہن میں پیدا ہوتے ہیں، کیا وجہ ہے کہ قرآن کے ان مستند مفسرین کو جنھوں نے اسلام، قرآن اور عربی کے ساتھ اپنی زندگیاں بسر کیں اور جن کا علم و عمل ہر کس و ناکس احترام کرتے چلے آئے ہیں، قرآن فہمی کی سعادت سے محروم قرار دیا جائے اور بیسویں صدی کے ایک ہندوستانی (اب پاکستانی) شاعر کا قرآن کی صحیح تعلیمات اور اسپرٹ تک پہنچنا تسلیم کر لیا جائے"۔

---

[1] نقوش اقبال / مولانا سید ابو الحسن ندوی ص [illegible]، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ ۱۹۷۳ء [2] بانگ درا [illegible] اردو مرتبہ مصنف [illegible] اقبال
[3] [illegible] ص [illegible] مطالعے اور جائزے / مصنف ناقد [illegible]

فاضل ناقد نے اپنی عبارت میں جن شکوک وشبہات کی طرف اشارہ کیا ہے انکا ازالہ بھی ضروری ہے، اور اس سلسلہ میں سب سے پہلے تو ہم یہ کہیں گے کہ یہ سچ ہے کہ ابتدائے اسلام سے لیکر ابتک قرآن مجید اور حدیث نبوی کے فہم و ادراک کے سلسلہ میں مختلف اسالیب میں فرعی خیالات سامنے آئے ہیں جن کی بناء پر قرآن مجید کی مختلف تفسیریں اور فقہ اسلامی کی مختلف کتابیں سامنے آئی ہیں، اور جن کے باعث مختلف اسلامی فرقے بھی معرض وجود میں آئے ہیں، مگر جتنے بھی اسلامی فرقے ہیں، اور جو اپنے آپ کو اسلامی فرقہ نہیں سمجھتے ہیں ان سب کا خدا ایک ہے! اس کا کوئی شریک نہیں، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کے رہبر اور خدا تعالےٰ کے پیغمبر ہیں، ان سب کے نزدیک قرآن مجید خدا کا کلام ہے، اور ان سب کا ایمان گزشتہ آسمانی کتابوں اور پیغمبروں پر ہے، نیز ان سب کا یہ اعتقاد ہے کہ انھیں مرنے کے بعد ایک روز دوبارہ زندہ کیا جائیگا اور اسی روز انکے بھلے اور برے اعمال کا حساب ہوگا، ان سبھی باتوں سے علامہ اقبال کے کلام کا کوئی تعارض نہیں، بلکہ علامہ اقبال بھی انہی سب باتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور انکا کلام ان ہی سب باتوں سے مزین اور آراستہ ہے۔

علامہ اقبال اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی دونوں صاحبان کا تعلق ایک ہی اسلامی مکتب فکر سے تھا، اور دونوں کے عقائد میں کوئی اختلاف نہ تھا، اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ اقبال نے ایسے چند اشعار کہے تھے، جو حضرت مولانا مدنیؒ کے شایان شان نہ تھے، مگر علامہ اقبال کی مراد یہ ہرگز نہ تھی کہ قرآن فہمی کے سلسلہ میں خود کو بلند و بالاتر ثابت کریں، دراصل مسئلہ وطنیت کا تھا، کیونکہ ۱۹۳۸ء کے آغاز میں حضرت مولانا حسین احمدؒ مدنی نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ "اس زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں"[1] اس متن کی تفصیل اترپردیش کے بعض اخبارات میں جس طرح سے شائع ہوئی تھی، اس سے علامہ اقبال نے یہ سمجھا کہ مولانا نے مسلمانوں کو جدید نظریۂ وطنیت اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے، اور ایسی صورت میں مذہب ثانوی حیثیت اختیار کر لیتا ہے، چنانچہ علامہ نے وہ چند اشعار لکھ دیئے، جو پسند نہیں کئے گئے

---

[1] "ہما" اقبال نمبر اکتوبر ۱۹۷۷ء ص ۱۵۹۔

لیکن اس کے بعد جب علامہ کو مولانا حسین احمد مدنی کے موقف کا صحیح علم ہوا، تو انھوں نے اس ضرر کی تلافی کر دی جو ان کے خط سے بعض قلوب کو پہنچ گیا تھا۔ ۲۸ مارچ ۱۹۳۸ء کو علامہ اقبال نے لکھا کہ "مولانا اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ انھوں نے مسلمانانِ ہند کو جدید نظریۂ وطنیت اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے، لہٰذا میں اس بات کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھ کو مولانا کے اعتراف کے بعد کسی قسم کا کوئی حق ان پر اعتراض کرنے کا نہیں رہتا۔ میں مولانا کے عقیدت مندوں کے جوشِ عقیدت کی قدر کرتا ہوں جنھوں نے ایک دینی امر کی توضیح کے سلسلے میں پرائیویٹ خطوط اور پبلک تحریروں میں مجھے متوجہ کیا۔ خدائے تعالیٰ ان کو مولانا کی صحبت سے زیادہ مستفید کرے۔ میں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ مولانا کی حمیتِ دینی کے احترام میں ان کے کسی عقیدت مند سے پیچھے نہیں ہوں۔"[1]

اس وضاحت کے بعد اب یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ علامہ اقبال اور حضرت مولانا مدنی دونوں ہی مسلمانوں کی فلاح و بہبود صدقِ دل سے چاہتے تھے، اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ کے اس خط کے بعد جدل و تکرار کی کوئی وجہ باقی نہیں رہ جاتی، مگر ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ علامہ اقبال کے انہی چند اشعار سے بعض لوگوں کو اچھا خاصا بہانہ مل گیا کہ ایک ہی مکتبِ فکر کے مسلمانوں میں تفرقہ اندازی کی ناخوشگوار فضا پیدا کی جائے۔

یہ کتنی حیرت کی بات ہے کہ فاضل ناقد اپنی کتاب میں ایک طرف تو اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہمیں اسلامیات کے ماہر ہونے کا دعویٰ نہیں ہے، اور دوسری طرف یہ اشارہ کرتے ہیں کہ علامہ اقبال فقہ کے اکثر مسائل کو اچھی طرح سمجھ نہیں پاتے تھے۔ اور اپنی اس بات کو ثابت کرنے کے لیے شہادت کے طور پر ناقد نے اپنی کتاب "مطالعے اور جائزے" میں علامہ

---

[1] روزنامہ احسان / ۲۸ مارچ ۱۹۳۸ء۔

اقبال کے ان دو خطوط کے اقتباسات پیش کئے ہیں، جو شیخ عطاء اللہ کے مرتبہ اقبال نامہ مجموعۂ مکاتیب اقبال سے ماخوذ ہیں، ایک خط میں علامہ نے مولانا سید سلیمان ندوی کی خدمت میں یہ لکھا ہے کہ

"اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہ اسلامی کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے، اگر مولانا شبلی زندہ ہوتے تو میں ان سے ایک ایسی کتاب لکھنے کی درخواست کرتا، موجودہ صورت میں اس کام کو آپ کے سوا کون کرے گا، میں نے ایک رسالہ اجتہاد پر لکھا تھا، مگر چونکہ میرا دل بعض امور کے متعلق خود مطمئن نہیں اس واسطے اسکو ابتک شائع نہیں کیا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے آپ سے بھی کئی امور کے متعلق استفسار کیا تھا۔"

دوسرے خط میں مذکورۂ بالا استفسار کی طرف ہی غالباً ارشادہ کیا گیا ہے۔

"آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ فقہاء نے اجماع سے نص کی تخصیص جائز سمجھی ہے ایسی تخصیص یا تعمیم کی مثال اگر کوئی ہو تو اس سے آگاہ فرمائیے۔

اس کے علاوہ یہ بھی معلوم کرنا ضروری ہے کہ ایسی تخصیص یا تعمیم صرف اجماع صحابہ ہی کر سکتا ہے، یا علماء و مجتہدین امت بھی کر سکتے ہیں، اگر مسلمانوں کی تاریخ میں صحابہ کے بعد کوئی مثال ہو تو اس سے بھی آگاہ فرمائیے یعنی یہ کہ کس مسئلے میں صحابہ یا علمائے امت نے نص کے حکم کی تخصیص یا تعمیم کر دی، میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ تخصیص یا تعمیم حکم سے آپ کی کیا مراد ہے۔

دیگر آپ کا ارشاد ہے کہ اگر صحابہ کا کوئی حکم نص کے خلاف ہو تو اس کو اس بات پر محمول کیا جائے گا کہ کوئی ناسخ حکم ان کے علم میں ہوگا، جو ہم تک نہ پہنچا۔

نہیں پہونچا، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کوئی حکم ایسا بھی ہے، جو صحابہ نے نص قرآنی کے خلاف نافذ کیا ہو اور وہ کون سا حکم ہے۔"[1]

یہ اقتباسات اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ علامہ اقبال ان فقہی مسائل کے سمجھنے میں حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی طرف رجوع کرتے تھے، جن کے بارے میں انھیں خود اطمینان نہیں ہوتا تھا، ساتھ ہی ساتھ مندرجۂ بالا اقتباسات سے اس کی بھی وضاحت ہوتی ہے کہ علامہ اقبال نے ایک رسالہ اجتہاد پر لکھا تھا جس کا لکھنا کوئی آسان یا معمولی کام نہ تھا اور جو اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ علامہ قانون داں تھے اور اسلامی قانون و فقہ سے بھی انھیں غیر معمولی الفت اور دلچسپی تھی، اور اپنی اسی دلچسپی کی وجہ سے انھوں نے ایک رسالہ اجتہاد پر لکھا تھا، مگر چونکہ ان کا دل بعض امور کے متعلق خود مطمئن نہیں تھا، اس لئے انھوں نے اسے شائع نہیں کیا۔

اب یہاں پر یہ عرض کرنا ہے کہ فاضل ناقد نے یہ کہکر کہ "علامہ اکثر فقہی مسائل کو خود مولانا سید سلیمان ندوی سے سمجھنے کی کوشش کیا کرتے تھے" جو اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش ہے کہ علامہ قرآن اور فقہ اسلامی کے مسائل کو اچھی طرح سمجھ نہیں پاتے تھے، اس سے یہ بات ہرگز نہیں ثابت ہوتی، بلکہ یہ اقتباسات اس بات کی دلیل ہیں کہ علامہ اقبال نے قرآن مجید اور فقہ اسلامی کے مسائل کو سمجھنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے، اور اس سلسلہ میں انھوں نے بے حد احتیاط سے کام لیا ہے، نیز ان اقتباسات کی روشنی میں اچھی طرح کہا جا سکتا ہے کہ یہ اقتباسات اس بات کا کھلا اعتراف ہیں کہ اقبال نے اپنے ہم عصر علماء میں سے جن باکمال شخصیتوں کو اسلامی مسائل کا اہل اور کامل سمجھا ان کی طرف رجوع کرنے میں پہلو تہی نہیں کی، یہ ان کی عظمت کی دلیل ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو اقبال نامہ (مجموعہ مکاتیب اقبال) مرتبہ شیخ عطاء اللہ۔ [2] مطالعے اور جائزے صفحہ ۳۶ از ۔ راجیندر ناتھ شیدا۔

ہاں البتہ اگر ناقد یہ کہتے کہ اقبال کو ان کے ہم عصر علماء دین کی صف میں نہیں رکھا جا سکتا تو اس کو تسلیم کرنے میں کسی کو عذر نہ ہوگا۔ لیکن اقبال کو عالم دین یا مفسر قرآن ماننے کی تو بات ہی دیگر ہے۔ یہاں در اصل بات یہ ہے کہ اقبال کے اندر اسلامی مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت تھی یا نہیں، بظاہر عدم صلاحیت کا اعتراف مشکل ہے، کیونکہ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اقبال کس حد تک اسلامی مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور کہاں تک اس میں کامیاب یا ناکام رہے ہیں ظاہر ہے کہ ان کے کلام و پیام اور ان کے خطبات و مکتوبات سے ہرگز چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ ویسے علامہ اقبال نے لادینی سیاست پر اظہار خیال کرتے ہوئے خود اپنے بارے میں یہ بتایا ہے کہ

جو بات حق ہو وہ مجھ سے چھپی نہیں رہتی۔

خدا نے مجھ کو دیا ہے دل خبیر و بصیر

ناقد نے اپنے تنقیدی جائزے میں فارسی اور عربی کی چند تعبیرات و اصطلاحات جمع کرنے کی کوشش کی ہے، مگر ایسا کرنے سے یا مشہور و معروف اسلامی فرقوں اور قرآن مجید کی بعض تفاسیر کی طرف اشارہ کرنے سے ہرگز یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ ناقد اسلام یا اسرار و رموز شریعت سے واقف ہیں، جب کہ علامہ اقبال کی شاعری پر نقد کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ناقد اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ ہو، اور اس کے اصول و عقائد سے آشنا ہو جائے کیونکہ اقبال ایک اسلامی شاعر ہیں، اور ان کی شاعری کا مصدر و مرجع قرآن اور سنت ہی جو دین اسلام کی بنیاد ہے، جیسا کہ خود اقبال گویا ہیں ؎

ازاں فوجے کہ از قرآن گرفتم ۔۔۔ سحر کردم صد و سی سالہ شب را[1]

علامہ اقبال کی شاعری پر نقد کرنے کے لیے کم از کم ان باتوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے،

---

[1] ارمغان حجاز / کلیات ص ۹۶۳۔

۱۔ علامہ اقبال نے جتنی باتیں کہی ہیں، وہ نثر ہو یا نظم، کیا ان کی وہ سبھی باتیں قرآن و حدیث سے مطابقت رکھتی ہیں، یا ان میں بعض باتیں ایسی ہیں جو واقعی قرآن و حدیث کی روشنی میں کہی گئی ہیں، اور بعض دیگر ایسی ہیں، جو قرآن و حدیث کی تفسیر یا تشریح تو نہیں کہی جا سکتیں، لیکن وہ باتیں بھی قرآن و حدیث یعنی اسلام کے بنیادی اصولوں سے کسی طرح بھی خارج نہیں کی جا سکتیں۔

۲۔ نقد کرنے کے لیے ہمیں اقبال کے ان جملہ اشعار کو بخوبی سمجھنا ہوگا، جن میں قرآنی آیات، واقعات، احادیث نبویہ اور سلف صالحین کے زریں اقوال کو انھوں نے اپنے خوبصورت انداز بیان اور اسلوب میں استعمال کیا ہے، اس کے بعد ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اقبال نے اپنے اشعار میں ان کے استعمال کا حسن و خوبی حق ادا کیا ہے یا نہیں، پھر ہمیں ان آیات و واقعات اور احادیث و اقوال کی تحقیق و تشریح کرنی ہوگی، جن کی طرف علامہ اقبال نے اپنے اشعار میں اشارہ کیا ہے، ان کی تحقیق و تفسیر و تشریح کے بعد کا جو مرحلہ ہے وہ یہ ہے کہ اشعار کا تسلسل کیا ہے، اقبال نے ان کا استعمال کس مناسبت سے کیا ہے، کہاں پر شاعر نے تنقید کی ہے، اور کہاں کیا طنز مضمر ہے، اور اس طرح گذشتہ سے پیوستہ اشعار کے معانی و مفہوم کیا نکلتے ہیں، خاص طور سے کسی بھی شاعر کے کسی بھی قصیدہ کے کسی بھی شعر پر تنقید کرنے میں ماقبل و مابعد کے روابط کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اور جب یہ سبھی باتیں ناقد کے سامنے ہوں گی تو شاعر کی مراد واضح شکل کر سامنے آجائے گی، اب اس آخری مرحلہ میں ناقد کو یہ فیصلہ کرنے کا اختیار ہوگا کہ شاعر کا کلام و پیام قرآن و حدیث کی آیات و نصوص کے معانی سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں۔

مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناقد نے علامہ اقبال کی اسلامی شاعری پر نقد کرتے وقت مذکورہ بالا باتوں کو مدنظر نہیں رکھا ہے، یا اسلامیات سے ہم آہنگی نہ ہونے کے باعث ان سب باتوں کی اہمیت و ضرورت کو قطعی طور پر نظر انداز کرتے ہوئے بالکل سطحی پیمانہ پر نقد کیا ہے۔

مقالے اور جائزے" کے بغور مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناقد نے اقبال کی شاعری کا ہر پہلو اور ہر جہت سے مطالعہ نہیں کیا ہے، اور نہ ہی اپنے جائزے کا کوئی خاص منہج متعین کیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کتاب پڑھنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ اقبال کی شاعری اور فلسفہ کی بعض خاص اصطلاحات بھی ناقد کے پلے نہیں پڑی ہیں۔ ناقد کو چشم باطن، وجدان اور عشقیہ بصیرت جیسی اصطلاحات کی حقیقت و ماہیت کا بھی علم نہیں ہے، اور شاید اسی بناء پر ناقد نے انکاری پہلو اختیار کرتے ہوئے اس موضوع پر تفصیلی بحث کرنے سے گریز کیا ہے جیسا کہ ناقد خود اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ

"اقبال کی رائے میں عقل کے ذریعہ سے مادی موجودات کے حقائق تو بے نقاب کیے جا سکتے ہیں، لیکن بلند تر یا روحانی حقیقتوں کو سمجھنے کے لیے عشق کی ضرورت پڑتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ وہ اس خیال کو تو بار بار دہراتے ہیں، لیکن ایسے روحانی حقائق کی تفصیلات بیان نہیں کرتے اس لئے اس موضوع پر تفصیلی بحث نہیں ہو سکتی۔"[1]

مندرجۂ بالا عبارت میں جو یہ افسوس ظاہر کیا گیا ہے کہ اقبال وجدان یا عشقیہ بصیرت جیسے کلمات کو تو بار بار دہراتے ہیں لیکن ایسے روحانی حقائق کی تفصیلات بیان نہیں کرتے تو اس کے جواب میں ہم صرف یہ عرض کریں گے کہ کسی بھی فلسفہ کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے ہمیں اس کی بنیادی اصطلاحات کو جاننا ہوگا، اگر وہ اصطلاحات ہی کسی کے فہم و ادراک سے بالاتر ہوں تو وہ یہ کہنے پر معذور سمجھا جائے گا کہ اقبال نے اپنے فلسفہ میں وجدان یا عشقیہ بصیرت جیسے کلمات کی روحانی حقیقتوں کی وضاحت نہیں کی ہے۔ جب کہ حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے، کیونکہ اقبال کی زندگی میں ہی انھیں علامہ اور ترجمان حقیقت کے[2] لقب سے یاد کیا جاتا تھا، اور

---

[1] "مقالے اور جائزے" ص ۶۹ [2] بانگ درا (دیباچہ) از شیخ عبدالقادر سابق مدیر مخزن ص (س)

دوسری دلیل یہ ہے کہ کسی بھی لفظ کی ایجاد بے ضرورت بے معنی نہیں ہوتی، اور پھر اگر اقبال کے کلام میں وجدان، چشم باطن اور عشق یہ بصیرت جیسی اہم اور بیش قیمت اصطلاحات کی وضاحت نہ ہوتی تو ان کے کلام و فلسفہ کے بعض اجزاء بے معنی اور مہمل قرار دیدیئے جاتے مگر کوئی شخص تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں اور شاید وہ شخص بھی جسے وجدان یا عشق یہ بصیرت جیسی اصطلاحات کی جداگانہ حیثیت و حقیقت سے قطعی انکار ہے[1]، اس بات کو تسلیم نہ کرے کہ اقبال کا فلسفہ معنی و مفہوم سے عاری تھا یا ہے۔

ناقد نے علامہ اقبال کی ذہنی الجھنوں اور ان کے اسباب کا جائزہ لینے کی کوشش تو کی ہے۔ اور کسی حد تک کامیاب بھی رہے ہیں، مگر ان الجھنوں کو سلجھانے کے لیے اقبال جس فکر و فلسفہ کے داعی تھے، اس کے تجزیہ میں ناقد نے انصاف سے کام نہیں لیا ہے، بلکہ ان کی فکر و نظر کو بہت سے مقامات پر ناقد نے معنی کا جو جامہ پہنایا ہے، وہ ان کی مراد کے بالکل برعکس ہے، اور بصد افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے، کہ ناقد نے نقد کرنے میں صرف سلبی ہی پہلو کو اختیار کیا ہے اور انھیں اقبال کے افکار و نظریات میں تعمیری اور ایجابی پہلو بہت کم نظر آئے ہیں، یا انھوں نے قصداً انھیں نظر انداز کر دیا ہے۔ اگر انھوں نے ایسا کیا ہے، تو یہ نقد کے میزان میں علمی دیانت داری کے خلاف ہے، اور ناقد نے جو سلبی پہلو اختیار کیا ہے، اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ مارکسی افکار و نظریات کے دلدادہ ہیں، جیسا کہ ناقد خود کہتے ہیں، کہ "مارکس نے جو مذہب کو عوام کے حق میں افیون کہا تھا وہ کسی فلسفی شاعر کا نادر تخیل نہیں تھا، بلکہ ترقی پذیر انسانیت کے اعلیٰ شکن شعور کی پکار تھی"۔

---

[1] مطالعہ اور جائزہ ص ۲۰۔ نیز ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں" کا ص ۴۰ بھی ملاحظہ ہو جو مکتبہ جامعہ لمیٹڈ سے ۱۹۶۵ء میں پہلی بار شائع ہوئی تھی / کتاب کے مصنف کا نام ہے سید عابد حسین۔

یہ بات قابل غور ہے کہ جب ناقد اس کی نظریات کو اس شکل میں سمجھتے ہیں
کہ ایک باطل فلسفہ اور انسانیت کے لیے مہلک زہر قرار دیتے ہیں تو بھلا کمیونسٹ ناقد
سے کہاں اس بات کی توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ کسی اسلامی شاعر یا اسلام یا دیگر آسمانی کتاب
کے فضائل بیان کرنے میں انصاف سے کام لے گا، جو خود ان کے اسرار و رموز سے واقف نہیں۔

ہاں مگر ناقد کو اتنا تو اعتراف کرنا ہی تھا کہ

"آج تک جن شاعروں نے زندگی اور اس کے مسائل کے متعلق سنجیدگی سے
غور کر کے قوم کے سامنے کوئی فلسفۂ حیات پیش کیا ہے، ان میں اقبال کا نام ہمیشہ
سرِ فہرست رہے گا..... اور اقبال کے نظامِ فکر میں جو گہرائی اور ربط ہے وہ کسی
سنجیدہ پڑھنے والے کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا" کیونکہ علامہ اقبال کی تنقیص کرنے
والے عناصر بھی اس بات کو خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اقبال کی فکر و نظر اور ان کے
فلسفہ کی گرفت تعلیم یافتہ طبقے کے ذہن و دماغ پر بہت مضبوط ہے، اور ان کی
فکر قبولِ عام کی سند حاصل کر چکی ہے۔[1]

فاضل ناقد کی یہ بات قابلِ قدر ہے کہ "اقبال کی تصنیفات میں جو چیز بادی النظر میں تضاد
محسوس ہوتی ہے اس کے متعلق یہ سمجھنا کہ وہ کسی ایسے شخص کی خامی ذہن کا نتیجہ ہے، جو کافی غور
نہ کرنے کی وجہ سے اصولِ حیات کے متعلق کسی خاص نتیجہ پر نہیں پہونچ سکا، زیادتی ہوگی کم از کم
ہم ایسے لوگوں سے متفق نہیں۔"[2]

اس مقام پر ناقد نے بے حد احتیاط اور انصاف سے کام لیا ہے، لیکن ناقد کا اقبال کی
فکر و نظر کو اس لئے محدود سمجھنا کہ وہ آفاقیت اور دہریت کی دعوت نہیں دیتی بلکہ خدا اور

---

[1] شخصیات از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مکتبہ ذکری رام پور ۱۹۹۷ء بحوالہ مطالعہ اور جائزے ص ۱۴۴-۱۴۵

اس کے رسولوں کا اعتراف کرتی ہے[۱]، غلط ہے۔

اسی طرح ناقد کا یہ کہنا بھی قطعاً درست نہیں کہ علامہ اقبال نے اپنی ذہنی صلاحیتوں کو مسلمان نوجوانوں میں الحاد کے بڑھتے ہوئے طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے مذہب کے فرسودہ عقائد کے حق میں ترجیحی فضا پیدا کرنے میں صرف کر دیا تھا جس کی وجہ سے ان کے کلام کی افادیت میں نمایاں کمی واقع ہو گئی۔[۲]

ناقد کے اس قول کو ہم اس لئے درست نہیں سمجھتے کہ جن مذہبی عقائد کو ناقد نے فرسودہ کہا ہے، انکو اقبال نے فرسودہ نہیں سمجھا اور یہ حقیقت ہے کہ اسلامی عقائد کبھی بھی فرسودہ نہیں، ہو سکتے کیونکہ اسلام ایک ابدی اور سماوی دین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ہمہ گیر و عالمگیر مذہب ہے، اس کو ہندوستان یا دنیا کے دیگر مذاہب یا افکار و نظریات پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، اور اس کو کسی خاص جگہ یا خاص زمانہ یا کسی خاص معاشرہ میں محدود کیا جا سکتا کیونکہ اسلام ایسی امتیازی شان اور خصوصیات رکھتا ہے، کہ وہ خود زمان و مکان یا کسی خاص معاشرہ میں مقید نہیں رہ سکتا اور یہی سبب ہے کہ اسلام صرف مکہ مدینہ اور اس کے آس پاس کے عرب قبیلوں میں ہی محدود نہیں رہا، بلکہ ہفت اقلیم پر چھا گیا، اور آج بھی یورپ کی عیسائی تنظیمیں انگشت بدنداں ہیں، کہ عصر حاضر میں اسلام کو اتنی تیزی کیساتھ مقبولیت کیوں حاصل ہوتی جا رہی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اقبال کے کلام کی افادیت پہلے بھی تھی، اور آج بھی ہے، اس کی افادیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، بلکہ روز بروز اس میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے آج ان کے کلام کی افادیت، شہرت اور مقبولیت پہلے سے کہیں زیادہ ہے، . . . . . .

[۱، ۲] "مطالعے اور جائزے"، ص ۲۲-۲۱

. . . . "آج اقبال کی فکر و نظر کے ترجمے

دنیا کی مختلف زندہ زبانوں میں کیے جا چکے ہیں، اور کیے جا رہے ہیں، ان کے کلام کی افادیت و مقبولیت آج صرف ہندوستان اور پاکستان کے ادبی و علمی حلقوں میں اردو زبانوں میں ہی محدود نہیں رہی بلکہ تمام عالم اسلامی اور عالم عربی اقبال کا گیت گاتا ہے، اور یہی نہیں بلکہ انکی فکر و نظر کا قائل اور مداح ہے، اور یہ محسوس کرتا ہے کہ اقبال کا آفاقی نغمہ اب بھی فضاؤں میں گونج رہا ہے، اور مسلمانوں کو دعوتِ فکر و عمل دے رہا ہے ؎

ناموسِ ازل را تو امینی تو امینی	دارائے جہاں را تو یساری تو یمینی
اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی	صہبائے یقین درکش و از دیر گماں خیز

از خوابِ گراں خوابِ گراں خوابِ گراں خیز (از خوابِ گراں خیز)

فریاد ز افرنگ و دلآویزئ افرنگ	فریاد ز شیرینی و پرویزی افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزئ افرنگ	معمارِ حرم! باز بہ تعمیرِ جہاں خیز

از خوابِ گراں خوابِ گراں خوابِ گراں خیز (از خوابِ گراں خیز)

اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ اقبال کا خاص مضمون فلسفہ رہا، لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ وہ ایک آزاد فکر انسان نہ تھے، دراصل بعض لوگوں نے آزادیِ فکر کو کفر و الحاد اور دہریت کا مترادف قرار دیا ہے جو قطعاً درست نہیں، ان باتوں کا مقصد دراصل ناقد کی اس بات کا جواب دینا ہے کہ "اگرچہ اعلیٰ تعلیم کے زمانے میں اقبال کا خاص مضمون فلسفہ رہا، جس کے اثر سے انھیں آزاد فکر انسان ہونا چاہئے تھا، لیکن عام مذہبی ماحول . . . . ان کے ذہن پر ایسا گہرا اثر چھوڑ چکے تھے کہ آئندہ ان کی فکر ہمیشہ کے لئے مذہب و ملت کی چار دیواری میں بند ہو کر رہ گئی۔

لے مطالعہ اور جائزے ص ۸۰۔

ایسی آزادی فکر جو انسان کو صراط مستقیم سے ہٹا کر ضلالت وگمراہی کے نشیب و فراز
بھٹکتا اور سسکتا ہوا چھوڑ دے۔ اس طرز فکر سے علامہ اقبال کی دنیائے مذہب و ملت کے
عدد ضوابط (ارکان اربعہ) ہزار ہا درجے بہتر ہیں جنھوں نے موجودہ عالم کو اپنی باہوں میں
سمیٹ رکھا ہے، کیونکہ ان میں اسلام کے زیر سایہ انسانیت کو مکمل اطمینان و سکون مل جاتا ہے
، یہ تو قابل تعریف بات ہے کہ علامہ اقبال نے یورپ میں تعلیم حاصل کی اور اپنے نظریات کے
سلسلہ میں مشرق و مغرب کے فلسفے کا بغور مطالعہ کیا اور ایشیا و یورپ کے فلاسفہ سے استفادہ
، تاہم ان کے اسلامی نظریات میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی بلکہ انھوں نے مرد آہن بن کر مغربیت
ر مغربی تہذیب پر ضرب کاری لگائی، اور اپنے کلام و پیام سے مشرق میں مغربی تہذیب و تمدن
، دلدادہ اور تجدد پسند عناصر کے باطل اوہام کی مکمل بیخ کنی کی۔

اگر ناقد کی نظر اس اسلامی طرز فکر پر ہوتی کہ الارض للہ کا اشارہ کس طرف ہے، اور علامہ
اقبال نے اپنے کلام و پیام میں الارض للہ کی جو دعوت دی ہے اس کا کیا مطلب ہے تو ناقد
علامہ اقبال کی اسلامی شاعری کی آفاقیت کا قائل ہو جاتا، اور پھر اقبال کی فکر و نظر کو ہرگز
ہرگز محدود نہیں قرار دیتا کیونکہ الارض للہ کی دعوت آفاقیت کو ثابت کرتی ہے، اور اسی لئے
اقبال نے کہا ہے کہ ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست[۱]، مگر وہ شخص جس کا کوئی خاص
مسلک نہ ہو اسے زندگی کی شاہراہ پر کوئی خضر راہ نہ مل سکا ہو، وہ کبھی ادھر اور کبھی ادھر بھٹکتا پھرتا ہو
اور اپنی مشکلات اور الجھنوں کا حل دہریت اور مارکسیت میں تلاش کرتا ہو تو وہ نہ تو الارض للہ کی

---

[۱] طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت | گفتند کار تو بہ نگاہ خرد خطاست
دوریم از سواد وطن باز چوں رسیم | ترک سبب ز روئے شریعت کجا رواست
خندید و دست خویش بہ شمشیر برد و گفت | ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

آفاقیت کا رمز سمجھ سکتا اور نہ ہی علامہ اقبال کی فکر بلند کا صحیح اندازہ کر سکتا، انجام کار ایسا شخص خود عاجز آکر یہی کہے گا کہ اقبال کی فکر محدود ہے، جب کہ حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے۔ اقبال کی دنیا اسلام ہے اور وہ اپنی اس وسیع دنیا میں ایک آزاد فکر انسان ہے۔ اس کی آزادی فکر اور بلند پروازی تخیل کا کج روی سے دور کا بھی کوئی رشتہ نہیں۔ ؎

میں کہاں رکتا ہوں عرش و فرش کی آواز سے　　مجھ کو جانا ہے بہت اونچا حد پرواز سے

اسی طرح فاضل ناقد کی اس بات سے بھی ہمیں اتفاق نہیں کہ

"انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں عقلیت کے بڑھتے ہوئے احساس نے ہندوستان کے ابھرتے ہوئے درمیانی طبقے پر گہرا اثر ڈالا، عقائد اوہام بن کر عقلیت کے آب رواں کی سطح پر خس و خاشاک کی مانند بہتے نظر آئے، عقلیت کے یہ نقوش درمیانی طبقہ پر ہی نہیں بلکہ خود اس دور کے مذہبی مصلحین کے ذہنوں پر نمایاں ہیں، اب مذاہب کو زندہ رکھنے کے لئے ایمان کی تلقین سے کام چلنا مشکل تھا ضرورت تھی تو ان کے اصولوں کی عقلی توجیہہ کی، چنانچہ مصلحین وقت مثلاً سر سید اور رشی دیانند نے اپنے مذاہب میں بدیہی طور پر خلاف عقل باتوں کو خلاف دین قرار دیکر باقی ایسے اصولوں کو جن کی ان کی نظر میں توجیہہ ممکن تھی مذاہب کی حقیقت بتایا۔"[1]

اس سلسلہ میں سب سے پہلے تو ہم یہ کہیں گے کہ اسلام کے عقائد آج بھی ان ہی اصولوں پر مبنی ہیں، جن پر پہلے تھے، ابتدائے اسلام سے لیکر آج تک ان میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی اور نہ ہی تا قیامت ان میں تبدیلی یا اوہام پرستی کا کوئی دخل ہوگا۔ اسلامی تاریخ کے کسی بھی مرحلہ میں آپ کو اس کی مثال نہیں مل سکتی کہ کوئی شخص خدا کا انکار کر کے خود کو مسلمان

---

[1] مطالعے اور جائزے

کہتا ہو، ہاں یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص ملحد یا دہریت پسند ہو جائے، دوسری طرف اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ زندگی کی ان بڑھتی ہوئی ضروریات کو جن کا عقائد سے کوئی تعارض نہیں، مذہب کے اصول و ضوابط کے مطابق اپنا لینے سے ہرگز یہ بات ثابت نہیں ہوسکتی کہ مذہبی عقائد عقلیت کے سامنے ماند ہو گئے، اور اوہام بنکر رہ گئے، کیونکہ جو لوگ بھی ادیانِ سماویہ پر یقین رکھتے ہیں وہ بھی اس بات پر متفق ہیں کہ خدا تعالیٰ نے ہی بشریت کو عقل بخشی ہے، اور وہی خالق کل ہے جس نے عقل انسانی کو غور وفکر کی اجازت دی ہے، اور غور وفکر کے نتیجے میں ضروریاتِ زندگی کے مطابق جو انسانی یا عقلی ایجادات سامنے آئی ہیں، ان سے مستفید ہونے یا انھیں مذہب میں شامل کر لینے سے عقائد پر کوئی حرف نہیں آتا، ہاں البتہ یہ اسوقت ہوتا جب بہت سے عقل کے اندھے دہریت پسندوں کی طرح عقل انسانی کو ہی خالقِ کل سمجھ لیا جاتا اور خالق و مخلوق میں کوئی فرق نہ رہ جاتا نیز عقل انسانی سے متاثر ہو کر ان عقائد کا انکار کر دیا جاتا جو آسمانی ادیان کی بنیاد سمجھے جاتے ہیں، مگر یہ ہو نہ سکا۔

اپنی بات کو مضبوط بنانے کے لیے ناقد نے سرسید احمد خان اور رشی دیانند کی مذہب میں عقلی توجیہات وتاویلات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جہاں تک رشی دیانند کی بات ہے، تو ہم انھیں بالقصد نظر انداز کرتے ہیں، کیونکہ انکا آسمانی ادیان سے کوئی تعلق نہیں، اس سے قطع نظر کہ وہ سرسید کے ہم پلہ ہیں یا نہیں مگر ہاں جہاں تک سرسید جیسے دیگر مصلحین کا مسئلہ ہے تو یہ ایک استثنائی بات ہے، اگر کوئی شخص راہ حق کی تلاش وجستجو میں ادھر ادھر بھٹک رہا ہو اور منزل تک پہونچنے کے لیے صرف اپنی ہی عقل کو راہِ حق کا منار و معیار سمجھتا ہو، اور اتفاق سے کسی غلط راستہ پر جا پڑا ہو تو اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں اور اس کا ذمہ دار وہ خود کہلائیگا کیونکہ قرآن مجید کی بہت سی آیاتِ مبارکہ کا مطلب خود قرآنی آیات ہی بتا دیتی ہیں اور

قرآنی آیات سے اگر دیگر آیات کے معانی کی وضاحت نہیں ہوتی تو بشریت کے عظیم رہنما حضرت محمدؐ (علیہ افضل الصلوات والسلام) جنھیں خدا تعالیٰ نے قرآن مجید سکھایا ہے، اور جنھوں نے کلام الٰہی کو بحفاظت تمام امت تک پہونچا دیا ہے، ان کی تعلیمات کی طرف رجوع کیا جاتا ہے یعنی قرآن پاک کی آیات کو احادیث نبویہؐ کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے، اور پھر تفسیر لکھنا ایک مکمل شعبۂ علم و فن ہے، ہر کس و ناکس کا کام نہیں مگر بہت سے لوگ اپنی ہی عقل کو ہر جگہ، ہر میدان میں استعمال کرتے ہیں اور وہ یہ تصور کرتے ہیں کہ وہ برحق ہیں، چاہے حقیقت اس کے برعکس ہی کیوں نہ ہو تو بھلا ایسے شخص سے کیا امید رکھی جاسکتی ہے کہ وہ راہ حق تک پہونچ جائے گا، اس میں کوئی شخص دو رائے نہیں رکھتا کہ سرسید احمد خان نے ملک و ملت کی خاطر کیا کچھ نہیں کیا، انھوں نے بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں لیکن شعبۂ تفسیر میں ان کی تفسیر کا جو مقام ہے، اس کا صحیح تجزیہ کوئی مفسر قرآن یا عالم دین ہی کرسکتا ہے، اور یہ بتاسکتا ہے کہ دینی حلقے میں اس تفسیر کی کیا حیثیت اور کیا قدر و قیمت ہے نہ کہ ایک ایسا ادیب جو مارکسی نظریات سے متاثر ہوکر مختلف متضاد نظریات کے جاننے اور سمجھنے کی کوشش میں اپنے آپ کو الجھتا اور بھٹکتا ہوا محسوس کرتا ہو۔

اور اب اخیر میں ایک عمومی جائزہ لیتے ہوئے ہم یہ بھی واضح کردینا مناسب سمجھتے ہیں کہ "مطالعے اور جائزے" پر ایک عام نظر ڈالنے کے بعد کوئی بھی شخص یہ اندازہ لگا سکتا ہے، کہ ناقد نے علامہ اقبال کی شاعری پر تنقید نہیں کی ہے، بلکہ اس طبقہ کے مذہب کی تنقیص کی ہے، جس طبقہ میں علامہ اقبال مقبول سمجھے جاتے ہیں، نیز "مطالعے اور جائزے" میں مذہب کو باطل اور وہم ثابت کرنے میں ناقد نے ایڑی چوٹی کا زور صرف کردیا ہے جب کہ فاضل ناقد کو چاہئے تھا، کہ کسی مذہب پر قلم چلانے سے پہلے مذہبی امور سے متعلقہ معلومات فراہم کرلیتا، پھر مذہب پر بالواسطہ یا بلا واسطہ حملہ کرتا، اس کے بعد کسی ایسے شاعر کو مشق ستم بناتا جس کے کلام و پیام اور فلسفہ کی واضح حقیقت و مقبولیت اور اس کے دوام پر ناقد کی تحریر جیسی ہزار ہا، تحریروں سے کوئی آنچ نہیں آتی۔

مکتوب بھوپال

بھوپال ۱۳ ربیع الآخر ۱۴۰۵ھ، ۶ جنوری ۱۹۸۵ء

مکرم بندہ! وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ

آپکا مرسلہ خط بہت تاخیر سے ملا، ڈاک کا انتظام یہاں ابتر ہے، اس لیے جواب میں تاخیر ہوئی،

۲۔۳ دسمبر ۱۹۸۴ء کی رات کو یہاں قیامت گذر گئی، شدید سردی کی رات میں ۲ بجے علم ہوا کہ یونین کاربائڈ کے کارخانہ سے گیس لیک ہوکر شہر والوں کو ہلاک کر رہی ہے، اسلیے فوراً گھروں کو چھوڑ کر جنگل کی طرف بھاگو، ۸ لاکھ آبادی کے شہری گھروں کو کھلا چھوڑ کر بلا کچھ اوڑھے پہنے سڑکوں پر بھاگ رہے تھے، کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا، يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ کا منظر تھا، ماں باپ اپنے بچوں کو کندھے پر اٹھائے، بغل میں دبائے، انگلی پکڑے بے تحاشہ بھاگ رہے تھے، جو بچے اپنے بھاگنے والے ماں باپ کا ساتھ نہ دے سکے انھیں محبت کرنے والے ماں باپ موت کے منہ میں چھوڑ کر بھاگ نکلے، قرآن پاک میں تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّا أَرْضَعَتْ پڑھا تھا، آنکھوں سے اس کا منظر اس شب کو دیکھا، الاماں والحفیظ کیسی بے کسی کا منظر تھا، بہت سے بھاگتے بھاگتے دم توڑ کر گرتے جا رہے تھے، ہزاروں شہید ہوئے، ۲۵۰۰ میتیں دفن کی گئیں، اتنی ہی لاشیں مرگھٹ میں جلائی گئیں، جو اس وقت شہر بھوپال سے گذرنے والی ٹرینوں میں فوت ہوئے یا زخمی ہوکر کسی اور جگہ فوت ہوئے، ان کا شمار نہیں، لاتعداد مویشی مر گئے، بعینہٖ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے زہر بادی کیطرح منٹوں میں مرتا تھا، غرض کیسا کیا منظر تھا اور تھوڑی دیر میں کیا ہو گیا، خدائے پاک کا انعام ہے کہ ہم لوگ مع متعلقین اور جماعت کے سینکڑوں افراد جو قرب اجتماع کے باعث بھوپال میں موجود تھے محفوظ و مامون رہے، معمولی آنکھ کے آشوب کی شکایت یا قلب پر گھٹن یا جلن کی شکایت تھی وہ علاج سے رفع ہو گئی، الحمد للہ جو ختم ہو گئے وہ جنت کو سدھارے، اب لاوارثوں کی فکر، یتیموں، بیواؤں، بیکسوں اور گیس کے اثر سے معذور ہو جانے والوں کی فکروں کا ہجوم ہے، دعا فرمائیں کہ اللہ پاک

مرحومین کی مغفرت فرمائے، ہزاروں بیماروں کو جو ہسپتالوں میں ہیں شفائے کامل عطا فرمائے، جو چکر بے والی و وارث، لاچار، معذور و بے وسیلہ ہو گئے ہیں ان کے حالات کو سازگار فرمائے، پھر ۱۶ر دسمبر کو اعلان ہوا کہ باقی گیس کو ضائع و بے اثر کیا جائے گا، اس کی وحشت میں ۱۳ر ۱۴ر ۱۵ر دسمبر کو بسوں، ٹرینوں، کاروں، اسکوٹروں پر لاکھوں آدمی شہر چھوڑ چلے، اور بھوپال جیسا بارونق شہر قبرستان کا منظر پیش کرنے لگا، کوئی دشمن غنیم بھی شہر کو خالی کراتا تو اس آسانی اور سہولت سے شہر خالی نہ ہوتا، حسب اعلان و تعیین سابق ۲۲ر ۲۳ر ۲۴ر دسمبر کو بھوپال کا تبلیغی اجتماع بحمد اللہ کامیابی سے منعقد ہو کر ختم ہوا، پہلے دن تعداد کم تھی، اس کے بعد تو انسانوں کا سمندر اُمنڈ آیا، ۲۴ر دسمبر کو ۱۲ بجے حضرت جی دام مجدہٗ کی رقت آمیز دعا شروع ہوئی، ہر آنکھ رو رہی تھی، اجتماع کے منعقد ہونے سے ایک طرح کا اطمینان و سکون اور دیکھی لوگوں نے الحمد للہ محسوس کی، ہزاروں انسانوں اور مسلمانوں کے بےکسی سے دم توڑنے پر دل مغموم ہے اور آنکھیں اشکبار، دار العلوم تاج المساجد، اس کے طلبہ، اساتذہ سب ہی محفوظ و مامون رہے، معمولی تکلیفات ہوئیں، جو علاج سے رفع ہو گئیں،

آپ کے خط سے مولانا عبد الرحمن پرواز صاحب کے انتقال کی خبر مل کر ملال مزید بڑھ گیا، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، اور پسماندگان کو صبر عطاء فرمائے، ۱۵ر دسمبر کا خط اب ملا ہے، تار، ڈاک اور فون سب معطل اور مشغول تھے۔

اُس رات کے تصور سے اب بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

۲۴ر دسمبر کو حسب اطلاع دار العلوم کی مجلس شوریٰ بھی ہوئی، آپ نہ خود آئے نہ معذرت کا جوابی لفافہ بھی بھیجا گیا تھا، خدا کرے آپ اچھے ہوں۔

محمد عمران خان ندوی

۱۲۔ عبد الشکور خان روڈ

بھوپال

مطبوعاتِ جدیدہ

اسلام کا آفاقی پیغام :- از جناب میرواعظ کشمیر مولانا محمد فاروق صاحب تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۲۲۰، خوبصورت جلد، قیمت ۲۰ روپئے پتے :- (۱) ہمدرد بکڈپو، راجوری لال، سری نگر، کشمیر (۲) ادارۂ علم وحکمت، دیوبند یوپی

کشمیر میں دین کے تحفظ وبقا، اس کی اشاعت وتبلیغ اور مسلمانوں کے عقائد واعمال کی اصلاح وتصحیح کے سلسلے میں میرواعظان کشمیر کے خاندان کے کارنامے اظہر من الشمس ہیں، مولانا محمد فاروق صاحب کا تعلق بھی اسی ممتاز علمی ودینی خانوادے سے ہے، جو کم سنی ہی میں میرواعظ کے منصب جلیل پر فائز ہو گئے تھے، وہ کشمیر کی انجمن نصرۃ الاسلام اور انجمن اوقاف جامع مسجد سری نگر کے سربراہ بھی ہیں، اس اعتبار سے مولانا محمد فاروق کشمیر کے مشہور علمی، دینی اور سیاسی رہنما ہیں، مگر ان کی علمی وعملی جد وجہد کا دائرہ وہیں تک محدود نہیں ہے، بلکہ وہ آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن رکین اور مسلمانان ہند کے مختلف قومی وملی معاملات میں بھی سرگرم عمل رہتے ہیں، ان کے وعظ وخطابت کی گونج کشمیر کی برف پوش وادی کی طرح ملک کے دوسرے علاقوں میں بھی سنائی دیتی ہے اور وہ اپنی حق گوئی وبے باکی کی بنا پر قید وبند کی صعوبتیں بھی جھیل چکے ہیں، زیر نظر کتاب میں مولانا کے مندرجۂ ذیل خطبات اور تقریروں کو عام فائدے کے لئے یکجا کر کے شائع کیا گیا ہے :- (۱) اسلام کشمیر میں (جامع مسجد، سری نگر) (۲) اسلام کی تعلیمات واقدار کی افادیت عصر حاضر میں (کشمیر یونیورسٹی) (۳) اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کی تعلیمات، سرچشمۂ فیضان (حیدر آباد) (۴) اسلام کے نقوش عالمی تہذیب وثقافت پر (کلکتہ) (۵) اسلام کی آفاقی تعلیمات حریت، صداقت، انصاف اور مساوات (لیہہ کشمیر)

(۶) اسلام، ملت اسلامیہ کے درپیش موجودہ مسائل کا حل (بنگلور) (۷) اسلام اور کشمیری زبان کی گرانقدر خدمت بیان الفرقان (جامع مسجد سری نگر) (۸) اسلام اور سیرت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم (دہلی) (۹) اسلام اور معراج مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم (ریڈیو کشمیر) (۱۰) اسلام میں اجتماعیت کی اہمیت، جمعہ کے فضائل و احکام پر جامع مسجد، سری نگر میں کی گئی تقریروں کے اقتباسات (۱۱) اسلام، اتحاد اور قربانی امت کے موجودہ امراض کا علاج (صدسالہ اجلاس دارالعلوم دیوبند) (۱۲) اسلام میں عورت کا مقام اور حقوق زوجین (مجالس نکاح کے خطبوں کے اقتباسات) (۱۳) اسلام کے قوانین ناقابل تنسیخ و ترمیم ہیں (اجلاس مسلم پرسنل لا بورڈ مدراس) (۱۴) اسلام میں شورائیت کا نظام (اجلاس آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت، بمبئی) عنوانات ہی سے خطبوں کی اہمیت و افادیت ظاہر ہے، پہلے خطبہ میں کشمیر میں اسلام کی اشاعت کی مختصر روداد بیان کی گئی اور ساتواں خطبہ کشمیری زبان میں پہلے ترجمہ قرآن بیان الفرقان کی تیسری اور آخری جلد کے رسم اجراء کے موقع پر دیا گیا ہے، باقی تمام خطبوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام مکمل دین و مستقل ضابطۂ حیات اور ایک ابدی، آفاقی اور عالمگیر مذہب ہے جو امن و سلامتی کا ضامن اور حریت و مساوات اور عدل و انصاف کا علمبردار ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں، آپ کی پاکیزہ زندگی اور اسلام کی تعلیمات و ہدایات ہی سے دنیا کے موجودہ بحران اور انسانوں کے مصائب کا خاتمہ ہو سکتا ہے، اس لئے مسلمانوں کو اسلام کی حیات بخش تعلیمات پر عمل پیرا اور متحد و منظم ہو کر انسانیت کی اخلاقی قیادت کا فرض انجام دینا چاہئے، غرض ہر خطبہ مسلمانوں کے لئے ایک پیغام اور لائحۂ عمل کی حیثیت رکھتا ہے، بعض خطبوں میں بڑی مفید اور نکتہ کی باتیں بھی آگئی ہیں، مثلاً "دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں اسلام کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ اس نے اپنی تقویم تو کیا خود اپنے دین کا نام بھی اپنے رسولؐ کے نام پر نہیں رکھا، بلکہ اس کی دعوت و پیغام پر رکھا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آفاقی و ابدی مذہب ہے، اور اس میں اصل مقصد اور بنیادی پیغام ہی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے نہ کہ شخصیت یا جماعت کو" اسی طرح معراج کے متعلق فرماتے ہیں "اس سے ثابت

چونکہ چاند، سورج، ستارے، آسمان، خلا، افلاک اور ملکوت یہ سب مخلوق ہیں، جو انسان کی دسترس سے باہر نہیں بلکہ اس کی زد میں ہیں، معراج کے عظیم واقعہ سے انسان کے لئے خلائی سفر اور ستاروں پر کمند ڈالنے کی راہیں کھل گئیں، آج کل سائنس داں انسان کو جن خلائی مہموں پر بھیجتے ہیں یہ وہی علاقے ہیں جو آج سے چودہ سو سال قبل داعی اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر معراج میں روند ڈالے تھے اور ان سے بہت اونچے مقامات تک پہنچ گئے تھے، شاعر مشرق دانائے راز علامہ اقبال فرماتے ہیں:-

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے　　کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

یہ خطبے مذہبی اور دعوتی نوعیت کے ہیں، لیکن فاضل خطیب کا دردمند دل دنیا بھر کے مسلمانوں کے درد و غم سے بھی بیقرار و بیتاب ہے، اس لئے کہیں کہیں ہندوستان کے فرقہ وارانہ فسادات، اسرائیلی جارحیت، فلسطین، حرم پاک اور ایران کے واقعات اور افغانستان میں روسی بربریت کا ذکر بھی آگیا ہے، ان خطبوں سے میر واعظ صاحب کی خطابت و تقریر میں قدرت و مہارت کا بھی پوری طرح اندازہ ہوتا ہے، کتاب کے شروع میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے پیش لفظ ہے، اور آخر میں مولانا قاری محمد طیب رحمہ، مولانا مفتی عتیق الرحمٰنؒ، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا منت اللہ رحمانی اور مولانا محمد منظور نعمانی وغیرہ کی تقریظیں درج ہیں، جن سے میر واعظ صاحب کی مقبولیت و عظمت کا اندازہ ہوتا ہے، یہ خطبے ہر مسلمان کے مطالعہ میں آنے کے لائق ہیں، ص۹۳ پر مولانا ظفر علی خاں کے شعر

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی　　نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

کو مولانا حالی کا بتایا گیا ہے، اور ص۱۳ پر آیات کا ترجمہ نہیں کیا ہے حالانکہ ص۱۳۲ پر نشاندہی کیا ہے جو صحیح ہے، ص۱۳۲ پر سفر معراج بجسم و روح کو مسلمہ بتایا ہے اور ثبوت میں حافظ ابن حجر کا ایک بیان نقل کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ جمہور کا قول ہے نہ کہ مسلمہ و متفق علیہ۔

معرکۂ اسلام و جاہلیت:- از مولانا صدرالدین اصلاحی، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت عمدہ،

صفحات ۲۱۶، قیمت سترہ روپیہ، پتہ - ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ یوپی ۲۰۲۰۰۱،

مولانا صدر الدین اصلاحی ہندوستان کی جماعت اسلامی کے مشہور اہل قلم اور ممتاز مصنف ہیں انھوں نے اس کتاب میں اسلام اور جاہلیت کی کشمکش اور معرکہ آرائی کی مختصر تاریخ بیان کی ہے اور اس سلسلہ میں مشہور حدیث بدء الاسلام غریبا وسیعود غریبا کی موثر اور دلنشین وضاحت کی ہے، مولانا نے اسلام اور جاہلیت کی دائمی کشمکش کا محور انسان کی ذات کو قرار دیا ہے جسے دونوں ہی فتح کرنے میں سرگرم عمل ہیں، اس سلسلہ میں جہاں انسان کی رہنمائی صراط مستقیم کی نشاندہی اور اسلام و جاہلیت کی سرحدوں میں خط امتیاز کھینچنے کیلئے وحی الٰہی کی مدد کا ذکر کیا ہے وہاں جاہلیت کی جوابی کاروائی اور وحی الٰہی کی بنیادیں متزلزل کرنے کا بھی ذکر کیا ہے اس کے ثبوت میں قرآن مجید سے تاریخی ثبوت پیش کیا ہے اور حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت لوطؑ، حضرت شعیبؑ اور حضرت موسیٰؑ کی سرگذشت بیان کرکے ان سے انکی قوموں کے تصادم اور ٹکراؤ کا ذکر کیا گیا ہے اسکے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسلام کی دعوت دینے اور اسکے مقابلہ میں جاہلیت کی جوابی کاروائی اور محاذ آرائی کی تفصیل قلمبند کی ہے، اس ضمن میں اسلام کی بعض نمایاں خصوصیات، قرآن مجید کے طریقۂ دعوت کی خوبیاں اور دعوت اسلامی کی مخالفت کے اسباب کی بھی نشاندہی کی ہے، انھوں نے اسلام کی ابتدائی تاریخ کے ان حالات کو حدیث بدء الاسلام غریبا پر منطبق کرکے دکھایا ہے کہ اسلام اسکے عقائد اور افکار و نظریات لوگوں کیلئے انوکھے نرالے اجنبی اور نامانوس بنے ہوئے تھے، جاہلیت کی وسعت ہمہ گیری اور اثر و نفوذ دکھانے کیلئے اسکی بھی مثالیں دی گئی ہیں کہ کبھی کبھی خود اسلام کے ماننے والوں کیلئے بھی اسکی بعض تعلیمات اجنبی اور نامانوس ہوتی ہیں، اسکے بعد رسول اللہؐ کے دور میں اسلام کی فتح مبین اور جاہلیت کے سرنگوں ہوجانے کا ذکر ہے، کتاب کے آخر میں جاہلیت کی دوبارہ واپسی کی داستان بیان کی گئی ہے، یہ حدیث کے دوسرے ٹکڑے سیعود غریبا کی تشریح ہے، اسمیں پہلے خود ملت اسلامیہ کے اندر جاہلیت کی دوبارہ واپسی اور اسکے اثر و نفوذ کی تفصیل دی گئی ہے، پھر بیرون ملت جاہلیت کی موجودہ یلغار کا نقشہ کھینچا گیا ہے جسکی نمایندگی مغرب کی تہذیب جدید کر رہی ہے، اس سلسلہ میں اسلام کے مختلف گوشوں پر جاہلیت کے حملہ آور ہونے کا ذکر کیا ہے، بالکل آخر میں حدیث کے آخری ٹکڑے فطوبیٰ للغرباء کی تشریح کی گئی ہے، اس میں دکھایا ہے کہ جاہلیت کے موجودہ غلبہ و تسلط کے باوجود اب ایسے حالات ابھر رہے ہیں جو اسکی پسپائی اور شکست اور

سلام کی فتح و کامرانی کا باعث ہو سکتے ہیں، اسلئے اسکے علمبرداروں کو ان حالات سے فائدہ اٹھانا اور اپنی ذمہ داری پورا کرنا چاہیے۔ یہ کتاب موثر اور دلنشین انداز میں لکھی گئی ہے جو دعوتی کام کرنے والوں کیلئے خاص طور پر مفید ہے۔

فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات :۔ مرتبہ ڈاکٹر عبیدہ بیگم صاحبہ، تقطیع متوسط کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۲۳، مجلد مع گرد پوش، قیمت ساٹھ روپئے پتہ، نصرت پبلیشرز، امین آباد، لکھنؤ۔

فورٹ ولیم کالج نے اردو زبان و ادب کی عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں، اس کے ذکر سے تاریخ ادب اردو کی کوئی کتاب خالی نہیں ہے، اب ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے اس موضوع پر یہ مبسوط اور مستقل کتاب لکھی ہے جس میں فورٹ ولیم کالج سے متعلق تمام ضروری باتیں تلاش و تحقیق سے لکھی گئی ہیں، یہ دراصل انکا وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر گورکھپور یونیورسٹی نے انہیں پی، ایچ، ڈی کی ڈگری دی ہے، یہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں فورٹ ولیم کالج کے اغراض و مقاصد کی مفصل وضاحت کی گئی ہے، اس ضمن میں کالج کے قیام کی صحیح تاریخ اور اسکے آغاز سے اختتام تک کی مکمل سرگذشت قلمبند کی گئی ہے، اور ان لوگوں کا ذکر بھی کیا ہے جنکی مساعی اور سرپرستی کالج کو حاصل تھی، دوسرے باب میں کالج سے وابستہ اردو مصنفین کے حالات و سوانح درج ہیں، اس میں ان لوگوں کا بھی مختصر تذکرہ ہے جو کالج کے باقاعدہ ملازم نہ تھے، مگر انھوں نے کالج کی کونسل سے انعام حاصل کرنے کیلئے یا اسکے اہم عہدہ داروں کی فرمائش پر کتابیں لکھی تھیں، غالباً مصنفین کے حالات کی فراہمی میں ڈاکٹر صاحبہ کو زیادہ کامیابی نہیں ہو سکی ہے، اسلئے دونوں قسم کے مصنفین کے حالات مختصر ہیں، تیسرا باب فورٹ ولیم کالج کی اردو مصنفات کے جائزہ کیلئے مخصوص ہے، جو بڑا طویل اور کتاب کے نصف سے زیادہ حصہ کو محیط ہے، اس میں کالج کے زیر اہتمام لکھی گئی جن کتابوں کا مصنفہ کو علم ہوا ہے، ان سب کے متعلق ضروری معلومات پیش کی ہیں، اور انکے مندرجات و مشمولات کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے، چوتھے باب میں انھوں نے فورٹ ولیم کالج کی نثر کے اسلوب پر بحث کی ہے، اور پانچویں باب میں اردو نثر پر اسکے اثرات دکھائے ہیں، اس کی وضاحت کیلئے کالج کے قیام سے پہلے اور بعد کے مصنفین کے نثری کارناموں پر بھی روشنی ڈالی ہے، اس کتاب میں فورٹ ولیم کالج پر لکھنے والوں کی کمی کی نشاندہی بھی کی گئی ہے، اور پیش رو مصنفین کے اغلاط کی تصحیح بھی کی گئی ہے، ماخذ کی طویل فہرست سے بھی مصنفہ کی محنت و کاوش کا اندازہ ہوتا ہے، فورٹ ولیم کالج پر مفید معلومات جمع کرنے کیلئے مصنفہ تحسین اور حوصلہ افزائی کی مستحق ہیں، ص ۵۲ کی پانچویں سطر میں ذہنیت کو ذکر لکھا ہے، ایسی طرح ص ۲۲۵ کے حاشیہ میں کلیلہ و دمنہ کے عربی مترجم کے نام کے سلسلہ میں لکھا ہے لیکن عبد المقفع ہی درست ہے، حالانکہ متن میں صحیح نام عبد اللہ ابن المقفع دیا ہے۔

تجلیاتِ قتیل:۔ مرتبہ ڈاکٹر ظفر رضوی برق، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۰۶، قیمت ۵ روپئے، پتہ:۔ ڈاکٹر ظفر رضوی برق، "دانشکدہ" ملکی محلہ آرہ

حضرت سید شاہ محمد قائم رضوی قتیل سجادہ نشین آستانہ چشتیہ نظامیہ داناپور سلسلۂ ناسخ کے ایک کامل الفن اور کہنہ مشق شاعر ہیں جن کے تلامذہ کی تعداد سو سے متجاوز ہوگی، ان کو فارسی و اردو دونوں زبانوں پر یکساں دسترس ہے اور دونوں میں صاحب دیوان ہیں، ڈاکٹر ظفر رضوی برق صدر شعبۂ اردو و فارسی جین کالج آرہ نے قتیل کا اردو دیوان "تجلیاتِ قتیل" مرتب کرکے شائع کیا ہے، ان کا بیان ہے کہ یہ دیوان ۲۰۵ غزلوں پر مشتمل تھا، اور کوئی غزل ۱۹ یا ۲۱ اشعار سے کم کی نہ تھی، میں نے طباعت کی مشکلات کے پیش نظر اختصار و انتخاب کو ملحوظ رکھا، ڈاکٹر صاحب خود بھی صاحب ذوق ادیب و شاعر ہیں، اس لئے انتخاب خوش سلیقگی سے کیا گیا ہے، شروع میں ایک مختصر مقدمہ ہے، اس میں داناپور کے تصوف و عرفان اور علم و ادب کے گہوارہ ہونے کا ذکر بھی کیا ہے، اور قتیل کے کلام کی مختصر خصوصیات بھی دکھائی ہیں، مقدمہ دلکش ادیبانہ طرز نگارش کا نمونہ ہے، مگر بہت مختصر ہے، اصل کلام اپنے رنگ میں اچھا ہے، ڈاکٹر ظفر رضوی برق نے اس ادبی سرمایہ کو محفوظ کرکے ایک ادبی خدمت انجام دی ہے۔

معلم القواعد والاعراب (جزو اول) **:۔** مرتبہ مولانا محمد امین صاحب ندوی، تقطیع متوسط، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۸۰، قیمت تین روپئے پچاس پیسے، ناشر:۔ مکتبہ دار العلم کوپاگنج، اعظم گڈھ۔

مصنف ایک تجربہ کار معلم ہیں، یہ کتاب ان کے برسوں کے مطالعہ و تجربہ کا نتیجہ ہے، اس میں نحوی قاعدے تو مجملاً بیان کئے گئے ہیں، مگر مثالوں اور ترکیبوں پر زیادہ توجہ کی گئی ہے، اور یہی اس کتاب کی اصل خصوصیت ہے، پہلے جملہ اسمیہ کا ذکر ہے، جیسے مبتدا و خبر کے ضروری قواعد بیان کئے گئے ہیں پھر جملہ فعلیہ میں مختلف افعال، فاعل، مفعول اور دوسرے منصوبات وغیرہ کے قاعدے، مثالیں اور جملوں کی ترکیب نحوی کی گئی ہے، آخر میں ادوات کا ذکر ہے، مگر اس میں صرف حروف استفہام اور اذا کے قاعدے ہی تحریر کئے گئے ہیں، غالباً باقی حروف کا ذکر دوسرے حصہ میں ہوگا، کتاب مبتدی طلبہ کے لئے

ہندوستان عہد وسطیٰ کا فوجی نظام

عہد وسطیٰ کے مسلمان سلاطین اور فرمانرواؤں کی عظمت و شان اور ترقی و تنزل کا اندازہ ان کی
فتوحات اور فوجی طاقت سے کیا جاتا ہے اور اسی حیثیت سے ان کی تاریخیں بھی لکھی جاتی رہیں،
خود ہندوستان کے مختلف فرمانرواؤں کی تاریخیں بھی اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئیں اور ان میں ان
کی فتوحات اور جنگوں کی تفصیل لکھی گئی، مغلوں نے بابر سے لے کر ظفر شاہ تک چار پانچ سو برس تک
ملک پر حکومت کی اور بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں اور اپنے مقبوضات کا دائرہ راس کماری سے
ہرات اور کابل تک پہنچا دیا، ان کی تاریخ بھی صرف ان کی جنگوں کی اور فتوحات کی تاریخ ہو کر
اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا کہ ان کا فوجی نظم و نسق کیا تھا، نبرد آزمائی کے طریقے کیا تھے، کس قسم
کے اسلحے استعمال ہوتے تھے، میدان جنگ میں فوجوں کی ترتیب کیا ہوتی تھی، ان کی مختلف ٹکڑیوں کے
نام کیا ہوتے تھے، پھر ان کی ذمہ داریاں کیا ہوتی تھیں، وغیرہ وغیرہ، جب سید صباح الدین عبد الرحمٰن
صاحب دار المصنفین کی رفاقت میں آئے اور ان کو انگریزی کا شعبہ دیا گیا، تو سید صاحب نے ان کو یہ
کٹھن موضوع دیا جس کے لئے مواد کا تلاش کرنا پہاڑ سے جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا، مصنف نے
دس بارہ سال کی مسلسل محنت اور جانفشانی سے نہ صرف مغلوں کے عہد کے بلکہ ہندوستان کے پورے
عہد وسطیٰ کے فوجی نظام پر ایک ضخیم کتاب تیار کر کے پیش کر دی، اس میں عہد وسطیٰ کے فوجی نظام،
آلات حرب، آتشیں اسلحے، بحری بیڑے، فوج کا کوچ، صف آرائی، ترتیب، میدان جنگ، قلعے، چھاؤنی
کمین گاہیں، مختلف فوجی عہدہ داروں کے فرائض اور ذمہ داریوں کی تفصیل نہایت دلچسپ انداز
میں بیان کی گئی ہے، یہ اپنے موضوع پر اردو میں منفرد کتاب ہے، قیمت: ۲۲ روپیہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

منیجر

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

قیمت دس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(یوپی ۔ ۲۷۶۰۰۱)

مجلسِ ادارت

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

تاریخ ہندوستان کا سلسلہ اب تک اٹھائیس کتابوں تک پہونچ چکا ہے، اس ضمن میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے، جس کی اب تک تین جلدیں شایع ہو چکی ہیں۔

جلد اوّل

اس میں مغل دور سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی اور وطن دوستی، رعایا پروری کے دلچسپ واقعات مستند ماخذوں کی مدد سے پیش کیے گئے ہیں، قیمت ۱۲ روپیے

جلد دوم

اس میں مغل فرماں روا بابر، ہمایوں، سوری خاندان کے شیر شاہ اور اسلام شاہ، پھر مغل شہنشاہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کی مذہبی رواداری، فراخ دلی، وطن دوستی، رعایا پروری کے سبق آموز واقعات پیش کیے گئے ہیں، قیمت ۲۳ روپیے۔

جلد سوم

اس میں جدو ناتھ سرکار کی کتاب کا جواب خود اس کی کتاب کے حوالوں سے اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اورنگزیب عالمگیر اور اسکے بعد کے مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی، وطن دوستی اور رعایا پروری کی تفصیلات آگئی ہیں۔ مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمن۔ قیمت ۳۰ روپیے

جلد ۱۳۵ ماہ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۴۰۵ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۸۵ء عدد ۲

مضامین

مقالات

ایک ضروری اعلان

معارف کا زر سالانہ جنوری سنہ ۱۹۸۵ء سے تیس روپیہ کر دیا گیا ہے، اس لئے براہ کرم آپ تیس روپیہ زر سالانہ روانہ فرمائیں، پرانے خریداروں سے گذارش ہے کہ اگر ان کا چندہ ختم ہوگیا ہو تو وہ بھی تیس روپیہ ہی بھیجیں، اور اسی کے ساتھ اپنے خریداری نمبر کا حوالہ بھی دیں۔

"منیجر"

شذرات

گذشتہ مہینہ معارف کے شذرات میں ذکر آیا تھا کہ ملک کے بدلے ہوئے حالات میں مسلمان اپنی سیاسی زندگی میں جامد اور منجمد رہیں، یا متحرک ہوں۔ وہ متحرک ہونے کے لیے کیا کریں۔

یاد آتا ہے کہ ۱۹۳۵ء میں مسلمانوں نے آج ہی کی طرح سیاسی حیثیت سے اپنی بے بسی اور لاچارگی محسوس کی تھی، تو اس وقت بجنور کے سہ روزہ اخبار مدینہ نے اپنا ایک صفحہ مسلمان کیا کریں؟ کے عنوان سے ملک کے مسلمان مشاہیر اور اکابر سے مضامین لکھوانے کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ اس کے فوراً ہی بعد مسلم لیگ طوفان کی طرح اٹھی اور سیلاب کی طرح مسلمانوں کے جذبات کو بہالے گئی۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان وجود میں آگیا۔ اس وقت اس سے بحث نہیں کہ پاکستان کا بننا صحیح یا غلط ہوا، توجہ اس پر دلانی ہے کہ یہی مسلم لیگ ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان اور ہندوستان میں بالکل نیم جان بلکہ مردہ ہو گئی، پاکستان میں اس کے اسباب پر تو وہاں کے لوگ غور کریں، لیکن ہندوستان میں اس کے بے عمل ہو جانے پر غور کیا جا سکتا ہے، تقسیم ہند کے بعد اعصابی اور نفسیاتی جنگ کے ذریعہ اس پر زہریلے قسم کی غداری کے اتنے الزامات رکھے گئے کہ اس کے بچے کچھے رہنما جو پاکستان نہ جا سکے، گوشۂ عافیت میں بیٹھ گئے، اس کے علاوہ عام مسلمان یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ تقسیم کی تلخیوں کے بعد ان کے از سر نو سیاسی خیالات و جذبات کیا ہوں، ان کی اکثریت اس کی خواہاں تھی کہ اس کو بدلے ہوئے حالات میں بدل کر رہنا ہو، کس طرح؟ ان کو اپنے گونگے جذبات کی خبر نہ ہو سکی، اور نہ کوئی ان کی صحیح رہنمائی کر سکا۔

برطانوی حکومت کے عہد میں مرکز اور صوبوں کی قانون ساز مجلسوں میں جداگانہ انتخاب کے ذریعہ اسکے اراکین منتخب ہوتے تھے، مسلمان اراکین مسلمانوں کے ووٹ سے منتخب ہو کر وہاں پہنچ جاتے تو ان میں اتنی آواز

[illegible]

[illegible] پہنچ جاتے

ہیں، ان کے زیادہ [illegible] ہوتے ہیں، اس دعاداری میں ان کو جو مالی نقصان پہنچ جاتے ہیں، اسی پر اکتفا کر لیتے ہیں۔

مسلمانوں کو اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ گذشتہ ۳۰ سال میں اس ملک میں ان کی کوئی نمایاں سیاسی حیثیت نہیں رہی، ان کی کہیں موثر آواز سنائی نہیں دیتی، جب فساد کے موقع پر ان کی چیخ پکار اور آہ و بکا سے ملک ضرور گونج اٹھتا ہے، مگر ان میں وہی مجرم قرار دیے جاتے ہیں، حالانکہ ان میں انکے جانی اور مالی نقصانات زیادہ ہوتے ہیں، اور انکی تلافی بھی نہیں ہوتی، ان کی کوئی طاقتور تنظیم نہ ہونے کی وجہ سے ان خونریز فسادات کی صحیح صورت حال ملک کے سامنے نہیں آتی۔

اس وقت ملک میں مسلمانوں کی تنظیموں کی کمی نہیں لیکن وہ موثر نہیں ہیں، اسکی وجہ یہ ہے کہ جس پر مسلمانوں کا اعتماد ہے، اس پر حکومت اور اکثریتی فرقہ کا اعتماد نہیں ہے، اور جس کو حکومت یا اکثریتی فرقہ قابل اعتبار سمجھتا ہے، اس سے عام مسلمان خوش نہیں، کوئی ایسی تنظیم نہیں جس پر دونوں کا اعتماد ہو، مسلمانوں کے گونگے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ وہ اچھے ہندوستانی بن کر ملک کے قومی بہاؤ میں ساتھ دینا چاہتے ہیں مگر جب غلط قسم کے قوم پرستی کی آواز انکے کانوں میں پڑتی ہے، تو پھر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ قومی بہاؤ ان سے دور چلا جاتا ہے یا وہ قومی بہاؤ سے دور ہو جاتے ہیں، ان کی دلی خواہش ہے کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ بھائی بھائی بن کر قومی بہاؤ کا ساتھ دیں، مگر وہ اپنے مذہبی وجود اور تہذیبی ہستی کو ختم کر دینا بھی پسند نہیں کرتے، یہ قطعی ضروری نہیں کہ قومی بہاؤ کا ساتھ دینے کیلئے دین دھرم کی تفریق مٹادی جائے، ہندو ہندو اور مسلمان مسلمان بن کر وطن کے فدائی اور شیدائی صحیح معنوں میں ہو سکتے ہیں۔

[illegible] انتہاپسند دل کے نعرے جو بھی ہوں، مسلمان اپنے اندر وطن دوستی کے [illegible] ملی [illegible] کی خاطر وہ اچھے مسلمان اور اچھے ہندوستانی بن کر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیں، [illegible] اس کے لئے ان کی فطری خواہش ہوگی کہ ان کی کوئی ملک گیر تنظیم ہو، لیکن جب تک ایسی تنظیم [illegible] وجود میں نہیں آتی، تو وہ مقامی اور شہری پیمانہ پر ایک ایسی تنظیم کی تشکیل کر سکتے ہیں [illegible] پورا اعتماد ہو، اور ہندوؤں کا اس پر پورا اعتماد نہ ہو تو کم از کم اس سے مشکوک [illegible] ایسی تنظیم کا تجربہ کرنا زیادہ مشکل نہیں، ارسطو اور افلاطون نے شہری ریاستوں میں جمہوریت کا تجربہ کیا تھا، جو آگے چل کر عالمگیر ہو گئی، مسلمانوں کی ایسی شہری تنظیمیں کامیاب ہو گئیں، تو کیا عجب کہ یہ ملک گیر ہو جائیں۔

خاموشی، سکون، خلوت نشینی اور منفردانہ زندگی کا نام اسلام نہیں، اسلام جد و جہد، سعی و عمل اور حرکت و سرگرمی کا نام ہے، وہ موت نہیں، حیات ہے، وہ سرتاپا کارزار ہے، لیکن خلوت میں بیٹھ کر نہیں، بلکہ میدان میں نکل کر یہ عمل ہے، ترکِ عمل نہیں ہے، یہ ادائے واجبات ہے، عدم واجبات نہیں، ادائے فرض ہے، احتراز فرض نہیں۔

ان سطروں کے لکھتے وقت پروفیسر محمد مجیب سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ دہلی کے انتقال پرملال کی خبر ملی، ان کی وفات ایک ایثار پسند محب وطن، ایک بہت ہی قابل قدر مصنف، اردو زبان و ادب کے ایک بہت ہی لائق عزت اور جاں نثار اہل قلم، جامعہ ملیہ کے ایک بہت ہی شفیق اور محبوب وائس چانسلر، ایک بہت اچھے انسان، علم دوست اور علم پرور کی رحلت ہے، سردست ان کے لئے دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ان کو اپنی بے پایاں رحمتوں اور برکتوں سے سرفراز فرمائے، آمین۔ آئندہ اشاعت میں ان شاء اللہ خاکسار کے قلم سے ایک تاثراتی مضمون ہوگا۔

سرسید احمد خاں اور مستشرقین

از عبید اللہ کوٹی ندوی رفیق دار المصنفین

۱۸۵۷ء میں ہندوستان پر انگریزوں کے برسر اقتدار ہوتے ہی، عیسائی مشنریوں نے سیاسی اقتدار سے فائدہ اٹھاکر، تبلیغ عیسائیت کا کام شروع کر دیا تو ان کے مقابلہ میں مولانا قاسم نانوتوی مولانا عنایت رسول چریا کوٹی، مولانا محمد علی مونگیری، ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے بحث و مناظرہ اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ بڑی اہم خدمات انجام دیں، خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا وجود تو رد عیسائیت کے باب میں تائید غیبی سے کم نہ تھا، ان عیسائی مشنریوں نے اسلام پر پیہم حملے کرکے یورپ میں اور پھر ہندوستان میں بھی اسلام کے خلاف بہت غلط فہمیاں پھیلا رکھی تھیں، دوسری جانب یورپ کی نئی نئی سائنس اور قوانین فطرت کے نئے نئے اسرار کے انکشاف کی وجہ سے مسلمانوں کے ذہنوں میں طرح طرح کی الجھنیں پیدا ہوگئی تھیں جن کو جدید اسلوب میں دور کرنے کی ضرورت تھی، مستشرقین بھی علمی انداز میں اسلام پر حملہ آور ہو رہے تھے، ان الجھنوں کو دور کرنے اور مستشرقین کے اعتراضوں کا جواب دینے کے لیے جو لوگ ہندوستان میں آگے بڑھے اُن میں سرسید احمد خاں مرحوم پیش رو کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کے زمانہ میں سرولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" چار جلدوں میں چھپ کر ہندوستان پہنچی تو یہ دیکھ کر لوگوں کو

حسن صورت ہوئی کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں نہایت سیدھی سادی اور صاف باتوں کو بھی توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے، یہ کتاب عیسائی مشنریوں کی مدد کے لیے تیار کی گئی تھی، چنانچہ سر ولیم میور لکھتے ہیں کہ

"پادری فنڈر صاحب نے جو ان باتوں میں مشہور ہیں کہ انھوں نے مسلمانوں سے مباحثے میں عیسائی مذہب کی بہت حمایت کی اس بات پر اصرار کیا کہ اسلام کے پیغمبر کے حالات میں ایک کتاب جو اس کے پیروؤں کے پڑھنے کے لیے مناسب ہو ایسے قدیم ماخذ سے ہندوستانی زبان میں تالیف کی جائے، جس کو خود مسلمان صحیح اور معتبر مانتے ہوں۔"

(خطبات احمدیہ ص ۱۷)

سر ولیم میور اضلاع شمال مغرب (یوپی) کے لفٹنٹ گورنر تھے، جب کہ سر سید احمد خاں بنارس میں منصفی (جج اسمال کاز کورٹ) کے منصب پر تھے، سر ولیم میور اور دوسرے انگریز افسروں سے دوستانہ مراسم کے علاوہ وہ "اسباب بغاوت ہند" لکھ چکے تھے، جس سے وہ بدنام ہوئے کہ وہ انگریزوں کے وفادار ہیں، انھوں نے "احکام طعام اہل کتاب" لکھی جس میں مسلمانوں کو انگریزوں سے معاشرتی روابط استوار کرنے کی ترغیب دی اسلیے وہ "کرستان" سمجھے جانے لگے تھے، اور علما کا ایک گروہ ان سے بہت بدظن ہو چکا تھا لیکن سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" شائع ہوئی تو ان کی حمیت اسلامی بھڑک اٹھی، اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کو محسوس ہوا کہ اسلام کی دلچسپ اور سیدھی سادی عمدہ باتیں بھی سر ولیم میور کو بری، بھونڈی اور نفرت انگیز معلوم ہوئیں تو اس کتاب کا جواب لکھنے کے لئے وہ بے چین ہو گئے، وہ اکثر اس کتاب کا ذکر کرتے اور نہایت افسوس کے ساتھ کہتے تھے کہ "اسلام پر یہ حملے ہو رہے ہیں، اور مسلمانوں کو مطلق خبر نہیں" (حیات جاوید حصۂ دوم ص ۱۲۰)، ۱۸۵۷ء میں ہندوستان کے اسلامی کتب خانے برباد ہو چکے تھے،

اور جو حوالے کی کتابیں لکھنے کے لیے درکار تھیں وہ یہاں دستیاب نہ تھیں،
اس لیے سرسید کو لندن جانے کا خیال پیدا ہوا، بعض سرکاری عہدیداروں کے منع کرنے کے
باوجود وہ یہ سمجھ گئے، اپنی ملازمت کو خطرے میں ڈال لیا، برطانوی حکومت سے اپنی وفاداری کی
پروا نہیں کی، سیاسی مصلحتوں کو نظر انداز کیا، ان کے لڑکے سید محمود لندن تعلیم کے لیے بھیجے جانے
والے تھے، ان کے ہمراہ جانے کا منصوبہ پیش تھا، اس کا بھی خیال نہیں کیا، اور وہ سر میور کی
کتاب کا جواب لکھنے کے لیے لندن پہنچ گئے۔ انڈیا آفس کے کتب خانہ اور برٹش میوزیم کی لائبریری
سے استفادہ کے علاوہ سیرت و تاریخ کی عربی کتابیں جو مصر، فرانس اور جرمنی میں چھپی تھیں وہاں سے منگوائیں
اور چند لیٹن اور انگریزی کی پرانی کتابیں جو نایاب تھیں بہت گراں قیمت پر لندن کے بازار سے خریدیں
اور شب و روز کی لگاتار محنت سے بارہ (۱۲) ایسیز (Essays) یعنی خطبے لکھ کر ایک دوست سے انگریزی
میں ترجمہ کرائے، اور لندن ہی میں خطبات احمدیہ کے نام سے اس کو چھاپ کر شائع کیا (خطبات احمدیہ)
اس کتاب کی تالیف کے زمانہ میں اپنے جذبات اور مالی مشکلات کے بارے میں انگلستان سے مولوی
سید مہدی علی خاں یعنی محسن الملک کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ

"ان دنوں ذرا میرے دل کو شورش ہے، ولیم میور صاحب کی کتاب کو میں دیکھ رہا ہوں
اس نے دل کو جلا دیا، اور اس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا اور
مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا
کتاب لکھ دی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق
ہو جاؤں تو بلا سے، میں نے فرانس اور جرمنی سے بہت سی کتب سیر کی فرمائش
کر دی ہیں۔" (حیات جاوید ص ۱۲۱)

ایک اور خط میں یہ لکھتے ہیں کہ "میرا خطبہ (یعنی خطبات احمدیہ) لکھنے میں مصروف

مصروف ہوں اس کے سوا اور کچھ خیال نہیں، جاتا آتا ملنا جلنا سب بند ہے۔ آپ میں خدا کے پیچھے ہو .... کسی مہاجن سے میرے لیے ہزار روپیہ قرض لیجیے .... ہزار روپیہ بھیجنے کے لیے لکھا ہے اور لکھا ہے کہ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ میرے ظروف مسی تک فروخت کرکے ہزار روپیہ بھیجو .... کیا کہئے اس کتاب کے پیچھے خواب و خور حرام ہو گیا ہے، خدا مدد کرے!

ایک اور خط میں یہ لکھا ہے کہ "میں روز و شب تحریر کتاب میں مصروف ہوں اور سب کام چھوڑ دیا ہے، لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے، اور کسی شخص کے مددگار نہ ہونے سے یہ کام اور بھی سخت ہو گیا ہے، ادھر جب حساب دیکھتا ہوں تو جان نکل جاتی ہے کہ الٰہی لکھنا اور چھپانا تو شروع کر دیا، روپیہ کہاں سے آئے گا۔" (حیات جاوید ص ۱۲۱)

خطبات احمدیہ کی جلد اوّل تمام ہوئی تو اس کی طباعت میں ۴ ہزار کے قریب لاگت آئی، کچھ روپیہ ان کے دوستوں نے ہندوستان سے چندہ کرکے روانہ کئے اور کچھ انھوں نے دوسروں سے قرض لیے، یہاں تک کہ انگلستان سے واپسی کے وقت ان کے پاس زادِ راہ کے لیے کچھ نہ تھا اور وہ نہایت پریشان تھے، اسی عرصہ میں ان کی صاحبزادی یعنی ہمشیرۂ حامد و محمود کا انتقال ہو گیا۔ کتاب کی طباعت کے سلسلہ میں اخراجات نے اور زیادہ فکر مند بنا رکھا تھا، چنانچہ لکھتے ہیں کہ "جیسا کچھ مصیبت کا وقت مجھ پر گزرا واقعۂ کربلا سے کم نہ تھا، ع

این ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر (ایضاً ص ۱۲۲)

وہ اس کتاب کی تالیف کو مذہبی فرائض میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری خیال کرتے تھے، حصۂ اوّل کی تکمیل پر، ایک خط میں اپنی کتاب کی غرض و غایت اس طرح بیان کرتے ہیں:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارہ برس کی عمر تک حال لکھ چکا اور سر ولیم میور صاحب اور مصنفوں نے یہاں تک کے حالات پر جو کچھ لکھا ہے سب کے ایک ایک حرف کا جواب

کا یہ نہایت عمدہ جواب ہے۔ اور یہ تحریر اگر کسی شخص کے آگے ڈال دی جائے کہ یہ بے دین کیوں نے ہو اگر وہ کہے کہ ہاں نہایت سچ اور انصاف کا جواب ہے تو تو میرا نام اور نہ میرا نام نہیں۔" (حیات جاوید ص ۱۲۳)

مستشرقین کی تردید میں خطبات احمدیہ کا امتیاز

لاہور ڈیوٹی کالج کے پرنسپل ریورنڈ جو پو نے اس کتاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک موقع پر یہ کہا کہ

"ہمارے نزدیک جو کام سید احمد خاں نے اسلام کی حمایت کا کیا ہے وہ آج تک کسی مسلمان سے بن نہیں آیا، جب کہ مسلمان اسلام کے سوا سب مذہبوں کو باطل یا غلط سمجھتے ہیں اور اسلام کا ماننا تمام بنی آدم پر فرض جانتے ہیں تو ان کا فرض تھا کہ جن کو وہ گمراہ سمجھتے تھے، ان پر اسلام کی حقیقت اور اس کی خوبی ظاہر کرتے، ان کے ملکوں میں جا کر ان ہی کی زبان میں وعظ کہتے، اور ان ہی کی زبان میں اسلام کی حمایت پر کتابیں لکھتے، میں نہیں جانتا کہ تیرہ سو برس میں سید احمد خاں سے پہلے کسی ایک مسلمان نے بھی ایسا کام کیا ہو۔" (ایضاً ص ۱۲۲)

اس کتاب کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مناظرہ کے مخاصمانہ طریق کے بجائے دوستانہ اور غیر متعصبانہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے، مخاطب کو خاموش کرنے کے لئے الزامی جواب دینے کے بجائے اس کو مطمئن کرنے کی راہ اپنائی گئی، اور تحقیقی جوابات دیئے گئے ہیں، چنانچہ کرنل گریہم نے سرسید کی لائف میں خطبات احمدیہ کے اس امتیاز کا اعتراف کیا ہے، ان کے خیال میں اس کتاب سے مصنف کا غیر معمولی تعمق نظر، غیر مذہبوں سے بے تعصبی اور اصلی عیسائیت کے سچے اصول کا ادب ظاہر ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ

"جو لوگ مذہبی باتوں سے دلچسپی رکھتے ہیں، ان کو چاہیئے کہ اس کتاب کو

غصہ سے جو میں میور ہیں گویا کہ ان کے نزدیک بالکل ایک غیر معقول مذہب ہے اور

اسلام کو ایک روحانی لعنت خیال کرتے ہیں، اور ہر ایک غیر متعصب صداقت اور تحقیق

کی اس میں خیال کی جاتی ہے، لیکن ہمارے ناظرین کتاب جو اس غلطی میں مبتلا ہیں

جب سید احمد خاں کی اس کتاب کو غور سے پڑھیں گے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالکل دوسرے

خیالات لے کر اٹھیں گے۔ ہمارے مصنف (یعنی سید احمد خاں) نے اپنے دلی دوست سر ولیم میور

کی کتاب لائف آف محمدؐ کی تحریروں کی مخالفت کی ہے، اور خوب جھگڑے ہیں اور

میں خیال کرتا ہوں کہ بے تعصب اور نکتہ سنج ناظرین کتاب بہت سی باتوں میں مؤلف

کے خلاف فیصلہ دینے میں اتفاق کریں گے۔" (حیات جاوید ص ۱۲۶)

سر ولیم میور سے پہلے مستشرقین، اسلام کے روحانی اور الہامی پہلو پر اپنا زور تحقیق صرف کرتے تھے، لیکن اس نے تاریخی شہادتوں کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلامی تعلیمات، جدید دور کی شائستگی، تمدن اور حسن معاشرت کے خلاف ہیں، اس نے مسلمانوں کی موجودہ پستی اور تنزل کو براہ راست اسلامی تعلیمات کا نتیجہ قرار دیا (خطبات احمدیہ ص ۲۲)، یہ نکتہ چینی کا ایک نیا طریقہ تھا، جس میں غیر مستند روایتوں، کمزور تاریخی داستانوں اور رطب و یابس واقعات سے جن کے بیان کرنے والے خود کم رتبہ اور غیر معتبر ہوں مدد لی گئی تھی، سر سید مرحوم نے دو طویل خطبوں میں مسلمانوں کی مذہبی کتابوں اور ان کی روایتوں کی تفصیل بیان کی ہے، روایات کی تنقید کے جو اصول و قواعد محققین نے مقرر کئے ہیں، اور جو معیار انھوں نے معتبر اور غیر معتبر روایتوں کا قرار دیا ہے، ان کی تشریح کی ہے، جس سے سر ولیم میور کے استدلال کی ساری عمارت منہدم ہو جاتی ہے، انھوں نے کہا ہے کہ اسلام میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے، جو زمانہ حال کی شائستگی یا دنیوی ترقیات میں مانع ہو اور مسلمانوں کے اعمال و کردار جن کے نتائج وہ آج بھگت رہے ہیں، ان کے جہالت و خود

[illegible] کے اسلام پر انھوں نے سر ولیم میور کے مطاعن کا نہایت معقول دلائل اور دل نشیں پیرایہ میں جواب دیا ہے۔ (خطباتِ احمدیہ ص ۲۹۲)

اس کتاب کی ایک اہم خصوصیت اس کی سادگی، عام فہم اندازِ بیان اور منصفانہ طریقِ استدلال ہے۔ وہ اپنے مخاطب کو جواب دیتے ہوئے اپنی شرافت، نرم خوئی، اور ہمدردانہ لب و لہجہ کو برقرار رکھتے ہیں، چنانچہ اس کتاب کے مقدمہ ہی میں چند مستشرقین کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ

"(میں) ان لائق اور قابل اور عالم واجب التعظیم عیسائی مؤرخوں کا ذکر کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتا جنھوں نے نہایت انصاف سے اور بالکل بغیر تعصب کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور مذہب اسلام کی نسبت ٹھیک ٹھیک اپنی رائے لکھی ہے بلکہ متعصب اور تنگ حوصلہ مخالفوں کے مقابلہ میں مذہب اسلام کی حمایت کی ہے، اگرچہ بعض مقامات میں انھوں نے بھی کچھ کچھ نقص اور نقصان بیان کئے ہیں، لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کا بیان کسی تعصب پر مبنی نہیں ہے، بلکہ اس مسئلہ کی حقیقت وہ نہیں سمجھے یا غلط سمجھ گئے۔" (خطباتِ احمدیہ ص ۲۰)

انھوں نے اپنی کتاب میں مختلف موقعوں پر مستشرقین کے اقوال بھی اسلام کی حمایت میں نقل کر دیئے۔

خطباتِ احمدیہ کی ایک اور خصوصیت جس کا مولانا الطاف حسین حالی نے بھی حیاتِ جاوید (ص ۱۰۰) میں ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ ان خطبات میں کوئی بات ایسی نہیں جس کو اسلام کے اصول مسلمہ کے خلاف سمجھا جائے، سوائے دو ایک مسئلوں کے جہاں بعض علمائے محققین نے مجبوراً لکھا ہے، جس کو سرسید احمد خاں نے ترجیح دی ہے، مثلاً معراج [illegible] کے واقعہ کو جیسا کہ بعض صحابہ کا مسلک ہے، انھوں نے رویا پر محمول کیا ہے، اور شق صدر اور براق کی سواری کو بھی اسی رویا میں داخل کیا ہے یا ایک آدھ بات اور، ورنہ اس کتاب کی تالیف کے زمانہ تک

سرسید مرحوم نے [illegible] کی تھیں جو ان کی تفسیر القرآن میں ملتی ہیں جن کی وجہ سے ان کے بعض مذہبی خیالات پر اعتراضات کئے گئے، خطبات احمدیہ میں انھوں نے اسلام کی حمایت اور مختلف اعتراضوں کے جواب میں جمہور علماء ہی کے مسلک کی ترجمانی کی ہے، جس کی وجہ سے اس کتاب کی افادیت بڑھ گئی، اور اس نے اگر ایک طرف مستشرقین کے گروہ کو اور صاف ذہن عیسائیوں اور دوسرے غیر مسلموں کو اسلام کی حقانیت سے آگاہ اور مطمئن کیا، تو دوسری طرف تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بھی اسلام کے بارے میں مختلف غلط فہمیوں کے دور کرنے میں مدد دی۔

مستشرقین کے اعتراضات اور ان کے جوابات

سرسید مرحوم نے مستشرقین کے اعتراضات کے جو جوابات دیئے ہیں ان کے بارے میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ اس سلسلہ میں ان کی کوششیں خشتِ اوّل کی حیثیت رکھتی ہیں، انھوں نے اپنی اس کتاب میں سر ولیم میور کے علاوہ دوسرے مستشرقین کے خیالات کا بھی جا بجا تجزیہ کیا ہے، مستشرقین نے سب سے پہلے تو حضرت ابراہیم حضرت اسمٰعیل علیہما السلام سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبی وابستگی کا انکار کیا ہے، وہ مکہ میں حضرت اسماعیلؑ کی سکونت سے بھی انکار کرتے ہیں، قیدار کی عدنان سے اور عدنان کی حضرت اسمٰعیلؑ سے نسبت خاندانی کو بھی تسلیم نہیں کرتے اور اس بارے میں عربوں کی علم الانساب میں مہارت اور واقفیت کو مشکوک قرار دیکر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ توراۃ میں جو پیشین گوئیاں کی گئی ہیں، ان سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت مراد نہیں ہے۔

سرسید مرحوم نے بائبل کے فارسی ترجمہ سے توراۃ کی پیشین گوئی نقل کی ہے، لیکن ہم یہاں برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور مطبوعہ ۱۹۵۸ء کا اردو ترجمہ درج کرتے ہیں۔

"اور سارہ نے دیکھا کہ ہاجرہ مصری کا بیٹا جو اس کے ابرہام سے ہوا تھا ٹھٹھے مارتا ہے۔ تب اس نے ابرہام سے کہا کہ اس لونڈی کو اور اس کے بیٹے کو نکال کیونکہ اس لونڈی کا

بیٹے اضحاق کے ساتھ وارث نہ ہوگا۔ پر ابرہام کو اس کے بیٹے کے باعث یہ بات نہایت بری معلوم ہوئی۔ اور خدا نے ابرہام سے کہا کہ تجھے اس لڑکے اور اپنی لونڈی کے باعث برا نہ لگے جو کچھ سارہ تجھ سے کہتی ہے۔ تو اس کی بات مان کیونکہ اضحاق سے تیری نسل کا نام چلے گا۔ اور اس لونڈی کے بیٹے سے بھی میں ایک قوم پیدا کروں گا۔ اس لیے کہ وہ تیری نسل ہے۔ تب ابرہام نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور اسے ہاجرہ کو دیا بلکہ اسے اس کے کندھے پر دھر دیا، اور لڑکے کو بھی اس کے حوالہ کر کے اسے رخصت کر دیا، سو وہ چلی گئی، اور بیر سبع کے بیابان میں آوارہ پھرنے لگی۔ اور جب مشک کا پانی ختم ہو گیا تو اس نے لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا۔ اور آپ اس کے مقابل ایک تیر کے ٹپے پر دور جا بیٹھی اور کہنے لگی کہ میں اس لڑکے کا مرنا تو نہ دیکھوں سو وہ اس کے مقابل بیٹھ گئی، اور چلا چلا کر رونے لگی۔ اور خدا نے اس لڑکے کی آواز سنی اور خدا کے فرشتے نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا، اور اس سے کہا اے ہاجرہ تجھ کو کیا ہوا؟ مت ڈر کیونکہ خدا نے اس جگہ سے جہاں لڑکا پڑا ہے، اس کی آواز سن لی ہے۔ اٹھ اور لڑکے کو اٹھا، اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال، کیونکہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا۔ پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا اور جا کر مشک کو پانی سے بھر لیا، اور لڑکے کو پلایا۔ اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا، اور وہ بڑا ہوا، اور بیابان میں رہنے لگا اور تیر انداز بن گیا۔ اور وہ فاران کے بیابان میں رہتا تھا، اور اس کی ماں نے ملک مصر سے اس کے لئے بیوی لی۔ (پیدائش باب ۲۱ درس ۹-۲۱)

مذکورہ بالا پیشین گوئی واضح طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر دے رہی ہے، اسی لئے سرولیم میور اور بعض دوسرے مستشرقین نے اس کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اور

یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت اسماعیلؑ کی نسل سے نہ تھے، حضرت اسماعیلؑ یا ان کی اولاد مکہ میں آباد نہیں ہوئی، اور فاران سے حجاز کی وادی یا مکہ کو مراد لینا درست نہیں۔

فاران | "سر سید مرحوم نے سر ولیم میور کو جواب دیتے ہوئے پہلے تو یہ بتایا ہے کہ :-

عربی ترجمہ توریت سامری میں جس کو آرکونی ئن صاحب نے ۱۸۵۱ء میں بمقام لگڈنی بٹاورم چھپوایا ہے، اس میں فاران اور حجاز سے ایک ہی جگہ مراد لی ہے، اور فاران کے لفظ کے آگے خطوط ہلالی (قوسین) میں حجاز کا لفظ لکھ دیا ہے، اور وہ عبارت یہ ہے "وسکن فی بریۃ فاران (الحجاز) واخذت لہ امہ امرأۃ من ارض مصر، (عربی ترجمہ توراۃ سامری) (خطبات احمدیہ - ص ۱۱۲ -)

اس کے بعد وہ یہ وضاحت کرتے ہیں کہ عموماً عیسائی مؤرخ اس بات کو کہ فاران اور حجاز سے ایک ہی جگہ مراد ہے، تسلیم نہیں کرتے اسکے تسلیم نہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ اگر وہ اس کو تسلیم کرلیں تو اس بات کو تسلیم کرنا بھی لازم آتا ہے کہ جو پیشین گوئی توریت میں فاران کی نسبت بیان ہوئی ہے، بلاشبہ اس سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نبی ہونا مراد ہے"۔ (ایضاً ص ۱۱۲)

فاران سے ایک قول کے مطابق وہ وسیع قطعۂ زمین مراد ہے، جو بیر شبع کی شمالی حد سے لیکر کوہ سینا تک چلا گیا ہے، اور فاران کے نام سے مشہور ہے، اس کے حدود اربعہ یہ ہیں شمال میں کنعان، جنوب میں کوہ سینا، مغرب میں مصر اور مشرق میں کوہ سعیر، اس میں بے شمار چھوٹے چھوٹے بیابان ہیں جن کو ملا کر کل بیابان بنتا ہے، اور وہ چھوٹے چھوٹے بیابان علحدہ علحدہ ناموں سے معروف ہیں، مثلاً شور، بیر شبع، اشیام، سین، زین، عیدام وغیرہ، لیکن سر سید مرحوم کے خیال میں

"اس بیان کی تردید کے لئے ... اس سے بہتر کوئی بات نہیں کہ ... توریت مقدس کی چند آیتیں نقل کر دیں کیونکہ ان سے صاف منکشف ہو جاتا ہے کہ فاران خود ایک

جداگانہ بیابان ہے۔ اور دونوں جگہ کے بیابان اس میں شامل نہیں۔

(الف) تب بنی اسرائیل دشت سینا سے کوچ کر کے نکلے اور وہ ابر دشت فاران میں ٹھہر گیا۔ (گنتی باب ۱۰ درس ۱۲) اس عبارت سے جس کا مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے بیابان سینا سے کوچ کیا، اور بیابان فاران میں مقام کیا، قرار واقعی ثابت ہوتا ہے۔ کہ وہ دونوں بیابان ایک دوسرے سے علیٰحدہ اور جداگانہ بیابان تھے،

(ب) اور چودھویں برس کدرلاعمر اور اس کے ساتھ کے بادشاہ آئے اور رفائیم کو عستارات قرنیم میں اور زوزیوں کو ہام میں اور ایمیم کو سوی قریتیم میں اور حوریوں کو ان کے کوہ شعیر میں مارتے مارتے ایل فاران تک جو بیابان سے لگا ہوا ہے آئے۔ (پیدائش باب ۱۴ درس ۵ تا ۶) پس جب تک کہ بیابان فاران کو ایک علیٰحدہ مقام نہ تسلیم کیا جائے اس درس کی عبارت مہمل ہو جاتی ہے۔ (خطبات احمدیہ ص ۱۱۵)

مزید وضاحت کے لئے ہم تورات سے درج ذیل اقتباسات بھی پیش کرتے ہیں:۔

(ج) اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ تو آدمیوں کو بھیج کہ وہ ملک کنعان کا جو میں بنی اسرائیل کو دیتا ہوں حال دریافت کریں۔ ان کے باپ دادا کے ہر قبیلہ سے ایک آدمی بھیجنا جو ان کے ہاں کا رئیس ہو۔ چنانچہ موسیٰ نے خداوند کے ارشاد کے موافق دشت فاران سے ایسے آدمی روانہ کئے جو بنی اسرائیل کے سردار تھے۔ (گنتی باب ۱۳ درس ۱ تا ۳)

(د) اور وہ چلے اور موسیٰ اور ہارون اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت کے پاس دشت فاران کے قادس میں آئے اور ان کو اور ساری جماعت کو ساری کیفیت سنائی اور اس ملک کا پھل ان کو دکھایا۔ (گنتی باب ۱۳ درس ۲۶)

(ہ) اور اس نے کہا، خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر آشکار ہوا، وہ کوہ فاران

جلوہ گر ہوا، اور لاکھوں (فارسی ترجمہ میں ہے "باہزار ہا قدسیان") قدسیوں میں سے آیا اس کے داہنے ہاتھ پر ان کے لئے آتشی شریعت تھی۔ (استثناء باب ۳۳ درس ۲)

(و) خدا تیمان سے آیا اور قدوس کوہ فاران سے۔ سلاہ۔ اس کا جلال آسمانوں پر چھا گیا اور زمین اس کی حمد سے معمور ہو گئی۔ (حبقوق باب ۳ درس ۳)

(ز) اور وہ مدیان سے نکل کر فاران میں آئے اور فاران سے لوگ ساتھ لیکر شاہ مصر فرعون کے پاس مصر میں گئے۔ (سلاطین اول باب ۱۱ درس ۱۸)

فاران کے بارے میں بعض مصنفوں کا گمان ہے کہ قادیش جہاں کہ حضرت ابراہیمؑ نے ایک کنواں بیر شبع کھودا تھا، اور فاران ایک ہی جگہ ہے، سر سید مرحوم نے اس قول کی تردید میں (گنتی باب ۱۳ درس ۲۶ کے علاوہ) توراۃ کی یہ عبارت بھی پیش کی ہے۔

"اور حوریوں کو ان کے کوہ شعیر میں مارتے مارتے ایل فاران تک جو بیابان سے لگا ہوا ہے آئے پھر وہ لوٹ کر عین مصفات یعنی قادس پہنچے اور عمالیقوں کے تمام ملک کو اور اموریوں کو جو حصیصون تمر میں رہتے تھے مارا۔ (پیدائش باب ۱۴ درس ۶، ۷، ۸)

وہ لکھتے ہیں کہ (مذکورۂ بالا اقتباس میں) جب تک قادیش اور فاران دو جداگانہ اور مختلف بیابان نہ قرار دیئے جائیں ورس مذکورۂ بالا کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے۔ (ایضاً ص ۲۷۱)

فاران کے بارے میں تیسری بات مسٹر روپ وغیرہ کی بیان کردہ یہ ہے کہ فاران اس بیابان کا نام ہے، جو کوہ سینا کے مغربی ڈھلاؤ پر واقع ہے، اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہاں ایک مقام ہے، جو فاران کے نام سے مشہور ہے، مگر سوال یہ ہے کہ آیا وہ وہی بیابان ہے، جس کا ذکر سفر تکوین پیدائش میں آیا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ صحرائے بیر شبع میں سرگردانی کے بعد وہاں آکر ٹھہرے تھے؛ اور کیا وہ وہی مقام ہے جہاں حضرت اسماعیلؑ متوطن ہوئے تھے، اگر یہ ثابت ہو جائے کہ

حضرت اسماعیل [illegible] تھے تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ یہ فاران وہ فاران
نہیں ہے، جس کا ذکر کتاب پیدائش میں آیا ہے۔ سرسید مرحوم نے مذکورہ بالا رائے کی
بھی تردید کی ہے، اور لکھا ہے کہ "کوئی کافی روایت ایسی موجود نہیں جس سے یہ ثابت
ہو کہ حضرت اسماعیل نے اس جگہ سکونت اختیار کی تھی اور ریورنڈ مسٹر فارسٹر جو اسی مقام کو حضرت
اسماعیل کی سکونت کی جگہ خیال کرتے ہیں، اور جس قدر دلائل اس کی تائید میں لاتے ہیں، وہ کسی قسم کی
شہادت پر مبنی نہیں ہیں۔ مصنف موصوف نے سفر تکوین (پیدائش) باب ۲۵ ورس ۱۸ پر جس کی یہ عبارت
ہے "اور اس کی اولاد حویلاہ سے شور تک جو مصر کے سامنے اس راستہ پر ہے جس سے اسور کو جاتے ہیں آباد تھی"
سے استدلال کر کے بیان کیا ہے کہ "خدائے تعالیٰ کے وعدے سب میں ایفا ہو گئے تھے، جبکہ اسماعیلیوں کی آبادی
سور سے حویلاہ تک انتہائے عرب میں سرحد مصر سے لے کر دہانۂ فرات تک پھیل گئی تھی"، اول
غلطی صاحب موصوف کی یہ ہے کہ حویلاہ کو دہانۂ فرات پر قرار دیا ہے۔ اصل حویلاہ جس کے بانی کا نام
سفر تکوین باب ۱۰ ورس ۲۹ میں مذکور ہے، نواح یمن میں عرض بلد شمالی ۱۱ درجہ ۳۰ دقیقہ اور طول
بلد شرقی ۴۲ درجہ ۳۶ دقیقہ پر واقع ہے، اور اس کی کامل تصدیق عرب کے اس نقشہ کے ملاحظہ
سے ہو سکتی ہے، جو عرب کے جغرافیہ کی شکل کے مطابق ہے، وہ اکثر صاحب کے نقشۂ کلاں سے چھوٹا کر کے
بنایا گیا ہے، اور اس کے ساتھ شام اور مصر کے ان اقطاع کو بھی زیر نظر رکھنا چاہیے جن کا نقشہ
ریورنڈ ڈاکٹر ٹی پی گیرے ایم اے نے مرتب کیا ہے، دوسری غلطی یہ ہے کہ مصنف موصوف نے
اور عیسائی مورخوں اور جغرافیہ دانوں کی تقلید میں "شور" کو عرب الحجر کے مغرب میں قرار دیا جو جہاں
صحرائے ایتام واقع ہے، اور یہ قطعی غلطی ہے، کیونکہ "صحرائے شور" سے توریت مقدس میں مراد تمام
وہ وسیع میدان ہے جو شام سے لیکر جانب جنوب ملک مصر تک منتہی ہوتا ہے" اس کے بعد وہ
اپنا خیال یوں ظاہر کرتے ہیں:

کتب مقدسہ توریت میں صرف دو نام ہیں شور اور شام جو خلیج عقبہ سے مصر کے سامنے ...
ناموں میں سے شور سے مراد شام اور شور سے مراد عرب ہے، اس سے صاف واضح ہے کہ بنی اسمٰعیل
اس وسیع قطعے میں آباد ہوئے تھے جو شمالی حدود یمن سے جنوبی حدود شام تک ختم ہوتا ہے یہ جگہ اب عام
حجاز معروف ہے اور فاران سے مطابقت رکھتی ہے، ہمارے اس نتیجہ کی اس امر سے بھی تصدیق ہوتی
ہے کہ یہی سرزمین ٹھیک مصر کے سامنے واقع ہوتی ہے، اگر کوئی شخص وہاں سے اسیریا کی جانب
غلیت کرے اور توریت مقدس کی اس آیت کی کماحقہ تصدیق ہوتی ہے جہاں لکھا ہے جو کہ سامنے
مصر کے ہے، اگر تو اسیریا کی طرف روانہ ہو یعنی مصر کے سامنے ہے، اگر تم ایک خط مستقیم وہاں
سے اسیریا تک کھینچو۔ (خطبات احمدیہ ص ۱۱۹)

انھوں نے کوہ سینا کے مغربی ڈھلاؤ پر واقع فاران کے بارے میں تفصیل سے یہ بتایا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی کتب خمسہ میں ان کا کچھ بھی ذکر نہیں (۱۲۲) سینا سے بنی اسرائیل کا سفر مشرق کی جانب تھا جس میں انھوں نے پہلی منزل تبعیرہ (گنتی باب ۱۱ ورس ۳) میں کی پھر قبروت ہتاوا آئے، اور وہاں سے حصروت پہنچے (گنتی باب ۱۱ ورس ۳۴، ۳۵) اور اس اخیر مقام سے کوچ کر کے بیابان پاران میں داخل ہوئے، (باب ۱۲ ورس ۱۶) چونکہ یہ پاران وہی جگہ ہے، جہاں ابر کا ظہور نمایاں کیا گیا ہے، اس لیے کچھ شک نہیں کہ حضرت موسیٰؑ کا سفر شمالی اور مشرقی سمت میں تھا یعنی قادیش کی طرف (باب ۱۳ ورس ۲۶) اس لئے وہ فاران جس کا ذکر حضرت موسیٰؑ نے کیا ہے، سینا کے مغربی جانب نہیں ہو سکتا، بنی اسرائیل کی صحرا نوردی کے عیسائی علماء نے پانچ مختلف راستے بتائے ہیں، جس سے کہ اختلاف کی صورت میں۔

"اگر بیابان فاران سے وہ سارا وسیع میدان مراد لیا جائے جو شام سے یمن تک چلا گیا
ہے، جیسا کہ خود کتاب مقدس میں مذکور ہے، اور صرف ملکی روایتیں ہی اس کی تائید نہیں
کرتیں بلکہ مشرقی مؤرخ بھی اسی کے مؤید ہیں، تب حضرت موسیٰؑ کے کوچ کے تمام بیان کی

تعیین ہو جاتی ہے اور اس کی صحت کی تصدیق ہوتی ہے۔" (خطبات احمدیہ ص ۱۲۵)

توریت (پیدائش باب ۲۱ درس ۱۴-۱۵) سے یہ بات سمجھنا درست نہ ہوگا کہ حضرت ہاجرہؓ بیر شبع ہی میں پھرتی رہیں، اور اسی مقام پر صرف وہی پانی جو حضرت ابراہیمؑ نے ان کو دیا تھا ان کے پاس تھا، اور وہ بھی ختم ہو گیا تھا، سرسید مرحوم کے نزدیک دو وجہ سے اس درس کے ایسے معنی لینے صحیح نہیں ہیں، اوّل اس وجہ سے کہ بیر شبع جو حضرت ابراہیمؑ نے قادیش کے نزدیک کھودا تھا، اور جس کے نواح میں وہ خود ایک عرصۂ دراز تک رہے تھے، ایک ایسا مقام تھا جس کے حالات اور جس کے قریب پانی کے کنوؤں کا ہونا، حضرت ہاجرہؓ سے پوشیدہ نہ تھا، دوم اس وجہ سے کہ بیابان بیر شبع میں پانی کا اس قدر نایاب ہونا ناممکن تھا، کیونکہ وہاں صرف حضرت ابراہیمؑ ہی کے بنائے ہوئے کنوئیں نہیں تھے، بلکہ قوم فلسطین کے تعمیر کیے ہوئے بھی موجود تھے، (پیدائش باب ۲۶ درس ۱۸ تا ۲۲) سرسید مرحوم کے نزدیک اس عبارت کے صاف اور صریح معنی یہ ہیں کہ:-

"مکان سے نکلنے کے بعد حضرت ہاجرہؓ بیابان بیر شبع میں پھرتی رہیں، مگر ملک کا وہ حصہ سکونت کے قابل نہ تھا، کیونکہ بیر شبع کے ارد گرد..... قومیں..... لڑاکا اور جھگڑالو تھیں..... اس لیے حضرت ہاجرہؓ نے ایسے مقام پر جانے کا خیال کیا ہوگا جہاں ان کو امن ملے اور آسائش سے رہ سکیں..... لیکن جب وہ بیابان فاران میں پہنچی ہوں گی تو پانی ملنے کی مشکل پیش آئی ہوگی، کیونکہ اس بیابان میں پانی نہایت نایاب تھا..... جب اس مقام پر پہنچیں جہاں اب مکہ معظمہ ہے، تو ان کے پاس پانی باقی نہیں رہا تھا..... خانہ بدوش عرب پانی کے چشمے کو..... چھپا دیتے تھے،..... جس وقت حضرت ہاجرہؓ مضطربانہ ادھر ادھر دوڑ رہی تھیں، تو ان کو وہ چشمہ مل گیا توریت مقدس کی عبارت سے بھی اسی طرف اشارہ پایا جاتا ہے، جہاں لکھا ہے، "پھر خدا نے اس کی آنکھیں

اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا، اور جا کر مشک کو پانی سے بھر لیا اور لڑکے کو پلایا" (پیدائش باب ۲۱ ورس ۱۹) ... بہرحال حضرت ہاجرہ نے اس مقام پر جہاں ان کو پانی کا چشمہ ملا تھا، رہنا شروع کیا، جب اور لوگوں کو اس چشمے کی خبر ہوئی تو بنو جرہم کے بہت سے لوگ اس کے قرب و جوار میں آکر آباد ہوگئے" (خطبات احمدیہ ص ۱۱۲)

سرسید مرحوم، بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل کی اولاد در اولاد کی مختلف نسلوں اور انکی متعدد شاخوں سے بحث کرتے ہوئے یہ بتاتے ہیں کہ "تمام تلاش اور تفتیش کے بعد جو ہم نے حضرت اسماعیلؑ کی اولاد سے ابتدائی مقام سکونت کے باب میں کی اس سے یہ نتیجہ پیدا ہوا کہ ان کے آثار یمن (حویلاہ) سے لیکر شام (شور) تک پائے جاتے ہیں، اور اس طرح پر حضرت موسیٰؑ کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے، جو سفر تکوین باب ۲۵ ورس ۱۸ میں مندرج ہے، کہ "وہ حویلاہ سے شور تک آباد ہوئے، جو سامنے مصر کے ہے، جب تو اسیریا کو روانہ ہو"

(خطبات احمدیہ ص ۱۳۱) (باقی)

حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ

اپنی

سیرۃ النبیؐ میں انشا پردازی کی حیثیت سے

از سید صباح الدین عبدالرحمن

تمہید اس خاکسار کو حضرت مولانا سید سلیمان ندوی قدس سرہ العزیز کے ادنیٰ شاگرد ہونے کی سعادت حاصل ہے، اس تعلق کی بنا پر وہ سمجھتا ہے کہ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد حضرت استاذی المحترم سب سے اچھے ماہر قرآنیات، سب سے اچھے ماہر حدیث، سب سے اچھے ماہر علم کلام، سب سے اچھے سیرت نگار، سب سے اچھے مورخ اور سب سے اچھے انشا پرداز تھے، آپ کو اختیار ہے کہ آپ اس سے اختلاف کریں، مگر آپ کو اس کا بھی حق نہیں کہ آپ اس خاکسار کو اپنی یہ رائے قائم کرنے کے حق سے محروم کردیں، آپ کو اپنی پسند ہے تو اس خاکسار کو بھی اپنی پسند ہے۔

یہ موقع تو نہیں کہ اس دعویٰ کو ثابت کیا جائے کہ وہ علامہ شبلیؒ کے بعد کس طرح سب سے اچھے ماہر قرآنیات، ماہر حدیث، ماہر علم الکلام، سیرت نگار اور مورخ تھے، مگر یہاں پر ان کی انشا پردازی سے متعلق کچھ باتیں عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا، اس سلسلہ میں ان کا یہ جوہر ان کی مشہور تصنیف سیرۃ النبیؐ میں کیسے چمکتا دکھائی دیتا ہے، اس کی طرف خاص توجہ دلانی ہے۔

جن کسی کو ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا اس نے ان کو طہارت، شرافت، تمکنت، عظمت، سنجیدگی، ادب، وقار کا پیکر پایا، ان ہی اوصاف کی بوقلمونی ان کی تحریروں اور کتابوں میں نظر آتی ہے،

ان کی تصنیف ارض القرآن میں سنجیدگی ان کے قلم کی متانت کی، ان کی کتاب سیرت عائشہؓ
میں ادب و احترام بچھا ہوا دکھائی دے گا، ان کی شعر و سخن کے نغمات اور نغموں میں لطافت کے
قلم سے ہم آغوش دکھائی دے گی، اور پھر ان کی شہرۂ آفاق سیرۃ النبیؐ میں خلوت اور وقار ہر سطر میں تسلیم خم
کرتے ہوئے دکھائی دیں گے، وہ اپنی ان ہی خصوصیات کی بنا پر کبھی اللہ تبارک تعالیٰ کی ذات پاک کا
جلال، کبھی اس کی صفات کاملہ کا جمال، کبھی اس کے مرغ و ماہی، اور کبھی بندوں کی مجبور و محکوم دنیا میں
اس کی بادشاہی دکھاتے رہے، کبھی رسول اللہ صلعم کی سیرت مقدسہ کے گلشن میں نسیم نو بہاری بن کر
اس کے گل و سرو صنوبر سمیٹتے رہے، کبھی تفسیر کے دریا میں مثل موج ابھر کر، کبھی حدیث کے دریائے سیال
سے گذر کر، کبھی تاریخ کے دریا کے سینے میں اتر کر، کبھی ملی سیاست کے جذبات کا تلاطم ابھار کر،
کبھی اپنے محبوب معاصروں کی موت پر اپنے آنسوؤں کا سیلاب بہا کر، اور کبھی انداز بیان کے کوثر و
تسنیم کو رواں کر کے اپنے علم و قلم کے مقام خودی کو فاش تر کرتے رہے،

سیرۃ النبی جلد اول و دوم تو علامہ شبلی نعمانیؒ کی لکھی ہوئی ہیں، لیکن سیرۃ النبیؐ کی تیسری جلد
سید صاحب کی اپنی تصنیف ہے، گو اس کے ۸۰۰ صفحوں میں ۸۲ صفحے مولانا عبدالباری ندوی کے
لکھے ہوئے ہیں، اس کا موضوع معجزات ہے اس میں معجزات کے امکانات، تاثیرات فلکیہ، علل خفیہ، قوت
کمالیہ، قوت نفسیہ، تاثیرات نفسانیہ، مکالمۂ الٰہی، وحی، نزول ملائکہ، عالم رویا، مشاہدات، مسموعات
اسرار رویائے معراج، معراج کے اسرار، اطلاعات اور انعامات، شق القمر، اور شق صدر وغیرہ جیسے غامض
پر مباحث ہیں، ان میں کبھی اشاعرہ، اور کبھی معتزلہ کے نقطہ ہائے نظر پیش کئے گئے ہیں، کبھی ابن رشد،
ابن تیمیہ، یعقوب کندی اور اصفہانی کی تصانیف کی ورق گردانی کی گئی ہے، ان تمام مباحث کی بنیاد
قرآن مجید اور احادیث پر رکھی گئی ہے، یہ موضوع آسان نہ تھا، خشک مشکل اور سنگلاخ تھا، اس کے
غامض مباحث میں اغلاق اشکال اور ابہام کے پیدا ہونے کا احتمال تھا، لیکن ان کو پیش کرنے میں

سید صاحب نے یہ طاقت ور انداز بیان اختیار کیا کہ جو چیزیں معلوم تھیں، وہ از سر نو معلوم ہونے لگی تھیں، اور جو چیزیں معلوم نہیں تھیں، ان کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ خیال کے خارستان میں لالہ زار دکھائی دے رہا ہے، اور ظنیات کے ریگستان میں ایک نئے قسم کا گلزار آباد ہو رہا ہے، شکوک و شبہات کی تاریکی میں ایمان کی مہتابی پھیل رہی ہے، پوری کتاب ایک عاشق اسلام کے بے قرار دل، ایک بیدار مغز متکلم کے مستحکم دلائل اور ایک رمز شناس عالم کی گہری نگاہ کے ساتھ لکھی گئی ہے، جس میں قرآن مجید کی آیتوں کے ہیروں کی کان کنی بھی کی گئی ہے، اور حدیث کے خزانے سے زمرد اور یاقوت بھی بکھیرے گئے ہیں، اس کو پڑھتے وقت یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت تک سید صاحب کی علمی معرفت اور تحقیقی نظر اپنے اوج کمال پر پہونچ رہی تھی، جس کو قلمبند کرنے میں ان کے قلم کی شگفتگی، تحریر کی روانی، زبان کی بے تکلفی، طرز استدلال کی ندرت، فصاحت کی دل نشینی اور بلاغت کی دل آویزی انکا پورا ساتھ دے رہی تھی اور انھوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری لکھنے یا پھول کو زیب چمن بنا کر اس کی شمیم انگیزی کرنے یا بوئے گل کو نسیم سحر سے پھیلانے، حسینوں کی مشکیں زلفوں کی شانہ نوازی اور عنبریں بانہوں کی مرصع آرائی کرنے میں تو انشا پردازی کا جوہر دکھانا بہت آسان ہے، لیکن موضوع کی سنگلاخی کے ساتھ افکار و مباحث کا قصر شیریں تعمیر کر کے اس کے اندر سے زبان کی جوئے شیر بہانا بہت مشکل ہے، اس کتاب کا مطالعہ کرتے وقت یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ اردو زبان کو ایسا پیرایۂ بیان مل رہا تھا جس سے اور دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی طرح اس میں بھی غور طلب اور دقائق کو شگفتہ اور شستہ طرز ادا میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

اس کتاب کی تمہید بھی پوری ادبی شان سے لکھی گئی ہے جس کے کچھ ٹکڑے یہ ہیں۔

" سیرت نبوی کا یہ حصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان حالات، مشاہدات اور کیفیات کے بیان میں ہے، جن کا تعلق اس عالم سے ہے، جو جامہ اس مادی عالم اور اس کے مادی

قوانین کے حدود سے باہر ہے، جس طرح بیداری کے بعد نیند کا ایک خاص وقت ہے، جس طرح
رات کے بعد دن نمودار ہوتا ہے، خزاں کے بعد بہار آتی ہے، ستارے غروب ہوتے ہیں، آفتاب
نکلتا ہے، گرمی جاتی ہے تو جاڑے آتے ہیں، پھول اپنے وقت پر کھلتے ہیں، درخت اپنے موسم میں
پھلتے ہیں، ستارے اپنے معین اوقات پر ڈوبتے اور نکلتے ہیں، اسی طرح روحانی عالم بھی اپنا
ایک خاص نظام رکھتا ہے، اس کا بھی ایک آسمان و زمین ہے، وہاں بھی تاریکی اور روشنی
ہے، خزاں اور بہار ہے، فصل و موسم ہے،

آشنا شناست و نظایت جہاں　　　کار فرمائے آسمان جہاں

تحریک یہ روانی رکتی نہیں اور بہتی چلی جاتی ہے، اس کے فوراً ہی بعد رقمطراز ہیں۔ (جلد ۳ صفحہ ۱)

"جب روئے زمین پر گناہوں کی تاریکی اور بدیوں کی ظلمت محیط ہو جاتی ہے، تو
صبح کا ظہور ہوتا ہے، اور آفتاب ہدایت نمودار ہوتا ہے، باغ عالم میں جب برائیوں کی
خزاں چھا جاتی ہے، تو موسم بدلتا ہے، اور بہار نبوت رونق افزا ہوتی ہے" (ایضاً ص ۱)
کس طرح؟ اس کو متکلمانہ رنگ میں اس طرح قلمبند کرتے ہیں۔

"اور جس طرح زمین، آسمان، سورج، پھل اور پھول کے خاص خاص قوانین
فطرت ہیں جن میں عموماً تغیر نہیں ہوتا، اسی طرح دنیا کے رشد و ہدایت، عذاب و رحمت
اور نبوت و رسالت کے خاص خاص اصول و قواعد ہیں، جن میں تغیر راہ نہیں پاتا،
انبیاء و رسل اپنے، اپنے وقت پر مبعوث ہو کر قوموں کو دعوت دیتے ہیں، قومیں ان کی
تصدیق یا تکذیب کرتی ہیں، منکرین ہلاک اور مومنین کامیاب ہو جاتے ہیں، اس روحانی
جہاد میں انبیاء و رسل سے ہمارے علم و دانش سے بالاتر افعال صادر ہوتے ہیں، اور
اللہ کے عجیب خوارق ظہور پذیر ہوتے ہیں۔" (ایضاً جلد ۳ صفحہ ۲)

ایسے شخص وہ رنگ میں کچھ فلسفیانہ شگفتگی پیدا کر دیتے ہیں کہ

"جس طرح ہمارا نفس اور جانی روح یا ہمارے جسم کی پراسرار مخفی قوت ہمارے کالبد خاکی پر حکمران ہے، اور ہمارے تمام اعضاء و جوارح اس کے ایک ایک اشارہ پر حرکت کرتے ہیں، اسی طرح نبوت کی روح اعظم [illegible] عالم جسمانی پر حکمران ہو جاتی ہے، اور روحانی دنیا کے سنن و اصول عالم جسمانی کے قوانین پر غالب آجاتے ہیں، اس لئے وہ چشم زدن میں فرش زمین سے عرش بریں تک عروج کر جاتی ہے" (ندوہ ۳ ص ۲)

اس کے بعد نبی کی عظمت اور فضیلت کا احساس دلانے میں ان کی انشاپردازی کے جلوے اس طرح نمایاں ہوتے ہیں۔

"سمندر اس کے ضرب سے تھم جاتا ہے، چاند اس کے اشارے پر ٹکڑے ہو جاتا ہے، اسکے ہاتھوں کی دی ہوئی چند خشک روٹیاں ایک عالم کو سیر کر دیتی ہیں، اس کی انگلیوں سے پانی کی نہریں بہتی ہیں، اس کے نفس پاک سے بیمار تندرست ہو جاتے ہیں، اور مردے جی اٹھتے ہیں، وہ تنہا مٹھی بھر خاک سے پوری فوج کو نابینا کر دیتا ہے، کوہ و صحرا، بحر و بر، جاندار و بے جان بحکم الٰہی اس کے آگے سرنگوں ہو جاتے ہیں، مگر باایں ہمہ وہ بندہ اور بشر ہوتا ہے، اور اس سے یہ جو کچھ عجائب قدرت ظاہر ہوتے ہیں، وہ اس کا نہیں بلکہ اس کے رب کا فضل ہوتا ہے، اور اسی کی حیثیت اور قدرت سے پیغمبر کے ہاتھ سے ظاہر ہوتے ہیں، یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لئے ظاہر کئے جاتے ہیں۔" (ایضاً جلد ۳ صفحہ ۳)

پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے بندوں کی بے چارگی، مجبوری، بے کسی اور لاعلمی کی مرقع آرائی اس طرح کرتے ہیں کہ اس میں منطقیانہ دلائل آگئے ہیں اور تاریخی کا لطف بھی۔

"لیکن جس طرح ہم کبھی یہ نہیں بتا سکتے کہ ننھا سا پھول، ننھا سا درخت، ننھا سا"

ستارے فلاں فلاں سمت و وضع میں کیوں جلوہ نما ہوتے ہیں، پھول سرخ کیوں ہوتے ہیں،
ستارے چمکتے کیوں ہیں، شہد میٹھا کیوں ہوتا ہے، چاند اور سورج چمکتے کیوں ہیں، تخم، درخت
غذا، خون اور گوشت کیونکر بن جاتے ہیں، اسی طرح اس کا جواب بھی نہیں دے سکتے، کہ
پیغمبروں کا ظہور اپنے اپنے وقت پر کیونکر ہوتا ہے، اور ان سے یہ مافوق العادۃ افعال، اعمال
بحکم الٰہی کیوں کر صادر ہوتے ہیں، ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ دنیا کا مذہبی
بلکہ روحانیت کا ہر عالم اپنی پر اسرار زندگی کے اندر اس قسم کے حالات و کیفیات کی ایک
دنیا رکھتا ہے، عالم کی تاریخ آپ کے سامنے ہے، جس میں اگر قوموں کے روحانی معلموں کے حالات
و سوانح غور سے پڑھیں، تو آپ کو ہر جگہ نظر آئے گا کہ وہ وہ کچھ دیکھتے تھے، جو ہم نہیں دیکھ سکتے
وہ وہ سنتے تھے جو ہم نہیں سن سکتے، وہ وہ کچھ جانتے تھے، جو ہم نہیں جان سکتے، اور ان سے افعال بھی
صادر ہوتے تھے، جو کسی اور سے نہیں ہو سکتے، یہ وہ تاریخی واقعات ہیں، جن سے انکار کرنا اسی طرح
ناممکن ہے، جس طرح سکندر، اور نپولین کے فتوحات یا موسیٰؑ اور عیسیٰ علیہما السلام کے وجود سے

(سیرۃ النبیؐ جلد ۳ - صفحہ ۱۰۴)

اس کتاب کا موضوع معجزات ہے، اس لیے اس میں فلسفیانہ مباحث بھی آگئے ہیں، مثلاً
پیغمبروں کی خصوصیات میں ایک چیز خواب بھی ہے، جس کو مذہبی اصطلاح میں رؤیائے صالحہ یا
رؤیائے صادقہ کہتے ہیں، عالم رؤیا کے عنوان سے اس کی بحث کی ابتدا انداز تحریر کی بلاغت
کا لحاظ رکھتے ہوئے کرتے ہیں۔

”رؤیا اور خواب درحقیقت نفس یا روح کے عجائبات کا ایک حیرت
انگیز طلسم ہے، علمائے نفس کہتے ہیں کہ اس کی حقیقت یہ ہے، کہ انسان کے قوائے نفسی و دماغی
ہر وقت اور ہر آن اپنے ذہنی اعمال میں مصروف رہتے ہیں، جب وہ سو جاتا ہے، اور

اس کے ظاہری حواس بیکار ہو جاتے ہیں تاہم قوت باطن کے فکر و تفکر کا عمل جاری رہتا ہے،
گو بھی انسان حسی اور پرسکون نیند سو جاتا ہے، اس سے جاگنے کے بعد اس کو ان حالات
خواب کا احساس نہیں ہوتا، لیکن کبھی کبھی جب اس کی نیند مستغرق اور گہری نہیں ہوتی، تو ان کو
بیداری کے بعد ان کے کچھ نامکمل مناظر یاد رہ جاتے ہیں، اسی کا نام خواب ہے" (جلد سوم ص ۳۰۳)

سید صاحب اس کو فلسفہ قدیم کا فرسودہ خیال قرار دیتے ہیں، اور پھر جدید عہد ترقی میں اس کا
جو تجزیہ کیا گیا ہے، اس کو اس طرح آسان طریقہ سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

"پھر جدید عہد ترقی میں سائیکولوجی اور نفسیات کے علماء کا مشہور و معقول نظریہ ہے
کہ ہم عالم بیداری میں اپنے جن خیالات، جذبات، ارادوں اور تمناؤں کو جان کر یا بے جانے
کسی سبب سے دبا دیتے ہیں اور مغلوب ہیں، جب ہمارے تعقل اور احساس کی جابرانہ حکومت ان سے
اٹھ جاتی ہے، ان کو ابھرنے کا موقع ملتا ہے، اور وہ ہم کو خواب بن کر نظر آتے ہیں" (ایضاً)

سید صاحب اس رویا کو خواب یا اوہام دماغی سے تعبیر کرتے ہیں، پھر عرفائے روح کے
نزدیک رویا کی کیا حقیقت ہے، اس کو اپنی نظر کی باریک بینی سے اس طرح قلمبند کرتے ہیں۔

عرفائے روح ... کے نزدیک رویا کی حقیقت کچھ اور ہے، وہ کہتے ہیں کہ انسان
جسم و روح سے عبارت ہے، روح جب تک جسم کے اندر ہے، اس کی جلوہ نمائی کے
دو رخ ہیں، جسمانی اور روحانی، اپنے جسمانی دروازہ سے وہ جھانکتی ہے تو اس کو جسم کے مادہ
کی سطح پر رنگارنگ نقش و نگار اور گلکاریاں نظر آتی ہیں، یہ اس کے وہ تعلقات
اور دلچسپیاں ہیں، جو اس کے اس جسمانی و مادی عالم کے ساتھ قائم ہیں، لیکن اس کے
پیچھے ایک دوسرا دروازہ ہے، جہاں سے وہ روحانیت کے عالم کی سیر کر سکتی ہے جس قدر
اس کا تعلق انس، دلبستگی، شیفتگی، اور مشغولیت عالم جسم سے زیادہ ہوگی اسی قدر دوسرے

عالم کی طرف سے فراموشی، غفلت اور بے تعلقی زیادہ ہوگی اسی قدر عالم غیب سے
کھڑکی جسمانی مصروفیتیں کم ہو کر جاتی ہیں، یعنی جتنی ہیں کہ وہ بھی کھڑکی کھل کر
جھانکنے کی فرصت مل جاتی ہے اور پھر روح کو جسم کے تعلقات سے باہر جاکر بیگانگی زیادہ
ہو جاتی ہے، شہرستان ملکوت میں اس کی سیر بہت آگے تک اور بہت دور تک
اور وہاں کے تمثیلی مناظر و مشاہدات سے اس کی اطلاع اور واقفیت زیادہ وسیع اور
بھی ہوتی ہے، جو روحیں کہ اس عالم کی جابی کی بندشوں میں رہ کر بھی ان میں گرفتار
اور مقید نہیں ان کے لیے عالم بیداری بھی اقلیم روح کی گلگشت سے مانع نہیں، اسی کا
نام مشاہدہ اور مکاشفہ ہے۔" (سیرۃ النبی جلد ۳۔ صفحہ ۳۲۲-۳۲۱)

یہ کیسا خشک موضوع تھا، لیکن سید صاحب نے اپنی تحریک روانی سے اس میں خشکی پیدا ہونے
نہیں دی فلسفیانہ مباحث میں اپنے انشا کا جوہر دکھا کر کیسی رنگینی پیدا کردی ہے۔

سید صاحب نے معجزات کی بحث میں مادہ یعنی ہیولیٰ، حوادث بلا سبب موثر تاثیرات فلکیہ، علل
خفیہ، قوت کمالیہ، قوت نفسیہ اور تاثیرات نفسانیہ، وغیرہ جیسے فلسفیانہ مباحث کو سلیس اور
فصیح زبان میں سمجھایا ہے۔ وہ ان حکمائے اسلام کے ادراک ہی کی طرح ہے، جو ان مباحث کے بڑے
ماہر سمجھے جاتے ہیں۔

معراج کے ذکر کی جو دل نشین اور فصیح تمہید ہے، اس کو پڑھنے سے اس کی ساری کیفیات ذہن پر
چھا جاتی ہیں، اور اس کو قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ فصاحت کی یہی تعریف ہے، کہ
جو کچھ لکھا جائے، اس میں دل نشینی ہو۔ ذیل کی عبارت کو اسی حیثیت سے ملاحظہ کریں۔

" اولوالعزم پیغمبروں کو آغاز نبوت کے کسی خاص وقت اور مخصوص ساعت میں یہ
رفیع حاصل ہوتا ہے، اور اس وقت شہرائیاروحیت کے تمام مادی پردے ان کے لیے

منور کر دیئے جاتے ہیں، پھر رسالت و نبوت کی تمام فرضی بیڑیاں ان کے پاؤں سے
کاٹ ڈالی جاتی ہیں، آسمان و زمین کے مخفی مناظر بے حجابانہ ان کے سامنے آتے ہیں، اور
وہ اس کے بعد زکاۃ، بہشتی بیج کر فرشتوں کے روحانی جلوس کے ساتھ بارگاہ الٰہی
میں پیش ہوتے ہیں، اور اپنے اپنے رتبہ اور درجہ کے مناسب مقام پر کھڑے ہو کر فیض
ربانی سے معمور اور غرق دریائے نور ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ بعض مقربان خاص کو تو یہ قدر
عطا ہوتا ہے کہ وہ حریم خلوت گاہ قدس میں بار پاکر قاب قوسین ز دو کمانوں کے
فاصلہ سے بھی نزدیک تر ہو جاتے ہیں، اور پھر وہاں سے اپنے منصب کا فرمان خاص لے کر
اسی کاشانۂ آب و خاک میں واپس آجاتے ہیں۔" (سیرۃ النبی جلد ۳ صفحہ ۳۹۲)
پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج خصوصی کا ذکر ایسے ایجاز کے ساتھ کرتے ہیں جس میں
سب کچھ کا احاطہ ہو گیا ہے۔

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ سرور انبیا اور سید اولاد آدم تھے، اس لیے اس حظیرۂ
قدس اور بارگاہ لامکان میں آپ کو وہاں تک رسائی حاصل ہوئی، جہاں تک کسی فرزند
آدم کا قدم اس سے پہلے نہیں پہونچا تھا، اور وہ کچھ مشاہدہ کیا جو اب تک دوسرے مقربانِ
بارگاہ کی حد نظر سے باہر تھا۔ (ایضاً۔ صفحہ ۳۹۵)
یہ تو سیرۃ النبیؐ جلد سوم کی تھوڑی سی جھلکیاں تھیں، اب ذرا آگے بڑھ کر اور جلدوں کی
طرف مائل ہوں۔

سیرۃ النبیؐ جلد چہارم سیرۃ النبیؐ جلد سوم ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی، اس کے آٹھ سال کے بعد
اس کی چوتھی جلد طبع ہوئی، جو ۸۰۰ صفحوں پر مشتمل ہے، یعنی تیسری جلد سے تیس صفحے زیادہ ہیں، یہ اس بات کا
ثبوت ہے کہ سید صاحب کے قلم کا مسافر پہلے سے زیادہ تیز اور سبک رو ہو گیا تھا، اس وقت ان کی عمر

۵۰ سال کی ہو گئی تھی کہ [illegible]

عشق [illegible]

یہ عشق رسول تھا جس کی وہ خوشہ چینی کرکے منزل کمال پر پہنچ گئے، سید صاحب کی عمر گذر رہی تھی [illegible]
عشق کی سرشاری بلکہ اس کی پھیلی ہوئی بجلیاں اور بکھری ہوئی تجلیاں ان کی سیرۃ النبیؐ کی پانچوں جلدوں
کی تحریروں میں دکھائی دیتی ہیں، اس چوتھی جلد کا موضوع منصب نبوت ہے، اس میں پیغمبر اسلامؐ
کی بعثت کے وقت دنیا اور خصوصاً عرب کی مذہبی اور اخلاقی حالت، خیر الامم بننے کی صلاحیت،
تبلیغ نبوی کے اصول، اس کی کامیابی کے اسباب، اسلام کے عقائد میں ایمان کی مختلف قسمیں جزا
سزا، دوزخ و جنت، قضا و قدر، نبوت کی حقیقت، نبی کی ضرورت، وحی، وحی متلو، وحی غیر متلو
اجتہاد، حکمت، وغیرہ جیسے موضوعات پر مباحث ہیں، ان کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے بیسویں
صدی کا ذہن جس زبان، اسلوب اور طرز ادا کا طلبگار ہے، سید صاحب نے اسی کو اختیار کر کے
اس کو مطمئن کیا ہے، ان کو پڑھنے کے بعد قارئین غیر شعوری طور پر محسوس کریں گے کہ وہ افکار کی
انجمن در انجمن سے گزر رہے ہیں، اور ان کے خیالات میں ارتعاش اور جذبات میں ہلچل پیدا ہو رہی ہے،
ان تمام باتوں کو قلمبند کرنے میں سید صاحب کو اس بات سے بڑی مدد ملی کہ ان کے ذہن کے دریچے اور
روشندان ہر طرف کھلے رہے، ان کے خیالات کے قصر میں قرآن مجید کی شعاعیں اور احادیث کی کرنیں
تو برابر داخل ہوتی رہیں، اسی کے ساتھ انھوں نے قوموں کی تاریخوں سے جو عبرت و بصیرت حاصل کی،
اس سے ان کے ذہن میں جلا پیدا ہوتی رہی، پھر علم کلام، فلسفہ اور نفسیات کی چاندنی بھی ان کے ذہن
پر چھائی رہی، ان ہی کے ملے جلے اثر و تاثیر سے ان کی تحریریں خود بخود ان کے قلم سے نکلتی رہیں، جن کو پڑھتے وقت
ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ ان کے قلم کے دل سے جذبات نکل رہے ہیں، وہ ان کے قارئین کے دلوں
میں اتر رہی ہیں، یہ باتیں وہی محسوس کریں گے جو اسلام کے جمال کے ساتھ دنیا سے شغل رکھنے کا

[illegible] اور اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے لیکن سید صاحب کا یہ خاص وصف تو ضرور ہے کہ وہ بڑے مسائل کو بھی حل کرتے تھے۔ لیکن ان کو سمجھانے میں ان کا قلم ان کا ساتھ نہیں دیتا۔ اس لئے ان کی تحریریں حواشی، تعلیقات اور توضیحات کی محتاج ہو جاتی ہیں۔ علامہ شبلی کی تحریروں کا یہ اعجاز ہے کہ مسائل کتنے ہی دقیق اور پیچیدہ ہوں، ان کو سمجھ کر اپنے انداز بیان سے بہت ہی بہتر اور واضح طریقہ پر اپنے قارئین کو سمجھا دیتے۔ دبستان شبلی کے ہی گل سرسبد سید صاحب تھے اس لئے اس انداز بیان کی گل افشانی ان کی ہر تصنیف کی تحریروں میں ہے۔ سیرۃ النبیؐ کی اس جلد چہارم میں تو اس کے ہر صفحہ میں ہے۔

اس میں مجوسیوں کی مجوسیت، مزدکیوں کی مزدکیت، یہودیوں کی یہودیت، عیسائیوں کی عیسائیت، ہندوؤں کی ہندویت، بودھوں کی بودھ مت، زردشتیوں کے نور و ظلمت، خیر و شر، نیکی اور بدی، اہرمن اور یزداں، کلیسا کی سفاکی، قباد، خسرو، نوشیرواں، قسطنطین جسٹینین اور دیگر وغیرہ کی حکمرانی کی تفصیلات آ گئی ہیں، پھر ملائکہ، جنات کی حقیقت، بتوں کی پرستش، شیاطین، دوسری قوموں میں بھوت اور کہانت وغیرہ کے تخیلات، شراب خواری، قمار بازی، سود خواری، سفاکی اور بے رحمی وغیرہ جیسے مسائل زیر بحث آئے ہیں، اس کے بعد یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ اس ظلمت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خورشید نبوت کس طرح طلوع ہوا، اور کیسے یہ ظلمت شب کافور ہو گئی، اور کیسے اس نبوت کا نور سرزمین عرب کو منور کرکے دنیا کو روشن کرتا چلا گیا، یہ موضوعات نئے تو نہیں تھے، ان پر گذشتہ چودہ سو سال سے کیا کچھ نہیں لکھا گیا ہے، بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، مگر سید صاحب نے ان ہی باتوں کو جس خاص انداز اور ذہن کو مطمئن کرنے والے پیرایہ میں لکھا ہے وہی اس کی نمایاں خوبیاں ہیں، قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت دی گئی تھی کہ لوگوں سے ایسی باتیں کہو کہ جو ان کے دلوں میں اثر کریں۔ اس ہدایت سے

سید صاحب [illegible] اور [illegible] کر اپنی تحریر [illegible] میں [illegible] کے
دلوں میں گھر کرتا ہے۔ اس جلد میں زیادہ تر عقائد کی بحثیں ہیں، علماء، حکماء، معتزلین اور صوفیائے کرام
وغیرہ نے اپنے اپنے مسلک کے مطابق ان کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے، مگر ان میں کچھ تو
اپنی کج مج بیانی، کچھ اپنے عقیدوں کی غلو پسندی، اور کچھ دوسروں کے عقائد پر جارحانہ روش کی وجہ
سے ان موضوعات کو موثر اور دل نشین نہیں بنا سکے، سید صاحب نے ان مباحث میں صرف قرآن
مجید اور احادیث کو اپنے لئے شمع ہدایت بنایا ہے، اور ان ہی کی روشنی میں اپنے خیالات
کی تصریح کی ہے، مگر ان کا طرز استدلال کچھ ایسا ہے کہ اس سے متقشف علماء، ذہین متکلمین، بیدار مغز
معتزلین اور رخار توحید سے مخمور صوفیائے کرام کو بھی اختلاف نہ ہوگا، عام قارئین کے شکوک و شبہات
کی ظلمت شب تو شب کافور دکھائی دے گی، اس میں توحید کی جو بحث ہے، اس پر چودہ سو سال
سے برابر بحث ہوتی آئی ہے، مگر اس کو اسلام نے جس طرح مادیت، جسمانیت اور انسانیت
کی آلایشوں سے پاک کیا، اس کو جس ذہن رسا کے ساتھ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے وہ اس کا
امتیازی وصف ہے، توحید کا مسئلہ جانا بوجھا ہوا ہے، لیکن اسی کو سید صاحب اپنے خاص حسن بیان
کے سہارے اس طرح پیش کرتے ہیں۔

"اس کی قدرت بے انتہا ہے، اس کی وسعت غیر محدود ہے، اس کی مشیت
کائنات کے ہر ذرہ میں نافذ ہے، اس کے علم کے احاطے میں اندھیرے اور اجالے
کی ہر چیز داخل ہے، دلوں کے اسرار، اور زبانوں کے الفاظ اور ہاتھ پاؤں کے اعمال
سب ہر لحظہ اور ہر لمحہ اس کے روبرو ہیں، اس کے سامنے اپنے ہر عمل کا جوابدہ
اور ذمہ دار ہے، اس کے مواخذہ کا خوف اور اس کی رحمت کی امید ہے، وہ محبوب
ازل ہے، اس کی محبت کا نشہ ہمارے دلوں کی ہشیاری ہے، اس کے فضل و کرم

وہ سلطنت و حکومت کی ہر قلمرو سے پہنچتے تک پھیلی ہیں، اس کی قوت ہر قوت پر غالب ہے
اس کا ارادہ ہر چیز پر حاوی ہے، اس کا حکم ہر جگہ بالا ہے، اس کی عبادت ہر مخلوق پر فرض
اور اس کی اطاعت ہر مکلف پر واجب ہے، وہ ہر عیب سے پاک، وہ منزہ اور ہر وصف کا
مستحق ہے، اور اس سے شفقت ہے انسانوں کی ہدایت دلانے اور ان کے تزکیہ اور اصلاح
کیلئے رسولوں اور پیغمبروں کو بھیجتا رہا، اور ان سے ہم کلام ہوتا رہا، اس کے کچھ احکام اور
بندھے ہوئے قانون ہیں، جن کی اطاعت نیکی اور نافرمانی گناہ ہے، وہ اندھیرے کی
روشنی، بھوکوں کی سیری، مایوسوں کی امید، زخمیوں کا مرہم، بے قراروں کی تسلی، بیکسوں
کا سہارا ہے، وہ ہم سے ہماری گردن کی رگ سے بھی قریب تر ہے، ہم اس کو جب پکارتے
ہیں، تو وہ سنتا ہے، وہ نیکیوں کو پسند، اور گناہوں سے نفرت کرتا ہے، وہ جب چاہے
آسمان و زمین کو فنا کر دے، اور جب چاہے، پھر بنا دے، اس کی محبت دنیا کا حاصل،
اس کی عبادت ہماری زندگی کا مقصود اور اس کی یاد ہمارے دلوں کی راحت ہے۔

(سیرۃ النبی جلد ۴ صفحہ ۴۰۰)

کیسی ڈھلی ہوئی عبارت ہے، اس کا لطف وہی لے سکتے ہیں، جن کو قرآن مجید پر عبور ہے،
اس کا ہر جملہ قرآن مجید کی کسی نہ کسی آیت کا یا تو ترجمہ ہے، یا اس کی پُر کیف تصریح ہے، قارئین اس
تحریر کے طرز ادا کی لذت سے محظوظ ہونے کے علاوہ توحید کے نور سے اپنے ذہن کو منور کریں، اور
ایک پیراگراف میں توحید کا جو نقشہ کھینچ کر سامنے رکھ دیا گیا ہے، وہ ایک صاحب کمال اہل قلم
ہی کے بس کی بات ہو سکتی ہے۔

سید صاحب کے قلم کا ایک بڑا وصف یہ بھی ہے کہ وہ جب چاہتے ہیں اپنی باوقار تحریر میں پر اثر
تاثیر تقریر کی لذت پیدا کر دیتے ہیں، اس کے نمونے اس چوتھی جلد میں جا بجا ملیں گے، ایک نمونہ سے

[illegible] آشنا ہوں۔

"عرب میں [illegible] خاتم النبیین کا اصل کام [illegible] دنیا کو
گم شدہ حقیقتِ توحید کو [illegible] ظلمت کدۂ عالم کو [illegible] دست،

گمراہوں کو راہ پر لانا، بچھڑوں کو یاد دلانا، بندوں کا رشتہ خدا سے جوڑنا، قدیم اور فراموش کردہ

اخلاق فاضلہ کا سکھانا، گناہوں کے دفتر کو دھونا، انسانوں کو شیطانوں کے دام فریب سے

نکال کر فرشتوں کی صف میں کھڑا کرنا، دنیا کو رحمت و محبت، لطف و شفقت، عدل و انصاف

مساوات کی تعلیم دینا، حکمت و دانائی، پند و موعظت اور تہذیب و تمدن کے رموز

سکھانا، روحانیت کی برباد شدہ دنیا کی دوبارہ تعمیر اور قلوب و ارواح کے ویران گھروں

کی از سر نو آبادی تو خاتم النبیین کا اصل کام ایک شریعت ابدی کی تاسیس، مذاہب عالم کی اصلاح،

فن اخلاق کی علمی و عملی تکمیل، قانون الٰہی کا اتمام اور تہذیب نفوس کی معراج آخر تھی، اور

یہ سب اس پر آشوب زمانے میں ہوتا رہا، جس کے لیل و نہار بظاہر صرف مخالفوں کے تیر و تفنگ

کے روکنے میں صرف ہوئے۔" (سیرۃ النبی جلد ۴ صفحہ ۲۰۷)

یہ صرف لفظوں اور جملوں کا انبار نہیں، بلکہ ہر لفظ اور ہر فقرہ میں خیالات
کی ایک دنیا آباد کر دی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے وجود پر اہم سے اہم فلسفیانہ، متکلمانہ اور معتزلانہ مباحث کئے گئے ہیں،
لیکن حضرت سید صاحبؒ نے اس کے وجود کو جس رنگ میں پیش کیا ہے، اس سے ہم آپ
ذرا لطف لیں۔

"یہ گوناگوں عالم، یہ رنگا رنگ کائنات، یہ تاروں بھرا آسمان، یہ بوقلمون
زمین، یہ سورج، یہ چاند، یہ درخت، یہ سمندر، یہ پہاڑ، یہ لاکھوں جاندار اور بے جان اشیاء

یہ سلسلۂ اسباب کا تسلسل، تغیر و انقلاب کا انتظام، یہ کائنات کا نظم، اور اس کے ذرہ ذرہ
کا باہمی ربط و ضبط، فلک پر ستاروں کی گردش، ان کی باہمی ترتیب، موت و حیات کے
مناظر، خواص و آثار کے رموز، انسان کا خیال، بلند پروازی، اور اس کا عجز و درماندگی، یہ
تمام باتیں خالق و صانع کے معجزات پیدا کرتی ہیں، یہ نیلگوں آسمان کی چھت، یہ زمین کا
سبزہ زار فرش، اور ایک ہی حرکت سے شب و روز کا انقلاب ایک خالق کل کا پتہ
دیتا ہے۔" (سیرۃ النبی جلد ۴ صفحہ ۶۵ - ۲۶۴)

اب ذرا اس سلسلہ میں ایک چھوٹے سے اقتباس سے اپنے ذہن کو روشن کر لیں۔

"یہ شب و روز کا نور و ظلمت، یہ سورج اور چاند کی روشنی، ان کی مقررہ رفتار،
اور باقاعدہ طلوع و غروب اس کی دلیل ہے کہ اس اجرام پر کوئی سوار ہے جس کے ہاتھ میں
اس کا سیاہ و سفید ہے۔" (ایضاً - ۲۶۵)

ان باتوں کی تائید میں وہ جب قرآن مجید کی آیتیں پیش کرتے ہیں، تو ان کا مطالعہ کرتے وقت
یہ خیال نہیں ہوتا کہ ہم عربی زبان کی کوئی عبارت پڑھ رہے ہیں، بلکہ ان کے ترجمے اپنی تحریروں
کے ساتھ ایسا منسلک کر دیتے ہیں کہ ان کو پڑھتے وقت وہی لطف آتا ہے، جو عربی زبان کے ماہروں
کو کلام پاک کی آیتوں کو پڑھنے میں آتا ہوگا۔

شرک کی حقیقت کو کس شگفتہ اسلوب میں پیش کرتے ہیں:

"شرک اور بت پرستی کا اصل زینہ اسباب و مؤثرات کا وجود ہے، خدا نے عالم میں ایک
سلسلۂ اسباب قائم کر دیا ہے، اور عالم کے تمام واقعات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، لیکن
یہ تمام سلسلہ ایک قادر مطلق کے دست قدرت میں ہے، اور اس سلسلہ کی ایک کڑی
بھی اس کے اشارہ کے بغیر جنبش نہیں کر سکتی، شرک اس طرح شروع ہوتا ہے کہ پہلا انسان

ان اسباب و علل میں سے بعض نمایاں اور قوی اور غیر معمولی ہوتے ہیں، اجرام
فلکی کی عظمت، آفتاب و ماہتاب کی نور افشانی، سمندر کی تلاطم، عناصر کی نیرنگ
آرائیاں، انسان کو مبہوت کر دیتی ہیں، وہ ان کی عظمت و تاثیر سے متاثر، پھر مشغوف
اور بالآخر ان کا غلام بن جاتا ہے، اعتقاد کے پہلے مرحلہ میں انسان خود اس کے دعویٰ پر
اس قدر امتیاز اور تفریق کرتا ہے، کہ یہ چیزیں خود خدا یا معبود نہیں ہیں، لیکن یہ تمیز آخر تک
قائم نہیں رہتی بلکہ رفتہ رفتہ خوش اعتقادی کا اثر غالب آ جاتا ہے، اور یہ چیزیں خدا
کی شریک بنتی جاتی ہیں، یہاں تک کہ اصل مسبب الاسباب نظر سے بالکل اوجھل ہو جاتا ہے"

(سیرۃ النبی جلد ۴ صفحہ ۱۸-۲۱۶)

شاعروں کی زبانی دل کی نیرنگیاں تو بہت کچھ سننے میں آتی رہتی ہیں، اب ذرا سیرۃ النبیؐ
کے مصنف سے اس کی بوقلمونی کا مشاہدہ کریں، رقمطراز ہیں۔

"ہمارے ارادہ کا محرک ہمارے خیالات اور جذبات ہیں اور ہمارے خیالات اور
جذبات پر ہمارے اندرونی عقائد حکومت کرتے ہیں، عام بول چال میں ان ہی چیزوں کی تعبیر
ہم "دل" کے لفظ سے کرتے ہیں، اسلام کے معلم نے بتایا کہ انسان کے تمام اعضا میں
اس کا دل ہی نیکی اور بدی کا گھر ہے، فرمایا، انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے
جو اگر درست ہے، تو تمام بدن درست ہے، اور اگر وہ بگڑ گیا تو تمام بدن بگڑ گیا، ہاں!
وہ ٹکڑا دل ہے۔ (جلد ۴ صفحہ ۲۰۰)

آخری سطریں حدیث کے ترجمے ہیں، لیکن عبارت کے سلسلہ میں ایسے جوڑ دیے گئے
ہیں کہ تسلسل میں کوئی فرق نہیں ہونے پایا ہے، یہ تو حدیث کے ذریعہ سے دل کو سمجھایا گیا ہے
اب قرآن مجید کے ذریعہ اسکو اس طرح سمجھایا ہے:

"قرآن پاک نے دل (قلب) کی تین کیفیتیں بیان کی ہیں، سب سے پہلا قلب سلیم
(سلامت رو دل) جو ہر گناہ سے پاک رہ کر باطمینان نجات اور سلامت روی کے راستہ
پر چلتا ہے، دوسرا اس کے مقابل قلب اثیم (گنہگار دل) یعنی جو گناہوں کی راہ اختیار کرتا ہے
تیسرا قلب منیب (رجوع ہونے والا دل) ہے، جو اگر کبھی بھٹکتا ہے، اور بے راہ بھی ہوتا
ہے، تو فوراً نیکی اور حق کی طرف رجوع ہو جاتا ہے۔" (سیرۃ النبی جلد ۴ صفحہ ۲۰۶)

یہ قسمیں بتا کر سید صاحب اپنے انشاء کے مخصوص رنگ میں لکھتے ہیں۔

"غرض یہ سب نیرنگیاں اسی ایک بے رنگ ہستی کی ہیں، جس کا نام دل ہے، ہمارے
اعمال کا محرک، ہمارے اس دل کا ارادہ اور نیت ہے، اس بھاپ کی طاقت سے اس مشین
کا ہر پرزہ چلتا اور حرکت کرتا ہے" (ایضاً جلد ۴ صفحہ ۲۰۶)

اس کے بعد یہ سمجھاتے ہیں کہ انسان کی عملی اصلاح کے لئے اس کی قلبی اصلاح مقدم ہے،
اس کے دل پر اگر کوئی چیز حکمراں ہے، تو وہ اس کا عقیدہ ہے۔

اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ چند صحیح اصول و مقدمات کا ہم اس طرح تصور کریں کہ وہ
دل کا غیر مشکوک یقین اور غیر متزلزل عقیدہ بن جائیں اور اسی صحیح یقین اور مستحکم عقیدہ کے تحت ہی ہم اپنے
تمام کام انجام دیں، اس کو اپنی دقت نظر سے کام لیتے ہوئے اس طرح سمجھاتے ہیں:

"جس طرح اقلیدس کی کوئی شکل چند اصول موضوعہ اور اصول متعارفہ کے مانے بغیر
نہ بن سکتی ہے، اور نہ ثابت ہو سکتی ہے، اسی طرح انسان کا کوئی عمل صحیح و درست نہیں
ہو سکتا جب تک اس کے لئے چند مبادی اور چند اصول موضوعہ ہم پہلے تسلیم نہ کر لیں۔"

(ایضاً جلد ۴ صفحہ ۲۰۰)

پھر عقل اور دل کی تھوڑی سی بحث لگی ہے، اس کی تصریح کرنے میں اپنی فکر کی گہرائی کو بروئے کار

[illegible] کی ابتری تھی اور جب ایک

ردی [illegible] کے پاس بڑی [illegible] جب شاہ خسرو [illegible] یعنی [illegible] میں گھٹ کر

ایک چوتھائی سے بھی کم [illegible] رہ گئی تھی، اور وہ بھی نہایت تفرق و ابتری کی حالت میں"

رعایا کی [illegible] خانہ جنگی کی [illegible] چڑھی ہوئی تھیں اور امراء و اعیان سلطنت اپنے

ذاتی مصارف کے لیے ہر طرح کے جبر و فریب، رشوت ستانی، اور لوٹ مار کو جائز

رکھتے تھے، فوج میں یوں تو بہت سے سپاہیوں کے نام لکھے ہوئے تھے، لیکن میدان جنگ میں

جانے کے وقت بہت تھوڑے سے لوگ تیار ہوتے، فوجی افسر فن جنگ سیکھنے کے بجائے

اپنا وقت باہمی حسد و رقابت میں صرف کرتے، اور ہر افسر کی یہ کوشش رہتی کہ دوسرے

افسر کی بدنامی و ذلت سے فائدہ اٹھا کر خود ترقی و منصب حاصل کرے۔ اندرونی بدنظمیوں

پر مستزاد یہ تھا کہ بیرونی غنیم اہل روم کو ایک دم کے لیے چین سے بیٹھنے نہیں دیتے تھے، روم

و فارس کے درمیان مدت سے لڑائیوں کا جو ایک غیر منقطع سلسلہ جاری تھا، گو بار ہا

گوتھس اور ونڈالس وغیرہ کے پیہم حملے روم کی رہی سہی قوت کو اور بھی پامال کر رہے تھے

(سیرۃ النبی جلد ۴۔ صفحہ ۲۲۰ تا ۲۲۱)

اس سیاسی افراتفری میں مذہب کا جو حال ہوا، اس کی بہت دل خراش تصویر اس طرح کھینچی ہے۔

"بت پرست رعایا کو چھوڑ کر [illegible] کی پوجا میں بدستور مصروف

تھی، اور وہ لوگ جنہوں نے عیسائیت قبول بھی کر لی تھی، وہ بھی باپ بیٹا روح القدس

اور مریم کی خدائی کے عقیدہ، حضرت عیسیٰ و مریم اور روح القدس کی شخصیت اور مرتبہ کی تعیین

نے بیسیوں فرقے پیدا کر دیئے تھے، جو نہ زبانی مناظروں سے گذر کر جنگ و جدل کی

نوبت آگئی تھی، یہاں تک کہ ۳۵۰ء میں خود عیسائیوں کے دو گروہوں کے مابین ایک عظیم الشان مذہبی جنگ چھڑ گئی جس میں ۳۰۰۰ عیسائیوں کا قتل عام ہوا، اس جنگ عظیم کے علاوہ ہمہ وقت ہر فریق دوسرے فریق کے خون کا پیاسا رہا کرتا، اور بارہا چھوٹی چھوٹی باتوں پر کشت و خون کی نوبت آجاتی، پادریوں نے اپنے منصب مذہبی کو حصول جاہ کا ایک ذریعہ قرار دے لیا تھا، اور اس بنا پر محض حب جاہ کی خاطر وہ ہر طرح کی ناجائز کوششوں میں مصروف رہتے۔ (سیرۃ النبی جلد ۲ صفحہ ۲۲-۲۲۲)

اور پھر اس زمانہ کی باہمی سفاکی کا ایک دل دوز منظر اس طرح پیش کرتے ہیں۔

"اسقف اعظم سینٹ سرل ... کی ایک خاتون دوست ہیپشیا نامی تھی، ایک روز وہ اپنی درسگاہ سے واپس آ رہی تھی کہ راہبوں کے ایک بہت بڑے گروہ نے اس پر حملہ کر دیا، گاڑی سے اتار کر برہنہ کی گئی، اور اس حالت میں تمام شہر کی سڑکوں پر گھسیٹتے ہوئے اسے کلیسا میں لائے، جہاں پہونچ کر پادری پیٹر کے گرز سے اس کا خاتمہ کر دیا گیا، قتل کے بعد اس کا گوشت ہڈیوں سے جدا کیا گیا، نعش کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے، اور آلائش جسم کو آگ میں ڈال دیا گیا" (ایضاً جلد ۲ صفحہ ۲۲۳)

اتنا لکھ کر سید صاحب کچھ چبھتے ہوئے جملے لکھتے ہیں، جن میں زہریلا طنز بھی ہے لیکن یہ ان حملوں کا دندان شکن جواب ہے جو عموماً عیسائی مشنریوں اور مورخوں کی طرف سے اسلامی تاریخ کے ایسے واقعات پر ہوا کرتے ہیں۔

سید صاحب رقمطراز ہیں:۔

"یہ واقعات ایسے ہیں جن کے ذکر سے آج قلم لرزتا ہے، مگر یہ عیسائی مذہب کے علمبرداروں کا سب سے روشن کارنامہ ہے۔"

اس کے بعد لکھتے ہیں۔

"یہ حالات ان تمام ملکوں کے تھے جہاں ان رومیوں کے زیر سایہ عیسوی مذہب پھیلا ہوا تھا، یعقوبی، نسطوری اور دوسرے فرقے جو سرکاری عیسوی مذہب سے الگ تھے، وہ دور دراز صوبوں اور ملکوں میں اپنی پناہ ڈھونڈتے تھے۔ (سیرۃ النبی جلد ۴ صفحہ ۲۲۲)

اور اس کے بعد ان کے لکھنے کا انداز وہی ہے، جو مستشرقین اسلام پر حملہ کرنے میں اختیار کرتے ہیں، سید صاحب لکھتے ہیں۔

"نائیس کی کونسل کے بعد آریوس اور اس کے حریفوں میں جو معرکہ آرائیاں ہوئیں، انھوں نے اس حقیقت کو واضح کر دیا، کہ شہزادہ امن کا مذہب ان جنگ جویوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہونے سے بچ نہیں سکتا۔" (ایضاً جلد ۴ صفحہ ۲۲۲)

شہزادہ امن سے مراد حضرت عیسی علیہ السلام ہیں، اس آخری اقتباس کے آخری جملے سے عیسائی مذہب کی پوری تاریخ پر بڑی ضرب کاری لگا دی گئی ہے۔

سیرۃ النبی جلد پنجم

سیرۃ النبی جلد چہارم کی اشاعت کے دو سال کے بعد سیرۃ النبی جلد پنجم سنہ ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی، جس کی ضخامت ۵۰۳ صفحے ہے۔ چوتھی جلد کا موضوع عقائد تھا اس پانچویں جلد کا موضوع عبادات ہے، یعنی اسلام میں عبادات کی حقیقت کیا ہے، اس کے اقسام کتنے ہیں، ان میں کیا مصلحت و حکمت رکھی گئی ہے، اس میں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے ابواب بھی ہیں، یہ موضوعات نئے نہیں ہیں، لیکن اس کتاب کے مصنف نے جس انداز میں ان کو پیش کیا ہے، اس کا مطالعہ کرتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو کچھ ایسی باتیں معلوم ہو رہی ہیں، جو پہلے معلوم نہ تھیں، حالانکہ وہ جانی بوجھی چیزیں ہیں، لیکن انداز بیان کی خوبی سے وہ نئی نئی معلوم ہوتی ہیں، وہ کلام پاک کی چھوٹی بڑی اور لمبی آیتوں کو اپنی تحریروں میں اس طرح جڑ دیتے ہیں

[illegible] کی طرح چمکتی نظر آتی ہیں، اور جب ان کے مطالب کو سمجھتے [illegible] معلوم ہوتا ہے
کہ ہمارے سامنے دل نشین باتوں اور دلنشیں تحریروں کا خزانہ بچھا ہوا ہے، احادیث کی
تشریح کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں نے جن باتوں کی طرف توجہ نہیں دلائی تھی ان کی
طرف توجہ دلا رہے ہیں، اس کتاب کے جو موضوعات ہیں ان میں فقہاء کا اختلاف رہا ہے،
لیکن اس سلسلہ میں سید صاحب نے جو کچھ لکھا ہے بڑے سے بڑے دیدہ ور فقہا کو اس سے اب تک
اختلاف نہیں ہو سکا ہے، اس میں ان کے انداز بیان سے ان کو بڑی مدد ملی، جس میں کچھ ان کے
کلامی رنگ کے خیالات جملوں اور فقروں کے پیکر میں نہ صرف صفحات بلکہ سینہ و دل میں بھی اترتے
ہیں، مثلاً نماز کے متعلق رقمطراز ہیں۔

"نماز کیا ہے؟ مخلوق کا اپنے دل، زبان اور ہاتھ پاؤں سے اپنے خالق کے سامنے
بندگی اور عبودیت کا اظہار، اس رحمان اور رحیم کی یاد، اور اس کے بے انتہا احسانات کا
شکریہ، حسن ازل کی حمد و ثنا، اور اس کی یکتائی اور بڑائی کا اقرار، یہ اپنے محبوب سے
مہجور روح کا خطاب ہے، یہ اپنے آقا کے حضور میں جسم و جان کی بندگی ہے، یہ ہمارے
اندرونی احساسات کا عرض نیاز ہے، یہ ہمارے دل کے ساز کا فطری ترانہ ہے، یہ
خالق اور مخلوق کے درمیان تعلق کی گرہ اور وابستگی کا شیرازہ ہے، یہ بے قرار روح کی تسکین،
مضطرب قلب کی تشفی اور مایوس دل کی دوا ہے، یہ فطرت کی آواز ہے، یہ حساس و اثر پذیر
طبیعت کی اندرونی پکار ہے، یہ زندگی کا حاصل اور ہستی کا خلاصہ ہے" (ص ۵)

یہ ادب لطیف کی عبارت نہیں، بلکہ اسلام کے ایک سچے عاشق کے دل کی آواز ہے،
اور کون ایسا عالم، متکلم، صوفی، عارف باللہ یا معمولی بندہ ہے، جو اس کو پڑھ کر سرشار نہ ہو جائے
ایسی عبارت آرائی، غنچوں، پھولوں، گلزاروں اور بلبل کی نغمہ سرائیوں کی مرقع آرائی کرتے

[illegible] سید صاحب نماز، روزہ، زکوٰۃ [illegible] رسول کے حکمت نیز
دور [illegible] پہلو [illegible] ان کا ذکر کرتے ہیں، جن میں خوش ذوقی بھی شامل ہے۔

زکوٰۃ کے جتنے افادی، شرعی اور فقہی پہلو ہیں، ان سب پر سید صاحب نے بحثیں کی ہیں، لیکن طرز ادا کی دل نشینی کی وجہ سے ان کو پڑھتے ہیں۔ لطیف نکتے اور شریعت کے اسرار کی تحریر جدید ذہن پر بھی آشکارا ہوتی نظر آتی ہے، اس کی اہمیت کے لئے استدلال کا زور ملاحظہ کیجئے، لکھتے ہیں۔

"قرآن پاک میں جہاں کہیں نماز کا ذکر ہے، اس کے متصل ہی برابر زکوٰۃ کا بھی بیان ہے، چنانچہ قرآن پاک میں بتیس مقامات پر اقام الصلوٰۃ کے بعد ہی ایتاء زکوٰۃ آیا ہے (سیرۃ النبی جلد ۵ صفحہ ۱۵۲)

اس کی اہمیت پر مزید زور یہ لکھ کر دیتے ہیں۔

"محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام صرف دو لفظوں سے مرکب ہے، خدا کا حق اور بھائیوں کا حق پہلے لفظ کا مظہر اعظم نماز اور دوسرے کا زکوٰۃ ہے، اس لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت حق جب بلند ہوئی تو اس کی پکار کی ہر آواز ان ہی دو لفظوں کی تفصیل و تشریح تھی۔"

اور پھر ذرا دعویٰ کی اس بلند آہنگی پر غور کریں۔

"نماز اور زکوٰۃ تو اس ان ہی دو اجمالی حقیقتوں کی تشریح کا نام اسلام ہے" (ج ۵ ص ۱۵۳-۱۵۴)

اس سلسلہ میں ان کے قلم کا زور کس طرح ہو دے کار آجاتا ہے اس کے ایک نمونہ سے پھر ایک بار لطف اندوز ہوں۔

"زکوٰۃ یا دوسرے الفاظ میں غریبوں کی چارہ گری، مسکینوں کی دست گیری،

مسافروں کی مدد اور یتیموں کی خبر گیری، بیواؤں کی نصرت، غرض اسی قسم کے بہت سے نیک کام
نماز کے بعد اسلام کی عبادت کا دوسرا رکن ہے۔ اس فریضہ کی سب سے پہلی ابتدا ہے
جو مذاہب کی تاریخ میں نظر آتی ہے۔" (سیرۃ النبی جلد ۵ صفحہ ۲۰۵)

روزہ کی تصریح کرتے ہوئے اپنے لسانی ذوق کا ثبوت یہ لکھ کر دیتے ہیں،

"روزہ اسلام کی عبادت کا تیسرا رکن ہے۔ عربی میں اس کو صوم کہتے ہیں، جس کے لفظی معنے رکنے اور چپ رہنے کے ہیں، بعض مفسرین کی تفسیروں کے مطابق قرآن پاک میں اس کو کہیں کہیں صبر بھی کہا گیا ہے، جس کے معنے ضبط نفس، ثابت قدمی اور استقلال کے ہیں۔"

پھر اس کی غایت کی تصریح اس حسن ادا سے کرتے ہیں،

"اسلام کی زبان میں روزہ کا کیا مفہوم ہے، وہ درحقیقت نفسانی ہوا و ہوس اور بہیمی خواہشوں سے اپنے آپ کو روکنے، اور حرص و ہوا کے ڈگمگا دینے والے موقعوں میں اپنے آپ کو ضابطہ اور ثابت قدم رکھنے کا نام ہے۔ روزہ کے استعمال میں عام طور سے نفسانی خواہشوں اور ان کی حرص و ہوا کا مظہر تین چیزیں ہیں، کھانا، پینا اور عورت و مرد کے جنسی تعلقات، ان ہی سے ایک مدت معینہ تک رکے رہنے کا نام شرعاً روزہ ہے، لیکن دراصل ان ظاہری خواہشوں کے ساتھ باطنی خواہشوں اور برائیوں سے دل اور زبان کا محفوظ رکھنا بھی خواص کے نزدیک روزہ کی حقیقت میں داخل ہے۔" (جلد ۵ صفحہ ۲۰۸)

رمضان کے مقدس مہینے میں قرآن کے نزول کا آغاز ہوا، اس کے تقدس کا احساس ہمارے دلوں میں یہ لکھ کر پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

"رمضان وہ مقدس مہینہ ہے جس میں قرآن سب سے پہلے دنیا میں نازل ہوا، اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عالم کی رہنمائی اور انسانوں کی دست گیری کے لیے دستور نامہ الٰہی کا سب سے پہلا صفحہ عنایت کیا گیا" (سیرۃ النبی جلد ۵ صفحہ ۲۰۹)

پھر رمضان کے روزے کی اہمیت کو اس بلیغ انداز میں بتایا ہے کہ

"یہ روزہ انبیاء علیہم السلام کی صرف پیروی اور تقلید ہی نہیں، بلکہ درحقیقت اللہ تعالےٰ کے اس عظیم الشان احسان کا شکریہ ہے، جو اس نے اپنے پیغمبر صادق کے ذریعہ انسانوں پر کیا شکریہ اس کی احسان شناسی کا احساس ہے، وہ کتاب الٰہی، وہ تعلیم ربانی، وہ ہدایت روحانی جو ان ایام میں انسانوں کو عنایت ہوئی۔ جس نے ان کو شیطان سے فرشتہ اور ظلمانی سے نورانی بنایا، پستی و ذلت کے عمیق غار سے نکال کر ان کو اوج کمال تک پہنچایا، ان کی وحشت کو تہذیب و اخلاق سے، ان کی جہالت کو علم و معرفت سے، ان کی نادانی کو حکمت و دانائی سے اور ان کی تاریکی کو بصیرت اور روشنی سے بدل دیا، ان کی قسمتوں کے پانسے الٹ دیئے، اور فضل و دولت اور خیر و برکت کے خزانوں سے ان کے کاشانوں کو معمور کر دیا جس نے ذرۂ بے مقدار کو آفتاب اور مشت خاک کو ہمدوش ثریا بنا دیا، قرآن پاک اپنے ان الفاظ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (بقرہ ۲ - ۲۳)	اور یہ (رمضان کا روزہ) اس لئے فرض ہوا تاکہ تم اللہ کی بڑائی کرو کہ تم کو اس نے ہدایت دی اور تاکہ تم اس کا شکریہ ادا کرو۔

(سیرۃ النبی جلد ۵ صفحہ ۳۶۰)

حج پر بھی لمبی بحث ہے لیکن اس سلسلہ میں خانہ کعبہ کے متعلق ان کی جو سرشارانہ تحریر ہے

اسی سے ان کی ساری تفصیلات معلوم ہو جائیں گی، اس عنوان کو پڑھتے وقت اپنا ذہن اس حیثیت سے لیں کہ اس کے لکھنے والے پر جو انبساطی کیفیت طاری ہے، اس کا اثر آپ کے دل پر کیا مرتب ہوتا ہے

"خانہ کعبہ اس دنیا میں عرش الٰہی کا سایہ اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا نقطۂ قدم ہے، یہ وہ آئینہ ہے، جس میں اس کی رحمت و غفاری کی صفتیں اپنا عکس ڈال کر تمام کرۂ ارض کو اپنی شعاعوں سے منور کرتی ہیں، یہ وہ منبع ہے، جہاں سے حق پرستی کا چشمہ ابلا، اور اس نے تمام دنیا کو سیراب کیا، یہ روحانی علم و معرفت کا وہ مطلع ہے، جس کی کرنوں نے زمین کے ذرہ ذرہ کو درخشاں کیا، یہ وہ جغرافی شیرازہ ہے، جس میں ملت کے وہ تمام افراد بندھے ہوئے ہیں، جو مختلف ملکوں اور اقلیموں میں بستے ہیں، مختلف زبانیں بولتے ہیں، مختلف لباس پہنتے ہیں، مختلف تمدنوں میں زندگی بسر کرتے ہیں، مگر وہ سب کے سب باوجود ان فطری اختلافات اور طبعی امتیازات کے ایک ہی خانۂ کعبہ کے گرد چکر لگاتے ہیں اور ایک ہی قبلہ کو اپنا مرکز سمجھتے ہیں، اور ایک ہی مقام کو ام القریٰ مان کر وطنیت، قومیت، تمدن، معاشرت، رنگ روپ اور دوسرے امتیازات کو مٹا کر ایک ہی وطن، ایک ہی قومیت (آل ابراہیم)، اور ایک ہی تمدن و معاشرت (ملت ابراہیمی)، اور ایک ہی زبان (عربی)، میں متحد ہو جاتے ہیں، اور یہ وہ برادری ہے، جس میں دنیا کی تمام قومیں اور مختلف ملکوں کے بسنے والے جو وطنیت اور قومیت کی لعنتوں میں گرفتار ہیں، ایک لمحہ اور ایک آن میں داخل ہوتے ہیں، جس سے انسانوں کی بنائی تمام زنجیریں ہوتی ہیں، قیدیں اور بیڑیاں کٹ جاتی ہیں اور تھوڑے دنوں کیلئے ایک لباس احرام، ایک وضع، میں دوش بدوش ہو کر حج میں تمام قومیں ایک ملک میں ایک تنظیم ایک خانوادہ کی برادری بن کر کھڑی ہوتی ہیں، اور ایک ہی بولی میں خدا سے باتیں

کہ قرآن جس امن کا [illegible] ہے وہ تمام ادنیٰ منازعات کا ختم کرنا ہے جو [illegible]

جنگ و جدل اور فتنہ و فساد کے اسباب ہیں۔ اس لیے یہ حرم پاک نہ صرف اس معنی

میں امن کا گھر ہے، کہ یہاں ہر قسم کی خونریزی اور ظلم و ستم ناروا ہے، بلکہ اس لحاظ سے

بھی امن کا گھر ہے کہ تمام دنیا کی قوموں کی ایک برادری قائم کر کے ان کے تمام ظاہری امتیازات

کو جو دنیا کی بدامنی کا سبب ہیں، مٹا دیتا ہے۔ (سیرۃ النبی جلد ۵ صفحہ ۸۵-۲۸۴)

اس جلد میں جہاد پر بھی بحث ہے، اسکی لغوی، معنوی، اصطلاحی اور عمومی حیثیت کو کس

ٹھنڈے پیرایہ میں سمجھاتے ہیں، وہ ذرا ہم آپ بھی سمجھنے کی کوشش کریں، لکھتے ہیں:

"جہاد کے معنے عموماً قتال اور لڑائی کے سمجھے جاتے ہیں، مگر مفہوم کی یہ تنگی قطعاً غلط ہے۔

جہاد کا لفظ جہد سے نکلا ہے، جہاد، مجاہدہ، فعال اور مفاعلت کے وزن پر اسی جہد سے

مصدر ہیں، اور لغت میں اس کے معنے محنت اور کوشش کے ہیں، اسی کے قریب قریب

اس کے اصطلاحی معنے بھی ہیں، یعنی حق کی بلندی، اس کی اشاعت اور حفاظت کے لیے

ہر قسم کی جدوجہد قربانی اور ایثار گوارا کرنا۔ اور ان تمام جسمانی، مالی اور دماغی

قوتوں کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو ملی ہیں، اس راہ میں صرف کرنا یہاں

تک کہ اس کے لئے اپنے عزیز و قریب، اہل و عیال، خاندان اور قوم کی جان

تک کو قربان کر دینا، حق کے مخالفوں اور دشمنوں کی کوششوں کو توڑنا، انکی تدبیروں

کو رائگاں کرنا، ان کے حملوں کو روکنا اور اسکے لیے جنگ کے میدان میں اگر ان سے لڑنا

پڑے تو اس کے لئے بھی پوری طرح تیار رہنا، یہی جہاد ہے، اور یہ اسلام کا ایک رکن

اور بہت بڑی عبادت ہے۔" (ایضاً جلد ۵ صفحہ ۲۹۹)

پھر جہاد بالنفس، جہاد بالعلم، اور جہاد بالمال کو کس طرح آسانی سے سمجھا دیتے ہیں،

اس کے لیے بھی کوئی وقت نہیں ہوتی، اور پھر وہی جہاد کے لیے وہ لشکر تیار ہیں بھیجے جاتے ہیں۔

"دائمی جہاد یہ ہے کہ یہ اس دین کی حمایت، علم دین کی اشاعت، حق کی نصرت و تائید کی دوڑ، بے دستوں کی امداد، سیہ کاروں کی ہدایت، امر بالمعروف نہی عن المنکر، اشاعت عدل، رد ظلم اور احکام الٰہی کی تعمیل میں ہمہ تن اور ہر وقت لگا رہے۔" (ج ۵، ص ۳۰۶)

یہ تحریر یادگار بھی ایک مثال ہے، اس کا اسلوب جس طرح سے چاہیں کر لیں، ان کی تحریروں میں دل کی جو کرشمہ سازیاں ہیں اس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ اب اس جلد میں لکھتے ہیں کہ جسمانی اور مالی عبادات کے علاوہ قلبی عبادات بھی ہیں، جن کا تعلق نفس کی اندرونی کیفیتوں سے ہے۔ سید صاحب کے خیال میں ان قلبی عبادات میں سر فہرست تقویٰ ہے۔ اس کی لغوی اصطلاحی، مذہبی اور روحانی حیثیت کو سمجھانے میں ایک معلم کے فرائض ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، فرماتے ہیں:

"قلبی عبادات میں سر فہرست تقویٰ ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام تعلیمات کا خلاصہ بلکہ روح ہے، عربی زبان میں اس کے لغوی معنے بچنے، پرہیز کرنے اور لحاظ کرنے کے ہیں، لیکن وحی محمدی کی اصطلاح میں یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے، جو اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ حاضر و ناظر ہونے کا یقین پیدا کر کے دل میں خیر و شر کی تمیز کی خلش، خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کر دیتی ہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے، جس کی بناء پر ہر کام میں خدا کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے، تقویٰ والا وہ ہے جو اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں سچائی کو لے کر آئے اور اس ابدی سچائی کو سچ جانے، وہ کسی کام میں ظاہری فائدہ، فوری ثمرہ، مال و دولت اور جاہ و عزت کے نقطہ پر نہیں بلکہ سچائی کے پہلو پر نظر رکھتا ہے، اور خواہ کسی قدر اس کا بظاہر نقصان ہو مگر وہ

جہاں تک عبادت باری کے ادا سے بال بھر ہٹنا نہیں چاہتا، جب وہ ہر کام میں خدا کی
رضا اور پسندیدگی پر نظر رکھتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ بھی ان کو اپنی طرف سے اپنے انعام کا
محبت کا صلہ عطا فرماتا ہے، اور بڑا صلہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا ہی میں بندوں کے درمیان
ان کے ساتھ عقیدت، محبت اور ہر دل عزیزی پیدا ہوتی ہے" (سیرۃ النبی جلد ۵ صفحہ ۳۱۲-۳۱۳)
یہی بات محراب کے نیچے منبر پر بھی کہی جاتی ہے، لیکن اس میں واعظانہ رنگ ہو جاتا ہے،
یہ کہ اقتباس کا رنگ بظاہر تو معلمانہ ہے، لیکن اس کو پڑھتے وقت کچھ فلسفیانہ طرز فکر کا احساس
بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

اخلاص کو بھی قلبی عبادت بتایا ہے، اس کو تحریر کے پورے وزن کے ساتھ سمجھایا ہے۔

"جو نیک کام بھی کیا جائے، اس کا محرک دنیاوی غرض نہ ہو، اور نہ اس سے مقصود
ریا و نمائش، جلب منفعت، طلب شہرت، طلب معاوضہ وغیرہ ہو، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ
کے حکم کی بجا آوری اور خوشنودی ہو، اسی کا نام اخلاص ہے" (ایضاً جلد ۵ صفحہ ۳۳۰)

توکل کو بھی قلبی عبادت قرار دیتے ہیں، اس کو سمجھانے کا یہ متین انداز ہے۔

"توکل جس قلبی یقین کا نام ہے، اس کے قریب قریب آج کل کے اخلاقیات میں
خود اعتمادی کا لفظ بولا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ کامیاب افراد وہی ہوتے ہیں،
جن میں یہ جوہر پایا جاتا ہے، لیکن اس خود اعتمادی کی سرحد سے بالکل قریب غرور، اور
فریب نفس کے گڈھے اور غار بھی ہیں، اس لئے اسلام نے انانیت کی خود اعتمادی کے
بجائے خدا اعتمادی کا نظریہ پیش کیا ہے جو ان خطروں سے محفوظ ہے" (ج ۵ ص ۳۳۶)

صبر کو بھی قلبی عبادات میں شمار کیا ہے اور اس کو اس طرح ذہن نشین کرایا ہے۔

"صبر بے بسی اور بے کسی یا دشمن سے کسی مجبوری کے سبب انتقام نہ لینے کا نام صبر نہیں

اس کے سمجھنے میں کوئی وقت نہیں ہوتی، اور پھر وائی جاد کو کیسے دل نشیں پیرایہ میں سمجھاتے ہیں:

"داعی بہادر یہ ہے کہ پر امن دین کی حمایت، علم دین کی اشاعت، حق کی نصرت، غریب بے کس و زیر دستوں کی امداد، سیہ کاروں کی ہدایت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اقامت عدل، رد ظلم اور احکام الٰہی کی تعمیل میں ہمہ تن اور ہر وقت لگا رہے۔" (ج ۵ ص ۳۰۹)

یہ تحریر ایجاز کی بھی ایک مثال ہے، اس کا مطالب جس طرح سمجھا ہیں کرلیں، ان کی تحریروں میں دل کی جو کرشمہ سازیاں ہیں اس کا ذکر پہلے آچکا ہے، اب اس جلد میں لکھتے ہیں کہ جسمانی اور مالی عبادات کے علاوہ قلبی عبادات بھی ہیں، جن کا تعلق نفس کی اندرونی کیفیتوں سے ہے، سید صاحب کے خیال میں ان قلبی عبادات میں سر فہرست تقویٰ ہے، اس کی لغوی اصطلاحی، مذہبی اور روحانی حیثیت کو سمجھانے میں ایک معلم کے فرائض ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، فرماتے ہیں:

"قلبی عبادت میں سر فہرست تقویٰ ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام تعلیمات کا خلاصہ بلکہ روح ہے، عربی زبان میں اس کے لغوی معنے بچنے، پرہیز کرنے اور لحاظ کرنے کے ہیں، لیکن وحی محمدی کی اصطلاح میں یہ دل کی اُس کیفیت کا نام ہے، جو اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ حاضر و ناظر ہونے کا یقین پیدا کرکے دل میں خیر و شر کی تمیز کی خلش، خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کردیتی ہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے، کہ وہ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے، جس کی بناء پر ہر کام میں خدا کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے، تقویٰ والا وہ ہے جو اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں سچائی لے کر آئے اور اس ابدی سچائی کو سچ بنائے، وہ کسی کام میں ظاہری فائدہ، فوری ثمرہ، مال و دولت اور جاہ و عزت کے نقطہ پر نہیں بلکہ سچائی کے پہلو پر نظر رکھتا ہے، اور خواہ کسی قدر اس کا بظاہر نقصان ہو مگر وہ

معاف اللہ دست بازی کے جادہ سے بال بھر ہٹنا نہیں چاہتا، جب وہ ہر کام میں خدا کی مرضی اور پسندیدگی پر نظر رکھتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ بھی ان کو اپنی طرف سے اپنے انعام و محبت کا صلہ عطا فرماتا ہے، اور بڑا صلہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا ہی میں بندوں کے درمیان ان کے ساتھ عقیدت، محبت اور ہر دل عزیزی پیدا ہوتی ہے۔" (سیرۃ النبی جلد ۵ صفحہ ۳۱۴-۳۱۳)

یہی بات محراب کے نیچے منبر پر بھی کہی جاتی ہے، لیکن اس میں واعظانہ رنگ ہو جاتا ہے، اوپر کے اقتباس کا رنگ بظاہر تو معلمانہ ہے، لیکن اس کو پڑھتے وقت کچھ فلسفیانہ طرز فکر کا احساس بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

اخلاص کو بھی قلبی عبادت بتایا ہے، اس کو تحریر کے پورے وزن کے ساتھ سمجھایا ہے۔

"جو نیک کام بھی کیا جائے، اس کا محرک دنیاوی غرض نہ ہو، اور نہ اس کا مقصود ریا و نمائش، جلب منفعت، طلب شہرت، طلب معاوضہ وغیرہ ہو، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری اور خوشنودی ہو، اسی کا نام اخلاص ہے" (ایضاً جلد ۵ صفحہ ۲۳۰)

توکل کو بھی قلبی عبادت قرار دیتے ہیں، اس کو سمجھانے کا یہ متین انداز ہے۔

توکل جس قلبی یقین کا نام ہے، اس کے قریب قریب آج کل کے اخلاقیات میں خود اعتمادی کا لفظ بولا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ کامیاب افراد وہی ہوتے ہیں، جن میں یہ جوہر پایا جاتا ہے، لیکن اس خود اعتمادی کی سرحد سے بالکل قریب غرور اور فریب نفس کے گڑھے اور غار بھی ہیں، اس لئے اسلام نے انانیت کی خود اعتمادی کے بجائے خدا اعتمادی کا نظریہ پیش کیا ہے جو ان خطروں سے محفوظ ہے" (ج ۵ ص ۲۳۶)

صبر کو بھی قلبی عبادات میں شمار کیا ہے، اور اس کو اس طرح ذہن نشین کرایا ہے۔

"صبر بے بسی اور بے کسی یا دشمن سے کسی مجبوری کے سبب انتقام نہ لینے کا نام صبر نہیں"

بلکہ لغوی معنی تو اسس کے رک جانے اور سہارنے کے ہیں۔ معنوی حقیقت اسکی یہ ہے کہ اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا اور اس کو اپنی جگہ پر ثابت قدم رکھنا، یہی صبر کی معنوی حقیقت بھی ہے، یعنی اسکے معنی بے اختیاری کی خاموشی اور انتقام نہ لے سکنے کی مجبوری کے نہیں بلکہ پامردی، دل کی مضبوطی، اخلاقی جرأت اور ثبات قدم کے ہیں"۔ (جلد ۵ صفحہ ۳۳۴)

پھر اس کی مختلف قسموں پر بحث کرنے میں اپنی نکتہ وری اور نکتہ سنجی کا بھی ثبوت دیا ہے۔ شکر کو بھی قلبی عبادت میں شمار کیا ہے، تحریر فرماتے ہیں، کہ اللہ پاک کے احسانوں اور نعمتوں کو بھلا کر دل سے اس کا احسان مند نہ بننا، زبان سے ان کا اقرار اور عمل سے اپنی اطاعت شعاری اور فرمانبرداری ظاہر نہ کرنا کفر ہے، جس کے مرتکب کا نام کافر ہے، اس کے مقابلہ میں اللہ تعالےٰ کے احسانات اور نعمتوں کی قدر جان کر اس کے احکام کی اطاعت اور دل سے فرمانبرداری کرنے کا نام شکر ہے۔ پھر قرآن مجید کی بہت سی آیتوں کی تفسیر بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

بندوں کے ساتھ حسن سلوک، اور نیک برتاؤ کی حقیقت بھی شکر ہی ہے، دولت مند اگر اپنی دولت کا کچھ حصہ خدا کی راہ میں دیتا ہے تو یہ دولت کا شکر ہے، صاحب علم اپنے علم سے بندگان الٰہی کو فائدہ پہونچاتا ہے، تو یہ علم کی نعمت کا شکر ہے، طاقتور کمزوروں کی امداد اور اعانت کرتا ہے، تو یہ بھی قوت اور طاقت کی نعمت کا شکرانہ ہے"۔

(سیرۃ النبی جلد ۵ صفحہ ۳۵۰)

ایسی عبارت کوئی عارف باللہ ہی لکھ سکتا ہے، اوپر کی تمام باتیں تو کلام پاک کی ہیں، لیکن ان کو اس طرح کاغذ کے صفحات پر منتقل کیا ہے۔ کہ پڑھنے والے محسوس کرتے ہیں کہ جو چیزیں ان کے تحت الشعور میں دبی ہوئی تھیں وہ ابھر رہی ہیں، اور یہ تمام چیزیں کچھ ایسی فصاحت اور سلاست سے قلمبند ہوئی ہیں، کہ پہلی نظر میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایسی عبارت تو ہر جا ہے لکھ سکتا ہے لیکن

موضوع کو سامنے رکھ کر کوئی ایسی تحریر لکھنا چاہے تو اس کو اپنی کوتاہ قلمی اور کج بیانی کا احساس ہو جائے ۔ سید صاحب کی تحریر کی امتیازی شان یہی ہے، کہ موضوع تو خالص مذہبی ہوتا ہے، لیکن اس کو قلمبند اس طرح کرتے ہیں کہ پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے کہ ہم کو روح افزا شربت پلایا جا رہا ہے، اور ہم خوش خوش پی رہے ہیں ۔

اس میں جابجا فقہی مسائل پر بھی مباحث ہیں، ان میں مناظرانہ رنگ پیدا ہونے نہیں دیا ہے بلکہ قرآن مجید اور احادیث کے ذریعہ سے جس نتیجہ پر وہ خود پہونچے تھے، ان کو اس طرح قلمبند کر دیا ہے کہ پڑھنے والوں کے ذہن میں شکوک و شبہات نہ رہیں ۔

پانچوں وقتوں کی نماز کی تفصیل اس طرح بتاتے ہیں ۔

"نماز فجر کا بالتصریح ذکر طٰہٰ، طور، دہر، ہود، قٓ، روم اور نور میں، ظہر کا بالاجمال دہر، قٓ، طٰہٰ اور اسراء میں، اور بالتصریح اسراء اور روم میں، عصر کا بقرہ، دہر، ہود، طٰہٰ، قٓ اور روم میں، مغرب کا بالاجمال، ہود، طٰہٰ اور روم میں، اور بالتصریح قٓ میں، عشاء کا بصورت صلوٰۃ الیل مزمل، طور اور دہر میں، اور بصورت عشاء بالاجمال ہود، اور روم میں، اور بالتصریح قٓ اور ہود میں ہے، تمام نمازوں کا بالاجمال تذکرہ بقرہ اسراء اور طٰہٰ میں ہے۔ طور سے فجر اور عشاء دو وقتوں کی نماز، اسراء، ہود، اور طٰہٰ سے کم از کم بظاہر تین وقتوں کی، روم سے چار وقتوں کی نماز ثابت ہے۔" (سیرۃ النبی۔ ج ۵ ص ۹۱)

جمع بین الصلاتین کی تصریح کرتے وقت قرآن مجید کی یہ آیت سامنے رکھی

فَسُبۡحٰنَ اللّٰہِ حِیۡنَ تُمۡسُوۡنَ وَ حِیۡنَ تُصۡبِحُوۡنَ ۔ وَ لَہُ الۡحَمۡدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ عَشِیًّا وَّ حِیۡنَ تُظۡہِرُوۡنَ ۔

اللہ کی تسبیح کرو جب شام (یا رات) کرو اور جب صبح کرو اور اسی کی حمد آسمان اور زمین میں ہے، اور اخیر دن کو اس کی تسبیح کرو اور ظہر کرو۔

اس کی تفسیر بیان کرنے میں پورے مسئلہ کا حل پیش کر دیا ہے، لکھتے ہیں کہ سورہ روم کی اس آیت سے ظہر و عصر کا نام تصریح کے ساتھ آیا ہے، مگر شام کی نماز میں اجمال ہے، یعنی مغرب و عشاء دونوں حین تمسون (جب رات کرو) کے ذریعہ سے ادا کر دیا گیا ہے۔ اس سے اس جانب ایک لطیف اشارہ نکلتا ہے، کہ یہ دونوں مل کر ایک بھی ہیں اور علٰحدہ بھی، ہیں، اسی بنا پر اشد ضرورت اور سفر کی بے اطمینانی کے وقت ظہر و عصر کو ایک ساتھ اور مغرب و عشاء کو ایک ساتھ ملا کر بھی ادا کر سکتے ہیں۔ اور صبح کی نماز چونکہ ہر آیت میں ہمیشہ علٰحدہ ذکر کی گئی ہے، اس لیے اس کا کسی دوسری نماز سے ملانا جائز نہیں، احادیث میں جمع بین الصلوتین کے عنوان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی مثالیں اس نکتۂ قرآنی کی تشریح میں موجود ہیں (سیرۃ النبی ج ۵ ص ۹۲-۹۱)

نماز با جماعت کی تصریح جس طرح کی ہے، اس سے ہم آپ لطف اندوز ہونے کے علاوہ کچھ سبق بھی حاصل کریں۔

"کسی قوم کی زندگی، اس کی نظم جماعت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی، یہی گرہ جب کھل جاتی ہے تو قوم کا شیرازہ منتشر و پراگندہ ہو جاتا ہے۔

اسلام میں نماز با جماعت مسلمانوں کی زندگی کی عملی مثال ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عملی مثال کو عربوں کے سامنے پیش کر کے ان کی زندگی کا خاکہ کھینچا، اور بتایا کہ مسلمانوں کا یہ صف بہ صف کھڑا ہونا، ایک دوسرے کے شانہ سے شانہ ملانا اور

یکساں حرکت و جنبش کرنا، ان کی قومی زندگی کی مستحکم و مضبوط دیوار کا مسالہ ہے جس طرح نماز کی درستی اس صف اور نظام جماعت کی درستی پر موقوف ہے، اس طرح پوری قوم کی زندگی اس باہمی تعاون، تضامن، شارکت، میل جول اور باہمی ہمدردی پر موقوف ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صفوں کی درستی پر بہت زور دیتے تھے، اور فرماتے تھے کہ جب تک تم خوب مل کر کھڑے نہ ہوگے تمھارے دل آپس میں نہ ملیں گے۔

(سیرۃ النبی جلد ۵ صفحہ ۱۳۰)

سیرۃ النبیؐ جلد ششم | سیرۃ النبیؐ جلد پنجم کی اشاعت کے پانچ سال کے بعد سیرۃ النبیؐ جلد ششم ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی جس کی ضخامت ۸۰۰ صفحے ہے، اس وقت سید صاحب کی عمر پچپن سال کی ہو چکی تھی، مگر اس کی ضخامت اور اس کے مسائل کے مباحث سے اندازہ ہوتا ہے، کہ ان کی تصنیفی زندگی کی جوانی، رعنائی اور دل آویزی برقرار تھی، اور پہلے ہی کی طرح ان کے قلم کا طاؤس رقص کرتا نظر آتا ہے،

اس جلد کا موضوع اسلام میں اخلاقیات ہے، اس کا تقاضا یہ تھا کہ اس کے طرز ذکر میں گہرائی اور گیرائی ہو، اور طرز ادا میں عظمت اور وقار ہو، یہی چیز نگی اس پوری کتاب میں چھائی نظر آتی ہے جو ان کی انشا پردازی کے مختلف جلووں میں سے ایک علحدہ جلوہ ہے، اس میں فضائل اخلاق، رذائل اخلاق اور آداب اخلاق کے علحدہ علحدہ عنوانات کے تحت مباحث ہیں، ان میں جو بات کہی گئی ہے، اس کی تائید میں پہلے قرآن مجید کی آیتیں اور مقدس حدیثیں پیش کر دی گئی ہیں اور یہ تمام مباحث اس لئے خشک نہیں ہونے پائے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی کے جلوہائے ہزار رنگ کو اس طرح قلمبند کیا گیا ہے کہ شروع سے آخر تک کتاب پڑھتے وقت یہ نہیں محسوس ہوتا کہ ہم مواعظ کی کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں، بلکہ محبت بھری حکایتوں کے ایک مجموعہ سے دل و دماغ کو محظوظ کر رہے ہیں، ان واقعات کو جمع کرنا تو تلاش و تحقیق کی دلیل ہے، لیکن ان کو دل نشین

اور دل آویز انداز میں پیش کرنے میں قلم کے اعجاز کی ضرورت تھی، جو اس میں پورے طور پر نظر آتا ہے، اس ضخیم کتاب میں جو اخلاقی تعلیمات دی گئی ہیں وہ تو اس مقالہ کا موضوع نہیں، لیکن جس طرح وہ قلمبند کی گئی ہیں، اُن کا پورا تو نہیں، ہاں تھوڑا سا احاطہ کرنا یہاں پر ضروری ہے،

طرزِ ادا کی رعنائی کا اندازہ حسب ذیل اقتباس سے کریں۔

"ایمان کے بعد، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے چار ستونوں پر قائم بتایا گیا ہو۔ بظاہر یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے، کہ اسلام کی اس عمارت میں اخلاق حسنہ کو کوئی جگہ ہی نہیں دی گئی ہے اور بے سمجھ واعظوں کی غلط بیانی سے اس غلط فہمی میں اور اضافہ ہو گیا ہے، حالانکہ عبادات کے شروع میں ہم یہ بتا چکے ہیں کہ دوسرے اہم مقاصد کے علاوہ ان عبادات سے ایک مقصد انسان کے اخلاق حسنہ کی تربیت اور تکمیل ہے، قرآن پاک میں یہ نکتہ ہر جگہ واضح کر دیا گیا ہے، چنانچہ نماز کا ایک فائدہ اس نے یہ بتایا ہے کہ وہ بری باتوں سے باز رکھتی ہے، روزہ کی نسبت بتایا ہے کہ تقویٰ کی تعلیم دیتا ہے، زکوٰۃ سراپا انسانی ہمدردی اور غمخواری کا سبق ہے، اور حج بھی مختلف طریقوں سے ہماری اخلاقی اصلاح و ترقی کا ذریعہ اور اپنی اور دوسروں کی امداد کا وسیلہ ہے، اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے ان چاروں ارکان کے نام الگ الگ جو کچھ ہوں، مگر ان کے بنیادی مقاصد میں اخلاقی تعلیم کا راز مضمر ہے، اگر ان عبادات سے یہ روحانی، اور اخلاقی ثمرہ ظاہر نہ ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ احکام الٰہی کی محض لفظی تعمیل اور عبادت کے جوہر و معنی سے یکسر خالی اور معرا ہیں، وہ درخت ہیں جن میں پھل نہیں، وہ پھول ہیں جن میں خوشبو نہیں، وہ قالب ہیں جن میں روح نہیں۔" (سیرۃ النبیؐ جلد ۶ صفحہ ۱۰-۱۱)

آخر کے چند جملوں سے ان مذہبی مواعظ میں کیسی دلکشی پیدا ہو گئی ہے، ذرا حسب ذیل

کرنوں سے بھی اپنے قلب کو منور کریں۔

"یہ ظاہری اخلاق ہماری اندرونی ایمانی کیفیت کا معیار اور پیمانہ ہیں، ہمارے دل کے اندر کا ایمان ہمارے گھر کا چراغ زیر دامن ہے، اس کی چمک دمک اور روشنی کا اندازہ اس کی باہر نکلنے والی شعاعوں سے کیا جائے گا۔" (سیرۃ النبیؐ جلد ۶ صفحہ ۲۴)

"اسلام نے انسان کی روحانی تکمیل کا ذریعہ اخلاق کو اسی لئے قرار دیا ہے کہ وہ صفات الٰہی کے انوار کے کسب و فیض کا سبب ہے، ہم جس حد تک اس کسب و فیض میں ترقی کریں گے ہماری روحانی ترقی کا سلسلہ جاری رہے گا، اور یہی ہماری زندگی کی روحانی سیر کی آخری منزل ہے، اخلاق کا اس سے بلند تر تخیل ممکن نہیں" (ج ۶ ص ۲۴)

دنیا کے آخری معلم کی تعلیم میں حکم خداوندی اور عقلی دقیقہ رسی، فرمان الٰہی اور اخلاقی نکتہ وری، امر ربانی اور حکم فطرت، کتاب اور حکمت دونوں کی آمیزش ہے۔ (ج ۶ ص ۲۸)

"انبیا علیہم السلام جو کچھ کہتے ہیں، وہ کرتے بھی ہیں، جو ان کی تعلیم ہے، وہی ان کا عمل ہے، جو ان کے منہ پر ہے، وہی دل میں ہے، اس لیے ان کی تعلیم اور صحبت کا فیضان خوشبو بن کر اڑتا، اور ہم نشینوں کو معطر بنا دیتا ہے، یہی وہ فرق ہے جو انبیاء اور حکما یعنی موسیٰؑ، عیسیٰؑ، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سقراط، افلاطون اور ارسطو میں نمایاں ہیں، سقراط اور افلاطون کے مکالمات اور ارسطو کے اخلاقیات کو پڑھ کر ایک شخص بھی صاحب اخلاق نہ بن سکا، مگر یہاں قوموں کی قومیں ہیں جو موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور محمد رسول اللہ علیہم السلام کی تعلیم و تلقین سے اخلاق کے بڑے بڑے مدارج پر پہونچیں، اور آج زمین کے کرہ پر جہاں کہیں بھی حسن اخلاق کی کوئی کرن ہے، وہ نبوت ہی کے کسی مطلع انوار سے چھن کر نکل رہی ہے۔" (جلد ۶ صفحہ ۲۹ و ۳۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ حسنہ کا اعلیٰ رتبہ متعین کرنا چاہتے ہیں، تو پہلے آپ سے پہلے کے انبیائے اکرام کا ذکر کرتے ہیں، مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر جس اسلوب میں کرتے ہیں، اس کا لطف لیتے ہوئے اس کی نکتہ آرائی پر بھی غور کریں۔

"کوہ زیتون کے پرتاثیر واعظ یعنی حضرت عیسیٰ کی معصومانہ باتیں سچائی اور راست بازی کی نصیحتیں لفظی صنائع و بدائع اور دلکش تمثیلوں سے بھری ہوئی تقریریں، دنیا نے سنیں، اور ان کی فصاحت اور شیرینی کا مزہ اب تک اس کے کام ودہن میں ہے، مگر کیا اس کی آنکھوں نے اس معصوم واعظ کی عملی مثالیں بھی دیکھیں؟ کیا اس سلبی پہلو کے سوا اس کے اخلاق کا کوئی ایجابی پہلو بھی ہمارے سامنے ہے؟ وہ جس نے یہ کہا کہ سب کچھ جو تمہارے پاس ہے، جب تک اس کو خدا کی راہ میں لٹا نہ دو، آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہوگے، کیا اس نے اپنا بھی سب کچھ خدا کی راہ میں لٹایا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ شریروں کا مقابلہ نہ کرو، کیا اس نے خود بھی شریروں کا مقابلہ نہیں کیا؟ وہ جس نے کہا کہ دشمنوں کو بھی پیار کرو کیا اس نے بھی کبھی اپنے دشمن کو پیار کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ تو اپنے پڑوسی کو اپنے سارے جان و مال سے پیار کر، کیا خود بھی اس کا ایسا ہی عمل تھا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ اگر تمہارے داہنے گال پر کوئی تھپڑ مارے تو بایاں گال بھی اس کے سامنے کردو، کیا اس نے خود بھی ایسا کیا، وہ جس نے یہ کہا کہ تم سے اگر کوئی تمہارا کرتا مانگے تو اپنی قبا بھی اس کے حوالہ کردو، کیا ایسی فیاضی اس سے خود بھی ظہور میں آئی؟ (سیرۃ النبیؐ جلد ۲ صفحہ ۳۳-۳۲)

یہاں تک وہ سب کچھ کہہ گئے جو کہنا چاہتے تھے، مگر وہ حضرت عیسیٰ کی نبوت پر ایمان کامل رکھتے تھے، ان کا احترام بھی ان کو کرنا تھا، اس لئے ان کا ادب شناس قلم رکتا ہے، اور اپنے قارئین کے

ذہن کو اس کے بعد ہی دو جملوں سے مسحور کر دیتے ہیں کہ۔

"ہم یہ نہیں کہتے کہ حضرت مسیحؑ میں یہ صفتیں موجود تھیں، بلکہ کہنا ہے کہ انجیل نے ان کی اس حیثیت کو محفوظ نہیں رکھا ہے۔" (سیرۃ النبی جلد ۶ صفحہ ۳۳)

اپنے قلم کی اس احتیاط کے بعد اپنے ناظرین کے ذہن کو یہ لکھ کر مسحور کرتے ہیں۔

"مگر اسلام کے اخلاقی معلم کی شان اس حیثیت سے بھی بلند ہے، اس نے جو کچھ کہا سب سے پہلے خود اس کو کر کے دکھایا، اس کا جو قول تھا وہی اس کا عمل تھا، اس نے یہودیوں کو طعنہ دیا کہ أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنسَوْنَ أَنفُسَكُمْ (بقرہ۔۵) کیا اوروں کو نیکی کی بات بتاتے ہو، اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو، اور مسلمانوں کو متنبہ کیا

لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ كَبُرَ مَقْتًا عِندَ اللَّهِ أَن تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ۔ (صف۔۱)	تم کیوں کہتے ہو کہ جو کرتے نہیں بڑی بیزاری کی اللہ کے یہاں کہ کہو وہ جو نہ کرو۔" (جلد ۶ صفحہ ۳۳)

اس میں قرآن مجید کی آیتیں اس طرح شامل ہو گئی ہیں کہ تحریر کی لڑیوں سے جدا نہیں معلوم ہوتی ہیں، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی اخلاق کے جلوؤں کو اس طرح دکھاتے ہیں۔

" ایک شخص نے ام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیا تھے، فرمایا کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا، کان خلقہ القرآن۔ جو قرآن میں الفاظ کی صورت میں ہے، وہی حال قرآن کی سیرت میں بصورت عمل تھا۔"

وہ عملی صورت کیا تھی، ذرا ان ہی کے قلم سے سن کر عشق رسول سے بھی تھوڑی دیر کیلئے سرشار ہو لیں۔

" اگر غریبوں اور مسکینوں کی امداد و اعانت کا حکم دیا تو پہلے خود اس فرض کو ادا کیا، خود بھوکے رہے، اور دوسروں کو کھلایا، اگر آپ نے اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو

معاف کرنے کی نصیحت کی تو پہلے خود اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کیا، کھانے میں زہر دینے والوں سے درگذر کیا، اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہیں لیا، جنھوں نے آپ پر تیر برسائے اور تلواریں چلائیں، مسلح ہو کر بھی کبھی ان پر ہاتھ نہیں اٹھایا، کپڑوں کی شدید ضرورت کے وقت میں بھی جس نے آپ سے کپڑا مانگا، خود اپنی چادر اتار کر اس کے حوالہ کر دی۔" (سیرۃ النبی جلد ۶ ص ۳۲)

ان عملی نمونوں کے افادی پہلوؤں کو اس طرح قلمبند کرتے ہیں۔

"دوسرے مذاہب کے لوگ انسانوں کو اپنے ہادیوں اور رہنماؤں کے صرف اقوال اور تعلیمات سناتے ہیں، انکی پیروی کی دعوت دیتے ہیں، اور مسلمان اپنے پیغمبر کے نہ صرف اقوال و نصائح کو بلکہ اسکے عملی نمونوں اور کارناموں کو بھی پیش کرتے اور انکی پیروی کی دعوت دیتے ہیں۔ دنیا کے کسی پیغمبر اور بانی دین کے صحیفہ نے خود اپنے پیغمبر یا بانی کی اخلاقیت کو تحدی اور اعلان کے ساتھ اس کے ہم عصروں کے سامنے پیش نہیں کیا، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیفہ نے سب سے آگے بڑھ کر بلا خوف خطر اپنے داعی اور مبلغ کی زندگی کی اخلاقیت کو خود اسکے معاصرین کے نقد و تبصرہ کے لیے پیش کیا۔" (جلد ۶ صفحہ ۳۲)

پھر رسول اللہؐ کی تعلیم کی وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

"اخلاقی معلم کے کمال کی ایک اور شرط یہ ہے کہ اس کی تعلیم میں یہ تاثیر ہو کہ وہ دوسروں کو بھی اپنے فیض سے بہرہ مند کر سکے، یعنی وہ خود کامل ہو، اور دوسرے ناقصوں کو بھی کامل بناتا ہو، وہ خود پاک ہو، اور دوسرے ناپاکوں کو بھی دھو کر پاک و صاف کر دیتا ہو، اخلاق کے سارے معلموں کی فہرست پر ایک نظر ڈال جاؤ کہ یہ تکمیل کی شان سب سے زیادہ کس میں تھی؟ کیا اس میں جسکو تمام قدم پر بنی اسرائیل کی سنگدلی اور کجروی کا گلہ کرنا پڑا ہے، کیا اس میں جس کے پورے گیارہ شاگرد بھی امتحان کے وقت پورے نہ اترے، کے

یا اس میں تھی جس کی نسبت اس کے صحیفۂ وحی نے بار بار اعلان کیا۔

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ	وہ ان کو خدا کی باتیں سناتا اور ان کو
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ	پاک و صاف بناتا، اور ان کو کتاب اور
(جمعہ - ۱)	حکمت سکھاتا ہے۔ (ص ۳۵)

قرآن کی یہ آیت یہاں اس طرح لکھی گئی ہے جیسے معلوم ہوتا ہے کہ ملہم غیبی صدا دے رہا ہے کہ جو کچھ نثر میں لکھا جا رہا ہے، وہاں پر اسی آیت کے نقل کرنے کی ضرورت ہے، پھر اسی چھوٹی سی آیت کی یہ تفسیر بیان کرتے ہیں۔

"اس تحدی اور اعلان میں یہ بات خاص لحاظ کے قابل ہے کہ اس میں اسلام کے معلم کی نسبت صرف یہی دعویٰ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو کتاب و حکمت کی باتیں سکھاتا اور خدا کے احکام سناتا ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ ان کو اپنے فیض و اثر سے پاک و صاف و مصفا بنا بھی دیتا ہے، وہ ناقصوں کو کامل، گنہ گاروں کو نیک، اندھوں کو بینا اور تاریک دلوں کو روشن دل بنا دیتا ہے، چنانچہ جس وقت اس نے اپنی حیات کا کارنامہ ختم کیا، کم از کم ایک لاکھ انسان اس کی تعلیم سے عملاً بہرہ مند ہو چکے تھے، اور وہ عرب جو اخلاق کے پست ترین نقطہ پر تھا، ۲۳ برس کے بعد وہ اخلاق کے اس اوج کمال پر پہونچا جس کی بلندی تک کوئی ستارہ آج تک نہ پہونچ سکا۔ (ج ۶ ص ۳۶)

پھر وہ یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے جلوہ ہائے صد رنگ کس کس طرح سے نمایاں ہوئے اس کے موثر انداز بیان کی تاثیر سے متاثر ہونا لازمی ہے، رقمطراز ہیں۔

"اس عالم کی تکمیل اور نظم و نسق کے لئے ایک ہی قوت کے انسانوں کی نہیں بلکہ سینکڑوں مختلف قوتوں کے انسانوں کی ضرورت ہے، اخلاق کے دوسرے معلمین کی درسگاہوں میں

ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ وہاں صرف ایک فن کے طالب العلم تعلیم پاتے ہیں، حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کی تربیت گاہ میں فوجی تعلیم کے سوا کوئی اور فن نمایاں نہیں حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کے مکتب میں عفو و درگذر کے سوا کوئی اور سبق نہیں، بودھ کے دربار اور خانقاہ میں در بدر بھیک مانگنے والے مرتاض فقیروں کے سوا کوئی اور موجود نہیں" (سیرۃ النبی ج ۶ ص ۳۰)

اتنا لکھنے کے بعد ان کے قلم میں کیلی کی سرعت پیدا ہو جاتی ہے رقمطراز ہیں،

"لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی درسگاہ عظمیٰ میں آکر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک عمومی جامعہ ہے، جس میں انسانی ترقی کی ہر قوت نشو و نما پا رہی ہے، خود معلم کی ذات ایک پوری یونیورسٹی ہے، جس کے اندر علم و فن کا ہر شعبہ اپنی جگہ پر قائم ہے اور ہر جنس اور ہر مذاق کے طالب علم آتے ہیں اور اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق کسب کمال کر رہے ہیں۔ (ایضاً ج ۶ ص ۳۰)

مجلس نبویؐ کی مرقع آرائی کر کے ہمارے اور آپ کے ایمان کو منور کرنے کا پورا موقع دیا ہے، لکھتے ہیں۔

"آپ کی حیثیت ایک انسان ایک باپ، ایک شوہر، ایک دوست ایک خانہ دار، ایک کاروباری ایک تاجر ایک افسر، ایک حاکم، ایک قاضی، ایک سپہ سالار، ایک بادشاہ، ایک استاد، ایک واعظ ایک مرشد، ایک زاہد، ایک عابد، اور ایک پیغمبر کی نظر آتی ہے، یہ تمام انسانی طبقے آپ کے سامنے اگر زانوے ادب تہ کرتے ہیں اور اپنے شعبہ و فن کے مطابق آپ کی تعلیمات سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں، مدینۃ النبیؐ کی اس درسگاہ اعظم کو غور سے دیکھو جس کی چھت کھجوروں کے پتوں سے اور ستون کھجور کے تنوں سے بنائے گئے تھے، اور جس کا نام مسجد نبوی تھا، اس کے الگ الگ گوشوں میں ان

انسانی جماعتوں کے الگ الگ دو بے کھلے ہوئے ہیں، کہیں ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ جیسے فرمانروا زیر تعلیم ہیں کہیں طلحہؓ و زبیرؓ و حنظلہؓ، سعد بن معاذؓ و سعد بن عبادہؓ جیسے ارباب حل و عقد ہیں، کہیں خالدؓ، ابوعبیدہؓ، سعد بن ابی وقاصؓ اور عمرو بن العاصؓ جیسے سپہ سالار ہیں، کہیں وہ ہیں جو بعد کو صوبوں کے حکمران و ملکوں کے قاضی بنے، کہیں زہاد و عباد کا مجمع ہے، جو دن کو روزوں میں، راتیں نمازوں میں کاٹتی تھیں، کہیں ابوذرؓ و سلمانؓ اور ابو درداءؓ جیسے وہ خرقہ پوش ہیں جو مسیح اسلام کہلاتے تھے، کہیں وہ صفہ والے طالب علم تھے، جو جنگل سے لکڑیاں لا کر بیچتے، اور گذارہ کرتے، اور دن رات علم کی طلب میں مصروف رہتے تھے، کہیں حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ جیسے فقیہ و محدث تھے، جن کا کام علم کی خدمت اور اشاعت تھا، ایک جگہ غلاموں کی بھیڑ ہے، تو دوسری جگہ آقاؤں کی مجلس ہے، کہیں غریبوں کی نشست ہے، اور کہیں دولت مندوں کی مجلس ہے، مگر ان میں ظاہری عزت اور دنیاوی اعزاز کی کوئی تفریق نہیں پائی جاتی، سب مساوات کی ایک ہی سطح پر اور صداقت کی ایک ہی شمع کے گرد پروانہ وار جمع ہیں، سب پر توحید کا یکساں نشہ چھایا اور سینوں میں حق پرستی کا ایک ہی ولولہ موجیں مار رہا ہے اور سب اخلاق و اعمال کے ایک ہی آئینہ میں اس کا عکس بننے کی کوشش میں لگے ہیں۔ (ج ۶، [illegible])

ایسا مرصع کار مینا نگار طرزِ بیان وہی اختیار کر سکتا ہے، جو عشق رسول میں سرشار ہو، اس میں نہ صرف جذبات کا جوش بار نظر آتا ہے، بلکہ مجلس نبوی کی صحبت گہر بار کا نقش و نگار اس طرح پیش کیا گیا ہے، کہ یہ قلمی محاکات کی بہت عمدہ مثال بھی بن گئی۔

سیرۃ النبی جلد ہفتم | سیرۃ النبی جلد ہفتم، سید صاحب کی ایک نامکمل اور ادھوری تصنیف ہے، وہ جلد ششم کے بعد اسلام میں معاملات اور سیاسیات کی جو تعلیمات دی گئی ہیں، ان پر ایک مستقل جلد لکھنا چاہتے تھے، اس کو شروع کیا تھا لیکن اس زمانے میں ان کی ملکی اور علمی زندگی میں بعض اسباب کی

بنا پر بڑا انتشار رہا،

وہ اپنی علالت اور صحت کی کمزوری کی وجہ سے بھی پریشان رہے، پھر جلد ہفتم لکھنے کا وقت انکا وقت حیات شبلی کی ضخیم جلد کی تدوین میں بھی صرف ہوا، ان اسباب کی بنا پر ان کی ساتویں جلد تیار نہ ہو سکی، چند ابواب لکھے تھے، جن کے عنوانات یہ ہیں، اسلام میں حکومت کی اہمیت، عہد نبوی میں نظام حکومت، سلطنت اور دین کا تعلق، امت مسلمہ کی بعثت قوت عالمیہ قوت آموزعالم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ'

اس میں ان کی فکر کی گہرائی تو ضرور ہے، لیکن تحریر کا وہ جوش اور روانی بہت نظر نہیں آتا، جو سیرۃ النبیؐ کی گذشتہ جلدوں میں نظر آتا ہے پھر بھی اس میں ان کے قلم کی پختگی نظر کی جامعیت اسلام کی روح سے آشنائی' اور اظہار رائے میں اعتدال و توازن تو اس کی ہر سطر میں نمایاں ہے، جیسا کہ ان کے حسب ذیل اقتباسات سے ظاہر ہوگا، ان سے ان کے سیاسی افکار و خیالات بھی معلوم ہو جائیں گے، اور ان کا طریقہ بیان بھی، خلافت راشدہ اسلام کی تاریخ میں ایک آئیڈیل حکومت سمجھی جاتی ہے، اس پر وہ تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اصل یہ ہے کہ اسلام نے اپنے اولین دور میں عملاً جس طرز کی حکومت قائم کی، اور جس قسم کی مثالیں اور تعلیمیں اس نے پیش کیں، ان کی روشنی میں اسلامی حکومت کا جو تصور قائم ہوتا ہے، اس میں بیک وقت مذہبی، شخصی، دستوری، جمہوری، اور زعیمی حکومتوں کے خصوصیات اور مظاہر نظر آتے ہیں، اس لیے اہل نظر اپنے اپنے مذاق کے اعتبار سے اسکی تعبیر کرتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسا طرز حکومت ہے، جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ذریعہ ظہور میں آیا، اور اسلام ہی نے اس کو پیش کیا ہے، وہ نہ استبدادی ہے نہ شخصی ہے، نہ دستوری ہے، نہ جمہوری ہے، اور نہ زعیمی ہے، بلکہ ایک ایسا طرز حکومت ہے، جس میں ان سب کے خصوصیات و فضائل تو یکجا ہیں، لیکن وہ ان کے قبائح و مثالب سے

خالی ہے اس لئے وہ دیکھنے والوں کو کبھی خدائی کبھی شخصی کبھی ذاتی کبھی دستوری اور کبھی جمہوری
بلکہ اشتراکی تک نظر آتی ہے، لیکن اگر اس کے اصل رخ سے دیکھئے اور اس کے ایک ایک خط و
خال کا جائزہ لیجئے تو اس کی شکل سب سے الگ نظر آئے گی" (ایضاً جلد ۱، صفحہ ۱۹۰)

پھر اس کی تصریح اس طرح کرتے ہیں جس میں ان کی امعان نظر بھی نمایاں ہے، اس کو جس باریک
بینی سے قلمبند کرتے ہیں، وہ قابل غور ہے۔

"اسلام کی سلطنت تمام تر مذہبی احکام پر قائم ہے، مگر اس کا امیر یا خلیفہ نہ خدا ہے نہ
خدا کا اوتار ہے، نہ خدا کا مظہر ہے، نہ خدا سے ہمکلام ہوتا ہے، نہ خدا سے براہ راست احکام
پاتا ہے نہ اس میں کوئی خدائی تقدس ہے، نہ وہ خدا کی طرف سے مقرر ہوتا ہے، بلکہ وہ انسان ہوتا ہے
جس کو مسلمانوں نے اپنی رائے سے یا سابق امیر نے امت کی سرداری اور خدا کی شریعت کی
تنفیذ کے لیے اس کو منتخب کیا ہے، تاہم اسلام کی حکومت کو اس لحاظ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ
کے ان احکام پر مبنی ہے، جو رسول کے ذریعے اس کو ملے ہیں، اس کو الٰہی ہی کہا جا سکتا ہے
اور اس بنا پر کہ اسلام کی حکومت میں ارباب شوریٰ اور اہل حل و عقد کا گروہ مانا گیا ہے
اور شوریٰ اور باہمی مشورہ کی تاکید ہے اس کو تسامحاً دستوری کہہ دینا ممکن ہے، اور اس سبب
کہ اس کے خلیفہ کا انتخاب افراد امت کی جانب سے بھی ہوتا ہے اور اس کو حکومت کے حقوق
اور فوائد میں امت کے عام افراد سے ایک ذرہ بھی تفوق حاصل نہیں ہوتا، لوگ جمہوری
سمجھ سکتے ہیں، اور اس خیال سے کہ خلیفہ کے احکام شرعی کی اطاعت امت پر واجب
ہے، اور وہ امت کے مشوروں کے ماننے پر قطعاً مجبور نہیں، اس کو شخصی کہہ دینا ممکن ہے،
اور اس نظر سے کہ خلیفہ کے ہر جائز حکم اور منشا پر بے چون و چرا عمل کرنا امت کیلئے ضروری
ہے اس کو زعیم یعنی ڈکٹیٹر سمجھا جا سکتا ہے" (ایضاً جلد، صفحہ ۱۹۱ - ۱۹۰)

خلافت راشدہ کے مختلف بلکہ پیچیدہ پہلوؤں کو کس صاف سلیس اور عام فہم انداز میں ایک پیراگراف میں سمجھا دیا ہے جو کسی اہل قلم کے لیے پورے ایک باب میں بھی سمجھانا مشکل ہو جاتا ہے صرف نفس مسئلہ کے ساتھ قلم پر قدرت کی بھی دلیل ہے۔ لیکن اوپر کے اقتباس کے بعد خود ہی اپنے قارئین کو یہ کہہ کر مسرور کرتے ہیں کہ

"لیکن ان مختلف جہتوں کی بناء پر ظاہر ہے کہ مغربی اہل سیاست کے بتائے ہوئے نظریات حکومت میں سے کوئی ایک نظریہ بھی اسلامی طرز حکومت پر پوری طرح صادق نہیں آسکتا۔"

(سیرۃ النبی جلد ، صفحہ ۱۹۱)

اور اسی کے بعد اسلامی سیاست کی اسلامی روح کو جس پر زور، موثر اور خوبصورت انداز میں قلمبند کیا ہے، وہ موجودہ دور کے اسلامی ممالک کے حکمرانوں کے لئے مشعل ہدایت ہے، لکھتے ہیں۔

"اصل یہ ہے کہ سیاسی مفکرین کی نظر حکومت کی ظاہری اشکال کے گورکھ دھندوں میں پھنس کر رہ گئی، اور اسلام کی نظر اس کے اندر کی حقیقت پر ہے۔ اس کے نزدیک حکومت کی ظاہری شکل یعنی انتخاب کا طریقہ، ارباب شوریٰ کی ترتیب اور تعیین، ان کے فرائض و حقوق، ان کے انتخاب، اظہار رائے کے طریقے اور دیگر متعلقہ مسائل اہمیت کے قابل نہیں، اصل چیز حکومت کے امیر و رئیس اور اس کے ارکان و عمال کا تقویٰ ہے" (ایضاً جلد ، صفحہ ۱۹۱)

اور پھر اس سیاسی تقویٰ کو جس طرح سمجھایا ہے اس کے سمجھنے میں کسی وقت نظر کی ضرورت نہیں، یہ لکھ کر ہماری تواضع کرتے ہیں،

"یہ تقویٰ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی ذمہ داری کا قلبی و ایمانی احساس اور اس حقیقت کی تلقین ہے کہ حکومت کا کوئی جز کسی کی شخصی یا خاندانی ملکیت نہیں، بلکہ وہ خدا کی ملکیت ہے اور اسی کے حکم یا منشائے حکم کا نفاذ حکومت کا فرض ہے، اور خدا کے بنائے ہوئے اور تعلیم کے

بعض احکام و قوانین میں سب مسلمانوں کی حیثیت یکساں ہے، اور سب ایک جیسے اس کے بندے اور تابع فرمان ہیں۔" (سیرۃ النبیؐ جلد ۷ صفحہ ۱۹۲)

تقویٰ کی بحث کو جاری رکھتے ہوئے اسلامی سلطنتوں اور عام سلطنتوں کا موازنہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"عام سلطنتوں کا اصول یہ ہے کہ وہ سلاطین و حکام و سلطنت کے عمال کے قول و فعل کو قانون کے سلسلوں سے جکڑ دیتی ہیں کہ وہ حق و عدل کے خلاف نہ کر سکیں لیکن اسلامی حکومت کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں اور عاملوں کے دلوں پر اپنا قبضہ جماتی ہے تاکہ تقویٰ اور آخرت کے مواخذہ کے خوف اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کے جذبہ سے حق اور عدل کے خلاف نہ کر سکیں، عام حکومتیں ہر روز اپنے ہر قانون کی اجاری توڑ پھوڑ کو دیکھ کر دوسرا قانون بناتی ہیں، پھر تیسرا اور چوتھا قانون، پھر اسی طرح ہر قسم کی برائیوں کی روک تھام کے لیے مسلسل قانون بناتی رہتی ہیں، اور مجرم اس کو اپنی چالاکی اور ہشیاری سے برابر توڑتے رہتے ہیں، اور سلطنت کا مقصود حاصل نہیں ہوتا، اس کے برخلاف اسلام کی سلطنت اگر اصول اسلام کے مطابق ہو تو صرف خدا کا تقویٰ اور آخرت کے مواخذہ کا ڈر ان کے دل کو ہر کجی اور عمل کی ہر برائی کو قطعاً ختم کر دیتا ہے، جس کی بے شمار مثالیں عہد نبوت، زمانہ خلافت اور بعض نیک و عادل سلاطین کی سلطنتوں میں ملتی ہیں۔" (ج۷، ص۱۹۲)

ایک بہت ہی پیچیدہ، عمیق اور متنازعہ فیہ مسئلہ کو کیسے ٹھنڈے لہجے میں اور ٹھنڈی تحریر کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی ہے، جو اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ ضرورت کے وقت وہ اپنی تحریر کے ذریعہ جذبات میں تلاطم اور تموج بھی پیدا کر سکتے ہیں لیکن جب غور و فکر کرنے اور کسی نتیجہ پر پہنچنے کی ضرورت ہوتی ہے تو اس کے لیے دعوتی انداز کی تحریر لکھ کر ذہن کو متوجہ کرتے ہیں۔

تمہید: تین ہزار دو سو چھیالیس صفحے کی سیرۃ النبیؐ کی پانچ جلدیں لکھ کر سید صاحب نے جوئے شیر لانے کے فرہاد کا لقب حاصل کیا، لیکن اسی فرہاد نے ان جلدوں کے ذریعہ سے اپنی انشا پردازی کا جو قصر شیریں تیار کیا، وہ اسی کے ساتھ ان کا دوسرا اہم کارنامہ ہے۔ ان میں جو انداز بیان ہے، وہ دنیا کے کسی زبان کے عظیم ترین مصنفوں کے اسلوب کے مقابلہ میں رکھا جا سکتا ہے۔ ان کو عربی زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی، وہ اس کے بڑے اچھے اہل قلم تھے۔ ان کو فارسی زبان پر بھی دسترس حاصل تھی، وہ انگریزی زبان سے بھی اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے، اس کی اہم کتابیں اور اخبارات میں برابر ان کے مطالعہ میں رہتے، اردو تو ان کی مادری زبان ہی تھی، لکھنؤ میں تعلیم پائی، اور اپنی عمر کا زیادہ حصہ یہیں گزارا، پھر علامہ شبلیؒ کی صحبت برابر حاصل رہی، ان تمام اثرات کی وجہ سے انکی تحریروں میں عربی زبان کی جزالت، شوکت اور حشمت آئی، فارسی زبان کی فصاحت، حلاوت اور تمکنت غیر شعوری طور پر ان کی تحریروں میں منتقل ہوتی رہیں، پھر شاید ان کو بھی خبر نہیں رہی کہ انگریزی زبان کے طرز ادا کی برجستگی اور روانی ان کی تحریروں کا پیچھا کرتی رہیں، علامہ شبلی نعمانی کی انشا پردازی کا وصف اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے، کہ سر سید نے ایک کان سے اردو کی نثر نگاری کا ایک ہیرا نکالا، حالی نے اس میں جلا دی، نذیر احمد نے اس میں چمک پیدا کی اور محمد حسین آزاد نے اس میں دمک عطا کی، مگر جس نے اس ہیرے کو کوہ نور بنا دیا وہ علامہ شبلی نعمانیؒ ہیں، اسی کوہ نور کا پرتو ان کی بزم کے صدر الصدور کی تحریروں میں دکھائی دیتا ہے۔

سیرۃ النبیؐ کی ان پانچ جلدوں میں کہیں تو اس کا اسلوب ایسا ہے، جو کسی باوقار مفسر کا ہونا چاہئے، کہیں اس کا انداز بیان وہ ہے، جو باوزن محدث کا ہوتا ہے، کہیں اظہار رائے وہی ہے جو ایک دیدہ ور فقیہ کے یہاں تلاش کیا جاتا ہے، کہیں طرز استدلال وہ ہے جس کی ایک مخلص متکلم سے توقع کی جاتی ہے، کہیں فکر کی گہرائی ایسی دکھائی دیتی ہے، جو ایک فلسفی کے طرز ادا

دکھائی جاتی ہے، کہیں، رجز خوانی کا وہ انداز ہے جو سالار کارواں کے منہ سے سنائی دیتا ہے، کہیں وہ حدی خوانی ہے، جو منزل کو طے کرنے میں مدد دیتی ہے، ان ہی اجزائے ترکیبی سے سیرۃ النبیؐ میں ان کی تحریروں میں وہ دلنشیں و دلآویز رنگ پیدا ہو گیا ہے، جس کے سہارے اس کے مطالعہ میں نشاط و انبساط کی کیفیت طاری رہتی ہے،

اگر تکرار کے خیال کو صرف نظر کر دیا جائے تو آخر میں یہ بھی کہنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سید صاحب کو غیر معمولی محبت، شیفتگی اور وارفتگی رہی، اسی لئے ان کی سیرۃ النبیؐ کی پانچوں جلدوں میں ان کے خون جگر کی لالہ کاری، سوز دل کی چنگاری، طلوعِ محبت کی ولولہ انگیزی اور حسن ذہن کی عفت مآبی پورے طور پر نظر آتی ہے، اسی لئے ان جلدوں کی تحریروں میں ایمان کی طہارت، صراطِ مستقیم پر چلنے کی ہدایت اور نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام انسانوں کو زندگی سنوارنے کی بشارت کی چاندنی چھٹکی ہوئی ہے، اسی کی بدولت ان جلدوں میں ان کے اسلوب، طرزِ ادا اور اندازِ بیان کے وزن، وقار، کمال اور جمال کی ایک خاص قسم کی آن، بان اور شان پیدا ہو گئی ہے، جو کسی دوسرے کے یہاں نہیں مل سکے گی۔

ایک بات اور، حضرت سید صاحب نے مولانا محمد علی جوہر اور علامہ محمد اقبال کی وفات حسرت آیات پر جو شذرات معارف میں لکھے ہیں، وہ ان کے ادب و انشا کے سہ نے کے ٹکڑے سمجھے جاتے ہیں، اور سمجھا جانا چاہئے، یہ جذبات سے لبریز ہو کر لکھے گئے ہیں، جب کسی تحریر پر جذبات اور خصوصاً المناک جذبات کا رنگ چھا جاتا ہے، تو اس کا موثر ہونا لازمی ہے، انھوں نے جگر مراد آبادی کی شعلۂ طور پر جو مقدمہ لکھا ہے، یا ان کی نقوشِ سلیمانی میں جو ادبی مضامین ہیں، ان میں بھی ان کی ادبی شان پورے طور پر نمایاں ہے، شعر و ادب پر جو بھی تحریر لکھی جائے گی، اس میں زبان کی شستگی اور بیان کی رنگینی خود بخود ظاہر ہو کر رہتی ہے، انکی خطبات مدراس میں

اس کا ہر صنفِ شیوہ بیانی کا مرغزار اور گلزار بن گیا ہے، وہ محض اس لئے کہ یہ عشقِ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم میں سرشار ہو کر لکھی گئی ہے، اس میں محبت کے گل اور شیفتگی کے بوٹے تحریری شکل میں نمودار ہو گئے ہیں، جو تعجب انگیز نہیں ہے، سید صاحب کی سیرۃ النبیؐ کی پانچوں جلدوں میں بھی یہی وارفتگی ہے، مگر اسی کے ساتھ ان میں معجزات، مشاہدات، مسموعات، اسراء، معراج، شق القمر، شق صدر، منصب نبوت، ایمان، برزخ، قیامت، نور، ظلمت، خیر، شر، توحید، عبادات نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، صبر، توکل، شکر، جہاد، تقویٰ، فضائل اخلاق، رذائل اخلاق، فلسفۂ اخلاق، معاملات، سیاست اسلامی، نظام حکومت اسلام اور حکومت الٰہیہ وغیرہ جیسے خشک مسائل ہیں، ان کو تحریر کی فصاحت، انداز بیان کی بلاغت، عبارت کی نفاست، جملوں کے در و بست اور انکے صحیح استعمال کی مہارت، الفاظ کے انتخاب کے حسن ذوق، قرآن مجید کے رموز اور حدیث پاک کے نکات کے غوامض اور کلامی نکتہ وری کی سریع الفہمی کے ساتھ قلمبند کرنا بڑا مشکل کام تھا، بلکہ دشواریوں کے ہفت خوان کو طے کرنا تھا لیکن ان مشکلوں اور دشواریوں سے حضرت سید صاحب جس طرح عہدہ برآ ہوئے ہیں، وہ بھی ان پانچوں جلدوں کے اسلوب کی نمایاں خوبیاں ہیں،

نوٹ :- یہ مقالہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ اردو کے اس سمینار میں پیش کیا گیا جو حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ پر منعقد کیا گیا تھا۔

مسدس حالی میں ربط و تسلسل

از جناب تاج پیامی صاحب آرہ

مسدس کی ہیئت میں ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں اشعار کا تعین نہیں ہوتا، اور ایک بند میں ایک خیال تفصیل سے پیش کیا جا سکتا ہے، شہر آشوب، تاریخی واقعات اور مرثیہ کے لیے یہ ہیئت بہت پہلے سے مستعمل ہے، حالی نے اپنی اس تاریخ ساز تاریخی اور قومی نظم میں مسلمانوں کا مرثیہ ہی پیش کیا ہے، مسدس حالی سے متعلق علامہ سید سلیمان ندوی "نقوش سلیمانی" میں تحریر فرماتے ہیں:

"اس نظم کے لیے نکتہ شناس شاعر نے مسدس کا رنگ اختیار کیا، مسدس اس زمانہ میں واسوخت کے لئے، پھر اہل بیت کرام کے دلدوز مصائب، اور شہید کربلا کے دلفگار سوانح کے بیان کے لئے یک گونہ مخصوص ہو کر غم و الم کی داستان سرائی کے لیے خاص ہو چکا تھا، اس لئے شاعر کو جب اپنی قوم کے زہرہ گداز ماتم کا خیال آیا تو مسدس سے زیادہ موزوں اور بہتر نظم کی کوئی صنف نظر نہیں آئی، جس کا وزن ہی گویا درد و غم اور نالہ و ماتم کے لئے بن چکا تھا۔"

مسدس میں شاعر نے اس عظیم الشان قوم کے حادثۂ موت کے اسباب اس تفصیل سے بیان کئے تھے جن کو سن کر ان بغیر ماتم کے جگر خستہ کے حادثۂ خونین کے وقت ہی سب سے پہلے اس موت کا حال معلوم ہوا، اس حسرت ناک انجام پر سخت حیرت تھی، شاعر نے موت کے طبعی اسباب سنا کر ان کی حیرت کو دور کر دیا، اور

ان اسباب کے موجود ہوتے ہوئے موت نہیں زندگی تعجب انگیز تھی"

حالی نے مسدس میں مسلمانوں کے عروج و زوال کے احوال و اسباب کو ربط و تسلسل اور ارتقائے خیال کے ساتھ پیش کیا ہے، حالی مسدس کی ترتیب، موضوع اور اسلوب کے بارے میں خود لکھتے ہیں :۔

اس مسدس کے آغاز میں پانچ سات بند تمہید کے لکھ کر اول عرب کی اس ابتر حالت کا خاکہ کھینچا ہے، جو ظہور اسلام سے پہلے تھی جس کا نام اسلام کی زبان میں جاہلیت رکھا گیا ہے، پھر کوکب اسلام کا طلوع ہونا نبی امی کی تعلیم سے اس ریگستان کا دفعۃً سرسبز ہو جانا اور ابر رحمت کا امت کی کھیتی کو رحلت کے وقت ہرا بھرا چھوڑنا، اور مسلمانوں کا دینی و دنیاوی قیادت میں تمام عالم میں سبقت لے جانا، بیان کیا ہے، اس کے بعد ان کے تنزل کا حال لکھا ہے، اور قوم کے لیے اپنے بے ہنر ہاتھوں سے ایک آئینہ خانہ بنایا ہے، جس میں آکر وہ اپنے خط و خال دیکھ سکتے ہیں کہ ہم کون تھے اور کیا ہو گئے "

مذکورہ اقتباس کا حوالہ پروفیسر کلیم الدین احمد اپنی کتاب اردو شاعری پر ایک نظر میں پیش کرتے ہیں، اس کے باوجود لکھتے ہیں :۔

"مسدس کے مضامین میں ربط و تسلسل مکمل نہیں، اور ارتقائے خیال بھی فطری نہیں، ارادی ہے، مضامین پھول کی طرح نہیں کھلتے بلکہ ایک اینٹ پر دوسری اینٹ رکھ کر مسدس کی عمارت بنائی گئی ہے، اینٹیں ایک دوسرے سے پیوستہ نہیں، دیواریں ہیں تو بھدا اور بے ڈھنگی مینار و سقف میں بھی تناسب نہیں، یہ تعمیری کمی پوری نظم میں بھی ملتی ہے، اور اس کے محدود ٹکڑوں میں بھی، دو مصرعوں، دو بیتوں، دو بندوں میں، وہ ربط و تسلسل نہیں جو ہونا چاہئے "

مسدس حالی پر پروفیسر کلیم الدین کے یہ سارے اعتراضات غلط ہیں، یہ نظم ساخت اور

مسدس دونوں لحاظ سے بالکل مکمل ہے، کہیں پر بے ربطگی نہیں، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے
مسدس حالی میں ارتقائے خیال فطری نہیں، بلکہ ارادی ہے، یہ برعکس (چھوٹی نظم یا غزل)
میں کہ ایک خیال فطری طور پر پھول کی طرح کھل پڑے۔ بڑی نظموں میں ارتقائے خیال
ارادی ہوتا ہے، چاہے وہ اوڈ ہو یا ایپک۔ خود ملٹن نے اپنی رزمیہ پیراڈائز لوسٹ کا مقصد بتایا ہے۔

I may assert eternal Previdence

And justify the ways of God te men ”

جہاں مقصد ہوگا وہاں ارادے کا دخل ہونا لازمی ہے۔ پروفیسر کلیم الدین بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن چونکہ انھیں مسدس حالی
کی خامیاں نکالنی تھیں اس لیے کیٹس کے اس مفروضہ کا سہارا لیا کہ اشعار شاخوں میں پتوں کی طرح
آنے چاہئیں۔ خود کیٹس کے شعری مسودے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے ایک ایک سطر کو کئی کئی بار
کاٹا ہے، کیا یہ ارادی عمل نہیں؟ کیٹس نے ملٹن کے طرز پر ایک رزمیہ ہائپیرین لکھنے کی کوشش کی مگر ناکام
رہا اس نے اسے یہ کہہ کر نامکمل چھوڑ دیا کہ میں اسے تسلسل استدلال کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔ حیات کو
پیش کرنے والا شاعر بڑی نظم تسلسل استدلال اور ارادے کے ساتھ کیسے کہہ سکتا تھا، پروفیسر کلیم الدین
اپنی کتاب Psycho-Analysis and Literary Criticism
میں خود لکھتے ہیں کہ شاعری ایک شعوری عمل ہے، انھوں نے انکار کیا ہے، کہ کالرج نے نیم غنودگی
کے عالم میں کبلا خاں نظم کہی تھی، اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ شاعری میں مضامین پھول کی طرح
کھلتے ہیں، تو یہیں سے Careless and thaughtless mamner
کی سرحد شروع ہو جاتی ہے، شاعری میں آمد کا یہ مطلب بھی نہیں کہ انھیں جیوں کا تیوں چھوڑ دیا جائے
یا ان سے لاپرواہی برتی جائے، شاعری کرنے میں اس کو سنوارنے کی کوشش بھی اس میں شامل ہے،
فن بہر حال دست ہنر کا مرہون منت ہے، عظیم شاعری اور اس کے لیے موزوں زبان مشقت طلب ہیں

ڈانٹے کا کتاب ہے۔

"Poetry and the language proper for it are an elaborate and painful toil."

بڑی نظم کی ساخت ایک عمارت ہی کی طرح ہوتی ہے، اسے پھول کے کھلنے سے تشبیہ نہیں دے سکتے، بڑی نظم کی تشکیل عمارت ہی کی طرح کی جاتی ہے، جس طرح ایک اینٹ پر دوسری اینٹ رکھ کر عمارت کی تعمیر کی جاتی ہے، اسی طرح بڑی نظم کو تشکیل و ترتیب دے کر مکمل کیا جاتا ہے، حالی نے بھی مسدس میں اسی فن کو اپنایا، تاج محل سے کسی نظم کو تشبیہ دی جا سکتی ہے تو وہ مسدس حالی ہے، مسدس حالی بھی تاج محل ہی کی طرح بالکل متناسب اور مکمل ہے،

آئیے اس کا جائزہ لیں، پروفیسر کلیم الدین احمد نے مسدس حالی سے چند بند لئے، اور ان کی ترتیب بدل دی اور کہا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن ترتیب بدل دینے سے جو نقص اور بد نظمی پیدا ہو گئی، اس پر انھوں نے غور و خوض نہیں کیا، مسدس حالی کے چند بند :-

چلن ان کے جتنے تھے سب وحشیانہ — ہر اک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ
فسادوں میں کٹتا تھا ان کا زمانہ — نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ
وہ تھے قتل و غارت میں چالاک ایسے
درندے ہوں جنگل میں بیباک جیسے

نہ ٹلتے تھے ہرگز جو اڑ بیٹھتے تھے — سلجھتے نہ تھے جب جھگڑ بیٹھتے تھے
جو دو شخص آپس میں لڑ بیٹھتے تھے — تو صدہا قبیلے بگڑ بیٹھتے تھے
بلند ایک ہوتا تھا گر واں شرارا
تو اس سے بھڑک اٹھتا تھا ملک سارا

وہ بکر اور تغلب کی باہم لڑائی　　صدی جس میں آدھی انھوں نے گنوائی
قبیلوں کی کر دی تھی جس نے صفائی　　تھی اک آگ ہر سو عرب میں لگائی

نہ جھگڑا کوئی ملک و دولت کا تھا وہ
کرشمہ اک ان کی جہالت کا تھا وہ

کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھگڑا　　کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا
لب جو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا　　کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا

یونہی روز ہوتی تھی تکرار ان میں
یونہی چلتی رہتی تھی تلوار ان میں

کلیم الدین احمد نے ان کی ترتیب یوں بدل دی اور رکھا۔ اسے یوں بھی پڑھ سکتے ہیں :-

کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھگڑا　　کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا
کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا　　لب جو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا

یونہی چلتی رہتی تھی تلوار ان میں
یونہی روز ہوتی تھی تکرار ان میں

جو دو شخص آپس میں لڑ بیٹھتے تھے　　تو صدہا قبیلے بگڑ بیٹھتے تھے
سلجھتے نہ تھے جب جھگڑ بیٹھتے تھے　　نہ ٹلتے تھے ہرگز جو اڑ بیٹھتے تھے

بلند ایک ہوتا تھا گر واں شرارا
تو اس سے بھڑک اٹھتا تھا ملک سارا

وہ بکر اور تغلب کی باہم لڑائی　　قبیلوں کی کر دی تھی جس نے صفائی
تھی اک آگ ہر سو عرب میں لگائی　　صدی جس میں آدھی انھوں نے گنوائی

نہ جھگڑا کوئی ملک و دولت کا تھا وہ
کرشمہ اک ان کی جہالت کا تھا وہ

فسادوں میں کٹتا تھا ان کا زمانہ نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ
ہر اک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ چلن ان کے جتنے تھے سب وحشیانہ

وہ تھے قتل و غارت میں چالاک ایسے
درندے ہوں جنگل میں بیباک جیسے

پروفیسر کلیم الدین نے مسدس حالی کے مذکورہ بندوں اور بیتوں کی ترتیب بدل کر حالی جیسے عظیم شاعر اور فن کار کا منہ چڑھایا ہے، اور اپنی عملی تنقید کا بھونڈا نمونہ پیش کیا ہے، حالی شاعر ہیں ایک اچھے شاعر کے ساتھ ساتھ فن کار بھی ہیں، اور ایک اچھے فن کار کے ساتھ ایک اچھے مصور بھی ہیں، وہ عظیم شاعری کرتے اور اسے سنوارتے بھی ہیں، اس کی نوک پلک بھی درست کرتے ہیں، اور اسے حسن ترتیب کے ساتھ پیش کرتے ہیں الفاظ کے انتخاب، مصرعوں اور بندوں کی ترتیب، ربط و تسلسل کو استدلال کے ساتھ پیش کیا ہے تسلسل استدلال اگر دیکھنا ہو تو مسدس حالی میں دیکھئے، یہاں صرف وہی بند زیر بحث آئیں گے جن کی ترتیب اور ترکیب پروفیسر کلیم الدین نے بدل کر ربط و تسلسل کا شیرازہ بکھیر دیا ہے،

حالی نے لفظ "چلن" سے شروع کیا اور "یونہی" سے ختم کیا، گویا وحشیانہ چلن کے سبب تکرار و تلوار کا سلسلہ یونہی چلتا رہتا تھا، حالی نے پہلے بند میں جھگڑوں کا سبب یہ بتلایا۔

چلن ان کے جتنے تھے سب وحشیانہ

اور پھر اسکے بعد ہر مصرع میں ہر بیت اور ہر بند میں ان کے وحشیانہ چلن کے سبب جھگڑوں کی تفصیل ترتیب وار تسلسل استدلال کے ساتھ بیان کی اور آخر میں کہا۔

یونہی روز ہوتی تھی تکرار ان میں
یونہی چلتی رہتی تھی تلوار ان میں

مسدس میں حالی کی ترتیب ایک اعلیٰ فن کی ترتیب ہے۔ جسے ایک بزعم خود غلط قسم کے ناقد نے "بے ترتیب" کہہ کے اس کا مذاق اڑایا ہے۔

پروفیسر کلیم الدین کے بیتوں اور بندوں کی ترتیب بدل دینے سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ جھگڑا بلا وجہ ہوتا تھا۔ مثلاً ان کے پہلے بند کا پہلا شعر لیجئے:۔

کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھگڑا
کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا

کسی نے مویشی چرایا اور کسی نے گھوڑا بڑھایا، تو اس میں جھگڑنے کی کیا بات تھی؟ پروفیسر کلیم الدین کی ترتیب سے اسکی وجہ معلوم نہیں کی جا سکتی۔ اب مصرعوں کی ترتیب کو لیجئے، حالی کہتے ہیں۔

وہ بکر اور تغلب کی باہم لڑائی
صدی جس میں آدھی انھوں نے گنوائی

اس شعر میں ضمیر "انھوں" کے اسم بکر اور تغلب موجود ہیں، لیکن پروفیسر کلیم الدین کی ترتیب بدل دینے سے شعر بے ربط ہو گیا ہے:۔

تھی اک آگ ہر سو عرب میں لگائی
صدی جس میں آدھی انھوں نے گنوائی

کیونکہ اس شعر کے دوسرے مصرع میں ضمیر "انھوں" سے اسم پہلے مصرع میں نہیں ہیں حالی کے یہاں ایسی خامی نہیں پائی جاتی۔ پھر دوسرے شعر کی ترتیب بھی حالی کے یہاں تسلسل استدلال کے ساتھ ہے۔ حالی کہتے ہیں:۔

قبیلوں کی کر دی تھی جس نے صفائی
تھی اک آگ ہر سو عرب میں لگائی

بکر و تغلب کی باہم لڑائی نے نہ صرف قبیلوں کی منافرت گہری کر دی تھی، بلکہ ہر سو جو میں
جنگ بھڑکا دی تھی، قبیلوں کے بعد ہر سو ہو سکتا ترکیب اور ترتیب زیادہ ہی اور منطقی ہے، اور اس سے
ربط و تسلسل بھی قائم رہتا ہے، یہ اہم نکتہ پروفیسر کلیم الدین کی بے ترتیبی سے مجروح ہوتا ہے جو ان کا ایک بند
بند جو "سلجھتے نہ تھے . . . سے شروع ہو کر . . . ملک سارا" پہ ختم ہوتا ہے، بالکل درست ہے
جو جناب کلیم الدین کی بے ترتیبی سے واقعی بگڑ جاتا ہے۔ حالی لکھتے ہیں:-

جو دو شخص آپس میں لڑ بیٹھتے تھے۔　　تو سو سو قبیلے بگڑ بیٹھتے تھے

بلند ایک ہوتا تھا گر واں شرارا

تو اس سے بھڑک اٹھتا تھا ملک سارا

آخری شعر پہلے والے شعر میں جو بات کہی گئی ہے اسے بڑے تناظر میں پیش کرتا ہے، یہ ہے حسن ترتیب
اور تسلسل استدلال جو کلیم الدین کے ترتیب بدل دینے سے بگڑ گئے تھے۔
ایک اور بند کو لیجئے پروفیسر کلیم الدین ترتیب بدل کر لکھتے ہیں۔

کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھگڑا　　کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا

کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا　　لب جو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا

یونہی چلتی رہتی تھی تلوار ان میں

یونہی روز ہوتی تھی تکرار ان میں

اس بند میں بھی ترتیب کی تبدیلی سے کئی منطقی ناگواریاں پیدا ہو گئی ہیں، ربط و تسلسل تو بالکل
ختم ہو گیا ہے، یہ پروفیسر کلیم الدین کے ترتیب شدہ بندوں میں پہلا بند ہے، اگر پروفیسر کلیم الدین کی اس
ترتیب کو تسلیم کر لیا جائے تو مویشی چرانے، پہلے گھوڑا بڑھانے، پانی پینے پلانے پہ جھگڑا کہیں ہوتا
تھا، تلوار کیوں چلتی تھی؟ ان کی وجہیں نہیں معلوم ہوتیں، جب کہ حالی کی ترتیب سے بند انا

بھنی ہو جاتا ہے۔ حالی نے اپنے پہلے ہی بند میں اس بات کی وضاحت کر دی تھی کہ سارے جھگڑوں کی جڑ ان کا "وحشیانہ چلن" تھا، اب مصرعوں اور بیتوں کو لیجیے:۔ حالی نے مصرعوں کی ترتیب یوں رکھی:

لب جو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا

پروفیسر کلیم الدین نے اس کی ترتیب بدل کر یوں کر دیا۔

کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا لب جو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا

حالی کے مصرعوں کی ترتیب بالکل درست ہے جب کہ پروفیسر کلیم الدین کی بالکل غلط ہے، کیونکہ آدمی پہلے "لب جو جاتا ہے، تب پانی پینے پلانے" پہ جھگڑا ہو سکتا ہے، کلیم الدین کی ترتیب سے تو پتہ چلتا ہے کہ لب جو جانے سے پہلے ہی پانی پینے پلانے پہ جھگڑا ہو گیا۔

اور یہ بات کس قدر مضحکہ خیز ہے، ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔

ایک باریک نکتہ اور بیان کرتا چلوں اس سے پروفیسر کلیم الدین کی ترتیب کی خامی اور بے ربطگی بالکل واضح ہو جائے گی، حالی نے بند کے آخر شعر کی ترتیب یوں رکھی تھی،

یونہی روز ہوتی تھی تکرار ان میں یونہی چلتی رہتی تھی تلوار ان میں

پروفیسر کلیم الدین نے اس کی ترتیب بدل کر اسے یوں بے ربط کر دیا۔

یونہی چلتی رہتی تھی تلوار ان میں یونہی روز ہوتی تھی تکرار ان میں

حالی کی ترتیب منطقی ہے، پہلے تکرار ہوتی ہے، تب تلوار چلتی ہے، لیکن پروفیسر کلیم الدین احمد نے پہلے ہی تلوار چلادی، جب تلوار چل گئی تو تکرار کی گنجائش کہاں۔؟

اس طرح ہم نے دیکھا کہ پروفیسر کلیم الدین نے مسدس حالی کے بندوں، بیتوں اور مصرعوں کی ترتیب بدل کر ان کے ربط و تسلسل کو بالکل ختم کر دیا تھا، ورنہ مسدس حالی کے ہر بند ہر بیت اور ان کے مصرعوں میں ربط و تسلسل ہے اور تسلسل استدلال کے ساتھ۔

مسدس حالی کی عمارت کی سیدھی اینٹیں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں، دیواریں بالکل سیدھی ہیں، مینار و سقف میں بھی تناسب ہے، اسکے محدود ٹکڑوں میں بھی، دو دو مصرعوں، دو دو بیتوں، دو دو بندوں میں وہ ربط و تسلسل ہے، جو ہونا چاہیئے۔

جدید دنیا میں اسلام، مسائل اور امکانات — مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۳۷۰، قیمت ۴۰ روپیہ پتے (۱) اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر (۲) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

پندرھویں صدی ہجری کی مناسبت سے اکتوبر ۱۹۸۱ء میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر نے جدید دور میں اسلام، مسائل اور امکانات کے موضوع پر ایک سمینار منعقد کیا تھا جس میں اردو اور انگریزی میں مفید اور بلند پایہ مضامین پڑھے گئے تھے، یہ کتاب اس سمینار کے اردو مضامین پر مشتمل ہے، ان مضامین میں ان مسائل و مشکلات کا ذکر ہے، جو موجودہ زمانہ میں اسلام اور مسلمانان عالم کو درپیش ہیں، اور بتایا گیا ہے کہ اسلام ان مسائل میں بھی مکمل رہنمائی کر سکتا ہے، اور دور نئی ضرورتوں، تقاضوں اور حالات سے عہدہ برآ ہونے کی اپنے اندر پوری صلاحیت بھی رکھتا ہے، عقائد، عبادات، اخلاق اور بعض بنیادی اقدار و مسائل کے بارہ میں گو اسکی تعلیمات و ہدایات ابدی اور ناقابل ترمیم و تغیر ہیں اگرچہ وہ پہلے ہی کیطرح آج بھی مفید، موثر اور معنی خیز ہیں، اور جو نئے معاشرتی، تمدنی و سیاسی مسائل مخصوص ماحول، عہد اور حالات کی وجہ سے پیدا ہوگئے ہیں ان کے بارہ میں اسلامی احکام میں لچک ہے، اور وہ اجماع، قیاس اور اجتہاد وغیرہ کے ذریعہ حل کئے جا سکتے ہیں، اس سلسلہ میں گذشتہ اسلامی تاریخ خصوصاً حضرت عمر فاروقؓ کے اجتہادات سے بڑی رہنمائی ملتی ہے، اس ضمن میں اسلام کی ان خصوصیات اور خوبیوں کو بھی نمایاں کیا گیا ہے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نوع انسانی کی فلاح و ترقی اور دنیا کے امن و امان کا ضامن ہے، اور وہی معاشرت، معیشت اور تمدن کا ایک متوازن اور عادلانہ نظام اور فلاحی حکومت عطا کر سکتا ہے، اس کا بھی جائزہ لیا گیا ہے کہ

[illegible] موجود ہیں، اور بعض سلسلوں میں ان کے احیاء [illegible]

[illegible] کتاب کی افادیت و اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

[illegible] عصر حاضر کے ساتھ اسلامی اقدار اور تعلیمات کی [illegible] (مولانا سعید احمد اکبر آبادی)، دور حاضر میں اسلامی اقدار کی معنویت (جناب غلام رسول ملک)، ذرائع پیداوار اور ذرائع تقسیم کی ملکیت (مولانا مجیب اللہ ندوی) شریعت بدلتے ہوئے زمانے میں حضرت عمر فاروق کے اجتہادات کی روشنی میں (مولانا سعید احمد اکبر آبادی) حضرت عمر فاروق اعظم کے اجتہادات سے ہم کو کیا ملا اور کیا مل سکتا ہے (جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب) غزالی کا اجتہاد (جناب رشید نازکی) اسلام اور سیکولرازم (جناب مفتی محمد رضا انصاری) فکر اقبال اور ہندی مسلمان (پروفیسر مسعود حسین خان) اصلاح و تجدد کے حامی اور ان کی الجھنیں (پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی) جمہوریہ اسلامی ایران میں اسلام کے مسائل اور امکانات (ڈاکٹر کبیر احمد جائسی)، ہندوستانی سیکولر جمہوریہ میں اسلامی قانون کی مناسبت (جناب غلام نبی باگرو) مسلم ممالک میں اسلامی قانون کا نفاذ اور اس کا جواز (جناب ایم۔ اے شیدا) اسلام اور بینکنگ (جناب ریحان الحق)، آخری مضمون میں سود کی حرمت اور بینک کے انٹرسٹ کو بھی سود ہی کی قسم قرار دینے کے باوجود موجودہ زمانہ میں بینکنگ کا ناگزیر ہونا بھی بتایا ہے، اور اسے سود کے بغیر چلانے کے بعض تجربوں کی نشاندہی کی ہے، جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن کے مضمون کے آخر میں بھی سود کے تعلق سے بعض قابل غور باتوں کی جانب توجہ دلائی گئی ہے، جناب غلام رسول ملک نے اچھے انداز میں اس کی وضاحت کی ہے کہ اسلامی اقدار موجودہ زمانہ میں بھی بڑی مفید اور بامعنی ہیں، خود فاضل مرتب کا مقالہ بھی قابل ذکر ہے، شروع میں اس زمانہ کے کشمیر کے وزیر اعظم جناب شیخ عبد اللہ مرحوم کا خطبہ افتتاحیہ درج ہے، گو سب مضامین ایک سطح کے نہیں ہیں، اور بعض کے مندرجات بھی محل نظر ہیں، تاہم اکثر مضامین سنجیدہ ہیں جو اصحاب علم کے مطالعہ میں آنے کے لائق ہیں۔

ایام خلافت راشدہ: مرتبہ مولانا عبد الرؤف رحمانی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر،

صفحات ۰۰۰ مجلد مع گرد پوش، قیمت تیس روپیہ، پتہ: جامعہ سراج العلوم السلفیہ جھنڈا نگر (نیپال)

خلفائے راشدینؓ کی حکومت بے مثال تھی، اس کتاب میں انکے عہد خیر و برکت دور کے اہم واقعات خصوصاً ان کی فروغ ایمان اور عدل و انصاف کی جھلک دکھائی گئی ہے اور انکی رعایا پروری اور خلق خدا کی خدمت اور نفع رسانی کے واقعات قلمبند کئے گئے ہیں، سب سے پہلے مصنف نے خلفائے راشدین کی امانت و دیانت کا تذکرہ کیا ہے اور قوم کے مال میں انکی احتیاط اور کسی قسم کی خیانت اور خورد برد نہ کرنے کے متعدد حیرت انگیز واقعات تحریر کئے ہیں، ان کی سادہ اور درویشانہ زندگی کے سلسلہ میں طعام، لباس اور رہن سہن وغیرہ میں انکی سادگی اور قناعت پسندی دکھائی ہے اور عام لوگوں کے ساتھ انکے حسن سلوک اور مساویانہ برتاؤ کی تفصیل بھی پیش کی ہے، اور زمین کی آبادکاری اور رفاہ عام کے مختلف کاموں کے علاوہ مسکینوں، یتیموں، بیوہ عورتوں اور بے سہارا لوگوں نیز غیر مسلموں اور ذمیوں کے ساتھ اچھے سلوک کا حال بیان کیا ہے، افلاس اور بے روزگاری کے خاتمہ اور سماجی و معاشی ناہمواری کو درست کرنے کے لئے انکی تدبیروں اور کوششوں کا ذکر ہے، عہدوں پر مناسب اور باصلاحیت لوگوں کے تقرر اور عمال کی نگرانی و احتساب اور ان کے خلاف دادرسی وغیرہ کے واقعات بھی پیش کئے ہیں، اس کتاب میں حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے دور کے واقعات بکثرت بیان کئے گئے ہیں، دوسرے خلفائے راشدینؓ کے علاوہ کہیں کہیں بعض عباسی خلفا کی رعایا پروری اور انصاف پسندی کا ذکر بھی آگیا ہے، اور جن پہلوؤں پر بحث کی ہے انکے متعلق پہلے اسلام کی عام ہدایات اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات بھی پیش کی ہیں، اس کے بعد خلفائے راشدینؓ کی زندگی سے اس کی مثالیں اور عملی نمونے دئے ہیں، اور ضمناً ان امور کے بارہ میں موجودہ دور کی حکومتوں کے غلط رویے کا بھی کہیں کہیں ذکر کیا گیا ہے، اردو میں خلفائے راشدینؓ کے حالات اور اسلامی نظام پر متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں، اس کتاب میں خلفائے راشدینؓ کی رعایا پروری اور انکے فلاحی کاموں کو یکجا کر دیا گیا ہے، زبان و بیان کی خامی کا اعتراف مصنف کو خود ہے، اسکے علاوہ اس میں ربط و تسلسل کی کمی اور ناہمواری بھی ہے، مختلف مباحث ایک دوسرے سے مختلط ہو گئے ہیں، تحریر میں الجھاؤ اور پھیلاؤ بھی ہے، کہیں کہیں حوالے درج نہیں ہیں، اور بعض کم درجہ کے حوالے بھی درج ہیں۔

"ض"

حیات سلیمان

ن جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندویؒ کی سادہ سوانح عمری ہی نہیں ہے بلکہ ان کے گوناگوں
، قومی، ملی، سیاسی حالات اور کارناموں کا ایک دلآویز مرقع ہے جس میں سید صاحبؒ کے دور کی
ری کی ملی و قومی، سیاسی و علمی، ادبی و لسانی تحریکوں مثلاً ہنگامۂ مسجد کانپور، تحریک خلافت، تحریک
لات، جنگ آزادی، مسئلۂ ملوکیت حجاز وغیرہ کی تفصیل بھی ضمناً آگئی ہے، اسی کے ساتھ
، جو سید صاحبؒ کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اس کی تاسیس، سال بہ سال اس کی ترقی
کے ساتھ ان کے قیام بھوپال، سفر پاکستان، قیام پاکستان کے دوران کی علمی خدمات
، اور پھر مختلف وفود کے رکن و صدر کی حیثیت سے سفر یورپ، سفر حجاز، سفر افغانستان
مل روداد بھی سید صاحبؒ کے خطوط اور تحریروں کی روشنی میں قلمبند ہو گئی ہے، یہ کتاب اپنے
رز انشاء کے لحاظ سے بالکل حیات شبلی کا مثنیٰ ہے، ویسی ہی دلکش، دلچسپ اور دلنشین۔

مولفہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی قیمت ۳۴ روپیے

سلوک سلیمانی

ولانا سید سلیمان ندویؒ کے عزیز ترین پاکستانی مسترشد مولانا سید سلیمان اشرف خان صاحب سلیمانی صدر
پشاور یونیورسٹی نے "سلوک سلیمانی پر ایک اجمالی نظر" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا تھا جو معارف
ء سے جنوری ۱۹۵۶ء تک مسلسل نکلتا رہا، یہ علمی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، اسی مضمو
افوں کے ساتھ مولانا اشرف صاحب نے کتابی صورت میں سلوک سلیمانی کے نام سے دو جلدوں میں شایع
ن میں حضرت سید صاحبؒ کی سلوک و معرفت سے متعلق تعلیمات کو مرتب کی توضیحات و تعبیرات کی
پیش کیا گیا ہے، ان دونوں جلدوں کو افادۂ عام کی خاطر دارالمصنفین نے بھی چھاپ کے شایع کیا ہے،

یمت جلد اول ۳۰ روپیے   قیمت جلد دوم ۲۵ روپیے

مصنفات مولانا سید سلیمان ندویؒ

النبی جلد سوم : معجزہ کے امکان و وقوع پر کلام اللہ قرآن مجید کی روشنی میں مفصل بحث قیمت ۳۰/-

النبی جلد چہارم : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ فرائض۔ 〃 ۴۰

النبی جلد پنجم : فرائض خمسہ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد پر سیر حاصل بحث۔ 〃 ۳۲

النبی جلد ششم : اسلامی تعلیمات، فضائل و رذائل اور اسلامی آداب کی تفصیل۔ 〃 ۴۸

النبی جلد ہفتم : معاملات پر مشتمل متفرق مضامین و مباحث کا مجموعہ۔ 〃 ۱۷

رحمت عالمؐ : مدرسوں اور اسکولوں کے چھوٹے بچوں کے لیے سیرت پر ایک مختصر اور جامع رسالہ۔ ۵

خطبات مدراس : سیرت پر آٹھ خطبات کا مجموعہ جو مسلمانان مدراس کے سامنے دیے گئے تھے۔ 〃 ۱۱

سیرت عائشہؓ : حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حالات، مناقب و فضائل۔ 〃 ۱۹

حیات شبلیؒ : مولانا شبلیؒ کی بہت مفصل اور جامع سوانح عمری۔ 〃 ۴۸

ارض القرآن ج ۱ : قرآن میں جن عرب اقوام و قبائل کا ذکر ہے ان کی اثری اور تاریخی تحقیق۔ 〃 ۱۸

ارض القرآن ج ۲ : بنو ابراہیم کی تاریخ، قبل از اسلام عربوں کی تجارت اور مذاہب کا بیان۔ 〃 ۱۳

خیام : خیام کے سوانح و حالات اور اس کے فلسفیانہ رسائل کا تعارف۔ 〃 ۳۴

عربوں کی جہاز رانی : بمبئی کے خطبات کا مجموعہ۔ 〃 ۱۲

عرب و ہند کے تعلقات : ہندوستان اکیڈمی کے تاریخی خطبات (طبع دوم عکسی) 〃 ۴۰

نقوش سلیمانی : سید صاحب کے منتخب مضامین کا مجموعہ، جن کا انتخاب خود موصوف نے کیا تھا۔ 〃 ۲۴

یاد رفتگان : ہر شعبۂ زندگی کے مشاہیر کے انتقال پر سید صاحب کے تاثرات۔ (زیر طبع طبع دوم عکسی) ....

مقالات سلیمان اول : ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر مضامین کا مجموعہ۔ 〃 ۲۶

مقالات سلیمان دوم : تحقیقی اور علمی مضامین کا مجموعہ۔ 〃 ۲۳

مقالات سلیمان سوم : مذہبی و قرآنی مضامین کا مجموعہ (بقیہ جلدیں زیر ترتیب ہیں) 〃 ۲۳

برید فرنگ : سید صاحب کے یورپ کے خطوط کا مجموعہ۔

دروس الادب حصہ اول و دوم : جو عربی کے ابتدائی طالب علموں کے لیے مرتب کیے گئے۔ ۳-۲

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

قیمت تیس روپے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(پن ۲۷۶۰۰۱)

مجلسِ ادارت

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

تاریخ ہندوستان کا سلسلہ اب تک اٹھائیس کتابوں تک پہونچ چکا ہے، اس ضمن میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے، جس کی اب تک تین جلدیں شایع ہو چکی ہیں۔

جلد اول

اس میں مغل دور سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی اور وطن دوستی، رعایا پروری کے دلچسپ واقعات مستند ماخذوں کی مدد سے پیش کیے گئے ہیں، قیمت ۱۲ روپیے۔

جلد دوم

اس میں مغل فرماں روا بابر، ہمایوں، سوری خاندان کے شیر شاہ اور اسلام شاہ، پھر مغل شہنشاہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کی مذہبی رواداری، فراخ دلی، وطن دوستی، رعایا پروری کے سبق آموز واقعات پیش کیے گئے ہیں، قیمت ۲۳ روپیے۔

جلد سوم

اس میں جدو ناتھ سرکار کی کتاب کا جواب خود اس کی کتاب کے حوالوں سے اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اورنگزیب عالمگیر اور اسکے بعد کے مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی، وطن دوستی اور رعایا پروری کی تفصیلات آگئی ہیں مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن۔ قیمت ۳۰ روپیے۔

جلد ۱۳۵ ماہ جمادی الاخری ۱۴۰۵ھ مطابق ماہ مارچ سنہ ۱۹۸۵ء عدد ۳

مضامین

مقالات

سلسلہ اسلام اور مستشرقین

جلد اول

دارالمصنفین میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر جو نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے، اس کی پہلی جلد چھپ کر شائع ہو گئی ہے، جو فروری ۱۹۸۲ء میں اس موضوع پر سمینار ہوا تھا اس کی بہت ہی مفصل اور دلچسپ روداد

"منیجر"

شذرات

۱۶ و ۱۷ فروری ۱۹۸۸ء کو کلکتہ کی مولانا محمد علی جوہر لائبریری کے زیر اہتمام مولانا محمد علی جوہر پر ایک روزہ سیمینار بہت ہی خوش اسلوبی سے انجام پایا۔

یہ لائبریری کلکتہ کے مسلمانوں کی خاص توجہ اور دلچسپی کا مرکز بنی ہوئی ہے، اس کے صدر پروفیسر خورشید احسن ہیں لیکن اس کی روح اس کے سکریٹری جناب خلیل احمد صاحب ہیں جو اپنی خاموش بے لوث اور سرگرم خدمات کی وجہ سے بہت مقبول ہیں، ان ہی کی کوششوں سے یہ سیمینار منعقد ہوا جس کو کامیاب بنانے میں جناب حکیم مولانا محمد زمان صاحب کے صاحبزادے جناب حکیم محمد عرفان حسینی سیمینار کمیٹی کے کنوینر کی حیثیت سے برابر اپنی محنت پر سرگرم رہے، ان کے والد بزرگوار ان کی رہنمائی کرتے رہے جن کی متعدد تصانیف اور مقناطیسی شخصیت ہر کام کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں پوری ضامن رہتی ہے، اس سیمینار کمیٹی کے صدر جناب محمد عبدالمجید تھے جو ضابطہ کی پابندی اور اپنے اخلاص کی فراوانی کیلئے کلکتہ میں مشہور ہیں۔

اس کا افتتاحی اجلاس بکر ہال میں حاضرین کے ایک اچھے مجمع میں ہوا، کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر خاص طور سے اس میں مدعو تھے، خصوصی مہمان علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب سید حامد صاحب تھے جنہوں نے کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو خاص طور سے مخاطب کر کے کہا کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے ملک میں مسلمان بن کر محبت کے ساتھ اپنے ہندو ہم وطنوں سے خوشگوار تعلقات قائم کر کے رہنا چاہتے ہیں، اس کھلے اجلاس کی صدارت ملک کے ممتاز مورخ، اسلامی تصوف کے عاشق زار اور قلم کے شہباز جناب پروفیسر خلیق احمد نظامی نے کی، ان کے خطبہ کے اسلوب کی تاثیر ان کے مضمون کی افادیت اور مولانا محمد علی کی یادوں کے مشعل کو روشن کرنے کی استطاعت ہم اس کو معارف کے نئے شمارہ میں شائع کر رہے ہیں، امید کہ ناظرین اس کو پڑھ کر اپنے جذبات و احساسات کے مردہ امید کو جھلملاتے پائیں گے، اس کھلے اجلاس کو جناب مولانا حکیم محمد زمان، پروفیسر صلاح الدین (ڈھاکہ یونیورسٹی) اور ڈاکٹر قمر الدین (کلکتہ یونیورسٹی) نے بھی مخاطب کیا، اجلاس کی نظامت کلکتہ کے مشہور ایڈووکیٹ جناب محمد یوسف کلکتوی نے اپنی شیریں بیانی سے کی۔

سیمینار کا دوسرا اجلاس [illegible] کی صدارت میں کھلے اجلاس کے بعد ہی ہوا، اس میں پہلا مقالہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

پڑھا، جو بہت ہی پر مغز اور مدلل تھا۔ تیسرا مقالہ کلکتہ کے مولوی ابو اسامہ ندوی کا "مولانا محمد علی کے بیان"

کے عنوان سے تھا، چوتھا کلکتہ کے شبینہ اخبار روزنامہ آزاد ہند کے کہنہ مشق، پختہ خیال اور باہمت اڈیٹر

جناب احمد سعید ملیح آبادی کا تھا، جس میں مولانا محمد علی جوہر کی صحافت نگاری کا تجزیہ کیا گیا تھا۔

دوسرے دن کی نشست پروفیسر خلیق احمد نظامی کی صدارت میں شبلی ہال میں ہوئی، اس میں پہلا مقالہ تھا کہ "ہم مولانا محمد علی جوہر سے کیا سیکھ سکتے ہیں" کے عنوان سے تھا، اس کا لب لباب یہ تھا کہ ہندوستان کے موجودہ دور کے مسلمان مولانا محمد علی ہی کی طرح سچے مسلمان اور سچے وطن دوست بن کر رہنا چاہتے ہیں، وہ مولانا محمد علی کی طرح اپنی مذہبی اور تمدنی ہستی کو کسی حال میں چھوڑنا پسند نہیں کریں گے۔

یہ مقالہ ختم ہوا تو خواجہ محمد یوسف صاحب نے رابندر ناتھ ٹیگور کا حوالہ دے کر جو سوال کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ کیا مسلمان نیشنلزم اور پیٹریوٹزم کے معیار پر پورے اترتے ہیں؟ روزنامہ ہند اخبار کے اڈیٹر جناب مسیح الدین زیدی کے سوال کا مطلب یہ تھا کہ کیا ایک ملک میں مختلف مذاہب کی گنجائش ہو سکتی ہے؟ ان سوالات کے جواب میں خاکسار نے یہ عرض کیا کہ اگر یہ معیار ہو کہ ہندوؤں کی اکثریت جو کچھ کہے وہ تو نیشنلزم ہے اور مسلمانوں کی اکثریت جو کچھ کہے وہ کمیونلزم ہے تو نیشنلزم کے اس معیار پر مسلمان پورے نہیں اتر سکتے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ مسلمان اپنے دلوں پر ہاتھ رکھ کر خود سے پوچھیں کہ وہ ہندوستان کے وفادار ہیں کہ نہیں؟ تو ان کہنے والوں کے لیے جواب یہ ہے کہ ہندو اپنے دلوں پر ہاتھ رکھ کر پوچھیں کہ وہ مسلمانوں کو اپنا سمجھتے ہیں کہ نہیں، اگر سچے دل سے وہ مسلمانوں کو اپنا سمجھیں تو بقول مولانا محمد علی مسلمان نہ صرف نیشنلسٹ بلکہ سپر نیشنلسٹ بن کر اس ملک کی خدمت کریں گے، رہا ملک میں مذاہب کا سوال تو بقول مولانا محمد علی مذہب سیاست کو نہیں بگاڑتا بلکہ سیاست مذہب کو بگاڑتی ہے، مولانا محمد علی تو اس ملک میں مذہب کی تہذیب و سیاست دیکھنا چاہتے تھے جو ان کے تخیل کے مطابق امریکہ کی تہذیب و سیاست سے زیادہ شریف اور زیادہ مضبوط ہوتی۔ آنجہانی گاندھی جی بھی یہی کہا کرتے تھے کہ سیاست میں اچھا [illegible]

اور مولانا محمد علی [illegible] اگی اور قومی یکجہتی پیدا ہوگی وہ ہندوستان کیلئے بہترین مثال ہے [illegible]
مذہب ایک دوسرے [illegible] ایک دوسرے کو دور کر دیا ہے بلکہ [illegible] پیدا ہوا ہے [illegible]

اس نشست میں مسلم یونیورسٹی کے ڈاکٹر اکمل ایوبی نے مولانا محمد علی کی صحافت [illegible] کے عنوان سے مقالہ پڑھا، مجلس کے عنوان [illegible]
جامعہ ملیہ کے پروفیسر [illegible] نے اپنی تقریر میں بتایا کہ ہندوستان میں مذہب کا مفاد [illegible] لازم ہونا چاہیئے، دارالعلوم ندوۃ العلماء
کے فاضل مدرس مولانا ابوالعرفان ندوی نے مولانا محمد علیؒ کی متنوع شخصیت پر اپنا مقالہ پڑھا۔

اسی روز آخری نشست دہلی کے پروفیسر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی صدارت میں ہوئی، جس میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے ڈاکٹر [illegible]
[illegible] نے مولانا محمد علیؒ کی پوری زندگی پر تبصرہ کیا، کلکتہ کے جناب محمد اسحٰق نے مولانا محمد علیؒ کے انگریزی ہفتہ وار کامریڈ پر ایک پُرمغز مقالہ پڑھا
روزنامہ [illegible] کے ایڈیٹر جناب رئیس الدین فریدی نے مولانا محمد علیؒ کی صحافت نگاری کے مختلف پہلو دکھائے، آخر میں جناب خواجہ احمد فاروقی نے اپنی
پیاری زبان اور بہت ہی پیارے لہجہ میں مولانا محمد علیؒ کی رنگا رنگ شخصیت پر اپنے گرانقدر خیالات سے سامعین کو محظوظ کیا
سیمینار مختلف دعوتوں کے ساتھ مولانا محمد علیؒ کی یادوں کی قندیل اچھی طرح روشن کرکے ختم ہوا۔

ایک شام سیمینار کے مقالہ نگار کلکتہ کی مشہور ایران سوسائٹی میں بھی مدعو تھے جہاں انکی قدردانی انکی گلپوشی کرکے کی گئی، اس موقع پر کلکتہ کے
وزیر جناب منصور حبیب اللہ بھی موجود تھے، وہ سب بڑی خندہ پیشانی اور فراخدلی سے ملتے رہے، اس مجلس میں ایران سوسائٹی کی گرانبہا
پر تقریریں بھی ہوئیں، اس سوسائٹی کے نائب صدر خواجہ محمد یوسف صاحب اپنی شیریں گفتار سے مجمع پر چھائے رہے۔

کلکتہ کے مختصر قیام میں یہاں کے مشہور سرجن ڈاکٹر مقبول احمد، امینیہ ہوٹل کے مالک حاجی عبدالقیوم، اس شہر کے مشہور اخبار
میں مشرق، روزنامہ آزاد ہند اور آبشار کے دفتر والوں اور انجمن مفید الاسلام والوں نے ہر طرح کی نوازش سے ممنون کیا، کلکتہ میں عید
عید کی نماز وہاں کی [illegible] امام مولانا [illegible] قیام گاہ پر برابر آتے رہے اور مفید معلومات فراہم کیں، انجمن مفید الاسلام کے مولانا محمد اسحٰق تو سایہ کی طرح
رہے، کلکتہ کے نامور اہل علم ڈاکٹر عطا کریم برقؔ، اور ڈاکٹر محمد صابر خان سے بھی ملاقاتیں رہیں، معارف کے مضمون نگار اور [illegible]
جناب آغا [illegible] کی وفات پر انکے گھر پر جاکر ان کے بھائیوں سے تعزیت کی۔

کلکتہ میں [illegible] دارالمصنفین والوں کی میزبانی وہاں کے مشہور [illegible] ہوٹل کے مالک اور علم نواز جناب [illegible] علی صاحب کی
[illegible]، انکسار، خوش مزاجی، وضعداری اور میزبانی کے معیار کی مخلصانہ یادوں کے ساتھ ہم لوگ کلکتہ سے

مقالات

سرسید احمد خاںؒ اور مستشرقین

از عبید اللہ کوٹی ندوی رفیق دار المصنفین

(۲)

حضرت اسماعیلؑ کی والدہ تورات کتاب پیدائش باب ۲۱، آیت ۱۰ میں ہے، "تب اس نے ابرہام سے کہا کہ اس لونڈی کو اور اس کے بیٹے کو نکال دے کیونکہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اضحاق کے ساتھ وارث نہ ہوگا۔" کئی مستشرقین نے حضرت اسماعیلؑ کے نسب نامہ کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی ہے، جس کی وجہ ظاہر ہے، اور یہود بھی حضرت اسماعیلؑ کی والدہ کو لونڈی کہتے تھے، اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ یہودی بنی اسماعیل کی ہمیشہ حقارت کرتے ہیں اور ضد و عداوت سے ایسی باتیں جن سے بنی اسماعیل بنی اسرائیل کے مقابلہ میں فروتر سمجھے جائیں، منسوب کرتے ہیں، اور اسی وجہ سے ان لوگوں نے غلط طور پر توریت مقدس سے بھی حضرت ہاجرہؑ کے لونڈی ہونے پر استدلال کیا ہے، جو سرتاپا غلط اور تحریف کی حیثیت رکھتا ہے، چونکہ اس بحث کا نسب نامۂ نبوی سے بھی گہرا تعلق ہے، اس لئے سرسید مرحوم نے مولانا عنایت رسول چریاکوٹی کی تحقیقات پر مشتمل ایک نفیس بحث بھی درج کتاب کی ہے، چند اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ انھوں نے سفر اشیار سے جو یہودیوں کی ایک معتبر تاریخ ہے، یہ نقل کیا ہے کہ بابل کا ایک باشندہ ورتیون تنگ دست اور مفلس تھا، جس نے مصر کی راہ لی، بادشاہ مصر نے

اس کی قدردانی کی، اعیان سلطنت میں اس کا اثر بڑھ گیا، یہاں تک کہ وہ بادشاہ ہوگیا، یہ پہلا شخص ہے جس نے فرعون کا لقب اختیار کیا، پھر قحط سالی کے زمانہ میں حضرت ابراہیمؑ اپنے گھر والوں کے ساتھ مصر گئے تو اس نے حضرت سارہؑ سے نکاح کرنا چاہا مگر پھر باز رہا، اور اس قدر متاثر ہوا کہ اپنی بیٹی ہاجرہ کو حضرت ابراہیمؑ کے نکاح میں دیدیا، رقیون عبرانی زبان کا لفظ ہے، اسی طرح حضرت ہاجرہؑ کا اصل عبرانی نام ہاجر ہے، جو اس بات کا قرینہ ہے کہ بادشاہ مصری النسب نہ تھا، بلکہ حضرت ابراہیمؑ کے قبیلہ سے نسبت رکھتا تھا، چنانچہ اس کے پاس سے حضرت ابراہیمؑ بڑے اعزاز و سامان وہ اہل کے ساتھ روانہ ہوئے۔ (پیدائش باب ۱۳ و رس ۱-۲)

۲۔ مفسرین توریت بھی حضرت ہاجرہؑ کو بادشاہ مصر کی بیٹی لکھتے ہیں، چنانچہ دوبی شلود اسحاق نے کتاب پیدائش باب ۱۶ آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ سرسید مرحوم نے اصل عبرانی تحریر اور اس کے عربی ترجمہ کے ساتھ درج ذیل اردو ترجمہ بھی تحریر کیا ہے:

"وہ فرعون کی بیٹی تھی، جب دیکھا ان کرامات کو جو بوجہ سارہ واقع ہوئیں تو کہا بہتر ہے کہ میری بیٹی اس کے گھر میں خادمہ ہو کر اس سے کہ ہو دوسرے گھر میں ملکہ۔"

حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں لونڈی میراث نہیں پاتی تھی، توراۃ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سارہؑ کو یہی اندیشہ تھا کہ حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت اسحاقؑ کے ساتھ میراث پائیں گے چنانچہ انھوں نے ہاجرہ کو الگ کر دینے کی درخواست کی۔ اور انھوں نے ہاجرہ کو جو لونڈی کہا تو غصہ اور ناراضگی کی وجہ سے تھا جس سے دیگر تصریحات کی موجودگی میں استدلال کرنا درست نہیں، توراۃ میں اور دوسرے مقامات پر حضرت ہاجرہؑ کے لیے شفحہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی خادمہ اور قبیلہ کی عورت کے ہیں، توراۃ (سموئل باب ۲۵ آیت ۴۱) میں حضرت داؤد کی

بائبل کے بیان میں جو زوجہ نہیں تھیں، شفحہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس کا ترجمہ اگرچہ لونڈی کیا گیا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ وہ آزاد تھیں، اور یہ لفظ ان کے لیے خادمہ کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ (خطبات ۱۶۳-۱۶۵) سرسید مرحوم کے نزدیک :-

"توریت مقدس سے کسی طرح حضرت ہاجرہ کا لونڈی ہونا ثابت نہیں ہے، نہایت صاف اور روشن بات ہے کہ اس وقت کے حالات پر جو ہم نظر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے، کہ اس زمانہ میں لونڈی غلام دو طرح پر ہوتے تھے، شرا (خریداری) سے اور غنیمت سے یعنی یا تو وہ لونڈی و غلام ہوتے تھے، جو لڑائی میں اسیر ہو کر آتے تھے، اور شبوث حرب کہلاتے تھے، یعنی غنیمت جنگ ،یا وہ لونڈی اور غلام کہلاتے تھے، جو خریدے جاتے تھے، اور ان کو مقنت کشف کہتے تھے، یا ان کی اولاد لونڈی و غلام ہوتے تھے، ولید بائیت ولید البیت یعنی خانہ زاد، مگر حضرت ہاجرہ ان باتوں سے پاک تھیں پھر وہ کیونکر لونڈی ہو سکتی تھیں، ان کو لونڈی کہنا محض بہتان ہے۔" (ایضاً ص ۱۶۷)

عربوں کا علم الانساب اور اس کی اہمیت

حضرت ابراہیم سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نسبی رشتہ کے بارے میں بحث کرتے ہوئے مستشرقین نے عربوں کے علم الانساب پر بھی اعتراضات کئے ہیں، جن کو سرسید مرحوم نے "ایک طرف دار مصنف کے خیالی شوشے" سے تعبیر کیا ہے، کہا یہ گیا ہے کہ

" اس بات کا فرض کر لینا کچھ ضرور نہیں ہے، کہ ان کے انساب کا علم یا روایت خود ان قوموں میں بجنسہٖ چلی آتی ہے، ..... یہ بات بالکل بعید از عقل معلوم ہوتی ہے کہ ایسی وحشی قوم کے پاس جن کے پاس کوئی تحریری یادداشت نہیں ہے، ان کو اپنے نسب کی واقفیت اتنی صدیوں تک محفوظ اور برقرار رہی ہو۔" (خطبات احمدیہ ص ۳۰۸)

سرسید مرحوم نے اپنے خیالات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ جو ملکی روایتیں عرب کی

مختلف قوموں کی تقسیم کے بارے میں ہیں، وہ نہایت معتبر ہیں۔ کیونکہ عرب اپنے آبائی رسوم اور اوضاع اور اطوار کے بدرجۂ غایت پابند تھے، وہ اپنے نسب ناموں کو یاد رکھنا اپنا فرض سمجھتے تھے، اور یہی وجہ تھی کہ ہر ایک قوم نہیں بلکہ ہر ایک قبیلہ اپنا جدا نام رکھتا تھا اور اس ذریعہ سے ہر ایک شخص اپنی قوم اور قبیلے کو بخوبی جانتا تھا، اور اپنے حسب و نسب پر بے انتہا فخر کرتا تھا، لڑائیوں میں مردانہ اشعار پڑھنا، اور لڑنے والوں کا ان کے حسب نسب کا جتلانا جنگی باجے کا کام دیتا تھا، انھوں نے اپنے اس بیان کی تائید میں ریورنڈ مسٹر فارسٹر کی تحریر بھی پیش کی ہے" وہ اپنے جغرافیۂ عرب میں لکھتے ہیں کہ عربوں کی قدیمی اوضاع اور رسوم اور یادگاروں کی پابندی کو جو ہمیشہ سے زبان زد خاص و عام ہے، تمام دلائل میں سب سے اول رکھنا مناسب ہے، کیونکہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ ان کے قومی خاصوں میں سے یہ خاصہ سب سے مقدم ہے۔ (خطبات احمدیہ ص۳۶)

پھر سر سید مرحوم یہ بیان کرتے ہیں کہ ملک عرب کی ملکی روایتیں نہایت عمدہ اور صحیح ذریعہ ملک عرب کے حالات دریافت کرنے کا ہے، ان کی رسوم کا علم مندرجہ ذیل ذریعوں سے ہو سکتا ہے، میدان جنگ میں کوئی جنگ آور بدون اس کے کہ حریف سے اپنا حسب و نسب بآواز بلند بیان کرے تنہا لڑائی میں مشغول نہیں ہوتا تھا۔ کسی عام مہم میں ہر شخص اپنے ہی قوم کے سردار یا رئیس کے جھنڈے کے نیچے قیام کرتا تھا، جب کسی قوم کے کسی آدمی سے کوئی جرم سرزد ہوتا تھا، تو اس کی پاداش میں اس ساری قوم کے لوگوں کو جرمانہ دینا پڑتا تھا، جو اب شرع میں بلفظ الدیۃ علی العاقلہ مستعمل ہے، اس قسم کے رسوم کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب کے لوگوں کو اپنی قوم کو چھوڑ کر دوسری قوم میں جا ملنا غیر ممکن ہو گیا تھا، اور اسی بنا پر جزیرہ عرب کے مختلف اقطاع پر تقسیم ہونے کی روایتوں پر اعتبار قائم ہوا، اور برقرار رہا، وہ اپنی طویل بحث کے اختتام (ایضاً ص ۱۳۷) پر ریورنڈ مسٹر فارسٹر کا قول مفصل نقل کرتے ہیں کہ

مستشرقین ... بیرونی روایتوں کی غیر مؤید شہادت کیسی ہی قابل
اعتراض اور مشکوک کیوں نہ ہو، مگر منصفانہ بحث کے مسلمہ قواعد کی رو سے ان کا قطعی
اتفاق تواریخ دینی اور دنیوی سے انکار کرنا مرتکب غیر ممکن ہے، خود عربوں کے ہاں زمانۂ
نامعلوم سے یہ ایک روایت چلی آتی ہے کہ قیدار اور اس کی اولاد ابتداءً حجاز میں آباد ہوئے
تھے، اس شخص کی اولاد میں ہونے کا بالخصوص قوم قریش جو مکہ کے والی اور کعبہ کے محافظ
تھے ہمیشہ فخر کیا کرتے تھے، اور خود محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قرآن میں اپنی قوم کی ریاست
اور اعزاز کے دعووں کی اسی بنا پر تائید کی ہے کہ اسماعیل کی اولاد قیدار کے
سلسلہ سے تھی۔ ایسی قومی روایت کا اعتبار جیسے کہ یہ ہے تاریخی روایت کے پایہ
کو پہنچ جاتا ہے، جب کہ اس کی تائید ایک طرف تو کتب مقدسہ کے ان بیانات
سے ہوتی ہے جن سے قیدار کے اسی حصۂ جزیرہ نما میں ہونا ثابت ہوتا ہے، اور دوسری
جانب اریانوس، بطلیموس، پلینی اکبر کے زمانوں میں ملک حجاز میں قوم کیڈری
ورانی، کدرون تائی، یا کدینی کی موجودگی کے غیر مشتبہ اور ناقابل اشتباہ امر سے
اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ (جغرافیۂ تاریخی جلد ا صفحہ ۲۲۰)

اسلام کے ذریعہ تکمیل دین

اپنی کتاب کے تیسرے خطبہ میں سرسید مرحوم نے ان مختلف مذاہب کا ذکر کیا ہے، جو اسلام سے پہلے عرب میں موجود تھے، اور یہ بتایا ہے کہ اسلام مختلف معاملات میں کن کن مذاہب سے مشابہت رکھتا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ "ان مذاہب کے بھاری بوجھ کے نیچے ملک عرب ایک مذبوحی حرکت کر رہا تھا کہ دفعۃً اسلام نمودار ہوا، اور اس کو حیرت انگیز سرعت میں ڈال کر اس کا غیر متحمل بوجھ دور کر دیا، اور یہ دفعۃً جزیرۃ العرب کے چاروں کونوں کو صدق کے نور سے بھر دیا۔" اس کے بعد انھوں نے یہ بتایا

اسلام مغلوب کے مختلف مذاہب میں کیا مماثلت ہے کہ ان کی کن باتوں کو برقرار رکھا
اور کن امور میں ان سے مخالفت کی، اس کے بعد عیسائیوں کا یہ اعتراض کہ "اسلام درحقیقت
اصول و عقائد متفرقہ و منتشرہ مذاہب سابقہ کی محض ایک ترتیب اور اجتماع کا نام ہے" پیش
کرنے کے بعد اس بات پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں کہ

"یہ مشابہت اصول اسلام کی دیگر مذاہب الہامی کے اصول سے اسلام کے
پاک اور الہامی ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے، تمام چیزیں جن کا مبدأ ایک ہی غیر منتہی
اور کامل ذات ہو، ضرور ہے کہ ایک ہی قسم کی اور ایک ہی کامل اصول پر ہونگی جس طرح
کہ خدا تعالےٰ سے اپنا مثل پیدا کرنا غیر ممکن ہے، اور جس طرح کہ اس کی ذات سے
کسی پیدا کی ہوئی چیز کو اپنی مرضی اور اپنی حکومت کے احاطہ سے خارج کر دینا محال
ہے، اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ ایک ہی غرض کے انجام دینے کے لیے دو متناقض
اصول اور احکام اس کی ذات سے صادر ہوں، مسلمانوں کو بلکہ تمام دنیا کو حضرت
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمیشہ ممنون رہنا چاہئے، جنھوں نے ابتداے دنیا
سے اپنے زمانہ تک کے تمام نبیوں کی رسالت کو برحق ٹھہرایا، جنھوں نے تمام الہامی
مذہبوں کی تکمیل کی اور جنھوں نے اپنے باایمان متبعین کے لیے بے بہا اور لازوال نور
کے دروازے کھول دیئے" (خطبات احمدیہ ص ۲۲۳)

صداے جنگ سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں کئی جگہ اسلام کے محاسن بھی بیان کیے ہیں جس
سرسید مرحوم نے یہ لکھکر بجا طور پر ان کی تحسین کی ہے کہ "سر ولیم میور ایک نہایت دیندار عیسائی ہیں
اور جب تک علانیہ اور نہایت روشن بات نہ ہو اسلام کے حق میں گواہی نہیں دے سکتے" اس کے
بعد شکر گزاری کے جذبہ کے ساتھ سر ولیم میور کے خیالات نقل کیے ہیں، لیکن اس درمیان

۔۔۔ صدائے جنگ سے بت پرستی موقوف ہوگئی" کے جملہ پر گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"سرولیم کی اس تحریر پر میں کچھ حاشیہ لکھنا چاہتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ صدائے جنگ نے بت پرستی کو معدوم نہیں کیا، بلکہ اس سچی وحدانیت کے وعظ نے بت پرستی کو معدوم کیا ہے، جس کا اثر قرآن مجید کے نہایت فصیح اور پرتاثیر فقروں سے لوگوں کے دلوں پر ہوتا تھا، اور نہ صرف عرب سے بت پرستی کو نیست و نابود کیا بلکہ تمام مذہبوں میں جو اس وقت دنیا میں رائج تھے، اور وہاں تک وعظوں کی آواز پہنچی تھی اس خیال کو پیدا کر دیا کہ بت پرستی نہایت کمینہ خصلت اور ایک سخت گناہ ہے۔

(خطبات احمدیہ ص ۲۲۶)

ڈگبن سرسید احمد مرحوم نے ایڈورڈ گبن کی تحریریں بھی، اپنی تائید میں، بڑی فراخ دلی
ل کی ہیں، لیکن وہ ان پر گرفت بھی کرتے جاتے ہیں، ایک جگہ وہ گبن کے اس جملہ پر چونک
، کہ "(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے) عقبیٰ کی جزا و سزا ایسی تمثیلوں میں بیان کی جو ایک جاہل
ا پرست قوم کی طبیعت کے نہایت موافق تھیں۔" اس پر ان لفظوں میں تبصرہ کرتے ہیں:

"انھوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ عقبیٰ کی سزا اور جزا کا بیان غیر ممکن ہے، اَن دیکھی، اَن چھوئی، اَن چکھی، اَن بوجھی چیز کیونکر سمجھ میں آ سکتی ہے، جس چیز کیلئے لفظ ہی انسان کی زبان میں نہ ہو وہ کیونکر بیان ہو سکتی ہے، کیفیت جو ایک ذاتی وجدانی چیز ہے وہ دوسرے کو کیونکر بتلائی جا سکتی ہے، یہ تمام امور محالات سے ہیں، پس وحی یا الہام ان کو کیونکر بیان کر سکتا ہے، سچا اور صحیح مسلمانی مسئلہ سزا و جزا کا یہ ہے "لا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر" پس کوئی بیان کرنے والا گو کہ وہ الہامی زبان ہو جزا کو بجز اس کے کہ نہایت ہی محبوب چیز ہے اور سزا کو بجز اس کے کہ نہایت ہی

[illegible]

ہو سکتا ہے۔ [illegible]

دو مونوی چیزوں کی تمثیل میں جنت کی سرور چیزوں کا بیان کیا ہے، مولوی [illegible] فرمایا کہ نیک

کام کرو گے تو مینہ برسے گا غلہ پیدا ہوگا۔ ورنہ بری گناہ کرو گے تو قحط پڑے گا، وبا

پھیلے گی۔" (خطبات احمدیہ ص ۲۲۰)

چند معاشرتی مسائل پر اعتراضات

سر ولیم میور نے اسلام کے چند معاشرتی مسائل پر اعتراضات کئے ہیں کہ مذہب اسلام سے تین بڑی خرابیاں پیدا ہوئی ہیں؛ اول یہ کہ اس میں ایک سے زیادہ بیویوں کا ہونا، طلاق دے دینا، اور غلام بنا لینا وہ باتیں ہیں، جو علم اخلاق کی بیخ کنی کرتی ہیں، عام زندگی کو آلودہ اور ناپاک کرتی ہیں، اور حسن معاشرت اور انسان کے گروہوں کی حالت کو درہم برہم کر دیتی ہیں، دوم یہ کہ مذہبی آزادی روک دی گئی ہے، بلکہ معدوم کر دی گئی ہے جس کا نام و نشان بھی نہیں دکھائی دیتا، سوم یہ کہ مذہب عیسائی کی ترقی میں اور اس مذہب کے قبول کرنے میں ایک مزاحمت قائم کی گئی ہے۔

(ایضاً صفحہ ۲۳۰)

سرسید مرحوم کے خیال میں، عیسائی مصنفین، مسلمانوں کی مخالفت میں، سنجیدگی، اور نیک نیتی کو برقرار نہیں رکھ سکے، اپنی عیب جوئی کے مصمم ارادہ کی وجہ سے وہ اس بات کی طرف دھیان نہیں دے سکے کہ آب و ہوا، مرد و عورت کی تعداد اور مختلف طبعی اسباب کا گہرا اثر معاشرتی حالات پر پڑتا ہے۔

تعدد ازدواج سرسید احمد خان کی نظر میں اس بات کا خیال کرنا ایک بڑی غلطی ہے، کہ مذہب اسلام میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا، مسلمانوں پر لازمی یا کچھ زیادہ کار ثواب کی بات ہے، حالانکہ یہ اجازت

[illegible] کی ضرورت ہے [illegible] معاشرت اور مذہب کی رو سے مسئلہ ازدواج پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"پہلے ہم اس بات پر غور کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ دریافت کریں کہ اس امر میں تمام ذی روح مخلوقات کے پیدا کرنے والے کی مرضی اور ارادہ کیا تھا۔ پس ہم قانونِ قدرت کی بے خطا نشانیوں سے پاتے ہیں کہ جن ذی روح کی نسبت ان کے خالق کا یہ منشا تھا، کہ ان کے صرف ایک ہی مادہ ہو تو ان کی نسل ہمیشہ جوڑا جوڑا پیدا ہوتی ہے، جن میں سے ایک نر و ایک مادہ پیدا ہوتا ہے، برخلاف اس کے جن ذی روح کی متعدد مادائیں ہونی مقصود ہیں ان کے ایک سے زیادہ بچے ہوتے ہیں، اور اس بات کا کچھ لحاظ نہیں ہوتا کہ نر و مادے کی تعداد میں باہم ایک ہی نسبت ہو اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو جاندار زمین پر رہنے والے اور چلنے والے ہیں، وہ اکثر بلکہ تقریباً سب اسی قسم کے ہیں، پس اس قانون قدرت کے بموجب انسان بھی اسی دوسری قسم میں داخل ہے، مگر (چونکہ) وہ تمام مخلوقات سے اشرف ہے، اس لئے اس کا فرض ہے کہ جو قوتیں اور حقوق قدرت نے اس کو عطا کئے ہیں، ان کو احتیاط سے اور موقع بہ موقع بہ لحاظ امور طبعی اور حسن معاشرت اور انتظام خانہ داری یا نظم ملکی و قوانین حفظان صحت اور ملکی تاثیرات آب و ہوا کے کام میں لائے۔ پس جیسے کہ کثرت ازدواج اکثر حالتوں میں قابل نفرت ہے ویسے ہی ایک سے زیادہ نہ ہونے کا قطعی التزام خلاف فطرت ہے۔ (خطبات احمدیہ۔ ص ۲۳۹)

تعدد ازدواج کے معاشرتی پہلو کو سرسید نے تفصیل سے بیان کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے

انسان مدنی الطبع پیدا ہوا ہے، اسی بات کو توراۃ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ جب خدا تعالےٰ کو یہ خیال آیا کہ انسان کا اکیلا ہونا اس کے حق میں اچھا نہیں ہے، تو اس نے اس کے واسطے ایک ساتھی پیدا کیا، اور وہ عورت ہے جو اس واسطے پیدا کی گئی ہے کہ انسان کی زندگی کے فکر و تردد اور رنج و راحت میں شریک ہو، اور مرد کے ساتھ شریک ہو کر اس بڑے حکم کی تعمیل میں کہ بڑھو اور پھلو اور زمین کو آباد کرو، مدد دے، مگر جب وہ کسی سبب سے ان قدرتی فرائض کی ادائیگی میں قاصر ہو تو اس نقصان کے رفع کرنے کی تدبیر اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ ایسی حالتوں میں ایک سے زیادہ مگر کسی خاص حد تک، ایک ہی وقت میں بیویاں رکھنے کی اجازت ہو یا پہلی بیوی کو طلاق دینے کے بعد دوسری سے نکاح کرے، یہ حق عورت کو بھی حاصل ہونا چاہئے تھا، چنانچہ مذہب اسلام کی رو سے اس کو یہ حق ہے، مگر سیاست مدن کے لحاظ سے صرف اتنا فرق ہے کہ مرد جب چاہے یہ علاج کر سکتا ہے، لیکن عورت کو پہلے قاضی کی اجازت حاصل کرنی چاہئے، اس تدارک کی انسان کو اجازت نہ ہوتی، تو اس کے سبب سے حسن معاشرت میں بڑا خلل واقع ہوتا، اور انسان کو بدترین گناہوں کی طرف مائل ہونا پڑتا، تعلیم و تربیت کے ذریعہ اس ضرورت کا کم ہونا تو ممکن ہے، لیکن اس کا مٹنا محالات سے ہے، اس لئے جہاں ضرورت ہو وہاں اس پر عمل پیرا نہ ہونے سے نقصانات ہونگے جو حسن معاشرت کے لئے سم قاتل ہیں۔ (خطبات احمدیہ ص ۱۴۲)، سرسید مرحوم نے تعدد ازدواج کی تائید میں دو مستشرقین کی آراء بھی نقل کی ہیں کہ

"گرم ملکوں میں جہاں عورتیں جلد بوڑھی ہو جاتی ہیں، ضرورت ہے کہ تعدد ازدواج کا قاعدہ جاری کیا جائے۔" (مسٹر مانٹیگو)، "ایشیا کے گرم ملکوں کی تاثیر سے دونوں گروہ یعنی مرد و عورت میں ایک ایسا اختلاف ہوتا ہے جو یورپ کی آب و ہوا میں نہیں ہے، جہاں دونوں برابر برابر بتدریج عالم ضعیفی کو پہنچتے ہیں، مگر ایشیا میں صرف مرد ہی کو

یہ بات معلوم ہے کہ [illegible] میں ... دو ما تھ رہتا ہے۔ اگر یہ بات سچ ہے، تو بانی اسلام کے لئے اس بات کی کہ انھوں نے کئی بیویوں کی اجازت دی، ایک بڑی وجہ تھی۔"

(مسٹر ڈبلیو اورسلی)

لیکن ان مذکورہ بالا تائیدی آراء سے سرسید کو کامل اتفاق نہیں جس پر وہ ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں۔

"افسوس ہے کہ ان دونوں صاحبوں نے تعدد ازدواج پر صرف امور طبعی کے لحاظ سے نظر کی ہے۔ مگر اسلام میں یہ اجازت خاص خاص حالتوں میں صرف امور طبعی کے لحاظ سے نہیں دی گئی، بلکہ زیادہ تر اس لحاظ سے دی گئی ہے کہ تزوج کی غرضوں اور مقاصد تزوج کے فوت ہو جانے کی حالت میں ایک تدارک حاصل ہو، جو عین مرضی آدم و حوا کے پیدا کرنے والے کی اس کی قدرت کے کاموں کی نشانیوں سے معلوم ہوتی ہے" (خطبات احمدیہ ص ۲۴۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب اور اس کے گرد و نواح میں نکاح و شادی سے متعلق بہت سی اخلاقی خرابیاں پائی جاتی تھیں۔ سرسید مرحوم کے بقول ایران میں قوانین طلاق بالائے طاق رکھ دیئے گئے تھے، اور رشتہ داری کا پاس و لحاظ نہیں تھا، یہاں تک کہ بیٹے کو اس کی ماں ایسے ہی مباح تھی جیسے باپ کو اس کی بیٹی اور بھائی کو اس کی بہن، یہودیوں کے یہاں جو ایران کے گوشہ مغرب میں بکثرت آباد تھے تعدد ازدواج کی رسم کسی قید اور حد کے بغیر بے روک ٹوک جاری تھی، عرب میں ایرانیوں اور یہودیوں دونوں کی رسمیں یکساں جاری تھیں، تعدد ازدواج کی کچھ انتہا نہ تھی، تمام عورتیں بغیر کسی امتیاز یا رتبہ یا عمر یا رشتہ داری کے، مردوں کی وحشیانہ خواہشوں کے پورا کرنے کا کام دیتی تھیں، عیسائیوں کا حال ان سے برعکس تھا، ان کے یہاں ایک بیوی کرنی بھی کچھ نیکی شمار نہ ہوتی بلکہ رہبانیت اور تجرد محض

[illegible] صحت دونوں کے لیے [illegible] ایسے زمانہ میں جبکہ
عقل و دل کی [illegible] پھیلی ہوئی تھی، اور اخلاق و معاشرت اس قدر بگڑ چکی تھی، اسلام نے ایسا
عمدہ قانون جاری کیا جو اپنی اصلیت کے لحاظ سے نہایت کامل، عقل کامل کے بالکل مطابق
انسان کی تندرستی بہبودی اور حسن معاشرت کی ترقی کا نہایت عمدہ ذریعہ اور زن و مرد کی حالت
زوجیت کے حق میں اور دونوں کے لیے اس کی تلخیوں کے دور کرنے میں نہایت ہی مفید ہے (خطبات احمدیہ ص ۲۲۲)

سرسید مرحوم نے مذہبی نقطۂ نظر سے بھی تعدد ازدواج کا جائزہ لیا ہے، جس کا
خلاصہ یہ ہے کہ جس خوبی سے اسلام نے تعدد ازدواج کو روکا ہے، اس طرح نہ یہودیوں کے مذہب نے
اس کی بندش کی ہے، اور نہ عیسائی مذہب نے۔ یہودیوں کے یہاں بکثرت اور بلا تعیین حد ازدواج
موجود ہے، عیسائی مذہب نے بھی تعدد ازدواج کی کہیں ممانعت نہیں کی، چنانچہ مسٹر گیبنز لکھتے ہیں کہ
"میں نہیں جانتا متعدد بیویوں کی اجازت کی نسبت اسلام پر ایسا سخت طعن کیوں کیا جاتا ہے، یہ حضرت
سلیمانؑ اور حضرت داؤدؑ کی نظیر پر جو خدا کی مرضی پر چلتے تھے اور جن کو خدا نے خاص اپنی شریعت کے
احکام کی تعمیل کے لیے بنایا تھا، یہ امر ہرگز اعتراض کے لائق نہیں ہے، خصوصاً اس وجہ سے کہ عیسیٰ مسیح
نے بھی ان بیس انجیلوں میں سے جن کو ان کے معتقدوں نے ان کے احکام کو قلمبند کرنے کے لیے
تحریر کیا تھا، کسی انجیل میں اس کی ممانعت نہیں کی۔" جان ڈیون پورٹ نے بھی اپنی کتاب میں بائبل
کی بہت سی آیتوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ "ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے، کہ تعدد ازدواج صرف
پسندیدہ ہی نہیں بلکہ خاص خدا نے اس میں برکت دی ہے۔" (ایضاً ص ۲۲۵) اس کے بعد
سرسید مرحوم تحریر فرماتے ہیں :-

"اب ہم کہتے ہیں کہ اسلام نے تمام مذہبوں سے بڑھ کر تعدد ازدواج کو نہایت
خوبی سے روکا ہے، اور صرف ایک جورو کرنے کو پسند کیا ہے، اور تعدد کو صرف ایک استثنیٰ

صورتوں میں حالت میں جائز رکھا ہے۔ ہم کو کچھ شبہ نہیں کہ یہ مسئلہ ہمارے مذہب کا ایسا ہو سکتا
ہے کہ جو اکثرت ازدواج کی ممانعت اور صورت ہائے خاص اور حالات مستثنیٰ میں اجازت ہو
اس عمدہ اور مفید قاعدہ کی پابندی اور آمد کرنے سے وہ لوگ اس خدا کے سامنے جوابدہ
ہوں گے، جو انسانوں کے دلوں کا محرم راز ہے، اور وہ یقیناً ان کو اس قسم کی سزا دے گا
جو ان کے گناہ کے لحاظ سے واجب ہوگی۔ جو تعدد ازدواج اس زمانہ میں رائج ہے اور
ہمارے دوسرے بھائیوں نے ایک حیلہ متعہ کا جو جاہلیت میں تھا، اسلام میں پیدا کر کے
عورتوں کو کھلانا شروع کر دیا، ان سب باتوں کو مذہب اسلام سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ ایسے
افعال پر اسلام کی خوبی و حقیقت سے چشم پوشی کرنا، چمگادڑوں کے لئے آفتاب کا سیاہ کرنا ہے

(خطبات احمدیہ ملخصاً - ص ۲۴۹)

طلاق | سر ولیم میور نے اسلام میں اجازت طلاق کے مسئلہ پر بھی اعتراض کیا ہے۔ جس کے جواب
سر سید مرحوم اس بات کو تو تسلیم کرتے ہیں کہ سب سے بڑا دشمن حسن معاشرت و تمدن کا طلاق ہے۔
سے نکاح کی وقعت گھٹ جاتی ہے، اور مرد کی محبت کا عورت کے ساتھ اور عورت کی
داری کا مرد کے ساتھ اعتبار نہیں رہتا۔ لیکن اس کے باوجود۔

"اس بات سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اگر کسی سبب سے ایسی خرابیاں مرد و عورت
میں پیدا ہو جائیں جو کسی طرح اصلاح کے قابل نہ ہوں تو ان کا بھی کچھ علاج ہونا چاہئے، اور
وہ علاج طلاق ہے بطور ایک علاج کے۔ ایسی حالت میں اس کی طرف رجوع کرنا
جائز ہو سکتا ہے جب کہ اس پر عمل کرنے سے ایسی مصیبتیں جو طلاق کی مصیبتوں سے بھی زیادہ
ناقابل برداشت ہوں اور ایسے ترددات و تفکرات جو طلاق سے بھی زیادہ رنج دینے والے
اور رنجشیں پیدا کرنے والے ہوں دور ہو سکتے ہوں اگر ایسی حالت میں طلاق کو جائز رکھا جائے

[illegible]

نہیں بلکہ اس کی اصلاح کرنے والی اور ترقی دینے والی ہے" (خطبات احمدیہ ص [illegible])

انھوں نے طلاق کے بارے میں یہودی اور عیسائی مذاہب کے طرزِ عمل کا بھی جائزہ دے کر

یہ واضح کیا ہے کہ "یہودیوں کے یہاں طلاق دینا کسی قید و شرط کے بغیر مرد کے اختیار میں تھا، وہ

جب چاہتا طلاق لکھ کر بیوی کو دیدیتا، اور اس پر کوئی گناہ عائد نہ ہوتا تھا، حضرت عیسٰیؑ نے

اس حکم کو منسوخ کر دیا، اور جیسا کہ اس زمانے کے عیسائی سمجھتے ہیں، سوائے زنا کے اور کسی حالت

میں طلاق کو جائز نہیں رکھا، یہ ایسا سخت حکم تھا جس کی برداشت انسان کی طاقت سے

تھی، اگر یہ حکم اسی طرح مانا جائے جیسا کہ آج کل عیسائی مانتے ہیں، تو حسن معاشرت کیلئے نہا

ہی مضر ہے، اور جو رنجیدہ امور، زن و شوہر میں واقع ہو کر تمام ازدواجی مقاصد کی بربادی کا سبب

بنتے ہیں، اس کا کچھ بھی علاج نہیں ہے، اس صورت میں تو زن و مرد دونوں کے لیے اور بہت

خرابیوں اور خوفناک حالتوں میں پڑنے کا اندیشہ ہے" چنانچہ جان ملٹن نے بائبل کی مختلف آ

طلاق کے جواز پر استدلال کیا ہے، نہ کہ اس کی ممانعت پر جیسا کہ اس زمانہ کے عیسائی سمجھتے

سرسید جان ملٹن کی یہ پوری بحث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں

"جان ملٹن نے اپنی بحث میں جو کچھ روشنی بائبل کے درسوں (آیتوں) پر ڈالی

ہے، وہ سب اسلام کی روشنی سے لی گئی ہے، کیونکہ اسلام نے بارہ سو برس پیشتر

بتا دیا تھا کہ طلاق بطور معجون مفرح استعمال کرنے کے لئے نہیں بلکہ صرف ایک

لا علاج مرض کا علاج ہے، مگر زن و شوہر کا معاملہ ایسا نازک ہے کہ اگر اس میں

بیماری پیدا ہو جائے تو سوائے انہی دونوں کے اور کوئی تیسرا شخص اس بات کی

تشخیص نہیں کر سکتا کہ آیا وہ اس حد تک پہنچ گئی ہے جس کا علاج بجز طلاق کے اور

کا ذریعہ ہو، اسی لیے اسلام نے اس مرض کی تشخیص نہ کسی بیرونی قاضی کی رائے پر منحصر کی ہے نہ کسی مفتی کے فتوے پر بلکہ صرف شوہر کی رائے اور اخلاق پر جس کی تسلی اور موانست کے لیے ابتدا میں عورت بطور انیس دلنواز اور مونس غمگسار پیدا ہوئی تھی۔ (خطبات احمدیہ ص ۲۶۰)

سرسید احمد خاں نے ان تعلیمات نبوی کو بھی نقل کیا ہے، جن میں مرد و عورت کی اخلاقی تربیت اور زن و شوہر میں یکجہتی اور محبت و انس کی ہدایات اور تدبیریں بتائی گئی ہیں، اور جن میں طلاق سے امکانی حد تک بچنے، اور مجبوری کی صورت میں سوچ سمجھ کر، مناسب وقفوں میں تدریج کے ساتھ تفریق کی اس کارروائی کو روبہ کار لانے کی ہدایت کی گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے ساتھ محبت رکھنے، مہربانی اور خاطرداری سے پیش آنے، ان کی سختی اور بدمزاجی کو برداشت کرنے کی نہایت تاکید فرمائی، اور یہ سب باتیں اسی مکروہ چیز یعنی طلاق کو روکنے کے لیے ہیں۔ اپنی اس بحث کے اختتام پر وہ بڑی جرأت کے ساتھ لیکن ہمدردانہ لب و لہجہ میں یہ وضاحت بھی کرتے ہیں کہ:

"اسلام صرف اسی حالت میں طلاق کی اجازت دیتا ہے، کہ وہ زن و شوہر کے حق میں ایک بیش بہا نعمت ثابت ہو اور اس کے ذریعے سے حالت زوجیت کی تمام تلخیاں رفع ہو جائیں یا کم ہو جائیں، اور بغیر اس کے حالت معاشرت روز بروز خراب ہوتی جائے، اس صورت میں ظاہر ہے، کہ طلاق بجائے اس کے کہ حسن معاشرت کے حق میں مضر ہو، وہ زن و شوہر دونوں کے حق میں ایک برکت اور حسن معاشرت کی ترقی کا کامل ذریعہ ہوگی، ہاں میں اس بات کو قبول کروں گا کہ مسلمانوں نے اس عمدہ حکم کو نہایت قابل نفرت طریقہ پر استعمال کیا ہو۔

پس ان کے اقوال کی تفریق ابھی پر ہوتی چاہئے کہ مذہب اسلام کا جو عمدہ طریقہ اس باب میں اسلام نے اختیار کیا ہے، وہ عقل، انصاف اور معاشرت کی نظر سے ایسا عمدہ ہے، کہ اس سے بہتر ہو ہی نہیں سکتا اور صاف صاف یقین دلاتا ہے کہ یہ مسئلہ اسی استاد کا بتایا ہوا ہے، جس نے انسان کو پیدا کر کے اس کے لئے، اس کا جوڑا پیدا کیا تاکہ اس کی تسلی اور دل کی خوشی کا باعث ہو" (خطبات احمدیہ۔ ص ۲۶۳) (باقی)

سلسلۂ مقالات سلیمان

سید صاحب نے قومی، ملی، دینی، فقہی، تعلیمی و علمی مضامین کے علاوہ مولانا شبلی کے تتبع میں بہت سے محققانہ مضامین بھی لکھے ہیں، اور ان میں انھوں نے بڑے بڑے انکشافات کئے ہیں، مثلاً بحر ہند اور بر اعظم امریکہ تک کے دریافت کرنے والے یورپ کے جہاز ران واسکوڈیگاما وغیرہ نہیں، عرب کے جہاز ران تھے، جو دن رات دنیا کے سارے سمندروں کا چکر لگایا کرتے تھے، اور نئی نئی دریافتیں کرتے تھے، اس سلسلہ کی پہلی جلد ان کے انہی معرکتہ الآرا تاریخی مقالات پر مشتمل ہے، دوسری جلد میں ان کے علمی و تحقیقی مضامین ہیں، تیسری جلد میں ان کے مذہبی، قرآنی اور فقہی مقالات ہیں، ایک جلد ان کے خالص ادبی و لسانی و تنقیدی مقالات پر مشتمل ہوگی، ایک جلد ان کے خطبات پر مشتمل ہوگی ایک جلد میں مختلف ملکوں اور خود ہندوستان کے اندر ان کے تمام سفروں کی روداد ہوگی، ایک جلد ان کے متکلمانہ مقالات کی ہوگی، جو انھوں نے تاریخ اسلام پر یورپ اور امریکہ کے معاند مستشرقین کے اعتراضات اور ان کی نکتہ چینیوں کے جواب میں لکھے ہیں، اسلام اور مستشرقین کے عنوان سے جو نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں یہ جلد عنقریب شائع ہوگی۔

"منیجر"

ہندوستان کی سیاسی بیداری میں مولانا محمد علی کا حصّہ

از پروفیسر خلیق احمد نظامی، علی گڑھ

یہ مقالہ ۲۰ فروری کو کلکتہ کی محمد علی لائبریری میں مولانا محمد علی جوہر کے سمینار میں صدارتی خطبہ کے طور پر پڑھا گیا۔ (معارف)

تاریخ کی بعض نامور شخصیتیں چند اقدار عالیہ کی اس طرح ترجمان بن گئی ہیں کہ ان کا نام لیجیے تو ذہن میں وہ اقدار یک بیک جگمگا اٹھتی ہیں، اور جب ان اقدار کا ذکر کیجیے تو ان کی شخصیت بے اختیار آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے، ایسی ہی ایک شخصیت مولانا محمد علی کی تھی جس کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ حریت، عزیمت اور حق گوئی کو قدرت نے جب مجسم دیکھنا چاہا تو "محمد علی" کا پیکر دیدیا، انھوں نے بے خوف ہو کر جس طرح برطانوی سامراج کے خلاف آواز اٹھائی، اور ہر قدم پر قید و بند کو لبیک کہا، اس کی دوسری مثال مشکل سے ملے گی۔ ہندوستان نے سیاسی بصیرت، فہم و فراست، تدبر اور مستقل مزاجی، ایثار اور قربانی کے بہت سے نمونے پیش کئے ہیں، لیکن حق گوئی، بے باکی اور سرفروشی میں کوئی شخص مولانا محمد علی کے درجہ کو نہیں پہونچا، ان کا کالبد خاکی اس خمیر سے تیار ہوا تھا جس سے ٹیپو سلطان کا پیکر بنا تھا۔ کہ جب باطل کی قوتوں سے نبرد آزما ہونے کا وقت آئے تو سر کاندھوں پر بوجھ بن جائے، اور خدمت دار و رسن کیلئے دل سینے میں تڑپنے لگے۔ جب مولانا محمد علی نے کہا۔ ؎

پیغام ملا تھا جو حسین ابن علی کو　　　خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لیے ہے

تو انھوں نے [illegible] استقلال کی [illegible]

۹ نومبر ۱۹۲۲ء کے بعد دیکھیں کس جذب اور کرب کے عالم میں اللہ سے دعا کرتے ہیں۔

"جو فدویت اور جاں فروشی کی روح حسینؓ ابن علیؓ کو اپنے اجداد ابراہیم و اسمٰعیل و محمد صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین سے ملی تھی، اور کرب و بلا کے ریگ زار میں جس کے ظہور کی تو نے اُن کو توفیق دی تھی، اسی عزم و استقلال اور اسی صبر و استقامت کی عاجزانہ درخواست میں بھی کرتا ہوں۔"

جس شخص نے آزادی وطن کے لئے اس طرح اپنی زندگی نثار کر دینے کا عزم کیا ہو، اس کے اعمال کو عام انسانی پیمانوں سے نہیں ناپا جاسکتا۔

۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو یوم محمد علی کے موقع پر مولانا ظفر علی خاں نے ایک نظم میں کہا تھا ؎

اب تک لگی ہوئی جو کروڑوں دلوں میں ہے
بیتابی اس لگن کی محمد علی سے تھی

اور اس میں کوئی مبالغہ نہ تھا، مولانا محمد علی نے ایک سوتی ہوئی قوم کو للکارا تھا، ؎

سونے کا نہیں وقت ہشیار ہو غافل
رنگِ فلکِ پیر زمانے کی ہوا دیکھ

اور جذبات حریت کو ابھار کر ایک قوت بنا دیا تھا، انھوں نے ٹوٹی ہوئی کشتی کے ملاح کی طرح طوفان کا مقابلہ کرتے ہوئے جان دی، بقول مولانا سید سلیمان ندویؒ۔

"وہ شکست خوردہ فوج کا آخری سپاہی تھا جو اعدا کے نرغے میں تنہا لڑ رہا تھا آخر زخموں سے چور ہو کر ایسا گرا کہ پھر کھڑا نہ ہو سکا۔"

مولانا محمد علی کے وصال کو نصف صدی سے زیادہ گزر چکی لیکن فضاؤں میں آج بھی اُن کی یہ آواز گونج رہی ہے، ؎

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

مولانا محمد علی کی پیدائش ۱۸۷۸ء میں ہوئی تھی، ۱۹۳۱ء میں انھوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا، ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں میں شاید ہی کسی لیڈر نے اتنی کم عمر پائی تھی، باایں ہمہ ان کی ۵۳ سالہ زندگی ہندوستان کی تاریخ کا ایک زریں باب ہے، جو کبھی بھلایا نہیں جاسکتا، عوام میں سیاسی شعور کی بیداری، برطانوی سامراج کے خلاف عوامی جدوجہد کا آغاز، اور دستور کی اصلاحات سے متعلق مطالبات کی گوناگوں پیچیدگیوں کا احساس .... تینوں کی ابتدا اسی دور میں ہوئی۔ قوموں کو اپنی آزادی کے حصول کے لیے جس منظم جدوجہد اور قربانی کی ضرورت ہوتی ہے، اور جس کے بغیر ان کی ساری آرزوئیں اور امنگیں بے سود رہتی ہیں، وہ اسی دور میں شروع ہوئی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا محمد علی کی جرأت، عزیمت، حق گوئی اور مجاہدانہ سرفروشی نے ہماری تحریکِ آزادی میں مقصد کی وہ تپش اور قربانی کا وہ جذبہ پیدا کردیا جس کے بغیر سامراجی قوتوں کا مقابلہ ممکن نہ تھا، جو شخص اس حسرت کے ساتھ میدانِ سیاست میں داخل ہوا

شاید کہ آج حسرتِ جوہر نکل گئی ‌‌ ‌‌ ‌‌ ‌‌ اک لاش تھی پڑی ہوئی گورِ کفن سے دور

اس کے اثرات کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟ اُن کی رگ رگ سے عمر بھر "من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را" کی صدا بلند ہوتی رہی۔

انقلابِ فرانس کے ایک مفکر نے لکھا ہے کہ آزادی پہلے ذہن میں قائم ہوتی ہے۔ پھر اس کا ظہور اعمال کے ذریعہ بیرونی دنیا میں ہوتا ہے۔ ہندوستان میں ذہنی آزادی کا اعلان مولانا محمد علی نے کیا، ان کے جذبۂ سرفروشی نے مردہ دلوں کو گرما دیا، اور آزادی کے شورش انگیز مقصد سے ان کی زندگیوں میں ہیجان برپا کر دیا، انھوں نے آزادی کی جنگ کے مفہوم کو عوام تک

پہنچانے کے [illegible] استعارات استعمال کیے، [illegible] ذہنی کو قریب آنے دیا، بلکہ قوم کی روح کے پوشیدہ مضراب کو چھیڑ کر، عزم ہمت اور قربانی کا سبق پڑھایا، غلامی کی زندگی کے مقابلے میں موت کو گلے لگانا سکھایا۔ اور کہا۔ ؎

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی — ہوسِ زیست ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی
اور کس وضع کی جویاں ہیں عروسانِ بہشت — ہیں کفنِ سرخ، شہیدوں کا سنورنا ہے یہی
نقدِ جاں نذر کرو سوچتے کیا ہو جوہر — کام کرنے کا یہی ہے تمھیں کرنا ہے یہی

مولانا ابوالکلام آزاد سے جب آپ بیتی لکھنے کا تقاضا ہوا تو فرمایا۔ ؎

گفتی کہ چرا حالِ دلِ زار نہ گوئی — من خود کنم آغاز بپایاں کہ رساند

وہی سوال مولانا محمد علی سے کیا گیا تو، ۱۲ جون ۱۹۲۷ء کے ہمدرد میں پکار اٹھے، ؎

کیا عشق ناتمام کی بتلاؤں سرگذشت — دار و رسن کا اور ابھی انتظار دیکھ

انھوں نے آزادیِ وطن کی طلب کو ایسا دل فریب بنا دیا تھا کہ کہتے تھے، ؎

دے نقدِ جاں تو بادۂ کوثر ابھی ملے — ساقی کو کیا پڑی ہے کہ مے ادھار دے
ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر — یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

آزادیِ ہند سے متعلق لٹریچر کو کبھی ایک جگہ جمع کر کے اس کا تقابلی مقابلہ کیا گیا تو مولانا محمد علی کی آواز سب سے اونچی اور پُرسوز سنائی دے گی۔ [1]

مولانا محمد علی کی سرگرمیوں کی نوعیت سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان عوامل اور محرکات کا تجزیہ کیا جائے جن کے زیرِ اثر ان کے جذباتِ حریت نے نشو و نما پائی تھی۔

(۱) مولانا محمد علی کے جذبات و افکار کی سب سے پہلی تربیت گاہ ایم اے او کالج علی گڑھ تھا، یکم مئی ۱۹۲۷ء کے ہمدرد میں لکھتے ہیں۔

سنہ ۱۸۹۰ء سے سنہ ۱۸۹۸ء تک میں علی گڑھ میں رہا، اور تقریباً جو کچھ میں نے
حاصل کیا ہے، وہ اسی علی گڑھ کا طفیل ہے :

یہاں ایک طرف مولانا شبلیؒ کی صحبت میں اسلامی جذبات نے فروغ پایا اور فہم قرآن کی صلاحیت پیدا ہوئی تو دوسری طرف سرسیدؒ کی مقناطیسی شخصیت نے درد قومی کا بے پناہ سرمایہ ایک شورش انگیز مقصد کی طرح ان کی رگ رگ میں دوڑا دیا۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں انھوں نے اپنی سیاسی جد و جہد کا بنیادی محرک سرسید کو قرار دے کر کہا تھا۔ ؎

سکھایا تھا تم ہی نے قوم کو یہ شور و شر سارا　　　جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو

(وکیل ۱۱ اپریل سنہ ۱۹۰۷ء)

جو لوگ سرسید کی تحریک کے بنیادی مقاصد کو نہیں سمجھ پائے، انھوں نے اس غلط فہمی کو پھیلایا ہے کہ سرسید نے انگریز کی غلامی اور سیاسی حقوق کے حصول کی جد و جہد سے علٰحدگی کا سبق پڑھایا تھا حقیقتاً سرسید کا خیال اس وقت یہ تھا کہ مسلمانوں کی ترقی کا انحصار ان کی مغربی تعلیم کے حصول پر مبنی ہے اور اگر ابتدا ہی میں سیاست کے خارزار میں پھنس گئے تو قوم کی تعلیمی کوششیں پس پشت پڑ جائیں گی اور پھر کوئی راہ ان کی ترقی کی پیدا نہ ہو سکے گی، یہ تجزیہ صحیح تھا، اور بالکل صحیح، اس کی بنیادی سچائی کو جس شخص نے سمجھا ہے وہ پنڈت جواہر لال نہرو تھے، اپنی سوانح حیات میں لکھتے ہیں کہ سرسید کا مسلمانوں کو سیاست سے علٰحدگی کا مشورہ اور مغربی تعلیم پر اُن کا زور ان کی فکر کی صحیح انقلابی سمت کو ظاہر کرتا ہے (ایک خود نوشت سوانح عمری ۴۶۱-۶۲)

مولانا محمد علی کا خیال بھی یہی تھا، لیکن بعد کو جب علی گڑھ کے ارباب حل و عقد نے ملکی سیاست سے علٰحدگی پر زور دیا اور ترک موالات کی مخالفت کی تو مولانا محمد علی نے اس زمانہ کے ارباب

اقتدار کی بے حسی کا اور فقدانِ بصیرت کا مرثیہ ضرور پڑھا، لیکن سرسید کے مسلکِ تعلیمی کی ان معاندانہ افکار سے اتفاق نہیں کیا جو بعض حلقوں میں ظاہر کیے جا رہے تھے، نواب وقار الملک نے جو مولانا محمد علی کے سیاسی مرشد تھے، سنہ ۱۹۰۷ء میں ایک مضمون میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں لکھا تھا۔

"خود جناب سرسید احمد خاں مرحوم و مغفور نے اب سے سالہا سال قبل صاف کہہ دیا تھا کہ اب وہ وقت نہیں ہے کہ ہم صرف اس انتظار میں بیٹھے رہیں کہ اول اپنی تعلیم کو پورا کریں، پھر ملکی معاملات میں قدم رکھیں۔"

مولانا محمد علی نے سرسید کی تحریک کی روح کو سمجھا تھا اور عمر بھر اس کو اپنی زندگی کی عزیز ترین متاع بنا رکھا تھا، انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم کی تو یہ سرسید کے خلاف آواز نہ تھی بلکہ اس دور کے علی گڑھ سے ناامیدی کا اعلان تھا!

اس پس منظر میں دیکھا جائے تو اس حقیقت کے اعتراف میں کوئی تامل نہ ہوگا کہ مولانا محمد علی کی پہلی تربیت گاہ جہاں سے دردِ قومی اور مسائلِ ملت کا احساس اُن کو ملا تھا، وہ سرسید کا علی گڑھ تھا۔

(۲) دوسرا زبردست اثر مولانا محمد علی پر آکسفورڈ کے قیام کا تھا۔ ایک آزاد ملک کے آزاد علمی مرکز میں ان کا دل اپنے ملک کے حالات پر خون کے آنسو رو دیا تھا۔ یہ حقیقت نظر انداز نہیں کرنی چاہئے کہ ہمارے بعض بہترین رہنما اور مفکر قیام انگلستان سے وہ جذبات لے کر واپس آئے تھے، جن سے ان کی زندگی میں قوت اور گیرائی پیدا ہوئی، ڈاکٹر محمد اقبال، پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا محمد علی سب نے انگلستان کی آزاد فضا میں اپنے ملک کی آزادی کے خواب دیکھے تھے، اقبال نے طلوعِ اسلام میں بالکل صحیح کہا ہے، ؎

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

مولانا محمد علی نے جس طرح وہاں کے تعلیمی اداروں کا ذکر کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ

ان کی روح اس آزاد ماحول کے لیے ترستی تھی جو انھوں نے انگلستان کی تعلیمی درسگاہوں میں دیکھا تھا۔
۱۹۰۷ء کے ایک رسالے The Proposed Mohammedan University
میں جس کو انھوں نے Aligarh Memories کے نام معنون کیا ہے، ان کا تصور بیلی اول کے
لیکچر روم Fenner ' King's chapel کے Cricket ground اور
Charwell کے Shady Backwaters کی طرف جاتا ہے، اس لئے کہ اس میں
ان کو انسانی فطرت قید و بند سے آزاد فطرت سے سرگوشیاں کرتی سنائی دیتی ہے۔ پنڈت
جواہر لال نہرو کا جوش آزادی اور ڈاکٹر محمد اقبال کی مغربی تہذیب اور فلسفہ سے نفرت انگلستان
ہی کی دین تھی، مولانا محمد علی کی فکر میں آکسفورڈ کا اثر عمر بھر کام کرتا رہا۔ وہاں ان کا مضمون تاریخ تھا
اور بعض غیر معمولی شہرت کے پروفیسر ان کے استاد تھے، تاریخ کے مطالعہ نے ان کی سیاسی بصیرت
کو جلا دی، فکر و نظر کے نئے پیمانے عطا کئے، اور سیاسی حوادث کے پیچھے جو سامراجی اثرات کارفرما
تھے، ان کو سمجھنے اور ان سے نبرد آزما ہونے کا جذبہ اور حوصلہ دیا۔

(۳) سرسید کے عطا کئے ہوئے درد قومی اور آکسفورڈ کی عطا کی ہوئی بصیرت نے برطانوی
سامراج کو مولانا محمد علی کے سامنے بے نقاب کر دیا۔ اور وہ اس کے مضمرات اور سازشوں کی
تہہ تک پہونچ گئے، ان کی ولادت سے ایک سال قبل ۱۸۷۷ء میں ملکہ وکٹوریہ نے
Empress of India کا لقب اختیار کیا تھا، اور سامراجی منصوبوں اور جدوجہد کا
ایک نیا دور شروع ہو گیا تھا۔

مولانا محمد علی نے ۱۹۰۸ء کے نیوز پیپر ایکٹ، ۱۹۰۹ء کی منٹو مورلے ریفارم، ۱۹۱۵ء
کے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ، ۱۹۱۶ء کے سیڈیشن کمیشن، پھر ۱۹۱۹ء کے مانٹیگو چیمسفورڈ
ریفارم، پھر ۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن کے تقرر میں سامراجی روح کو کارفرما دیکھا تھا، اس

سامراجی ذہن میں "لڑاؤ اور حکومت کرو" کے خطرناک نظریہ پر انگریزوں کی کوششوں کی بنیاد رکھی
تھی تقسیم بنگال اور پھر اس کی تنسیخ میں یہی مقاصد کارفرما تھے، مولانا محمد علی نے تمام دستوری مطالبات
اور سیاسی کاوشوں کی سمت کو سمجھ لیا تھا، اور ان کو یقین ہو گیا تھا کہ آزادی کی تحریک کو جارحانہ
خطوط پر چلائے بغیر کامیابی ممکن نہیں، مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح دہشت پسندانہ تحریکوں سے
تو شاید ان کا رابطہ نہیں رہا ہے لیکن وہ فکر و نظر میں کھلے ہوئے دہشت پسند تھے، اگر مہاتما گاندھی کی عدم
تشدد کی تحریک ان کے جوش کی عنان گیر نہ ہو جاتی تو ان کی زندگی کا رخ کچھ اور ہی ہوتا۔ !

(۴) مولانا محمد علی کے جذبات کی غالباً سب سے بڑی تربیت گاہ ان کی "زندانی زندگی" تھی
گو ان کا جوش سرفروشی دار و رسن کو پکارتا تھا، اور وہ کہتے تھے۔ ؎

مستی دار کو حکم نظربندی ملا — کیا کہوں کیسے رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

لیکن حقیقت یہ ہے کہ قید و بند کی زندگی نے اُن کے ساتھ وہی عمل کیا جو امام احمد بن حنبلؒ
امام ابن تیمیہؒ اور مجدد الف ثانیؒ کے ساتھ کیا تھا، انھوں نے جیل کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں
اللہ کی یاد سے اپنے نہاں خانۂ دل کو روشن کیا، اور پھر اس سے وہ قوت اور روشنی حاصل کی کہ
بے اختیار پکار اٹھے۔ ؎

اب ہوا ہے ماسوا کا پردہ فاش — معرفت کے اب کہیں دفتر کھلے
فیض سے تیرے ہی اے قید فرنگ — بال و پر نکلے قفس کے در کھلے

جو جیل خانہ میں اپنی چہیتی بیٹی آمنہ کی شدید علالت کی خبر کو سن کر کہنے لگے۔ ؎

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو — نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

وہ جذبات کے کس قلزم سے گذر کر صبر و رضا کی اس منزل پر پہونچا ہوگا، اور کس عالم
میں اس نے اللہ سے دعا کی ہوگی۔

[illegible] دل [illegible] جیل طور نہیں

اللہ کی ذات پر پورا بھروسہ، حق کے لیے جان دینے کا جذبہ ان کو جیل خانہ کی تنہائی ہو

اور اسکے سہارے انھوں نے اپنی سیرت کو سنوارا اور اس میں وہ دلنوازی پیدا کی جو خالق

کائنات سے رشتہ جوڑنے والے ہی کی میراث ہے۔ ؎

قید اور قید بھی تنہائی کی شرم رہ جائے شکیبائی کی

کر گئی زندۂ جاوید ہمیں تیغ قاتل نے مسیحائی کی

مولانا محمد علی کی فکر اور جذبات کا کوئی مطالعہ ان کے جیل خانے جانے سے پہلے اور اس کے

بعد کی زندگی کے زبردست فرق کا تجزیہ کئے بغیر ممکن نہیں۔

۵۔ مولانا محمد علی کے قیام انگلستان نے ان کو عالم اسلام کے حالات اور مغربی

استعمار کے عزائم سے واقف کر دیا تھا، یورپ کے مرد بیمار کی جانب مغربی طاقتوں کی

للچائی ہوئی نظروں، اسلامی طاقت کو پارہ پارہ کر دینے کے عزائم، طرابلس کی جنگ،

بلقان کی بغاوت، سب کو انھوں نے حقیقی تاریخی پس منظر میں دیکھا، اور ان کو اسلام کی

عالمگیر بربادی میں انگریزی کی سازشوں کا احساس ہونے لگا، مولانا شبلی کا یہ شعر وہ ورد کر

پڑھا کرتے تھے :۔

کہاں تک لو گے ہم سے انتقام فتح ایوبی دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک!

لیکن جب ونسٹن چرچل نے قسطنطنیہ پر حملہ کے وقت اعلان کیا۔ (ہم آخری اور بہترین

صلیبی جنگ لڑ رہے ہیں)

یہ جملہ ایک نشتر کی طرح مولانا محمد علی کے قلب کی گہرائیوں میں اتر گیا، اور عثمانیوں

کے سیاسی اقتدار کو ختم کرنے کی کوشش میں ان کو اسلام کے خلاف مغربی سازش اپنے پورے

عواقب اور نتائج کے ساتھ نظر آنے لگی، خلافت کے ڈوبنے کے باوجود یہ بات کچھ کم تھی
یہ ایک نشانی تھی جو منزلِ مقصود کی طرف اشارہ کر رہی تھی، کاروان بھٹک چکا تھا، وہ
گرد و غبار سے اَٹ گئی تھی، لیکن یہ نشانِ راہ پکار رہا تھا۔ ؎

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار — لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

اس "قلب و جگر" کی تلاش میں خود انکا دل تلاش صد پارہ "بن گیا، لیکن وہ جنس نایاب
کہیں نہ ملی، اور جب مصطفےٰ کمال نے خلافت کے خاتمے کا اعلان کیا تو وہ عرفی کے اس
شعر کی مجسم تفسیر بن گئے۔ ؎

تو اچہ آگہی کہ مرا از غروب ایں خورشید — چہ گنج ہائے سعادت زیان جاں آمد

انھوں نے خلافت کے تصور سے ہندوستان کی تحریک آزادی کو تاب و توانائی
بخشی۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ ہندوستان کی سیاسی جدوجہد اور خلافت کی بقا کے لئے
تحریک کو ایک ہی رشتہ میں پرونے لگے تھے، تو غلط نہ ہوگا۔ خلافت ڈیلیگیشن کے مقاصد پر بحث
کرتے ہوئے، ایک حالیہ تصنیف میں یہ جملہ بڑا قابل غور ہے :-

" From an examination of the Delegation's activities utterances and writings it is evident that they had gone to Europe not only to plead the cause of Khilafat but through this medium to advance the nationalist movement in India."

N.Qureshi "Mohd Ali's Khilafat Delegation to Europe." Karachi 1980. p.63

یہ تھے وہ بنیادی محرکات جنھوں نے مولانا محمد علی کی سیاسی فکر کو نشو و نما دی تھی،
ان مختصر تجزیے کے بعد ان کے بنیادی سیاسی تصورات پر ایک نظر ڈال لی جائے تو ان کے کام
کی صحیح سمت متعین کرنا زیادہ آسان ہو جائے۔

١۔ مولانا محمد علی کے دل میں ہندوستان سے گہری محبت تھی، فرقہ واریت کی پرچھائیاں
بھی ان کی فکر پر نہیں پڑی تھیں، وہ ہندو مسلمان کو ایک رشتۂ الفت میں بندھا ہوا دیکھنا چاہتے
تھے، مہاراجہ بڑودہ اور مہاراجہ الور نے ان سے جو سلوک کیے تھے، وہ تمام عمر نہیں بھولے۔ انھوں
نے مہاتما گاندھی کو جس طرح اپنا رہبر تسلیم کر لیا تھا، اور ان کی قیادت میں اپنی مذہبی تحریک
یعنی خلافت کو چلایا تھا، اس سے ان کے انداز فکر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

٢۔ اسلام مولانا محمد علی کی شخصیت کا مرکزی نقطہ تھا، وہ اسلام سے تعلق کو اپنے لئے
باعث فخر سمجھتے تھے، انھوں نے اسلام اور اپنی وطن دوستی میں کبھی کوئی تصادم محسوس نہیں کیا
جن لوگوں نے ان دونوں جذبات کو مختلف سمتوں میں کارفرما دکھایا ہے، انھوں نے مولانا محمد علی
کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تناقض پر زور ان طبائع کی ستم ظریفی ہے،
جن میں سچائی کی کمی ہے اور منافقت کا جذبہ جن کا رہبر ہے، گول میز کانفرنس کے چوتھے اجلاس
میں، ١٩ر نومبر ١٩٣٠ء کو اپنی آخری تقریر کرتے ہوئے مولانا محمد علی نے کہا تھا۔

"جہاں تک احکام خداوندی بجالانے کا تعلق ہے میں اول بھی مسلمان ہوں،
دوئم بھی مسلمان ہوں اور آخر میں بھی مسلمان ہوں، یعنی میں مسلمان ہونے کے علاوہ
اور کچھ نہیں ہوں ...... اور یہی حال ڈاکٹر مونجے کا ہے، احکام خداوندی کی بجاآوری
میں ان کو پہلے ہندو ہونا چاہئے، اور بعد کو مسلمان، لیکن جہاں ہندوستان کا سوال
آتا ہے، جہاں ہندوستان کی آزادی کا سوال آتا ہے، یا جہاں ہندوستان کی فلاح

جیسا اسرائیل ... [illegible] ... ہندوستانی ... [illegible]

آخر میں بھی ہندوستانی ہوں، اور ہندوستانی ہونے کے علاوہ کچھ نہیں ہوں اور نہ میں دوسرے

کے دائروں سے تعلق رکھتا ہوں جو ہم مرکز نہیں ہیں۔"

۲- بعض اوقات مولانا محمد علی کے مذہبی جذبے کو مذہبی تنگ نظری سے تعبیر کیا جاتا ہے
یہ خیال بھی غلط اور گمراہ کن ہے۔ ان کی فکر میں مذہبی جذبات اخلاق و انسانیت کی معراج
داخل ہوئے ہیں، ایسا اخلاق جو کائنات کے ہر ذی روح کے ساتھ انصاف کر سکے اور ایسی
انسانیت جو "الخلق عیال اللہ" کی تفسیر بن جائے، ان کا عقیدہ تھا۔

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اقبال کے اس مصرعہ کو نقل کر کے انھوں نے اپنی فکر کی وضاحت بھی کی ہے

۳- مولانا محمد علی نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ کانگریس سے گہرے تعلق میں گزارا تھا، جیسا کہ
کہ جس طرح انھوں نے اپنا رہبر تسلیم کیا، اور ان کی سرکردگی میں سیاسی تحریک
آگے بڑھایا، اس سے ان کے سیاسی مسلک کی ترجمانی ہوتی ہے، وہ کانگریس کے صدر رہے،
اور پنڈت جواہر لال نہرو نے ان کے سیکریٹری کی حیثیت سے کام بھی کیا، پنڈت نہرو کے

ان کے خطوط سے نہرو خاندان سے گہرے قلبی تعلقات بے لاگ اور آزادانہ تبادلۂ خیالات اور بے پناہ خلوص کا اندازہ ہوتا ہے

جن اسباب کی بنا پر مولانا محمد علی کانگریس اور اس کی لیڈرشپ سے دور ہو گئے، اس کا تجزیہ
ضروری ہے، لیکن آسان نہیں، اگر مولانا ابوالکلام آزاد ۱۹۵۸ء تک اپنے بعض افکار و
نظریات کا تجزیہ عوام تک پہونچانا نہیں چاہتے تھے، اور انڈیا ونس فریڈم کے کچھ اجزاء کو مزید
۳۰ سال کے لیے سربمہر نیشنل آرکائیوز میں رکھوانا ضروری سمجھا تھا، تو یاد رکھیے کہ مولانا محمد علی
افکار کے کشف و تحقیق کے لیے بھی شاید اس سے زیادہ ہی وقت درکار ہوگا فرقہ واریت

[illegible] پیدا [illegible] سیاسی

[illegible] ممکن نہیں رہا ہے۔ [illegible] ہندوستان سے

بھی ختم [illegible] کی جائے۔ (۱) مولانا محمد علی کا یہ نظریہ [illegible] آزادی اور (۲) ہندوستان میں [illegible]

اتحاد [illegible] کے لیے ان کی پرخلوص جدوجہد ان کے علاوہ جو کچھ ہے وہ فروعی حیثیت رکھتا

ہے۔ اور اس کا تجزیہ جس ذہنی فضا کا مطالعہ کرتا ہے وہ ابھی برصغیر میں پیدا نہیں ہوئی۔

۵۔ مولانا محمد علی میں مذہبیت کا غلبہ ان کی زندگی کے حقائق کی پیداوار تھا، ان کا جوش

آزادی، ناپیدا کنار سمندر کی طرح موجیں مارتا تھا، ان کے حالات زندگی ایک جہت تک آپ ہمیں

اس کو ڈالدیتے تھے، انھوں نے سیاسی زندگی کے عروج اور زوال دونوں کی کیفیت دیکھی تھی،

ان کے اقتصادی حالات ان کے ارادوں کو شکست نہ دے سکے تھے، لیکن ان کے جسم کو چکنا چور

کر دیا تھا، مذہب کے سہارے انھوں نے اپنی دکھتی ہوئی کمر کو آرام پہنچایا تھا، اور اپنے زخموں کا

مداوا تلاش کیا تھا۔ ۱۰ راکتوبر سنہ ۱۹۲۶ء کے ہمدرد میں لکھتے ہیں: "نظربندی کے مصائب اور

نظربندی ہی کی فرصت نے مجھے پہلی بار سارے قرآن سے آشنا کرایا"

۶۔ مسلمانوں کے مقامات مقدسہ پر برطانوی سامراج کی للچائی ہوئی نظروں کو مولانا محمد علی نے

پہچان لیا تھا، لائڈ جارج کو ممبران خلافت ڈیلیگیشن کی جانب سے ۱۷ جنوری سنہ ۱۹۲۰ء کو جو خط

انھوں نے لکھا ہے، اس میں دو مطالبے کئے ہیں،

(1) Territorial integrity and Political Independence

of the Empire of the Khalifa and

(2) the inviolability of Jazirat-ul-Arab the Holy

land of Islam"(Unpublished letters of Ali Brothers

P.302

[illegible] کے فن و جود کا اظہار مقامات متبرکہ تک پہنچتے تھے۔ اقبال کی طرح
ان کا احساس بھی پیر شب کے متعلق یہ تھا۔

جب تک باقی ہے تو تمنا باقی ہم بھی ہیں   صبح ہے تو اس چمن میں گوہر شبنم بھی ہیں

۶۔ آزادیٔ فکر و ضمیر محمد علی کی فطرت کا تقاضا تھا۔ وہ اپنے نظریات کو کسی مصلحت کے تابع نہیں کر سکتے تھے، وہ بادشاہ، سیاسی رہبر، استاد، پیر سب کے سامنے اپنی خودی، اور اپنے فکر کی آزادی برقرار رکھتے تھے۔

مہاتما گاندھی سے اختلاف ہوا، تو اس کے اظہار میں تامل نہ کیا، اور جب اپنے مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے رائے کا اختلاف ہوا، تو اس کو بھی پوشیدہ نہ رکھ سکے۔ پروفیسر مارگولیتھ ان کا استاد تھا، لیکن اس کی Life of Mahomet پر ان کی برہمی قابل دید تھی۔ ان کے مزاج پر نظر کئے بغیر ان کی شخصیت کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ ان کے یہاں جذبات، فکر، زبان تینوں میں مکمل ہم آہنگی تھی، وہ سیاست میں رہتے ہوئے بھی سیاسی آدمی نہیں تھے۔ ان کے اعمال میں جذبات کی کارفرمائی زیادہ اور فکر کی جلوہ گری کم ہوتی تھی، یہ ان کی سرشت کا تقاضا تھا، ممکن ہے کہ ان کے دماغ نے کسی جگہ غلطی کی ہو، لیکن ان کا دل ہمیشہ سچائی، خلوص اور عزیمت کا مرکز رہا۔

ان محرکات اور افکار کی بنیادی سمت کو ذہن میں رکھ کر اگر ان کی سیاسی کاوشوں اور جدوجہد کا تجزیہ کیا جائے تو ان کی شخصیت کی دل گیری اور ان کے افکار کی بلندی کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ محمد علی کی شخصیت انسانیت، حب الوطنی، اور آزادیٔ فکر سے بنی تھی، ان کی سیاسی زندگی کے اہم کارناموں کا سرسری جائزہ بھی جو تفصیل چاہتا ہے، وہ ایک مضمون میں ممکن نہیں، یہاں صرف چند اہم واقعات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرا کر آپ سے رخصت چاہوں گا۔

مولانا محمد علی کے ان خطوط سے جو گوکھلے کے نام سنہ ۱۹۰۸ء اور سنہ ۱۹۱۰ء میں لکھے گئے ہیں، یہ حقیقت پوری طرح آشکارا ہو جاتی ہے کہ وہ گوکھلے کے ذریعہ مسلم گروہ کو قومی سیاست کے میدان میں لانے کے لیے بے چین تھے، بعض اوقات گوکھلے سے کہتے تھے، کہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش ضروری ہے، ایک خط میں لکھتے ہیں۔

Do'nt you think that an effort should be madC to understand the Mohammadan point of View .

(Shan Muhammad unpublishedletters of Ali Brothers Delhi 1979)

اسی طرح کے افکار و نظریات کو لے کر وہ کلکتہ پہونچے۔

کلکتہ بجا طور پر فخر کر سکتا ہے کہ ہندی مسلمانوں کے دو عظیم الشان جریدے، جنھوں نے تحریک آزادی میں شاندار رول ادا کیا ہے، یعنی الہلال اور کامریڈ اسی سرزمین سے نمودار ہوئے تھے، یہاں سے آزادی کی آواز بلند کی گئی تھی، ۱۴ جنوری سنہ ۱۹۱۱ء کو کامریڈ کا پہلا پرچہ مولانا محمد علی کے کلکتہ میں قدم رکھنے کے دس دن بعد منظر عام پر آگیا تھا، ۲۳ مئی سنہ ۱۹۲۳ء کے ہمدرد میں کامریڈ کے متعلق لکھتے ہیں،

"بے جا نہ ہوگا اگر ہم کہیں کہ یہ کامریڈ ہی کا طفیل تھا کہ سنہ ۱۹۱۱ء سے لے کر سنہ ۱۹۲۱ء تک مسلمانان ہندوستان بتدریج ایک ہی قومی پالیسی پر متفق ہو گئے تھے اور وہ پالیسی خود بتدریج ترقی کرتے کرتے انھیں خلافت کی بقا و احیا اور ہندوستان کی آزادی و سوراج کے مطالبہ تک لے آئی۔"

ترکی، بلقان اور طرابلس کے حالات و حوادث نے مولانا محمد علی کی روح کو تڑپا دیا تھا، جب انھیں معلوم ہوا کہ Bulgarians استنبول سے ۲۵ میل دور رہ گئے ہیں تو انھوں

[illegible]

لکھ کر ان کی رگ رگ میں [illegible] ستمبر ۱۹۱۱ء سے [illegible] ۱۹۱۲ء [illegible]

جو مضامین The Last Fight of the Turks

The Sacrifice، The Crescent and the Cross کے عنوان سے

لکھے ہیں ان سے مسلمانوں کے جذبات میں ایک ہلچل مچ گئی۔ یہی زمانہ تھا جب اقبال بارگاہ

رسالت میں ایک آبگینہ لے کر حاضر ہوئے تھے۔ ؎

جھلکتی ہے تیری امت کی آبرو اس میں　　　طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

مولانا محمد علی کا پیمانۂ دل خون ہو چکا تھا۔ مارچ ۱۹۱۳ء کو مضمون نے انجمن خدام کعبہ کی بنیاد ڈالی اور ان کی سرگرمیوں

کا نیا دور شروع ہوا۔ ترکی کے اعلان جنگ کے بعد مولانا محمد علی نے ایک مضمون Choice of The Turks (یعنی ترکوں کا انتخاب) لکھا اور برطانوی وزارت خارجہ کی نیندیں حرام

کر دیں۔ مدت تک رام پور، مہرولی، دہلی، چھندواڑہ، بیتول کے جیل خانوں میں رہے اور عزیمت

وحق گوئی کی ان سنتوں کو تازہ کر دیا جن پر انسانیت کی بقا کا مدار ہے۔

۱۳ر دسمبر ۱۹۱۹ء کو جلیان والا باغ کے مظالم کا امرت سر کانگریس کے اجلاس میں

اس طرح ذکر کرتے ہیں۔

"جلیان والا باغ میں جو لوگ جمع تھے، گولیاں ان پر نہیں چلائیں، بلکہ ہمارے

دلوں پر گولیاں چلائی ہیں، اس نے ایک نئی آگ بھڑکا دی ہے، جس میں ہندو مسلمانوں

کی ایک نئی قوم پیدا ہو رہی ہے۔ اس نے ایک ایسی نئی قوم پیدا کی ہے، جو انشاء اللہ تعالیٰ

روئے زمین پر کسی سے خوف نہیں کھائے گی۔"

مولانا محمد علی کا عقیدہ تھا کہ برطانوی استبداد کے خلاف متحدہ جدوجہد ہندو مسلمان کو

[illegible] ملک سے محبت [illegible] اس لئے [illegible]

"میں کہتا ہوں کہ میرا سب سے اعلیٰ بادشاہ خدا ہے۔ اور خدا نے مجھ کو دیا ہی

مذہب ہی ایسا ہے، جیسا کہ جارج پنجم کو:"

پھر آزادی کی آواز اور بلند ہوتی ہے، اور کہتے ہیں۔

"مجھ کو جیل جانے دو، مسٹر تلک اگر ضرورت ہو تیسری بار جیل خانے بھیج دئے جائیں، مسز اینی بیسنٹ دوبارہ نظر بند کر دی جائیں، بلکہ اس بڑھاپے میں اگر ضرورت ہو تو اپنے ہی بالوں سے پکڑ کر انھیں پھانسی دے دی جائے، لیکن ہندوستان کو آزاد چھوڑ دیجئے، تاکہ آئندہ کوئی شخص کسی ہندوستانی مرد عورت کو نہ کہہ سکے کہ تو پیدائشی غلام ہے۔"

جب ۶ اپریل ۱۹۱۹ء کو رولٹ ایکٹ کے خلاف تقریر میں انھوں نے مہاتما گاندھی کی سیاسی رہبری کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے طوق غلامی کو اتار پھینکنے کا اعلان کیا، جب ترک موالات اور سودیشی کی تحریک کا آغاز ہوا تو محمد علی کی یہ گرجدار آواز فضاؤں میں گونج اٹھی۔

"صلوٰۃ عشق کا وضو خون سے ہوتا ہے، آپ سوراج کے سچے عاشق ہیں تو اس نماز کا وضو کرنے کے لیے اپنی آرام طلبی و تن آسانی کا خون کریں، آپ کے بدن پر جو تن زیب اور ڈوریا ہے، اس کو اتار کر پھینک دیں، یہی چیز ہے، جس کی قیمت سے وہ قوت پیدا ہوتی ہے جس نے امرتسر میں آپ کے بھائیوں کو پیٹ کے بل چلوایا۔ آپ کہتے ہیں کہ کھدر میں گرمی لگتی ہے۔ قرآن کریم میں دوزخ کا ذکر یاد کرو، اور دوزخ کی آگ سے ذرا ڈرو جو اس سے کہیں زیادہ گرم ہے، میں بمبئی میں خواتین سے کہہ آیا ہوں کہ تم گاڑھے کی ساڑی پہننے سے گھبراتی ہو، شاید ایک وقت آئیگا کہ تم کو اپنی کھال اتار کر ملک کے لیے دینی ہوگی۔"

مولانا محمد علی کے [illegible] کی سرفروشی کی ایک [illegible]

چھوٹے [illegible] ایک [illegible] [illegible]

ہی کے اصرار پر سی۔ آر۔ داس نے اپنی پریکٹس ترک کی۔ یکم اپریل سنہ ۱۹۲۱ء کو مولانا محمد علیؒ نے
ایک کروڑ رضاکار تحریک ترک موالات کے لیے اور ایک کروڑ روپے کی تلک میموریل فنڈ
کے لیے اپیل کی (Afzal Iqbal: Life & Times of Mohammed Ali)
(P.290) حقیقت یہ ہے کہ قومی تحریک میں مولانا محمد علیؒ نے جس خلوص، انہماک اور جذبۂ سرفروشی
کے ساتھ شرکت کی اس کو کوئی دیانت دار مورخ فراموش نہیں کر سکتا۔

جب تک کانگریس سے تعلق رہا، نہایت خلوص اور احترام کے ساتھ مہاتما گاندھی کی پیروی
کی، مولانا عبدالماجد دریابادی کا بیان ہے کہ کراچی سے بیجاپور جیل جاتے ہوئے کسی اخبار کے نمائندے
نے تحریک ترک موالات کے متعلق معلوم کیا تو جواب دیا کہ تحریک کا حال تو وہ لوگ بتا سکتے
ہیں، جو باہر ہیں، لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ خود احکام رسولؐ کے بعد، گاندھی جی کے کہنے پر عمل
کرتے ہیں۔ (ذاتی ڈائری ج ۱ ص ۱۰۶)

مولانا ابوالکلام آزاد نے پیغام میں جو مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی ادارت میں کلکتے سے
نکلتا تھا، مولانا محمد علی کی گرفتاری پر ایک پیغام شائع کرایا تھا، اس میں کہا تھا (۲۲ ستمبر سنہ ۱۹۲۱ء)

"ان کی گرفتاری ہمارے لیے کوئی غم نہیں ہے، البتہ ان کی عزت پر رشک ہے،
.... وہ ہم سے بازی لے گئے۔"

اور یہ صحیح تھا، ان کو اپنے جذبات سرفروشی اور عزیمت کی بنا پر اپنے معاصرین پر فوقیت
حاصل ہو گئی تھی۔

وہ کس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کو ساتھ لے کر چلنا چاہتے تھے، اس کا اندازہ ان کی

گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے مولانا محمد علی نے جو تقریر کی تھی، اس کی گونج نہیں کی تعجب ہے کہ ان کے مداحوں کے کہیں چوک ہوئی ہو، لیکن ان کی ایک ایک سطر سے بالیقین قومی، انسان دوستی، حب الوطنی اور سرفروشی مولانا محمد علی کی شخصیت کے جوہر تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ

سالہا گوش جہاں زمزمہ زا خواہد بود　　زیں نوا ہا کہ دریں گنبد گردوں نزد است

بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ مولانا محمد علی جتنے صرور تھے، لیکن ان کا کوئی کارنامہ نہیں ہے۔ یہ تنگ دلوں اور تنگ نظروں کا فیصلہ ہے۔ اس کا جواب پروفیسر رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں یوں دیا جا سکتا ہے کہ مرد غازی کے کارنامہ کا اندازہ مفتوحات کی وسعت، مال غنیمت کی فراوانی، جشن و جلوس کی بہاری و طرب انگیزی، تمغہ اور اسلحہ کی چمک اور جھنکار سے نہیں کیا جاتا، بلکہ اس کا اندازہ کیا جاتا ہے ٹوٹی ہوئی تلوار، بکھری ہوئی زرہ بہتے ہوئے لہو، دہکتی ہوئی روح اور دمکتے ہوئے چہرہ اور ڈوبتے ہوئے سورج سے (گنجہائے گراں مایہ ص ۸)

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت	:-	دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	:-	ماہانہ
نام پرنٹر	:-	سید اقبال احمد
قومیت	:-	ہندوستانی
پتہ	:-	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر	:-	
ایڈیٹر	:-	سید صباح الدین عبد الرحمن
قومیت	:-	ہندوستانی
نام و پتہ مالک رسالہ	:-	دار المصنفین اعظم گڈھ

میں اقبال احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں

اسلامی تمدن میں علم کی روایت اور اس سے متعلق مسائل

از ڈاکٹر نذیر احمد، علی گڑھ،

اسلام میں علم اور علمار کا درجہ نہایت افضل قرار دیا گیا ہے، چنانچہ قرآن کریم و احادیث نبویؐ میں علم کی عظمت اور علما کے بلند مرتبے کے بارے میں تاکید ہے۔

امام محمد غزالی کی احیار العلوم میں پہلی کتاب، کتاب العلم ہے، جس کا پہلا باب، علم تعلم اور تعلیم کے فضائل میں ہے، امام صاحب نے علم کی فضیلت میں قرآن مجید کی متعدد آیات اور حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث نقل کی ہیں، ان میں چند یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ (قرآن ۳/۱۸)

خدا تو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتے اور علم والے لوگ جو انصاف پر قائم ہیں وہ بھی گواہی دیتے ہیں۔

اس آیت میں پہلے خدا کی گواہی ہے، پھر ملائکہ کی اور آخر میں اہل علم کی، لیکن ذیل کی آیت میں اہل علم کو دوسرے درجے پر رکھا ہے۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ۔ (قرآن ۱۳/۴۳)

کہہ دو کہ میرے اور تمہارے درمیان خدا اور وہ شخص جس کے پاس کتاب (آسمانی) کا علم ہے گواہ کافی ہے۔

آیت ذیل میں اللہ کے ذکر کے بعد راسخین علم کا ذکر آیا ہے۔

وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ — حالانکہ مراد اصلی اللہ کے سوا کوئی نہیں

وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا — جانتا اور جو لوگ علم میں دستگاہ کامل

بِهٖ (قرآن ۳) — رکھتے ہیں کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے

ذیل کی آیت قابل توجہ ہے۔

یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ — جو لوگ تم میں سے ایمان لائے ہیں اور

وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ — جن کو علم عطا کیا گیا ہے، خدا ان کے درجے

(قرآن ۵۸) — بلند کرتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ علماء مومنوں سے سات سو درجہ آگے ہیں، اور ایک درجے سے دوسرے درجے تک پانچ سو سال کا فاصلہ ہے۔

اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ — خدا سے تو اس کے بندوں میں سے ڈرتے ہی

الْعُلَمٰٓؤُا۔ (قرآن ۳۵) — ہیں جو صاحب علم ہیں۔

مویدبن محمد جاجرمی مترجم فارسی احیاء فرماتے ہیں، عربی میں انما کا تقاضا حصر ہے پس اس آیت کا مقتضی یہ ہے کہ خشیت سوائے علماء کے کسی اور میں پائی ہی نہیں جا سکتی۔

قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ — ایک شخص جس کو کتاب الہٰی کا علم تھا کہنے

اَنَا اٰتِیْکَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْکَ — لگا کہ میں آپ کی آنکھ جھپکنے سے پہلے پہلے

طَرْفُکَ (قرآن ۲۷) — اسے آپ کے پاس حاضر کئے دیتا ہوں

دراصل اتنی پھرتی سے (یعنی پلک جھپکنے سے قبل) لانے کا موجب صرف اس کا علم تھا۔

وَتِلْکَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا — اور ہم یہ مثالیں لوگوں کے (سمجھانے)

[illegible]	کے لئے بیان کرتے ہیں مگر ان کو اہل
(قرآن [illegible])	دانش ہی سمجھتے ہیں۔

مثالیں تو عمومی طور پر تمام لوگوں کے لئے ہیں، لیکن اس کے صحیح مفہوم و مقصود کا ادراک علماء کے لئے مخصوص ہے۔

وَلَوْ رَدُّوْهُ إِلَى الرَّسُوْلِ وَإِلَى أُوْلِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهُ مِنْهُمْ۔ (قرآن [illegible])

اور اگر یہ لوگ اس کو رسول کے اور جو ان میں ایسے امور کو سمجھتے ہیں، ان کے حوالے کر دیتے تو اس کو وہ حضرات تو پہچان ہی لیتے جو ان میں اس کی تحقیق کر لیا کرتے۔

واقعات کے حکم کا استنباط علماء سے متعلق ہے، خدائے عز و جل کے حکم کے بیان میں ان کا مرتبہ انبیاء علیہم السلام سے مل گیا ہے۔

اب چند احادیث ملاحظہ ہوں۔

اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ — علماء انبیاء کے وارث ہیں۔

جس طرح کوئی مرتبہ پیغمبری کے برابر نہیں، اسی طرح کوئی درجہ وراثت پیغمبری سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔

اَلْإِيْمَانُ عُرْيَانٌ فَلِبَاسُهُ التَّقْوٰى وَزِيْنَتُهُ الْحَيَاءُ وَثَمَرَتُهُ الْعِلْمُ

ایمان برہنہ ہے، پرہیزگاری اس کا لباس اور شرم آرائش، اور علم اس کا ثمرہ ہے۔

انسانیت کا کمال انکشاف حقائق پر موقوف ہے۔

أَقْرَبُ النَّاسِ مِنْ دَرَجَةِ النُّبُوَّةِ أَهْلُ الْعِلْمِ وَالْجِهَادِ۔

لوگوں میں نبوت کے درجے سے زیادہ قریب اہل علم اور اصحاب جہاد ہیں۔

لَمَوْتُ قَبِيلَةٍ أَيْسَرُ مِنْ	[illegible]
مَوْتِ الْعَالِمِ۔	زیادہ سخت ہے۔
يُوزَنُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِدَادُ	قیامت کے دن علما کے قلم کی سیاہی
الْعُلَمَاءِ وَدَمُ الشُّهَدَاءِ وَفِي	اور شہدا کے خون تولے جائیں گے
رِوَايَةٍ فَيَرْجَحُ مِدَادُ الْعُلَمَاءِ	دوسری روایت میں ہے [illegible]
عَلَى دَمِ الشُّهَدَاءِ	میں علما کے قلم کی سیاہی کو شہید کے خون پر
فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِي	عالم کو عابد پر ویسی فضیلت ہے جیسے
عَلَى أَدْنَى رَجُلٍ مِنْ أَصْحَابِي۔	میرے اصحاب میں سے عام آدمی پر
فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِ	عالم کی عابد پر ویسی فضیلت ہے جیسے چودھویں
الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ عَلَى سَائِرِ	کے چاند کو سارے ستاروں پر۔
الْكَوَاكِبِ۔	
فَضْلُ الْمُؤْمِنِ الْعَالِمِ عَلَى الْمُؤْمِنِ	علم والے مومن کو عبادت گزار مومن پر
الْعَابِدِ سَبْعُونَ دَرَجَةً	ستر درجہ فضیلت حاصل ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے، عالم اور عابد میں ستر درجہ کا فرق ہے، اور دو درجہ کے درمیان کی مسافت ستر سال گھوڑے کی دوڑ کی مسافت کے برابر ہے۔

ایک حدیث میں ہے، تھوڑا سا عمل جو علم پر مبنی ہے، بہت ہے، اور بہت سا عمل جس کی بنیاد نادانی اور جہل پر ہے، وہ بے فائدہ ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ علم مال سے بہتر ہے، اس لئے علم تیرا نگہبان ہے، اور مال کی تو نگرانی کرتا ہے، علم حاکم ہے اور مال محکوم، مال خرچ کرنے سے کم ہو جاتا ہے اور علم بڑھتا ہے۔

علم کی فضیلت میں بزرگوں کے بہت سے اقوال ہیں، مثلاً فتح موصلی نے ایک
بار فرمایا کہ اگر بیمار کو کھانا پینا، دوا دارو نہ دی جائے تو وہ مرے گا یا نہیں، لوگوں نے
کہا کہ مر جائے گا، اسی طرح اگر دل کو تین روز علم و حکمت کی غذا نہ دی جائے تو مر جائے گا۔
اور یہ قول سچ ہے کہ علم و حکمت دل کی غذا ہے، اور اس سے ہی زندہ رہتا ہے، جیسے
غذا بدن کے لئے ضروری ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ میرے نزدیک تھوڑی دیر رات کے علمی مذاکرات تمام
رات کی عبادت سے بہتر ہیں، اسی طرح کا قول حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت احمدؒ بن حنبل
کا بھی ہے۔

"زبیر ابو بکر نے کہا ہے کہ میرے والد نے عراق میں مجھے خط لکھا کہ تحصیل علم میں مشغول
ہو جاؤ، اس لئے کہ درویشی کی حالت میں علم مال ہے، اور تونگری میں جمال حضرت
لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی کہ علما کی صحبت میں بیٹھا کر، اللہ تعالیٰ دلوں کو
حکمت کے نور سے ایسا ہی زندہ کرتا ہے جس طرح بارش سے زمین، بعض حکما نے
کہا ہے کہ جب عالم کا انتقال ہوتا ہے تو چڑیا فضا میں، اور مچھلیاں پانی میں اس کے لئے
روتی ہیں، اگرچہ اس کا چہرہ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے لیکن اس کا ذکر دلوں سے
ختم نہیں ہوتا"

غرض اسلام میں علم کی اتنی فضیلت ہے کہ اس کے برابر کسی اور عبادت کا درجہ نہیں اللہ تعالیٰ
نے آدم علیہ السلام کو جب پیدا کیا تو انھیں ساری اشیاء کا علم دیا، پھر مسابقے کی ایک محفل قائم کی
قرآن عزیز میں ہے، اور اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کر کے سب چیزوں کے اسما کا علم دیا،
پھر وہ چیزیں فرشتوں کے روبرو کر دیں، پھر فرمایا کہ بتاؤ مجھکو ان چیزوں کے اسما مع ان کے آثار

دو مجھے، اگر تم سچے ہو، فرشتوں نے عرض کیا آپ تو پاک ہیں ہم کو کوئی علم نہیں بجز اس کے جو آپ نے دیا ہے، بیشک آپ بڑے علم والے حکمت والے ہیں (کہ جس کے لئے جس قدر مصلحت جانا اسی قدر فہم و علم عطا فرمایا) حق تعالے نے ارشاد فرمایا کہ اے آدم! ان کو چیزوں کے اسما بتلادو، پس جب انھوں نے ان کو بتلا دئے تو حق تعالے نے فرمایا دیکھو میں تم سے کہتا نہ تھا، کہ بیشک میں جانتا ہوں تمام پوشیدہ چیزوں آسمانوں اور زمین کی اور جانتا ہوں جس بات کو تم ظاہر کرتے ہو اور جس بات کو دل میں رکھتے ہو، اور جس وقت حکم دیا ہم نے فرشتوں کو کہ سجدے میں گر جاؤ آدم کے سامنے سو سب سجدے میں گر پڑے بجز ابلیس کے، اس نے کہنا نہ مانا اور غرور میں آگیا، اور ہو گیا کافروں میں سے۔

اس سلسلے میں دو امر قابل ذکر ہیں، اوّل تو یہ کہ علم کا مرتبہ عبادت سے بڑھ کر ہے، آدم علم کی علامت تھے، اس کے مقابلے میں فرشتے اور جن تھے، جو کثرت عبادت میں ضرب المثل تھے، مگر اس کے باوجود انھیں آدم کے سامنے سجدے کا حکم دیا گیا، اور ابلیس کے انکار پر اسے راندۂ درگاہ کر دیا گیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضرت آدمؑ کا علم اشیا کا علم تھا، کائنات میں جتنی چیزیں تھیں سب کے نام مع ان کے خواص کے حضرت آدمؑ کو سکھا دئے گئے تھے، اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اشیائے کائنات کا علم ایک لحاظ سے علم نبوت میں داخل ہے،

علم کی اتنی اہمیت کے پیش نظر مسلمان ابتداے اسلام ہی سے اسکی طرف بڑے انہماک سے متوجہ ہوئے، ہر مسجد ایک مدرسہ یا تعلیمی درسگاہ ہو گئی، اور دیکھتے دیکھتے لاکھوں کی تعداد میں چھوٹے بڑے مدرسے وجود میں آگئے، گھر گھر علم کا چرچا پھیل گیا، ہر شخص نے اپنے اپنے وسائل کے اعتبار سے تحصیل علم کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی صدی میں سارے اسلامی معاشرے میں علمی برتری کے واضح خطوط نظر آنے لگے، علم عام ہوا، اور اتنا عام ہوا کہ علم کی عمومیت کی ایسی مثال اس دور کے

کسی اور معاشرے میں نہیں تھی۔ اس کے متعدد مثبت نتائج پیدا ہوئے۔ مثلاً

۱۔ بڑے بڑے مدرسے قائم ہوئے (۲) کتابخانوں کی تشکیل ہوئی (۳) شرعی مطالعات بھی علوم کے زمرے میں شامل ہوئے (۴) لاکھوں کتابیں لکھی گئیں، خطاطی کا فن وجود میں آیا اور ہزاروں نامور خطاط پیدا ہوئے (۵) ایسے علماء و فضلا کثرت سے نمودار ہوئے جن کے کارنامے رہتی دنیا تک احترام کی نظر سے دیکھے جائیں گے۔

ویسے اسلامی معاشرے میں ہر مسجد مدرسہ ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مسجد مسلمانوں کی دنیوی و دینی زندگی کا مرکز تھا، یہیں نماز ادا کی جاتی، یہیں تعلیم و تعلم کا عمل انجام پذیر ہوتا، یہیں نکاح و طلاق ہوتے، یہیں چھوٹے بڑے مقدمے فیصل ہوتے، یہیں وفود جاتے، یہیں سزا دی جاتی۔ یہ سب اس وجہ تھا کہ اسلام میں دین و دنیا کا امتیاز بے معنی ہے، یہاں دنیا بھی دین ہے، اور دین ساری چیزوں پر محیط ہے۔ دنیا کا دین سے الگ تصور گمراہی ہے۔ اقبال نے سچ کہا ہے کہ جدا ہو دین سے سیاست تو رہ جاتی ہے چنگیزی لیکن یہ باتیں صرف ابتدائی دور کی ہیں جب معاشرے میں ترقی کے آثار نمایاں ہوئے تو ہر ایک امر کے لئے الگ الگ ادارے کی ضرورت محسوس ہونے لگی، اسی کے تحت علمی ضرورت کے لئے بڑے بڑے مدرسے قائم ہونے شروع ہوئے، لیکن واضح ہے کہ یہ عمل کئی صدی بعد شروع ہوا۔ اور اس کا نقطۂ عروج مدارس نظامیہ کا قیام ہے۔ ان کے قیام میں نظام الملک طوسی وزیر متوفی ۴۸۵ھ کا بڑا دخل ہے، بلکہ ابن خلکان کا قول ہے کہ اسے مدارس اسلامیہ کا بانی سمجھنا چاہئے۔ سبکی نے طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۱۳۷ میں لکھا ہے۔

"نظام الملک نے بلخ، نیشاپور، ہرات، اصفہان، بصرہ، مرو، آمل، موصل میں مدرسوں کی بنیاد ڈالی، ہمارے استاد ذہبی نے نظام الدین کو اسلامی مدرسوں کا

بانی قرار دیا ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ نیشاپور میں نظام الملک کی پیدائش سے قبل مدرسہ بیہقیہ موجود تھا۔ اسی شہر میں ایک اور مدرسہ سعدیہ نام کا تھا، اس کی بنیاد سلطان محمود کے بھائی امیر نصر بن سبکتگین نے ڈالی تھی۔ نیشاپور ہی میں ایک تیسرا مدرسہ تھا جس کا بانی ابو سعید اسماعیل بن علی المثنی استرآبادی تھا۔ چوتھا مدرسہ استاد ابو اسحاق اسفرائینی کا بنوایا ہوا تھا، اور ابو اسحاق کے حال میں لکھا ہے کہ اس کے پہلے اس درجے کا کوئی مدرسہ نہ تھا، اس سے واضح ہے کہ اسفرائینی سے قبل اس شہر میں مدرسے موجود تھے۔ البتہ نظام الملک پہلا شخص ہے جس نے مدرسے کے طالب علموں کے لئے راتبہ مقرر کیا تھا۔"

مدرسہ بیہقیہ کے بانی، امام ابو الحسن محمد بن شعیب البیہقی شافعی فقیہ متوفی سنہ ۳۲۴ھ، اور اسعد بن مسعود عتبی نیشاپوری بھی اس مدرسے میں رہ چکے تھے، امام ابو الحسن علی بن حسین بیہقی کچھ دنوں اسی مدرسے میں درس دے چکے تھے، اسی مدرسے میں امام الحرمین ابو المعالی عبد الملک ابن عبد اللہ جوینی (م ۴۷۸)، استاد امام غزالی، ابو القاسم اسکاف اسفرائینی سے اصول سیکھتے تھے۔

نظام الملک نے نیشاپور میں ایک مدرسہ امام الحرمین ابو المعالی عبد الملک بن عبد اللہ جوینی (م ۴۷۸) کے لیے کھلوایا تھا۔ اس میں امام الحرمین نے تیس سال درس دیے۔ درس و تدریس کے علاوہ وعظ و خطابہ و مجلس ذکر بھی ان ہی کے ذمے تھی۔ لکھتے ہیں کہ روزانہ تین سو آدمی ان کے درس میں شامل ہوتے، اور شامل ہونے والوں میں اکثر علما اور وزرا و صدور کے بیٹے بھی تھے۔ امام محمد غزالی (م ۵۰۵) اس مدرسے کے فارغ التحصیل تھے۔ فارسی کا مشہور شاعر انوری ابیوردی (م ۵۸۳) نے طوس کے مدرسے میں تعلیم حاصل کی تھی۔

نظامیہ بغداد کی بنیاد ۴۵۹ھ میں پڑی۔ اس مدرسے نے اسلامی علوم کی جیسی خدمت کی ہے
کم مدرسوں کے نصیب میں شاندار کام انجام دیا ہوگا۔ ابن جبیر اندلسی ۵۸۰ھ میں بغداد آیا تھا،
اس نے اس مدرسے کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔ ۷۲۷ھ میں ابن بطوطہ یہاں آیا، اور اس نے
اس کی تعریف کی، غرض تمام ممالک اسلامیہ میں مدرسۂ نظامیہ نے بے مثال علمی خدمات انجام
دیں، نظامیہ بلخ میں رشید الدین وطواط (م ۵۷۳ھ) نے آدم بن اسد الہروی سے جو اس زمانے
کے مشہور محدث و ادیب تھے، علوم کی تحصیل کی تھی، اصفہان کے مدرسے سے جو صدر الدین خجندی
(م ۵۵۲ھ) کے نام پر صدریہ کہلاتا تھا، پانچویں اور چھٹی صدی کے سینکڑوں علما و فضلا نکلے
ہیں، مرو کے مدرسۂ نظامیہ کا ذکر ابوالحسن بیہقی نے اپنی کتاب جوامع احکام النجوم میں کیا ہے۔
ہرات کا مدرسۂ نظامیہ نویں صدی ہجری تک قائم تھا، فارسی کے مشہور شاعر و ادیب مولانا
عبدالرحمٰن جامی اسی مدرسے کے فارغ التحصیل تھے۔

مدارس نظامیہ کی تقلید میں سارے ایران اور ماوراء النہر کے علاقے میں متعدد مدارس
کھلے، ان میں ملک شاہ سلجوقی (م ۴۸۵ھ) کا مدرسہ محلۂ کران اصفہان قابل ذکر ہے، جو
شافعیہ اور حنفیہ دونوں کے لیے وقف تھا، نیشاپور میں مدرسۂ خاتون مہد عراق کی بنیاد پڑی،
اس میں ایک بڑا کتب خانہ تھا، اس میں ابوالفضل بیہقی کی تاریخ کے چند مجلد تھے، واضح رہے
کہ اب اس تاریخ کے کچھ ہی مجلد باقی ہیں، جو تاریخ مسعودی کے نام سے ایک بار ہندوستان
میں اور دو بار ایران سے شائع ہو چکی ہے، مرو شاہجہاں کا مدرسہ خصوصیت سے قابل
ذکر ہے، اس میں سمعانی (م ۵۶۲ھ) نے کچھ دنوں درس دیا، شمس الائمہ ابوالقاسم اسماعیل بن
حسن بیہقی (م ۴۰۲ھ) کاشغر کے ایک مدرسے میں درس دیتے تھے۔ یاقوت حموی ساتویں صدی
کے آغاز میں ایک مدرسے کا ذکر کرتا ہے جو عمید ابو منصور متوفی (م ۴۹۴ھ) کا بنوایا تھا۔ ہمدان میں

[illegible] نے ایک مدرسہ تعمیر کرایا تھا جس کے لیے مرو رُوذی مؤلف راحۃ الصدور کے خالو ابو الفضل احمد بن علی راوندی کو طلب کیا گیا تھا، عماد الدین کاتب نے اپنی کتاب [illegible] میں لکھا ہے کہ ہمیں کے ایک مدرسے میں جو جمال الدین خادم جاندار کا بنوایا ہوا تھا، سلطان مسعود ابن محمد بن ملک شاہ (م۔ ۵۴۷ھ) دفن ہوا۔ اس مدرسے کا ذکر رشید الدین فضل اللہ نے بھی جامع التواریخ میں کیا ہے۔

نوشیروان خالد وزیر عباسیان (م۔ ۵۳۲ھ) جس کے نام پر حریری نے مقامات لکھے ہیں، اس نے کاشان میں ایک بڑا مدرسہ تعمیر کرایا، اس میں بہت سی کتابیں وقف کیں، ۶۲۲ میں وہ مدرسہ اور کتاب خانہ دونوں باقی تھے، لیکن ۶۴۴ میں تجارب السلف کے مؤلف کے بقول وہ برباد ہو چکے۔ ابو جعفر علاء الدولہ کالیجار نے ۴۳۵ میں یزد میں ایک عالی شان مدرسہ قائم کیا، وہ اسی میں مدفون ہے، نظامیۂ بغداد کے بعد متعدد اہم مراکز بغداد میں قائم ہوئے جن میں بلطاسیہ خصوصیت سے قابل ذکر ہے، اس میں ایک بڑا کتاب خانہ تھا، جس کی فہرست ۳۴۰ جلدوں میں تھی، اس میں پچاس حصے اور چار ہزار کاو تر تھے، آخر میں مدرسۂ نظامیہ کے جواب میں ۶۲۵ھ میں مدرسہ مستنصریہ کی بنیاد المستنصر باللہ (۶۲۳ - ۶۴۰ھ) کے حکم سے پڑی، ۲ سال تک اس پر کام ہوتا رہا، اس کے ساتھ ایک بڑا کتب خانہ تھا، ڈیڑھ ہزار حمال اس کی کتابوں کے منتقل کرنے پر مامور تھے، ضیاء الدین احمد خازن کتاب خانۂ خلیفہ اور ان کے والد شیخ عبد العزیز نے فنی اعتبار سے کتابوں کی فہرست تیار کی، اس سے کتابوں کا حصول آسان ہوگیا۔

اسلامی تمدن میں مدرسے اور کتاب خانے کی اہمیت اس وجہ سے ہوئی کہ اس تمدن میں علم کو جب یہ بالادستی حاصل تھی اسی کے نتیجے میں ہزاروں اور لاکھوں مدرسے اسلامی ممالک میں وجود میں آئے، اسی کے ساتھ کتاب خانوں کی بھی تشکیل ہوئی، بادشاہوں سے لیکر عام آدمیوں تک

کو کتاب اور کتاب خانوں سے دلچسپی تھی، چنانچہ بغداد، رے، بخارا، سمرقند وغیرہ میں بادشاہوں اور امیروں کی طرف سے شاہی کتاب خانے وجود میں آئے، مغرب میں اندلس میں خلفائے اموی نے کتاب خانے جمع کئے، مصر میں فاطمی خلفا بھی کتاب خانوں کے جمع کرنے میں بہت پیش پیش تھے، لکھتے ہیں اندلس کے فرماں روا الحکم (م - ۳۶۶) کا کتاب خانہ اتنا عظیم تھا کہ اس کی فہرست ۴۴ جز میں تھی اور ہر جز ۵۰ صفحے پر مشتمل تھا، اس میں ۴ لاکھ کتابیں بتائی جاتی ہیں، اسی طرح فاطمی خلفا کے زمانے میں قاہرہ میں جو کتب خانہ تھا اس میں سولہ لاکھ مخطوطات تھے، اس میں محض علوم سے متعلق ۱۸ ہزار مخطوطے تھے، بغداد میں ہارون کے زمانہ میں بیت الحکمۃ کا کتاب خانہ سب سے اہم کتاب خانہ بن گیا تھا، ابن ندیم مولف الفہرست (م - ۳۸۵) نے اس کتاب خانہ کی توصیف کی ہے، یہ مرکز علمیہ تاتار ۶۵۶ھ تک پورے شباب پر تھا، عضد الدولہ دیلمی کا کتاب خانہ شیراز میں نہایت معروف تھا، مقدسی نے اس کو دیکھا تھا، اور اس کی تعریف کی ہے، آل بویہ کے وزیر ابوالفضل بن عمید کا کتب خانہ انواع و اقسام کی کتابوں سے مملو تھا، مشہور مورخ و ادیب ابو علی بن مسکویہ ان کا خازن تھا۔ ابن عمید کا شاگرد اور جانشین صاحب کافی اسماعیل بن عباد (م ۳۸۵) تھا، اس نے ایک عالی شان کتاب خانہ جمع کیا تھا، نوح بن منصور سامانی نے اس کو وزارت کا عہدہ سپرد کرنا چاہا تو اس نے اس بنا پر عذر کیا کہ وہ اپنا سامان منتقل نہیں کر سکتا خصوصاً کتب خانہ جو چار سو اونٹوں سے زیادہ کے بوجھ کی کتابوں کو حاوی تھا۔

ابو نصر شاہ پور بن اردشیر وزیر صمصام الدولہ و بہاء الدولہ دیلمی نے بغداد میں دار العلم کی بنیاد ڈالی اس کے ساتھ ایک عظیم کتاب خانہ تھا، جو سلاجقہ کے غلبہ تک دائر تھا، عضد الدولہ دیلمی کے ایک امیر نے رامہرمز میں ایک کتاب خانہ اور دوسرا البصرہ میں قائم کیا، رامہرمز کا کتاب خانہ معتزلی مذہب کے لئے خصوصیت سے وقف تھا، بخارا میں سامانی سلاطین نے بڑے بڑے

کتب خانے [illegible] گئے، جو علم کے مرکز تھے، نباتات [illegible]
کے بعض بادشاہ کتاب خانے میں بہت صرف کرتے تھے، ہر ایک [illegible]
کی کتاب کے لئے الگ الگ کمرے تھے، اس میں ایسی ایسی کتابیں تھیں کہ اکثر علما نے نام
بھی نہ سنا ہوگا۔ اس کتب خانہ میں جس سے ابن سینا نے استفادہ کیا تھا کچھ دنوں بعد آگ لگ گئی۔
یاقوت حموی جو حملۂ تاتار سے قبل خراسان اور ماوراءالنہر میں رہ چکا تھا، لکھتا ہے کہ مرو میں بارہ کتاب خانے
تھے، ہر ایک میں تقریباً بارہ ہزار مجلدات تھیں، یاقوت کا گھر بھی کتابوں سے خالی نہیں رہا۔

علمی مراکز، کتاب خانے، مدرسے وغیرہ کی تعمیر و تشکیل میں بادشاہ، وزیر، امیر، علماء و فضلا
سب کی کوشش کو دخل رہا ہے، اسلامی تمدن کی یہ خصوصیت نہایت درجہ قابل دید ہے کہ علما و فضلا
قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے، ان میں اکثر وزارت کے عہدۂ جلیلہ پر فائز بھی ہوئے جیسے ابن عمید، صاحب
ابن عباد، مہلبی، شاپور بن اردشیر، ابن سعدان ابو علی سینا، جیہانی، بلعمی، ابوالحسن سہیلی، نظام الملک طوسی
وغیرہ، اسی قدردانی کا نتیجہ علمی برتری کی شکل میں رونما ہوا، اور یہی علمی بالادستی اس معاشرے کی سب سے
ممتاز خصوصیت ہے، اسی کی وجہ سے علمی ترقی ہوئی، اور اسی بنا پر علمی مراکز، مدرسے، کتاب خانے قائم
ہوئے، اتنے کہ دوسرے معاشرے میں ان کا ذکر مذکور نہیں۔

مسلمانوں کے غلبے کے دور میں نہ صرف علوم میں ترقی ہوئی، بلکہ نئے نئے علوم ایجاد ہوئے، قرآن
آسمانی صحیفہ ہے، اس کے مطالعے سے عوام اور خواص دونوں کو یکساں دلچسپی رہی ہے، اس مطالعے نے
ایسی شکلیں اختیار کیں کہ ان سے کئی علوم ایجاد ہوئے، ان میں ممتاز ترین علم تجوید و قرأت، اور علم تفسیر ہے،
اور آخر الذکر تو ایسا جامع ہے کہ اس میں کئی اور علوم شامل ہیں۔

علم قرأۃ ان تمام اختلافات سے بحث کرتا ہے، جن کا تعلق قرآن کے الفاظ اور [illegible]
کی کیفیات اور ادائیگی سے ہے، اور اس کے پیچھے وہ جذبہ کار فرما ہے کہ کلام اللہ تحریف کی زد [illegible]

تجوید سے ... رفتہ رفتہ اس کے اصول وضوابط مقرر ہوئے، اور وہ ایک مخصوص علم ہوگیا، رسول اللہ سے مخصوص ہے۔ ابتدا میں حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، اس کے بعد قراء سبعہ کا نام آتا ہے، اور پھر تین اور قراء جنہوں نے اس فن میں بڑی ناموری حاصل کی۔

ان دس قراء کے نام حسب ذیل ہیں۔

نافع بن عبدالرحمٰن بن ابی نعیم (م ۱۶۹) عبداللہ بن کثیر (م ۱۲۰) ابوعمرو بن العلا (م ۱۵۴) عبداللہ بن عامر (م ۱۱۸) عاصم بن ابی النجود (م ۱۲۹) حمزہ بن حبیب (م ۱۵۴) ابوالحسن علی بن حمزہ (م ۱۸۹) ابومحمد یعقوب بن اسحاق الحضرمی (م ۲۰۵) ابوجعفر مخزومی (م ۱۳۲ھ) ابومحمد خلف بن ہشام البزاز (م ۲۲۹)

کسی مذہبی صحیفے کے پڑھنے کے واسطے ایک اہم علم وجود میں آجانا، ایسی نادر وانوکھی بات ہے جس کی مثال تاریخ بشر میں کہیں نہیں ملتی۔

مطالعات قرآن سے متعلق دوسرا علم تفسیر ہے، یہ علم وہ ہے جس میں قرآن کے معانی کے حقائق نحو، صرف، لغت، تاریخ، تہذیب وغیرہ کی روشنی میں واضح کیے جائیں، اس طرح کے مطالعے کا مقصد منشائے الٰہی کی جستجو ہے، اس کے خصوصیات موضوعات اسباب نزول وترتیب نزول، توضیح اشارات ومجملات، تمیز مابین ناسخ ومنسوخ، محکم ومتشابہ، تفصیل قصص وحکایات وغیرہ ہیں۔

ابتدا میں صحابہ قرآن کے مطالب کی تفسیر وتوضیح کرتے رہے، لیکن یہ روایت کتبی سے زیادہ شفاہی رہی، ان ابتدائی مفسرین میں خلفائے اربعہ کے علاوہ حضرت ابن مسعودؓ، ابی بن کعبؓ، زید بن ثابتؓ، عبداللہؓ بن زبیر، انس بن مالکؓ، ابوہریرہؓ، جابرؓ بن عبداللہ، عمرو بنؓ عاص،

ہر جزو کی تشریح خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ بعد میں ہزاروں مفسر پیدا ہوئے اور مختلف طرز پر

ہزاروں تفسیریں لکھی گئیں۔ یہاں تک کہ تیسری صدی میں محمد بن جریر طبری عالم وجود میں آئے جن کی

تفسیر جامع البیان فی تفسیر القرآن" جو اصلاً ۳۰ مجلدات پر مشتمل تھی، تیس جلدوں میں شائع ہوئی۔

اسی کا فارسی ترجمہ یا تلخیص سامانی امیر منصور بن نوح (۳۵۰ - ۳۶۵ھ) کے مشورہ سے ۷ جلدوں

میں ہوا۔[1]

مسلمانوں کی اپنے آقا سے غیر معمولی محبت کے نتیجے میں ایک حیرت انگیز علم وجود میں آیا جس کو علم حدیث کہتے ہیں۔ اس علم کے واسطے سے پیغمبر علیہ السلام کے اقوال و افعال کی تحقیق و تدقیق ہوتی ہے۔ اس کے دو بڑی قسمیں ہیں، علمِ روایۃ الحدیث، اور علمِ درایۃ الحدیث، اس علم کے مختلف شعبے ہیں، اور ہر ایک بمنزلہ ایک علم کے ہے۔ جیسے علم غریب الحدیث، علم اسباب ورود الاحادیث۔ علم تاویل اقوال النبی، علم غرائب لغات الحدیث، علم تلفیق الاحادیث، علم رواۃ الاحادیث، علم التطرق الاسانید وغیرہ۔

محدثین نے حضور سرور کائنات کے اقوال کے جمع کرنے، ضعیف اور قوی کے درمیان حد فاصل کھینچنے اور انھیں رطب و یابس سے پاک کرنے میں جو محیر العقول کارنامے انجام دیے دنیا کی تاریخ اس کی مثال سے خالی ہے۔ ایک ایک محدث کو احادیث کے فراہم کرنے میں ہزاروں میل کا سفر کرنا پڑا، پھر لاکھوں احادیث میں سے اعلیٰ معیار پر جانچنے کے بعد ایک مجموعہ تیار ہوا، اور ہر حدیث کے درج کرنے میں اسناد پر انتہائی غور و فکر کے علاوہ تقویٰ کو عمل میں لایا گیا، امام بخاری نے ایک ہزار مشایخ سے مل کر تقریباً چھ لاکھ حدیثیں ۱۶ برس کی مدت میں ایران، عراق، شام، عرب، مصر کی ہزاروں میل کی مسافت طے کرنے کے بعد فراہم کیں، ان میں صحیح بخاری تقریباً سات ہزار دو سو ستر

---

[1] دانشگاہ تہران سے (۱۳۳۹ تا ۱۳۴۴) نسخہ حبیب یغمائی کی تصحیح سے ۷ جلدوں میں شائع ہوا ہے۔

[illegible] ...... امام بخاری کا ہر حدیث کے ضبط تحریر میں لانے سے قبل وضو کرنا، غسل کرنا اور دو رکعت نماز ادا کرنا۔

علم حدیث کے فن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اقوال کی پرکھ کے جو معیار اس وقت قائم کیے گئے ان میں ہم نے دیکھا کہ اقوال پر کس قدر جانچ پڑتال کی گئی ہے جس میں کسی آدمی کی شہادت اور روایت کو اصول بنایا گیا۔ اس میں ہم عصر شہادت کی اہمیت کے باوجود شاہد یا راوی کے اوصاف کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس کا واضح نتیجہ یہ ہے کہ تاریخ بشر میں کوئی واقعہ اتنی شہادتوں اور روایتوں سے نقل نہیں ہوا ہے، جتنی ایک چھوٹی حدیث کے سلسلہ کی شہادتیں ہیں، تہذیب عالم میں اقوال کے جانچنے اور پرکھنے کی اتنی بڑی کوشش کا پتا نہیں چلتا، مسلمانوں میں اس سلسلے میں جو بلند اصول مرتب ہوئے، اور جن پر ہزارہا اقوال جانچے گئے، ان اصول پر دوسرے تمدن کے اقوال کا ذکر تو کیا، ان کی ممتاز ترین شخصیات پوری نہیں اترتیں، اگر ان اصول و نتائج کی روشنی میں فیصلے صادر کیے جائیں تو اشخاص کے وجود مشکوک ہو جائیں گے اور معاملہ ظن و تخمین سے آگے نہیں بڑھے گا، غرض ایک طرف تو شک و شبہ کی گہری گرد تہذیب بشر کے ہزارہا افراد و اقوال پر چڑھی ہوئی ہو اور دوسری طرف اسلامی معاشرے کے ہزارہا کردار اپنی تاریخیت کی وجہ سے گویا جانے پہچانے فرد معلوم ہوتے ہیں، غالباً اسی تصور کے پیش نظر علامہ اقبال نے کہا تھا۔

گماں آباد ہستی میں یقیں مرد مسلماں کا بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی

مسلمانوں نے علم حدیث پر جتنی توجہ کی اتنی کسی اور علم پر نہیں کی، اور اس کا حق بھی تھا، اس علم میں جتنی محنت، صلاحیت، اخلاص وغیرہ درکار تھا، اتنا کسی علم میں نہ تھا، محدثین کی کوشش بہرحال اس امر پر تھی کہ کوئی غلط یا مشکوک بات حضورؐ کی طرف منسوب نہ ہو جائے، بہرحال یہ حیرت انگیز کام انجام پایا، اور اس سے منجملہ اور فوائد کے دو تین بڑے فائدے ہوئے، اول

یہ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی اور سیرت و شخصیت کے ایک ایک خدوخال نمایاں ہو گئے جن کی بنیاد معتبر ترین ماخذ پر تھی ۔

دوم یہ کہ حضورؐ کی سیرت کے ایک ایک خدوخال کے روشن ہو جانے کے بعد کائنات عالم کی کوئی شخصیت آپ کے پاسنگ نہیں ہوتی، کوئی شخص اپنے والد کے بارے میں اتنے وثوق سے کوئی بات نہیں کہہ سکتا جتنا حضورؐ کے متعلق کہہ سکتا ہے۔ حضورؐ کی زندگی کی یہی تاریخیت غیروں سے بھی اپنا لوہا منوا رہی ہے، یہ صدقہ ہے ہزاروں محدثین کی مخلصانہ اور جان توڑ محنت کا جو احادیث کی جمع آوری میں انکو کرنا پڑی ہیں۔ مجھے وہ دن دور نظر نہیں آتا جب ہزاروں لاکھوں انسان جوق درجوق حضورؐ کی سیرت سے متاثر ہو کر آپ کی غلامی کا دم بھرنے لگیں گے۔

تیسرا فائدہ یہ ہوا کہ اسی کے طفیل میں آج سے سیکڑوں سال پہلے کے ہزاروں افراد کے حالات نہایت مستند ذرائع سے سامنے آگئے ہیں، دنیا کی تاریخ پر یہ محدثین کا بڑا احسان ہے، اس کے بارے تاریخ بشر کی گردن سبکدوش نہیں ہو سکتی۔

اس میں شبہ نہیں کہ قرن اول و دوم میں احادیث کے مختلف مجموعے ممتاز محدثین نے جمع کئے ان محدثین میں ابن جریج (م۔ ۱۵۰) مکہ میں، محمد بن اسحاق (م۔ ۱۵۱)، اور مالک بن انس (م۔ ۱۷۹) مدینہ میں، ربیع بن صبیح (م۔ ۱۶۰) سعید بن عروبہ (م۔ ۱۵۶) حماد بن سلمہ (م۔ ۱۶۷) بصرے میں، سفیان ثوری (م۔ ۱۶۱) کوفے میں، ابن المبارک (م۔ ۱۸۱) نے خراسان میں احادیث کی فراہمی کی کوشش کی لیکن ان مجموعوں میں سے سوائے موطا ابن مالک کے کوئی موجود نہیں تیسری صدی میں احادیث کے سلسلے میں نقد وانتقاد کے طریقے وضع ہوئے، اور احادیث کے درمیان تمیز کرنے کے اصول منضبط ہوئے، رجال حدیث کے بارے میں اطلاعات فراہم ہوئیں، اسی کا نتیجہ صحاح ستہ کا وجود ہے جو حسب ذیل مجموعوں سے عبارت ہیں۔

صحیح بخاری جامع امام محمد بن اسماعیل بخاری (م - ۲۵۶) صحیح مسلم ابوالحسن مسلم بن حجاج
نیشاپوری (م ۲۶۱) سنن ابن ماجہ ابو عبداللہ محمد بن یزید قزوینی (م - ۲۷۳) سنن ابو داؤد البصری
(م - ۲۷۵) جامع ترمذی، امام ترمذی (م - ۲۷۹) سنن نسائی، ابو عبدالرحمٰن النسائی
(م - ۳۰۳) اس کے ساتھ امام احمد بن حنبل کی کتاب مسند بھی صدر درجہ قابل توجہ ہے۔

علم فقہ بھی مسلمانوں کی ایجاد ہے، یہ ایسا علم ہے، جو شرع کے عملی احکام سے بحث
کرتا ہے، اس علم کی بنیاد استنباط احکام پر ہے، جو کتاب و سنت سے اخذ کئے جاتے ہیں اس علم
میں اجتہاد درجۂ اول کی حیثیت رکھتا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ فقہ کے مختلف مکتب فکر ہوگئے، اور
ان کے اختلاف نے سیاسی رنگ اختیار کر لیا، جس سے مسلمانوں میں زبردست اختلافات رونما ہوئے
جس سے اسلام کو بہت نقصان پہنچا، سنیوں میں فقہ کے حسب ذیل چار مکاتب فکر ہیں۔
۱۔ حنفی جو حضرت ابو حنیفہؒ (م - ۱۵۰) کے پیرو ہیں (۲) مالکی جو حضرت مالکؒ بن انس
(م - ۱۷۹) کی پیروی کرتے ہیں (۳) شافعی جو حضرت محمد بن ادریس شافعیؒ (م - ۲۰۴) کے
ماننے والے ہیں (۴) حنبلی جو امام احمدؒ بن محمد حنبل (م - ۲۴۱) کے تتبع کرنے والے ہیں، ان
چار بڑے مکاتب کے علاوہ فقہ جعفری پر حضرات شیعہ عمل کرتے ہیں، سنیوں میں بھی سفیان
بن سعید ثوری (م - ۱۶۱) محمد بن جریر طبری (م - ۳۱۰) نے ائمہ اربعہ سے کسی حد تک مختلف مکاتب
فکر کی بنیاد ڈالی، اور ان کے بھی ماننے والے ہوگئے تھے۔

ہندوستان میں خصوصیت سے فقہ میں بہت جزئی اختلافات پیدا ہوئے جن کا نتیجہ اس
لحاظ سے بہت برا ہوا، کہ اس سے مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو زبردست دھکا لگا، لیکن قابل
توجہ یہ بات ہے کہ علم فقہ پر جتنی چھوٹی بڑی کتابیں ملتی ہیں، کسی دوسرے فن میں نہیں ملیں گی اور
عام مسلمانوں کو اس علم سے جتنی دلچسپی رہی ہے، کسی علم سے نہ ہوگی، فقہ پر کتابوں کی تعداد

کہ وہ ذہن تک پہنچ جائے گی، اس سے اسلامی سرمایے میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دوسرے مذاہب میں مذہبی امور کو عملی شکل دینے کے کچھ مروجہ طریقے ہیں، اور ان مذاہب کے ماننے والے اس طریقے پر عمل پیرا ہوتے ہیں، لیکن مروجہ طریقہ علمی درجہ نہیں پا سکتا، اور اسلام میں فقہ نے جیسی علمی شکل اختیار کی، اور اصول و فروع کے تحت سے جو مکاتب فکر پیدا ہوئے، اس کی مثال تہذیب عالم میں نہیں ملے گی، اور فقہ پر جو لٹریچر ہے اس سے سینکڑوں کتاب خانے پُر ہو سکتے ہیں۔

علم کلام وہ علم ہے، جس میں عقائد ایمانی پر عقلی دلائل قائم کئے جاتے ہیں، اس علم کے موضوع مباحثِ مبدا و معاد، توحید، تنزیہ و تجسیم وحدود ایمان و جبر و اختیار و خلق، گویا عقائد کی تحقیق و تدقیق عقلی دلائل سے علم کلام کا اصل موضوع رہا ہے، اسکے نتیجے میں مسلمانوں میں کئی فرقے ہوئے جن میں اشاعرہ، معتزلہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں،

علم کلام پر اتنا مواد موجود ہے کہ وہ کئی ضخیم کتابوں کے لیے کافی ہے، یہ علم بھی خاص مسلمانوں کے درمیان پھیلا، کسی دوسرے مذہب میں اس کا نام نشان نہیں۔

تصوف کو ایران میں بڑی قوت ملی، اور تیسری صدی ہجری سے اس نے علمی شکل اختیار کی، ہزاروں صوفی پیدا ہوئے، انکی وجہ سے اسلامی زندگی میں تصوف کا بہت گہرا اثر ہوا، اس کے متعدد سلاسل ہیں، ہندوستان میں سلاسل چہار گانہ خصوصیت سے مقبول ہوئے، قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ، نقشبندیہ، اسکے سوا سلسلہ فردوسیہ پیدا ہوا، غرض تصوف ایسا علم ہے، جو خالص اسلامی ہے، اور اس میں اتنی وسعت ہے کہ سیکڑوں تنقیدی کتابیں اس موضوع پر لکھی جا سکتی ہیں، یورپ اور امریکہ میں اب یہ موضوع بڑی دلچسپی کا ہو گیا ہے، تصوف کا لٹریچر بہت وافر ہے خصوصیت سے فارسی کے نثری اور شعری ادب کا بہت بڑا حصہ تصوف سے تعلق رکھتا ہے۔

(باقی)

اقبال کی دو نظمیں قرآن کے آئینے میں

از

ی محمد بدیع الزماں، ممبر ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، پھلواری شریف، پٹنہ،

اقبال کے سارے تخیلات "انسان" اور "انسانیت" کے محور پر ہی گردش کرتے ہیں اسی لئے
نے اپنے سارے کلام میں انسان کی فطری خوبیوں اور صلاحیتوں کو اجاگر کرنا اور کوشش پیہم کے
ے تسخیر کائنات میں اپنی خوبیوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر نیابت الٰہی کا فریضہ انجام دیا
ں اپنی شاعری کا مطمح نظر رکھا، ایسے تو یہ باتیں اُن کے سارے کلام میں ملتی ہیں مگر دو خصوصی
ں میں انھوں نے اپنے ان خیالات کو یکجا نظم کیا ہے۔

پہلی نظم "فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں" ہے اور دوسری نظم اس کے تتمہ کے طور پر
بریل" ہی میں اس کے بعد ہی "روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" ہے، دونوں نظموں کا ماخذ
، قرآن مجید کی آیات ہیں جن کو کہیں کہیں تو انھوں نے ہو بہو نظم کیا ہے، اور کہیں کوئی شعر یا
ا کوئی مصرعہ یا پورا بند اُن آیات پر مبنی ہے، پہلی نظم جو درج ذیل ہے، کل پانچ اشعار پر مشتمل ہے

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بے تابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی!

سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن
تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی!

جمال اپنا اگر خواب میں بھی تو دیکھے
ہزار ہوش سے خوشتر تری شکر خوابی!

گراں بہا ہے ترا گریۂ سحرگاہی
اسی سے ہے ترے نخلِ کہن کی شادابی!

تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر ۔۔۔ کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

اس نظم میں اقبال نے انسان کی بے پناہ صلاحیتوں اور تخلیق کائنات اور تخلیق آدم دونوں کے اسرار و رموز کو پانچ ہی اشعار میں سمو کر دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ اس نظم کا یہ شعر

جمال اپنا اگر خواب میں بھی تو دیکھے ۔۔۔ ہزار ہوش سے خوشتر تری شکر خوابی!

درج ذیل آیات کا ترجمان ہے:۔

ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔ (لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ) (سورۃ۔ والتین۔ ۹۵۔ رکوع ۱)

اُس (خدا) نے زمین اور آسمان کو برحق پیدا کیا ہے اور تمہاری صورت بنائی، اور بڑی عمدہ بنائی۔ (وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ) (سورۃ التغابن ۶۴۔ رکوع ۱)

ان آیات میں "بہترین ساخت" اور "تمہاری صورت بنائی اور بڑی عمدہ بنائی" سے مراد انسان کی صرف جسمانی طاقتیں یا ظاہری شبیہ ہی نہیں بلکہ انسان کو ہوش و گوش کا شعور، فکر و فہم اور علم و عقل کی صلاحیتیں، سیرت اور قوت ارادی بھی مراد ہیں۔

دوسری نظم "روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" میں اقبال یہ باور کراتے ہیں کہ حضرت آدمؑ کا جنت سے اخراج ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت تھا، چونکہ خدا کو انسان کو روئے زمین پر خلیفۃ الارض بنانا تھا، اس لئے اسے اس منصب کی عمدہ برآری کیلئے بے پناہ صلاحیتوں سے صرف آراستہ کرنا مقصود نہ تھا، بلکہ اُن صلاحیتوں کو تسخیر کائنات کے کام میں بھی لانا تھا، اس لئے کائنات میں لاکھوں چیزوں کی تخلیق کی گئی، اور اس طرح خدا نے روز اول ہی انسان کا تعلق کائنات سے اور کائنات کا تعلق انسان سے قائم کر دیا، اور انہی دو نکتوں کی اقبال نے دو الگ الگ ان نظموں میں وضاحت کی ہے، اس دوسری نظم میں وہ یہ بتا رہے ہیں

[illegible] ہے جو کلام اقبال [illegible] ہے ہی مگر

[illegible] تمام ساری چیزوں کی تخلیق کی بھی

نظم اس طرح ہے :

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ!
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ!
ایام جدائی کے ستم دیکھ، جفا دیکھ!
بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ!

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبد افلاک، یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں
تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے!
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے!
ناپید ترے بحر تخیل کے کنارے!
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے!
تعمیر خودی کر، اثر آہ رسا دیکھ!

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں!
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں!
جنت تری پنہاں ہے ترے خون جگر میں!
اے پیکر گل کوشش پیہم کی جزا دیکھ!

نالندہ ترے عود کا ہر تار ازل سے!
تو جنس محبت کا خریدار ازل سے!
تو پیر صنم خانۂ اسرار ازل سے!
محنت کش و خونریز و کم آزار ازل سے!
ہے راکب تقدیر جہاں تیری رضا دیکھ!

اس نظم کے مختلف بندوں میں اقبال نے خدا کی پیدا کردہ نعمتوں کا ذکر کیا ہے جیسے

[illegible]

[illegible]

[illegible] "آنکھ کھول" بہت معنی خیز ہیں جو ہو بہو درج ذیل قرآنی آیات سے ماخوذ ہیں:-

"ان سے کہو: زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اسے آنکھیں کھول کر دیکھو۔ اور جو لوگ ایمان لانا ہی نہیں چاہتے ان کے لیے نشانیاں اور تنبیہیں کیا مفید ہو سکتی ہیں۔"

(سورۃ یونس ۱۰۔ رکوع ۱۰)

"کیا ان لوگوں نے کبھی دیکھا ہی نہیں ہے کہ کس طرح اللہ خلق کی ابتدا کرتا ہے، پھر اس کا اعادہ کرتا ہے؟ یقیناً یہ (اعادہ تو) اللہ کے لئے آسان تر ہے، ان سے کہو کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو اس نے کس طرح خلق کی ابتدا کی ہے۔" (سورۃ العنکبوت ۲۹۔ رکوع ۲)

دوسرے بند کا پہلا شعر اور دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ ہو بہو درج ذیل آیات کے ترجمان ہیں، اور ان آیات میں بھی "کھول آنکھ" کی باتیں کہی گئی ہیں:-

"کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمان کی ساری چیزیں تمہارے لئے مسخر کر رکھی ہیں، اور اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں تم پر تمام کر دی ہیں، اس پر حال یہ ہے کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی علم ہو، یا ہدایت، یا کوئی روشنی دکھانے والی کتاب۔" (سورۃ لقمان ۳۱۔ رکوع ۳)

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اس نے وہ سب کچھ تمہارے لئے مسخر کر رکھا ہے، جو زمین میں ہے، اور اس نے کشتی کو قاعدے کا پابند بنایا ہے کہ وہ اس کے حکم سے سمندر میں چلتی ہے۔ اور وہی آسمان کو اس طرح تھامے ہوئے ہے کہ اس کے اذن کے بغیر وہ زمین پر نہیں گر سکتا۔"

(سورۃ الحج ۲۲۔ رکوع ۹)

[illegible]

[illegible]

[illegible] (سورۃ العنکبوت [illegible] رکوع [illegible])

خدا نے آنکھیں کھول کر اپنی نشانیوں کو دیکھنے کی تاکید اس لئے کی ہے تاکہ انسان کو غور و فکر کے بعد یقین ہو جائے کہ اتنی ساری چیزوں کا خالق صرف وہی وحدہٗ لاشریک ہی ہو سکتا ہے، اور دوسرے یہ کہ یہ چیزیں خدا نے عبث نہیں بنائی ہیں۔ انہی حکمتوں کی ترجمانی اقبال نے "کھول آنکھ" میں کی ہے۔

ارشادِ ربانی ہے :-

"ہم نے اس آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان میں ہے بے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنایا ہے، اگر ہم کوئی کھلونا بنانا چاہتے اور بس یہی کچھ ہمیں کرنا تھا تو اپنے ہی پاس سے کر لیتے" (سورۃ الانبیاء ۲۱ - رکوع ۲)

"اس (خدا) نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ستونوں کے جو تم کو نظر آئیں، اس نے زمین میں پہاڑ جما دئے تاکہ وہ تمہیں لے کر ڈھلک نہ جائے۔ اس نے ہر طرح کے جانور زمین میں پھیلائے اور آسمان سے پانی برسایا اور زمین میں قسم قسم کی عمدہ چیزیں اُگا دیں، یہ تو ہے اللہ کی تخلیق" (سورۃ لقمٰن ۳۱ - رکوع ۲)

"اچھا، تو کیا انھوں نے کبھی اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا؟ کس طرح ہم نے اسے بنایا اور آراستہ کیا، اور اس میں کوئی رخنہ نہیں ہے، اور زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں پہاڑ جمائے، اور اس کے اندر ہر طرح کی خوش منظر نباتات اُگا دیں، یہ ساری چیزیں آنکھیں کھولنے اور سبق دینے والی ہیں ہر اس بندے کے لئے جو (حق کی طرف)

[illegible]

"آنکھ کھول" بہت معنی خیز ہیں جو ہو بہو درج ذیل قرآنی آیات سے ماخوذ ہیں۔

"ان سے کہو: زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اسے کھلی آنکھوں سے دیکھو۔ اور جو لوگ ایمان لانا ہی نہیں چاہتے، ان کے لیے نشانیاں اور تنبیہیں کیا مفید ہو سکتی ہیں؟"

(سورۃ یونس ۱۰، رکوع ۱۰)

"کیا ان لوگوں نے کبھی دیکھا ہی نہیں ہے کہ کس طرح اللہ خلق کی ابتدا کرتا ہے، پھر اس کا اعادہ کرتا ہے؟ یقیناً یہ (اعادہ تو) اللہ کے لئے آسان تر ہے، ان سے کہو کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو اس نے کس طرح خلق کی ابتدا کی ہے۔" (سورۃ العنکبوت ۲۹، رکوع ۲)

دوسرے بند کا پہلا شعر اور دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ ہو بہو درج ذیل آیات کے ترجمان ہیں، اور ان آیات میں بھی "کھول آنکھ" کی باتیں کہی گئی ہیں۔

"کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمان کی ساری چیزیں تمہارے لئے مسخر کر رکھی ہیں، اور اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں تم پر تمام کر دی ہیں، اس پر حال یہ ہے کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی علم ہو، یا ہدایت، یا کوئی روشنی دکھانے والی کتاب۔" (سورۃ لقمان ۳۱، رکوع ۳)

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اس نے وہ سب کچھ تمہارے لئے مسخر کر رکھا ہے، جو زمین میں ہے، اور اس نے کشتی کو قاعدے کا پابند بنایا ہے کہ وہ اس کے حکم سے سمندر میں چلتی ہے، اور وہی آسمان کو اس طرح تھامے ہوئے ہے کہ اس کے اذن کے بغیر وہ زمین پر نہیں گر سکتا۔"

(سورۃ الحج ۲۲، رکوع ۹)

[illegible]

[illegible]

[illegible] (سورۃ البقرہ ۲ ۔ رکوع ۲۰)

خدا نے آنکھیں کھول کر اپنی نشانیوں کو دیکھنے کی تاکید اس لئے کی ہے تاکہ انسان کو غور و فکر
کے بعد یقین ہو جائے کہ اتنی ساری چیزوں کا خالق صرف وہی وحدہٗ لاشریک ہی ہو سکتا ہے۔ اور
دوسرے یہ کہ یہ چیزیں خدا نے عبث نہیں بنائی ہیں۔ انہی نکتوں کی ترجمانی اقبال نے "کھول آنکھ"
میں کی ہے۔

ارشادِ ربانی ہے :-

"ہم نے اس آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان میں ہے نرے کھیل کے طور پر
نہیں بنایا ہے، اگر ہم کوئی کھلونا بنانا چاہتے اور بس یہی کچھ ہمیں کرنا تھا تو اپنے ہی پاس
سے کر لیتے۔" (سورۃ الانبیاء ۲۱ ۔ رکوع ۲)

"اس (خدا) نے آسمانوں کو پیدا کیا، بغیر ستونوں کے جو تم کو نظر آئیں، اس نے زمین
میں پہاڑ جما دئے تاکہ وہ تمہیں لے کر ڈھلک نہ جائے۔ اس نے ہر طرح کے جانور زمین میں
پھیلائے اور آسمان سے پانی برسایا اور زمین میں قسم قسم کی عمدہ چیزیں اگا دیں۔ یہ تو ہے اللہ
کی تخلیق۔" (سورۃ لقمٰن ۳۱ ۔ رکوع ۲)

"اچھا، تو کیا انھوں نے کبھی اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا؟ کس طرح ہم نے
اسے بنایا اور آراستہ کیا، اور اس میں کوئی رخنہ نہیں ہے، اور زمین کو ہم نے بچھایا اور
اس میں پہاڑ جمائے، اور اس کے اندر ہر طرح کی خوش منظر نباتات اگا دیں، یہ ساری
چیزیں آنکھیں کھولنے اور سبق دینے والی ہیں ہر اس بندے کے لئے جو (حق کی طرف)

[illegible] ہم نے ایک [illegible] باغ اور

خس کے قطعے اور بنجر علاقے کو سرسبز کرکے جنت پیدا کردی ہے جہاں سے درے ہوئے

خوشے توڑے جاتے ہیں۔ یہ انتظام یہ بندوں کو رزق دینے کا ہے (سورۂ ق۔ حصہ رکوع ۱)

اقبال نے اس نظم کے پہلے بند کے دوسرے شعر کا دوسرا مصرعہ ایام جدائی کے ستم دیکھ جفا دیکھ

اس لیے کہا ہے، چونکہ خدا نے آدم کو نافرمانی کی وجہ سے جنت سے نکالتے وقت یہ کہا تھا کہ

"اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن (آدم اور ابلیس) دشمن ہو اور تمہارے لیے

ایک خاص وقت تک زمین میں جائے قرار اور سامان زینت ہے" — اور فرمایا:

وہیں تم کو جینا اور مرنا ہے، اور اُس میں سے تم کو آخر کار نکالا جائے گا" (سورۂ اعراف رکوع ۲)

یہی ہے ایام جدائی یعنی ایک خاص مدت تک زمین میں جائے قرار۔ اس مصرعہ میں اقبال

نے درج ذیل آیات بھی ذہن نشین کرائی ہے کہ

"اور یہ دنیا کی زندگی کچھ نہیں ہے، مگر ایک کھیل اور دل کا بہلاوا۔ اصل زندگی کا گھر تو

دار آخرت ہے۔ کاش یہ لوگ جانتے" (سورۃ العنکبوت۔ ۲۹ ۔ رکوع ۷)

اور جہاں تک "ایام جدائی" کے "ستم اور جفا" کا سوال ہے ستم یہ ہے کہ "وہیں تم کو جینا اور مرنا ہے"

اور پھر یہ کہ "دنیا کی زندگی کچھ نہیں ہے، مگر ایک کھیل اور دل کا بہلاوا" اور "جفا" یہ ہے کہ "اصل زندگی

کا گھر تو دار آخرت ہے، جہاں نامۂ اعمال کی پرکھ ہوگی۔

اس نظم کے دوسرے بند میں یہ مصرعہ ع "تھی پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں"

درج ذیل آیات پر مبنی ہے:-

"پھر یاد کرو اس موقع کو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ "میں سڑی ہوئی مٹی کے

سوکھے گارے سے ایک بشر پیدا کر رہا ہوں، جب میں اس میں اپنی روح سے کچھ پھونک دوں تو تم

معلوم ہوتا ہے جس وقت ... تمام فرشتوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے:

(سورۃ الحجر ۱۵۔ رکوع ۳)

"ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتدا کی، پھر تمہاری صورت بنائی۔ پھر فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو۔ اس حکم پر سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔" (سورۃ الاعراف ۷۔ رکوع ۲)

یہ تو پہلے دو بندوں میں جتنی باتیں کہی گئی ہیں وہ قرآن مجید میں بہت جگہ مذکور ہیں، مگر سورۃ نحل (رکوع ۲) میں یہ ساری باتیں یکجا ملتی ہیں، جن کی ترجمانی ان پہلے دو بندوں میں کی گئی ہے۔

"وہی ہے جس نے آسمان سے تمہارے لیے پانی برسایا جس سے تم خود بھی سیراب ہوتے ہو اور تمہارے جانوروں کے لیے بھی چارہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس پانی کے ذریعے کھیتیاں اگاتا ہے، اور زیتون اور کھجور اور انگور، اور طرح طرح کے دوسرے پھل پیدا کرتا ہے۔ اس میں ایک بڑی نشانی ہے، ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔"

"اس نے تمہاری بھلائی کے لیے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے، اور سب تارے بھی اسی کے حکم سے مسخر ہیں۔ اس میں بہت نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔"

"اور یہ بہت سی رنگ برنگ کی چیزیں اس نے تمہارے لیے زمین میں پیدا کر رکھی ہیں، ان میں ضرور نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو سبق حاصل کرنے والے ہیں۔"

"وہی ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کر رکھا ہے تاکہ تم اس سے تر و تازہ گوشت لے کر کھاؤ اور اس سے زینت کی وہ چیزیں نکالو جنہیں تم پہنا کرتے ہو۔ تم دیکھتے ہو کہ کشتی سمندر کا سینہ چیرتی ہوئی چلتی ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے کہ تم اپنے رب کا

فضل تلاش کرو، شاید کہ شکر گزار بنو۔

"اُس نے زمین میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں تاکہ زمین تم کو لے کر ڈھلک نہ جائے۔ اس نے دریا جاری کئے، اور قدرتی راستے بنائے تاکہ تم ہدایت پاؤ۔ اس نے زمین میں راستہ بتانے والی علامتیں رکھ دیں، اور تاروں سے بھی لوگ ہدایت پاتے ہیں، پھر کیا وہ جو پیدا کرتا ہے، اور وہ جو کچھ بھی پیدا نہیں کرتے دونوں یکساں ہیں؟ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے، اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو گن نہیں سکتے۔"

سورۂ نحل کی مندرجۂ بالا آیات اور اس سے قبل کی آیات میں خدا نے انسان کو اپنی آنکھیں کھول کر اس کی نشانیوں اور نعمتوں کو بار بار دیکھنے کی تاکید کی ہے۔ اگر آپ ان سب ارشادات کی وجہیں بھی ہر جگہ یہ بتائی ہے کہ یہ سب نشانیاں اُن لوگوں کے لئے ہیں جو:

(۱) غور و فکر کرتے ہیں، (۲) جو عقل سے کام لیتے ہیں، (۳) جو سبق حاصل کرنا چاہتے ہیں، (۴) جو اپنے رب کا فضل تلاش کرنا چاہتے ہیں، (۵) ہدایت پانا چاہتے ہیں، (۶) اللہ کے خالقِ کائنات ہونے پر ایمان لانا چاہتے ہیں، (۷) آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔

اقبال نے بھی "کھول آنکھ" اور "ٹیپ کے بندوں" "بیتاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ" اور "آئینہ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ" میں ان ہی نکتوں کی ترجمانی کی ہے۔

اس نظم کے تیسرے بند میں اقبال یہ بتاتے ہیں کہ خدا نے انسان میں اتنی تخلیقی قوتیں ودیعت کی ہیں کہ اگر وہ اُن ساری چیزوں کو جن کا پہلے دو بندوں میں ذکر کیا ہے، غور و فکر کر کے اپنے قوتِ عمل سے تصرف میں لائے تو وہ دنیا پر فائز ہو سکتا ہے، اور دنیا اس کے اشاروں کو سمجھنے لگے گی کہ یہ انسان دنیا کو کس راہ پر لے چلنا چاہتا ہے۔ مگر اس کے لیے اقبال نے تعمیرِ خودی کی شرط رکھی ہے اور بغیر اس کی تعمیر کے یہ کام ممکن نہیں۔ خودی کی تعمیر کیوں کر ہوگی اس کی طرف اشارہ انھوں نے

اس تیسرے بند کے دوسرے شعر میں کہا ہے کہ تخمین یعنی غور و فکر اور آہِ رسا یعنی ذکر سے کام لو، خودی کی تشکیل، تعمیر و تزئین اسی "فکر" اور "ذکر" سے ہوتی ہے۔

"ذکر" قرآن میں یادِ الٰہی کا نام ہے۔ اس تیسرے بند میں اقبال نے درج ذیل آیات کی ترجمانی کی ہے، جس سے خودی کی تعمیر ہوتی ہے:۔

"زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں ان ہوشمند لوگوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں، جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں، اور آسمان اور زمین کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں، (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں)۔ "پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے، تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔ پس اے رب ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے..."

"مالک! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا، اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو۔ ہم نے اس کی دعوت قبول کر لی"۔ جواب میں ان کے رب نے فرمایا ــ "میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں"۔ (سورۂ آلِ عمران ۳۔ رکوع ۲۰)

"تم (نبیؐ) یہ حکایات ان کو سناتے رہو، شاید کہ یہ کچھ غور و فکر کریں، بڑی ہی بُری مثال ہے ایسے لوگوں کی جنھوں نے ہماری آیات (نشانیاں) کو جھٹلایا، اور وہ آپ اپنے ہی اوپر ظلم کرتے رہے ہیں۔ ..... اور حقیقت یہ ہے کہ بہت سے جن اور انسان ایسے ہیں جن کو ہم نے جہنم ہی کے لئے پیدا کیا ہے، ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں، ان کے پاس آنکھیں ہیں، مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں، ان کے پاس کان ہیں، مگر وہ ان سے سنتے نہیں، وہ جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے، یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے گئے ہیں۔ (سورۃ الاعراف ۷۔ رکوع ۲۲)

اس تیسرے بند کا پہلا مصرعہ ، "پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے" مصرعہ ثانی کا بند ، "تعمیر خودی کر، اثرِ آہِ رسا دیکھ"! مندرجہ بالا آیات کی ترجمانی کرتے ہیں مگر جب انسان کی خودی کا رخ "محمود کر" کے ذریعے خدا کی طرف ہو جاتا ہے، تو اس کی آہوں کے شرارے فلک تک پہنچ گئے ہیں، اور اس کی سعی و عمل میں خدا اس کا مددگار ہو جاتا ہے ، اور یہی ہے خودی کا اثرِ آہِ رسا جو مندرجہ بالا آیات میں اس آیت سے ماخوذ ہے ۔

"میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں۔"

اور جس شخص نے اپنی خودی کی تعمیر کر لی ہے، اس کی آہوں کے شرارے فلک تک اس لئے پہنچتے ہیں کیونکہ ارشادِ ربانی ہے ۔

"جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے انھیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے ۔ اور یقیناً اللہ نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔ وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ۔ (سورۃ العنکبوت ۲۹ ۔ رکوع ۷)

"بے شک راستہ بتانا ہمارے ذمہ ہے۔" (سورۃ اللیل ۹۲ ۔ رکوع ۱)

خدا اپنی طرف آنے کا راستہ اسی کو دکھاتا ہے، جو اس کی طرف رجوع کرے:"

(سورۃ الشوریٰ ۴۲ ۔ رکوع ۱)

اس نظم کے چوتھے بند کے پہلے شعر میں اقبال انسان کو اس کی بے پناہ صلاحیتوں سے آگاہ کر رہے ہیں، جس کو بروئے کار لا کر وہ ایک تازہ جہاں پیدا کر سکتا ہے، اور اپنے خونِ جگر سے اسی دنیا میں ایسی جنت بنا سکتا ہے، جس کے سامنے خدا کا بخشا ہوا فردوس بھی شاید آنکھ نہ جچے، مگر یہ سب صرف "کوششِ پیہم" ہی سے ممکن ہے، کیونکہ اسی کوششِ پیہم اور عمل کے ذریعے انسان کو تخلیق و ارتقا کی منزلیں طے کرنی ہیں۔

یعنی کہ انسان کے لئے کچھ نہیں ہے، مگر وہ جس کی اس نے سعی کی۔ (وَاَن لَّیسَ لِلاِنسَانِ اِلَّا مَا سَعیٰ)۔ (سورۃ النجم ۵۳ ۔ رکوع ۳۹)

شروع کے بندوں میں کائنات میں پھیلی ہوئی اتنی ساری چیزوں کے ذکر کے بعد اقبال نے چوتھے بند میں درج ذیل آیات کی ترجمانی کی ہے:۔

"واقعہ یہ ہے کہ یہ جو کچھ سروسامان بھی زمین پر ہے، اس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے تاکہ ان لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔" (سورۃ الکہف ۱۸ ۔ رکوع ۱)

اسی کوشش پیہم کو اقبال نے "بانگِ درا" کی ایک غزل میں اس طرح نظم کیا ہے۔ ؎

سعیِ پیہم ہے ترازوئے کم و کیفِ حیات — تیری میزان ہے شمارِ سحر و شام ابھی

پانچویں اور آخری بند میں اقبال نے انسان کی خیر کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ یہ کہ تو روزِ ازل سے ہی عشق کے دام میں پھنسا ہوا ہے یعنی خدا سے محبت تری سرشت میں داخل ہے، تو محنت کش ہے اس لئے کہ تو مشقتوں میں پیدا کیا گیا ہے، تو تقدیرِ جہاں کا راکب ہے، اور یہی خدا کی رضا ہے۔ اس بند کے پہلے شعر کا پہلا مصرعہ:۔ "نالندہ ترے عود کا ہر تار ازل سے"

درج ذیل آیات کا ترجمان ہے:۔

"اور جو لوگ مومن ہیں اللہ کی محبت میں بہت شدید ہوتے ہیں۔" (سورۃ البقرہ ۲ ۔ رکوع ۲۰)

اسی شعر کا دوسرا مصرعہ:۔ "تو جنسِ محبت کا خریدار ازل سے" درج ذیل آیات پر مبنی ہے:۔

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں، وہ اللہ ہی کی راہ میں لڑتے اور مارتے اور مرتے ہیں۔ ان سے (جنت کا وعدہ) اللہ کے ذمہ ایک پختہ وعدہ ہے۔ پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے خدا سے چکا لیا ہے، یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔"

اس تیسرے بند کا یہ مصرعہ، "پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے" مع مصرع ثانی کا بند، "تعمیرِ خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ" مندرجہ بالا آیات کی ترجمانی کرتے ہیں کہ جب بندے کی خودی کا رسوخ "فکر و ذکر" کے ذریعے خدا کی طرف ہو جاتا ہے، تو اس کی آہوں کے شرارے فلک تک پہنچ گئے ہیں، اور اس کی سعی و عمل میں خدا اس کا مددگار ہو جاتا ہے۔ اور یہی ہے خودی کا اثرِ آہِ رسا جو مندرجہ بالا ابیات میں اس آیت سے ماخوذ ہے۔

"میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں۔"

اور جس شخص نے اپنی خودی کی تعمیر کر لی ہے، اس کی آہوں کے شرارے فلک تک اس لئے پہنچتے ہیں کہ یہ ارشادِ ربانی ہے۔

"جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے انھیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے۔ اور یقیناً اللہ نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔ وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ۔ (سورۃ العنکبوت ۲۹، رکوع ۷)

"بے شک راستہ بتانا ہمارے ذمہ ہے۔" (سورۃ اللیل ۹۲۔ رکوع ۱)

"اور خدا اپنی طرف آنے کا راستہ اسی کو دکھاتا ہے، جو اس کی طرف رجوع کرے۔"

(سورۃ الشوریٰ ۴۲۔ رکوع ۲)

اس نظم کے چوتھے بند کے پہلے شعر میں اقبال انسان کو اس کی بے پناہ صلاحیتوں سے آگاہ کر رہے ہیں، جن کو بروئے کار لا کر وہ ایک تازہ جہاں پیدا کر سکتا ہے، اور اپنے خونِ جگر سے اسی دنیا میں ایسی جنت بنا سکتا ہے، جس کے سامنے خدا کا بخشا ہوا فردوس بھی شاید آنکھوں کو نہ جچے، مگر یہ سب صرف "کوششِ پیہم" ہی سے ممکن ہے، کیونکہ اسی کوششِ پیہم اور عمل کے ذریعے انسان کو تخلیق و ارتقا کی منزلیں طے کرنی ہیں۔

[illegible] انسان کے لئے کچھ نہیں ہے۔ مگر وہ جس کی اس نے سعی کی۔ (وان لیس للانسان الا ما سعی) ۔ (سورۃ النجم ۵۳ ۔ رکوع ۲)

شروع کے بندوں میں کائنات میں پھیلی ہوئی اتنی ساری چیزوں کے ذکر کے بعد اقبال نے چوتھے بند میں درج ذیل آیات کی ترجمانی کی ہے :۔

"واقعہ یہ ہے کہ یہ جو کچھ سروسامان بھی زمین پر ہے، اس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے تاکہ ان لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے"۔ (سورۃ الکہف ۱۰ ۔ رکوع ۱)

اسی کوشش پیہم کو اقبال نے "بانگ درا" کی ایک غزل میں اس طرح نظم کیا ہے۔

سعی پیہم ہے ترازوئے کم و کیف حیات تیری میزان ہے شمار سحر و شام ابھی

پانچویں اور آخری بند میں اقبال نے انسان کی خمیر کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ یہ کہ تو روز ازل سے ہی عشق کے دام میں پھنسا ہوا ہے یعنی خدا سے محبت تری سرشت میں داخل ہے، تو محنت کش ہے اس لئے کہ تو مشقتوں میں پیدا کیا گیا ہے، تو تقدیر جہاں کا راکب ہے، اور یہی خدا کی رضا ہے۔ اس بند کے پہلے شعر کا پہلا مصرعہ :۔ "نالندہ ترے عود کا ہر تار ازل سے"

درج ذیل آیات کا ترجمان ہے :۔

"اور جو لوگ مومن ہیں اللہ کی محبت میں بہت شدید ہوتے ہیں۔ (سورۃ البقرہ ۲ ۔ رکوع ۲۰)

اسی شعر کا دوسرا مصرعہ :۔ "تو جنس محبت کا خریدار ازل سے" درج ذیل آیات پر مبنی ہے :۔

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومن سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں وہ اللہ ہی کی راہ میں لڑتے اور مارتے اور مرتے ہیں۔ ان سے (جنت کا وعدہ) اللہ کے ذمہ ایک پختہ وعدہ ہے۔ پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے خدا سے چکا لیا ہے، یہی سب سے بڑی کامیابی ہے"۔

"[illegible] اس کی بندگی بجا لانے والے اس کی تعریف کے گن گانے والے اس کی خاطر زمین میں گردش کرنے والے اس کے آگے رکوع اور سجدہ کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے، بدی سے روکنے والے، اور اللہ کے حدود کی حفاظت کرنے والے (اس شان کے ہوتے ہیں، وہ مومن جو اللہ سے خرید و فروخت کا یہ معاملہ طے کرتے ہیں) اور اے نبیؐ ان مومنوں کو خوشخبری دے دو۔" (سورۃ التوبہ ۹ ۔ رکوع ۱۴)

اس "جنس محبت" پر ایک حدیث بھی درج ذیل ہے۔

حضرت نعمان بن بشیرؓ کا بیان ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے۔

تم مومنوں کو آپس کے رحم اور محبت اور ہمدردی کے معاملہ میں ایک جسم کی طرح پاؤ گے۔" (بخاری و مسلم)

یہ کہ انسان "محنت کش" ہے، اس آیت سے ماخوذ ہے۔

درحقیقت ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔ (سورۃ البلد ۹ ۔ رکوع ۱)

اس بند کا ٹیپ کا بند "ہے وہی تقدیر جہاں تیری رضا دیکھ!" مندرجہ ذیل آیات پر مبنی ہے۔

"اللہ نے وعدہ فرمایا ہے، تم میں سے اُن لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ اُن کو اُسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا، جس طرح اُن سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے۔" (سورۃ النور ۲۴ ۔ رکوع ۸)

"اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو، میری زمین وسیع ہے، پس تم میری بندگی بجا لاؤ"
(سورۃ العنکبوت ۲۹ ۔ رکوع ۱)

اب جہاں تک تسلیم و رضا کا سوال ہے اقبال کا اشارہ درج ذیل آیات سے ہے۔

"اے نفس مطمئن چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو (اپنے انجام نیک سے) خوش (اور اپنے رب کے) نزدیک پسندیدہ ہو۔ شامل ہو جا میرے (نیک) بندوں میں اور داخل ہو جا جنت میں۔"
(سورۃ الفجر ۸۹ ۔ رکوع ۱)

مکتوب پیرس

مولانا سید سلیمان ندوی قدس اللہ سرہ کی صد سالہ سالگرہ کی تجویز

پاریس ۱۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۴ھ دوشنبہ

مخدوم و محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کئی ہفتے ہوئے عنایت نامہ مل گیا، اور سرفراز کیا تھا، جشن سلیمانی کی آخری معلوم تجویز کے انجام کے انتظار میں جواب میں تاخیر ہوئی۔ معاف فرمائیں۔

کیا ایسے جشن شرعاً جائز ہیں؟ | آج کل کے بحران فکری میں بعض مسلمان اور خود جشن میلاد نبوی کو بھی حرام قرار دے رہے ہیں، اور واحد استدلال یہ کہ رسول اکرم نے اس کا حکم نہ دیا، (جس میں خلق عظیم ہو تو کیا اس کی تواضع اجازت دے سکتی ہے، کہ وہ ایسا حکم خود اپنے متعلق دے؟)، مگر یہ بھولے اس بات کو بھولتے ہیں کہ خود خدا نے اپنے حبیب کا یہ جشن شروع فرمایا، اور ہمیں اطلاع دی کہ "إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا" اور مزید برآں خود رسول اکرم کو، اور آپ کے واسطے سے مسلمانوں کو حکم دیا کہ "وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ" کیا اس سے بڑھ کر کوئی نعمت خداوندی ہو سکتی ہے کہ کسی امت، اور نوع انسانی کے کسی معاشرہ میں کوئی نبی بھیجے؟

حدیث صحیح ہے کہ "العلماء ورثۃ الانبیاء" اس تحدیث نعمت کا موضوع بننے کا استحقاق کسی نبی کے بعد سب سے پہلے علمائے امت کو حاصل ہوگا۔ اور تحدیث نعمت کے طریقے غیر محدود ہو سکتے ہیں۔

جشن سلیمانی | عصر حاضر میں، خاص کر ہمالیہ کے جنوب کے برّ عظیم، اردو زبان میں مرحوم سید سلیمان ندوی نے

[illegible] کی ہے کہ ان کے حاشیہ کسی اور نے شائع کئے وہ کے منسوب ہے اور [illegible] کرنے والے شاگرد اور دیگر معاصروں کی طرح پاریس میں بھی بکثرت ہیں۔ کہتے ہیں کہ مرحوم نے ایک بار اس سرزمین فرنگ کو اپنی آمد سے شرف بھی بخشا تھا، یہ بھی معلوم لگا کہ ڈیڑھ سو سال سے زیادہ عرصے سے جامعۂ پاریس میں اردو کی تعلیم کی کرسی قائم ہے، اور گارسین دتاسی سے لے کر اب تک اس کا سلسلہ جاری ہے، (پاریس میں اردو کی کرسی کے قیام کا فرانسیسی فرمان شاہی مورخہ ۱۱ دسمبر ۱۸۳۰ء کا موجود ہے)

<u>جشن صد سالہ</u> | مولانا مرحوم کی ولادت دیبنہ میں، خاندانی روایات کے مطابق، جمعہ ۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ کو ہوئی۔ اور ان کے دادا کی طرف ایک تاریخی قطعہ منسوب ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں۔ ؎

بگفتا کہ بے داد شد مصرعے — <u>شدہ مہر تابان زبرج کمال</u>

اس کی معادل تاریخ نہ معلوم کس نے (سہواً) ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء بتائی اور وہ یہاں تک پھیلی کہ مرحوم کے مزار تک پر کندہ کرا دی گئی۔

فرنگیوں نے دو تین سو سال سے تقابلی جدولیں شائع کرنی شروع کی ہیں، جن میں ہجری اور عیسوی معادل تاریخیں درج ہوتی، اور آسانی سے ڈھونڈھی جا سکتی ہیں، ایسی قدیم ترین کتاب لاطینی میں چھپی اور اب ہر یورپی فرنگی زبان میں موجود ہے، اور اسی کی نقل عربی اور اردو اور شاید فارسی اور ترکی میں بھی) ہوئی اور ان ساری غلطیوں کی حامل جو فرنگی جدولوں میں ہیں۔

بات یہ ہے، کہ ان میں گزشتہ چودہ سو سال کے ہر مہینے کی رویت ہلال کو حساب کر کے معلوم کرنے کی جگہ ایک من گھڑت اصول فرض کر لیا ہے کہ محرم، ربیع الاول، جمادی الاولیٰ، رجب، رمضان اور ذی القعدہ ہمیشہ ہمیشہ تیس کے ہوتے ہیں، اور صفر، ربیع الآخر، جمادی الآخرہ، شعبان اور شوال ہمیشہ انتیس کے ہوتے ہیں، اور ذی الحجہ حسب حساب کبھی انتیس اور کبھی تیس کا ہوتا ہے۔

[illegible] ہوتا ہے کہ یہ بالکل غلط ہے، رمضان شاذ ہی کبھی انتیسا ہوتا ہے تو کبھی تیسا، لگاتار کئی کئی مہینے مسلسل انتیسے اور کبھی مسلسل کئی کئی مہینے تیسے بھی ہو سکتے ہیں،

ان حالات میں ان فرنگی جدولوں پر کامل اعتماد نہیں ہو سکتا، ایک، دو یا تین دن کا فرق ہو سکتا ہے، جیسا کہ ابھی نیچے مرحوم کی تاریخ وفات کے سلسلہ میں عرض ہوگا۔

بہرحال ان فرنگی جدولوں کے مطابق جمعہ ۲۳ صفر سنہ ۱۳۰۲ھ کی معادل تاریخ جمعہ ۱۲ دسمبر سنہ ۱۸۸۴ء ہے (۲۲ نومبر نہیں)، تاریخ وفات اتوار ۲۲ نومبر سنہ ۱۹۵۳ء کو ہوئی جو پاکستانی رویت ہلال کے مطابق ۱۴ ربیع الاول سنہ ۱۳۷۳ھ تھی، (لیکن فرنگی جدولوں کے مطابق اتوار کو ۱۵ ربیع الاول تھی، اور ۱۴ کو سنیچر کا دن تھا)

افسوس ہے کہ سنہ ۱۴۰۲ھ میں کسی کو خیال نہ آیا کہ مرحوم کی ولادت کا صد سالہ جشن منایا جائے اب فرنگی صدی کے سوا چارہ نہیں۔

<u>پیرس کی تقریبیں</u>: حکومت فرانس نے ابھی کوئی سال ڈیڑھ سال سے سیاسی مصلحت کے تحت سرکاری ٹیلی ویژن میں ہر اتوار کی صبح کو نو سے ساڑھے نو بجے تک پندرہ منٹ مستقل طور پر "اسلامی اشاعت" (Emission Islamique) کے لئے دے رکھے ہیں، اس کا سہرا مستشرق پروفیسر ژاک برک (Jacques Berque) کے سر ہے، جو صدر جمہوریہ موسیو متیراں کے پرانے شخصی دوست ہیں، اس کی سربراہی کے لیے مقامی مسلمانوں کی ایک کمیٹی قائم کی گئی ہے، ہم سے اس کے صدر اور معتمد نے عرض کیا کہ ایک اشاعت مرحوم سید سلیمانؒ کے لیے مختص کی جائے، انھیں کچھ تفصیلیں بھی دیں کہ مرحوم کا علمی کارنامہ کیا ہے، اور ٹیلی ویژن کی ضرورتوں سے مرحوم کے اور مرحوم کے مزار کے کچھ فوٹو جو مولانا غلام محمد صاحب کراچی، کا تحفہ تھے، نیز مرحوم کی چند کتابوں کے سرورق کے عکس بھی مہیا کئے، یہ عرض قبول کی گئی، اور اتوار ۱۰ نومبر سنہ ۱۹۸۵ء کو یہ اشاعت عمل میں آئی، اس میں

منعقد ہوا، دیگر مقرروں میں ایک پروفیسر محمد المنتصر فریدی صاحب سابق [illegible] تھے، اور دوسرے سالار الدین محمد صاحب تھے جو کتب خانہ الشرقیہ میں ایک فہرست نگار ہیں، اور کار دیال کے ماتحت۔

۲۔ اسی دن دوپہر کو پیرس کے علاوہ استان گراڈ کی مسجد میں یوم اقبال کا جشن ہوا، جو بطور شاندار طریقے پر واقع ہے، اور وسعت کے لحاظ سے یہاں کی سب سے بڑی مسجد ہے کہ کوئی تین ہزار آدمی بیک وقت نماز پڑھ سکتے ہیں، پیرس میں رابطة الطلاب المسلمین ایک انجمن ہے، جو تقریباً تیس سال سے قائم ہے، وہ ہر اتوار کو ایک لیکچر کراتی ہے عربی میں ہو تو اس کا فی الفور فرانسیسی ترجمہ ہوتا ہے، فرانسیسی میں ہو تو عربی ترجمہ، قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند، اولاً قرآن خوانی اور فاتحہ ہوئی، پھر میں نے تقریباً دو گھنٹے اپنے معلومات فرانسیسی میں برجستہ عرض کئے، جن کا آدھا وقت عربی ترجمے میں صرف ہوا، اس کے بعد حاضرین نے جو بہت متاثر تھے، سوالات بھی کئے، اور توضیحیں چاہیں۔

۳۔ اس کے چند دن بعد دسمبر کے آغاز میں، اس کے لئے یہاں کی ترکی مسجد میں ہندی پاکستانی جلسہ ہوا، انگلستان میں عالمگیر اسلامی مشن نامی ایک ادارہ قائم کیا گیا ہے، اس کی ایک شاخ پیرس میں بھی دو چار سال سے قائم ہے، ان احباب کو یاد دلانا پڑا کہ سلیمان ندوی کون تھے، کب تھے، پھر ان کی فرمائش کی تعمیل کرنی پڑی، اولاً [illegible] گھنٹہ حاضرین نے قرآن خوانی کی، پھر وہاں اردو میں اس موضوع پر لیکچر ہوا۔

۴۔ اب پیرس میں ایک جگہ تیرہ یونیورسٹیاں قائم ہو گئی ہیں، ان میں سے ایک میں اردو کے استاد محمد عبدالماجد صاحب ہیں، انھوں نے جامعہ میں اس تقریب کا اہتمام کیا اور [illegible] دسمبر کو ٹھیک صد سالہ سالگرہ کے دن ان کے غرفے میں فرانسیسی تقریریں ہوئیں، خود ان کی بھی اور ایک [illegible] کی بھی، میں نے خاص کر اس پر زور دیا کہ مرحوم کے ہاں [illegible] بہت تھی، اور [illegible] کا موضوع

کام کرتے رہے، مثلاً قدیم مسلمانوں کے ہاں اندھوں کا خط، جمع و تدوین قرآن، تحریری تدوین حدیث
انجیل برنابا، نظریۂ ارتقا، ملک حبشہ میں ایک اسلامی مملکت، روس میں اسلامیات کی
تعلیم، جاپان کا نظام تعلیم وغیرہ وغیرہ۔ زمانہ طالب علمی میں سیرت عائشہؓ لکھی جو بعد میں آج تک
بار بار شائع ہوتی رہی ہے، اور بڑی مستند کتاب ہے، انھیں اسلامی دستور سے بھی دلچسپی تھی،
مسئلہ خلافت کے سلسلے میں ہندوستانی وفد میں لندن بھی گئے، اور مکۂ معظمہ کی کانفرنس میں بھی
شریک رہے، وہ عربی کے خطیب تھے، انگریزی ہی نہیں عبرانی بھی جانتے تھے۔ کتابیں دس
بیس لکھیں تو مقالے سیکڑوں۔ وسعتِ قلب کا یہ عالم تھا کہ حنفی تھے، لیکن سوانح عمری لکھی
تو امام مالکؒ کی۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ سیرت النبیؐ کی پانچ جلدیں ہیں، جو اردو زبان
کا طرۂ ناز ہیں، ہنوز ناتمام ہی تھی کہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

۵۔ پاریس میں جامعات کے ساتھ، ایک مستقل ادارہ ہے "بین الممالک معاملات کی
تحقیق"۔ اس میں معلومات اور دستاویزیں، جمع کی جاتی ہیں، اس نے بھی مرحوم سے دلچسپی لی ہے۔
اور توقع ہے کہ آیندہ چند ہفتوں یا مہینوں میں اس کے ہاں بھی معتاد لکچروں میں (جو ہر پیر کو
ہوتے ہیں۔) ایک سید صاحب مرحوم کی تقریب کے لئے بھی ہوگا۔ واللہ المستعان۔

(ڈاکٹر) محمد حمید اللہ

مولانا محمد علیؒ

مصنف اس کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ ملک کے سیاسی لیڈروں میں سب سے زیادہ میں مولانا محمد علیؒ
جوہر سے متاثر ہوا، میں اپنی اس وقت کی زندگی تک بہت سے سیاسی رہنماؤں کو دیکھا مگر مولانا محمد علی میں جو
غیر معمولی خوبیاں تھیں، ان میں کسی کو بھی ان کا ہمسر نہیں پایا، محمد علی پر یہ کتاب ان کے اپنی عقیدت مندانہ
تاثرات اور سرشارانہ کیفیات کی آئینہ دار ہے، اور اس کی کوئی مستقل سوانح عمری نہیں ہے۔ (زیر طبع)

مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن۔

مطبوعات جدیدہ

آئینۂ حرم:- مرتبہ جناب محی الدین قادری [illegible]، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۹۰ مجلد مع نقشے، قیمت ۵/۲ روپیہ، پتہ:- رزاقیہ کتاب گھر ۴/۱۳۳۹، [illegible]

یہ کتاب مسجد نبویؐ اور مدینہ منورہ کے آثار و مشاہد کے متعلق ایک مفید و مستند دستاویز ہے جو چار حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش، بعثت اور مکی دور کے مختصر حالات تحریر کرنے کے بعد بیعت عقبہ، ہجرت اور مسجد نبویؐ کی تعمیر کا مفصل حال درج ہے، آپ کے عہد مبارک نیز خلفائے راشدینؓ، اموی و عباسی خلفاء اور عثمانی ترکوں کے زمانہ میں مسجد نبویؐ میں جو توسیع و اضافہ ہوتا رہا ہے، اس کی مفصل کیفیت بیان کی گئی ہے، اس میں مسجد نبویؐ سے متعلقہ عمارتوں، آپ کے منبر، مختلف ستونوں، روضۂ اقدس، حضرات شیخینؓ کی آرامگاہوں، گنبد خضراء، امہات المومنین کے حجروں، ریاض الجنۃ اور اصحاب صفہ کے چبوترہ کے علاوہ مسجد قبا اور مسجد ضرار کے بارہ میں بھی ضروری معلومات پیش کئے گئے ہیں اور ضمناً سیرت نبویؐ کے بعض واقعات کا بھی تذکرہ آگیا ہے، جیسے اذان، تحویل قبلہ، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی فرضیت، شراب کی حرمت اور پردہ کے احکام، غزوات، صلح حدیبیہ، فتح مکہ اور حجۃ الوداع کے واقعات وغیرہ، ہر جماعت کے نقشے بھی دئے ہیں، اور مسجد نبویؐ کے عہد بعہد اضافوں کو ظاہر کرنے کے لیے کئی نقشے دئے ہیں، دوسرے حصہ میں مدینہ طیبہ میں حاضری کے آداب، روضۂ اطہر اور مسجد نبویؐ کی زیارت کی اہمیت، مدینہ میں داخلہ کی دعائیں لکھی ہیں، اور حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخینؓ کی جناب میں پیش کئے جانے والے سلام کا ذکر ہے، ایک حصہ جنت البقیع کے ذکر کے لیے مخصوص ہے، اس میں اس کے آثار اس کے حدود اور داخلہ کے اوقات

باقیات، جنت البقیع میں دفن صحابہ، تابعین اور ان کے اسماء کا ذکر کیا ہے، چوتھے حصہ میں مدینہ منورہ اور اس کے اطراف کی مشہور اور متبرک جگہوں کا ذکر ہے، اسی حصہ میں سقیفہ بنی ساعدہ، جبل سلع، احد کے میدان اور پہاڑ اور بدر وغیرہ کے علاوہ بعض کنووں، باغوں، متعدد مسجدوں، شامی محلہ، مدینہ یونیورسٹی، دار القضا، اسپتال، مدینہ کے بازار، ریلوے اسٹیشن، عمارت حکمۃ سعودی حکومت، اور مولانا عبد الباقی فرنگی محلی کے کتب خانوں کے بارہ میں مفید معلومات قلمبند کئے گئے ہیں اور مدینہ منورہ کی کھجوروں، پھلوں، ترکاریوں اور پانی وغیرہ کی عجیب خصوصیات اور فائدے تحریر کئے ہیں، بالکل آخر میں استنبول کے ایک پمفلٹ کے حوالے سے انیس متبرک یادگاروں کی تصویریں درج ہیں، ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور بعض خلفائے راشدینؓ کی تلواریں، احد میں شہید دندان مبارک، مہر نبوت اور مصحف عثمانی وغیرہ کئی اہم تبرکات کی تصویریں ہیں، اس کتاب سے مصنف کے دینی جذبہ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ عقیدت ومحبت کا اظہار ہوتا ہے، انھوں نے بڑی محنت و جستجو سے مدینہ طیبہ اور حرم نبوی کے متعلق بہت سے مفید، ضروری اور مستند معلومات تحریر کئے ہیں اس کتاب کی خوبی عمارتوں کے مفصل نقشے ہیں، اس اعتبار سے مدینہ منورہ کے زائرین کو اس کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے، حضرت سلمان فارسیؓ کے طویل العمر ہونے کی روایتیں بے بنیاد ہیں لیکن مصنف نے ان کو معتبر سمجھ لیا ہے، (ص ۱۰۰) اسطوانہ کا املا، استوانہ لکھا ہے، اور عثمان بن مظعون کو عثمان بن معضون لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

دین اسلام اور اولین مسلمانوں کی دو متضاد تصویریں، مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۹۰، قیمت چھ روپیہ، پتہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، پوسٹ بکس ۱۱۹ ندوۃ العلماء لکھنؤ،

اس کتاب میں ہندوستان کے مشہور داعی و مصلح مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اسلام کے اولین

میں توسط کے [illegible] دو بالکل متضاد تصویریں کھینچی ہیں، ایک تو مسلم [illegible] جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو خصوصیات
اور [illegible] صفات، حقائق اور غیر مسلم مؤرخوں کی شہادتوں سے ثابت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم
و تربیت اور صحبت کی غیر معمولی تاثیر، انقلاب انگیزی و قلب ماہیت کی قوت اور آدم گری و مردم سازی کی معجزانہ شان کی
وجہ سے ایک مثالی و معیاری معاشرہ وجود میں آگیا اور روئے زمین پر افراد انسانی کا کوئی مجموعہ اور نسل انسانی کا کوئی
گروہ صحابہ کرام سے بہتر سیرت و کردار کا حامل نہیں گزرا، دوسرے آپ نے بانیان سلطنت اور عام کشور کشاؤں کی طرح
خاندانی و موروثی سلطنت کی بنیاد رکھنے اور اپنے ذاتی و خاندانی مفاد کا تحفظ کرنے سے نیز الانساب فلا تقاب کا
عملی معاملہ ہی نہیں رکھا، خطرے کی جگہوں پر اپنے کو اور اپنے عزیزوں کو آگے رکھا، اور نفع و آرام کے موقع پر اپنے کو سب سے
پیچھے کر دیا، آپ کی تعلیم نے انسان کی ذاتی سعی و صلاحیت کو اصل اور سعادت و ترقی کا معیار و مدار قرار دیا، تیسرے آپ کا
لایا ہوا صحیفہ ہر قسم کی دستبرد، تغیر و تبدل اور تحریف سے پاک رہا جس کی شہادت غیر مسلموں نے بھی دی ہے، چوتھے آپ کی
ذات مرکز ہدایت، سرچشمہ قیادت اور امت کی قلبی وابستگی اور ذہنی سپردگی کا محور رہی، اور اس آفتاب عالمتاب کے سامنے اقطاب
و ابدال، کملاء و فضلائے اہل بیت ذرات تھے، اسلام اور قرن اول کے مسلمانوں کی اس تصویر یا تعبیر کو وہ اہلسنت
والجماعت کا اجماعی عقیدہ بتاتے ہیں، اور اسکے بالکل متوازی فرقہ امامیہ اثنا عشریہ کے حوالہ سے اسلام کے مبلغ اولیں
اور صحابہ کرام کی نہایت مکروہ اور گھناؤنی تصویر کشی کی ہے جو نبی کا مقصد عام فرمانرواؤں کی طرح خاندانی حکومت
کی تاسیس قرار دیا ہے، اور اس فرقہ کا یہ خیال بھی بتایا ہے کہ قرآن مجید محرف ہو چکا ہے، اور وہ ائمہ کو معصوم اور
نبی ہی کی طرح مفترض الطاعت سمجھتا ہے، مصنف نے یہ تصویر قدیم شیعی علماء کی کتابوں کے علاوہ دور حاضر کے
ایرانی انقلاب اور اسلامی حکومت کے داعی آیت اللہ خمینی کی کتب و رسائل کی مدد سے تیار کی ہے، اور آخر میں
عقل سلیم اور انصاف پر اسکا فیصلہ چھوڑ دیا ہے کہ کون سی تصویر زیادہ موزوں اور قابل قبول ہو سکتی ہے،
امید ہے کہ اصحاب علم و نظر مولانا کے نکات بحث پر سنجیدگی سے غور و فکر کر کے صحیح و صائب فیصلہ کریں گے اور اسلام کی
پیش کی ہوئی اصلی تصویر کو دھندلا ہونے سے بچائیں گے۔

فہرست مشترک نسخہ ہائے خطی فارسی پاکستان (جلد اول) | مرتبہ جناب احمد منزوی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۹۰۰، مجلد، قیمت ۳۰ روپے، پتہ: مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، خانہ ۵۵، خیابان سہروردی ۲/۱-۶، اسلام آباد

پاکستان کے کتب خانوں میں فارسی کے جو مخطوطات موجود ہیں، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان نے ان کی فہرست شائع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے، یہ اس سلسلہ کی پہلی جلد ہے جس میں پاکستان کے متعدد کتب خانوں کے مختلف فنون کے ۳۳۰۰ مخطوطات کا ذکر ہے، جو حسب ذیل تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے (۱) علوم قرآن (تفسیر، تجوید، ترجمۂ قرآن) (۲) علوم ریاضی (ستارہ شناسی، اختر بینی، علوم غریبہ (رمل، جفر)) (۳) علوم تجربی (طبیعیات، دم شناسی، کان شناسی، جواہر شناسی، کشاورزی، جانور شناسی، خواص اشیاء، صنعت، فیزیک، آتش بازی، زیور سازی، فراست، قیافہ شناسی، جستن اسم اعظم، اپترجگی، طب، کیمیا، چند دانشی) کتابوں کے نام حروف تہجی کی ترتیب سے درج ہیں، ان مخطوطات اور ان کے مصنفین کے نام اور سن تصنیف کی صراحت کی ہے، اور شروع کی عبارت اور ابواب و فصول کا ذکر بھی ہے، پھر کتاب اور مصنفین کے بارے میں جن دوسری کتابوں میں معلومات درج ہیں ان کی نشاندہی کی ہے، کتابوں کے ناموں اور تصنیف کے فرق و اختلاف کی تصریح بھی کی ہے، پاکستان کے ان شہروں کے نام لکھے ہیں جہاں کے کتب خانوں میں یہ مخطوطات ہیں، خط کی قسم، کاتب کے نام، تاریخ کتابت اور صفحوں کی تعداد بھی تحریر کی ہے، اگر کسی کتاب کے متعدد نسخے ہیں تو ان کا ذکر تاریخی اعتبار سے کیا ہے، جناب احمد منزوی پاکستان میں فہرست نگاری اور کتاب شناسی کے ماہر خیال کئے جاتے ہیں، وہ پہلے بھی مخطوطات کی فہرستیں مرتب کر چکے ہیں، ان کا نام ہی زیر نظر فہرست کی خوبی کی ضمانت ہے، انھوں نے مقدمہ میں اس محنت شاقہ کا ذکر کیا ہے جو اس فہرست کی ترتیب و تالیف میں ان کو اٹھانی پڑی ہے، اور ان امور کی صراحت بھی کی ہے جن کو اس میں پیش نظر رکھا گیا ہے، مرکز تحقیقات کے ڈائرکٹر نے قرآن مجید کی روشنی میں قرأت، کتابت، قلم، کاغذ اور علم کی اہمیت بڑے اچھے انداز میں واضح کی ہے، اور فہرست نگاری کی جانب قدیم علمائے اسلام کے اعتنا کا ذکر بھی کیا ہے، کتاب کی کئی فہرستیں بھی دی گئی ہیں، ایک فہرست مضمون وار کتابوں کے آخر میں مؤلفین کے ناموں کے لحاظ سے درج ہے، اور آخر کی دو فہرستوں میں ایک حروف تہجی کے مطابق کتابوں کے ناموں کے اعتبار سے ہے، اور دوسری متن کے حصہ کتاب شناسی میں وارد ناموں کی ہے، مگر اس جلد میں قرآنیات کے بعد حدیث و فقہ کے بجائے ریاضیات و طبیعیات کی کتابوں کا ذکر ہے جو ذرا بے محل معلوم ہوتا ہے۔

قومی یکجہتی اور اسلام :- مرتبہ ڈاکٹر غوث الدین ندوی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۱۲۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۲ روپیہ، پتہ: مکتبہ پولس چوکی، مدح گنج، سیتاپور روڈ، لکھنؤ۔

حیات سلیمان

یہ جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندویؒ کی صرف سوانح عمری ہی نہیں ہے بلکہ ان کے گونا گوں مذہبی، علمی، قومی، ملی، سیاسی حالات اور کارناموں کا ایک بلا وغیرہ مرقع ہے جس میں سید صاحبؒ کے دور کی نصف صدی کی ملی و قومی سیاسی و علمی، ادبی و لسانی تحریکوں مثلاً ہنگامۂ مسجد کانپور، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، جنگ آزادی، مسئلۂ ملوکیت حجاز وغیرہ کی تفصیل بھی ضمناً آگئی ہے، اسی کے ساتھ دار المصنفین جو سید صاحبؒ کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اس کی تاسیس، سال بہ سال اس کی ترقی کی روداد کے ساتھ ان کے قیام بھوپال، سفر پاکستان، قیام پاکستان کے دوران کی علمی خدمات کا تذکرہ اور بحیثیت مختلف وفود کے رکن و صدر کی حیثیت سے سفر یورپ، سفر حجاز، سفر افغانستان وغیرہ کی مفصل روداد بھی سید صاحبؒ کے خطوط اور تحریروں کی روشنی میں قلمبند ہو گئی ہے، یہ کتاب اپنے اسلوب و طرز انشاء کے لحاظ سے بالکل حیات شبلی کا ثانی ہے، ویسی ہی دلکش، دلچسپ اور دلنشین۔

مولفہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی قیمت ۳۴ روپے

سلوک سلیمانی

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے عزیز ترین پاکستانی مسترشد مولانا سید سلیمان اشرف خان صاحب سلیمانی صدر شعبۂ عربی پشاور یونیورسٹی نے "سلوک سلیمانی پر ایک اجمالی نظر" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا تھا جو معارف میں ستمبر ۱۹۵۵ء سے جنوری ۱۹۵۶ء تک مسلسل نکلتا رہا، یہ علمی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، اسی عنوان کو مزید اضافوں کے ساتھ مولانا اشرف صاحب نے کتابی صورت میں سلوک سلیمانی کے نام سے دو جلدوں میں شائع کیا ہے، ان میں حضرت سید صاحبؒ کی سلوک و معرفت سے متعلق تعلیمات کو مرتب کی توضیحات و تعبیرات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے، ان دونوں جلدوں کو افادۂ عام کی خاطر دار المصنفین نے بھی چھاپ کر شائع کیا ہے۔

قیمت جلد اول ۳۰ روپے   قیمت جلد دوم ۲۵ روپے

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

قیمت [illegible] روپے سالانہ

دار المصنفین اعظم گڈھ

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

تاریخ ہندوستان کو [illegible] ایک حد تک پہنچ چکا ہے، اس ضمن میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے، جس کی اب تک تین جلدیں شایع ہو چکی ہیں۔

جلد اول

اس میں مغل دور سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی اور وطن دوستی، رعایا پروری کے دلچسپ واقعات مستند ماخذوں کی مدد سے پیش کیے گئے ہیں، قیمت ۱۲ روپیے۔

جلد دوم

اس میں مغل فرماں روا بابر، ہمایوں، سوری خاندان کے شیر شاہ اور اسلام شاہ، پھر مغل شہنشاہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی، وطن دوستی اور رعایا پروری کے سبق آموز واقعات پیش کیے گئے ہیں، قیمت ۲۳ روپیے۔

جلد سوم

اس میں [illegible] واقعہ نگار کی کتاب کا جواب خود اس کی کتاب کے حوالوں سے اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر اور اس کے بعد کے مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی، وطن [illegible] اور رعایا پروری کی تفصیلات آ گئی ہیں۔ مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن۔ قیمت ۳۰ روپیے۔

جلد ۱۳۵ ماہ رجب المرجب ۱۴۰۵ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۸۵ء عدد ۴

مضامین

مقالات

شذرات

مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو اور بہار اردو اکاڈمی کے بعد استاذی محترم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی صد سالہ سالگرہ کے سلسلہ میں کل ہند انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام دہلی میں ایک باوقار سیمینار ۹ر ۱۰ مارچ کو ہوا،

انجمن کے موجودہ سرگرم اور متحرک جنرل سکریٹری جناب ڈاکٹر خلیق انجم کی وجہ سے اس کے ذریعہ سے اہم علمی ادبی اور لسانی خدمات انجام پارہی ہیں، انھوں نے جو اہم ترین کام انجام دیا ہے وہ انجمن کے لیے راؤز ایونیو میں شاندار اردو گھر کی تعمیر ہے، اس کے لیے وہ ہر طرح کی دلی مبارکباد کے مستحق ہیں، شاہ جہاں کو دہلی کے لال قلعہ کی تعمیر میں شاید اتنی مشکلوں اور پریشانیوں کا سامنا نہ کرنا پڑا ہوگا جتنا کہ ڈاکٹر خلیق انجم کو اردو گھر بنانے میں پڑا ہوگا، اب یہ عمارت دہلی کے قلب میں کھڑی ہوکر زبان حال سے یہ کہہ رہی ہے کہ دہلی کے قلعۂ معلی کی زبان ایک بار پھر اردوئے معلی بن کر رہے گی، اسی اردو گھر میں حضرت سید صاحبؒ پر سیمینار ہوا، اس میں معززین کا جو اجتماع ہوا وہ اسے کامیاب بنانے کا ضامن تھا۔

سیمینار کا افتتاح عالی جناب سید مظفر حسین برنی گورنر ہریانہ نے اپنے پرمغز اور دلنشین خطبے کیا، اس کو سن کر [illegible] راقم کی طرح اور حاضرین کو خوشی ہوئی کہ ایک بے حد مشغول اعلیٰ عہدیدار کی نظر علم و فن کے ایک بحر العلوم اور قلم کے قلمرو کے ایک حکمراں پر اتنی اچھی ہے، معارف کے ناظرین کو بھی اس کا اندازہ اس کو پڑھ کر ہوگا جو معارف کی اسی اشاعت میں شائع کیا جارہا ہے۔

اس سیمینار میں جو مقالات پڑھے گئے ان کی نوعیت کا اندازہ ان کے حسب ذیل عنوانات سے ہوگا، مولانا سید سلیمان ندویؒ ایک ادیب کی حیثیت سے، از پروفیسر عبد المغنی (پٹنہ) مولانا سید سلیمان ندویؒ کے ایک اہم خط پر اظہار خیال، از ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی (دہلی یونیورسٹی) مولانا سید سلیمان ندویؒ کا تصور نبوت و شریعت، از ڈاکٹر عنوان چشتی (جامعہ ملیہ دہلی) مولانا سید سلیمان ندویؒ کوچۂ شاعری میں، از ڈاکٹر رفعت سروش (غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی) مولانا سید سلیمان ندویؒ اور فارسی ادبیات، از ڈاکٹر تنویر احمد علوی (دہلی یونیورسٹی) دبستان شبلی کے ایک ممتاز ادیب، از ڈاکٹر مسز افتخار بیگم صدیقی (ذاکر حسین کالج دہلی) سید صاحبؒ کا نظریۂ علم از ڈاکٹر مشیر الحق [illegible] (جامعہ ملیہ دہلی) مکاتیب سلیمان ندوی کا ایک جائزہ، از جناب عبد اللطیف اعظمی (جامعہ ملیہ دہلی) آزادی سے پہلے ہندوستان میں فرقہ پرستی اور مولانا سید سلیمان

نقطۂ نظر، از ڈاکٹر عالم (دہلی) مولانا سید سلیمان ندویؒ اور اردو ادب، از ڈاکٹر ضیا کریم (دہلی) مولانا سید سلیمان ندویؒ اور معاصرین، از سید شہاب الدین دسنوی (پٹنہ) مولانا سید سلیمان ندویؒ حالات اور کارنامے، از ڈاکٹر ضیا نجم (دہلی) سیرۃ النبیؐ میں اردو کے مستعمل الفاظ کی تحقیقات، از مولوی عبید اللہ کوثر ندوی (دارالمصنفین اعظم گڑھ) حضرت سید صاحبؒ اور دارالمصنفین، از مولوی ابو البقاء ندوی (دارالمصنفین اعظم گڑھ) حضرت سید صاحبؒ کی خیام پر ایک نظر، از خاکسار راقم۔

حضرت سید صاحبؒ کی علمی فضیلت اور جلالت کچھ ایسی ہے کہ زیادہ تر مقالہ نگاروں نے اس کا اعتراف کیا ہے، کچھ اعتراضات بھی ہوئے، مثلاً ڈاکٹر عنوان چشتی نے اپنے مقالہ میں یہ پیش کیا کہ سید صاحبؒ نے نبی کو محض بشر کہا ہے، مثل بشر نہیں کہا ہے، اور مثل کی تشریح سے گریز کیا ہے، یہ تمام مباحث سید صاحبؒ کی سیرۃ النبی جلد چہارم میں ہیں، جن کو غور سے پڑھا جائے تو اس میں سید صاحبؒ نبی کو نہ صرف بشر بلکہ مافوق البشر بھی کہتے ہیں، اسلیے کہ ان کی مافوق بشری خصوصیات، اخلاقی، روحانی، دماغی، قلبی، علمی اور عملی ہیں، ان کا سرچشمہ الہام الٰہی، القائے ربانی، حکمت یزدانی، فہم رسالت اور ملکۂ نبوت سے ماخوذ ہے (سیرۃ النبی جلد چہارم ص ۱۱۴، ۱۳۱، ۱۳۷) یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ سید صاحبؒ نے مثل کی تشریح سے گریز کیا ہے، سیرۃ النبی جلد چہارم میں مثل بشر کی تشریح کم از کم دس مختلف جگہوں پر کی گئی ہے، کلام پاک میں نبی کے لیے مثل بشر کے الفاظ استعمال نہیں ہوئے، بلکہ بشری کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، البتہ نبوت کی وجہ سے وہ مافوق بشری خصوصیات کے حامل ہو جاتے ہیں۔

آخر میں پروفیسر صاحب کہتے ہیں کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اجتہادی غلطی کرنے والے جس جزوقتی نبی کا تصور پیش کیا ہے وہ قرآن کے اس تصور نبوت کے خلاف ہے جس میں نبی خطا اور نسیان سے محفوظ رہتا ہے، یہ اعتراض بھی صحیح نہیں، سید صاحبؒ جزوقتی نبی کے تصور کی تردید کرتے ہیں اور اس کو نظریہ پسند گروہ کا ایجاد قرار دیتے ہیں اور اس پر انھوں نے افسوس کا اظہار کیا ہے اور اس کو اعتدال کی حد سے باہر قرار دیا ہے (سیرۃ النبی جلد چہارم ص ۱۱۶)، رہی یہ بات کہ رسول اللہ بھی خطا اور نسیان سے محفوظ ہوتے ہیں تو قرآن مجید میں یہ آیت بھی ہے لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ

مقالات

سرسیّد احمد خان اور مستشرقین

از عبید اللہ کوٹی ندوی رفیق دارالمصنفین

(۳)

غلامی | سر ولیم میور کا ایک اعتراض اسلام میں غلامی کے مسئلہ پر بھی ہے، جس کے جواب میں سرسید مرحوم فرماتے ہیں کہ:

"اگر اس معاملہ پر مذہبی طور پر نظر کی جائے تو نہ یہودیوں کو اور نہ عیسائیوں کو اس قدر جرأت ہوسکتی ہے کہ وہ اس میں کچھ عیب نکالیں یا اس کی نسبت کچھ اعتراض کریں، کیونکہ توریت کا ہر صفحہ ایسے مضامین سے بھرا ہوا ہے جس میں غلامی کا جواز تسلیم کیا گیا ہے (خواہ اس کو خدا کا حکم مانو یا حضرت موسیٰ کا یا اس زمانے کے رسم و رواج کا قانون) اور انجیل میں کسی مقام پر ایک مضمون بھی نہیں پایا جاتا جس میں اس بے رحم دستور کی ممانعت ہو" (خطبات احمدیہ ص ۲۶۴)

عیسائیوں کے یہاں غلامی کا رواج اس قدر تھا کہ بقول گاڈفری ہیگنز "انجیل اور حواریوں کے ناموں کے ہر ایک صفحہ میں غلاموں کا جواز تسلیم کیا گیا ہے، مثلاً اس میں جہاں کہیں لفظ "سروس" یا "ڈولوس" پایا جاتا ہے اس کا ترجمہ خدمت گار کیا گیا ہے، وہاں اس کا ترجمہ غلام ہونا چاہیے، لفظ "سروس" کے لغوی معنی اس شخص کے ہیں جو بازار میں خرید اگیا ہو یا فروخت کیا گیا ہو، اور "فریدیئن" ہمارے اجرت دار اور خدمتگار کے

ہم جب یہ دیکھتے ہیں کہ بدقسمتی سے عیسائیوں کو خانگی غلامی کی اجازت دی جانے تو اس سے کسی طرح یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ افریقہ کی بردہ فروشی جائز ہے، جس کی زیادتی کا زمانہ اگلے لوگوں کے گمان میں بھی نہ تھا، اور جو بہر حال پھر ان کی خانگی غلامی سے مختلف ہے۔ (ایضاً ص ۲۹۵) گاڈفری ہیگنز یہ بھی کہتے ہیں کہ "محمد حضرت محمدؐ نے [بعض حالتوں میں] غلامی کے مٹانے کے لیے نہایت عمدہ ترکیبیں کیں، وہ تھے جو ساتویں صدی عیسوی میں عرب کے بیابانوں میں کھڑے ہوئے تھے، حضرت محمدؐ تو فرماتے ہیں کہ ایسے غلاموں کو جو ہم سے اس مضمون کی ایک تحریری سند چاہیں کہ جس وقت وہ ایک رقم معین ادا کردیں گے اپنے آپ کو آزاد کرلیں تو تم ہمیشہ یہ دستاویز ان کو لکھ دو، اگر تم ان میں کوئی بھلائی جانو، تو تم خدا کی دولت میں سے جو اس نے تم کو دی ہے ان کو دو۔" گاڈفری ہیگنز کہتے ہیں کہ مجھ کو انجیل میں ایسا کوئی حکم نہیں ملا۔ (ایضاً ص ۲۶۷) لیکن سرسید مرحوم کا خیال ہے کہ:

"جو لوگ تعلیم کی تاریکی میں اندھے ہو رہے ہیں وہ بھی [گہری] بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی اور خوشی غلاموں کے آزاد کرنے کی تھی اور ہمیشہ ہر حکم میں غلاموں کی آزادی پر رغبت دلاتے تھے، (ایضاً ۲۶۸) اسلام لانے سے غلامی ساقط ہو جانے پر جو استدلال گاڈفری ہیگنز نے کیا ہے ہم کو دل سے اس پر اتفاق ہے، خدائے تعالیٰ نے سورۂ حجرات میں صاف صاف فرمایا ہے کہ (إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ سب ایمان لانے والے آپس میں بھائی ہیں .... اور اس لیے کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کا غلام نہیں ہو سکتا، یہی اخوت اس امر کا باعث ہے کہ جب کوئی مسلمان بغیر وارث ترکہ کے مر جاتا ہے تو اس کا مال بیت المال میں اس کے سب مسلمان بھائیوں کے لیے چلا جاتا ہے، کتابت کا جو ذکر گاڈفری ہیگنز صاحب نے کیا ہے وہ حکم صرف ایسا ہی نہ تھا کہ اس کا کرنا یا نہ کرنا مالک کی مرضی پر موقوف ہو، بلکہ اس کا کرنا واجب تھا، اور انکار کرنا قابل سزا کے تھا، چنانچہ بخاری کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن سیرین نے جب حضرت انسؓ سے کتابت کی درخواست کی تو انھوں نے انکار کیا۔ ابن سیرین نے وہ مقدمہ حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کیا، حضرت عمرؓ نے .... خط آزادی بمعاوضہ حضرت انسؓ سے لکھوا دیا ...." (ایضاً ص ۲۶۹)

مزید غلامی کے بارے میں اسلامی تعلیمات کا ذکر کرتے ہوئے بخاری کی یہ روایت بھی درج کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں کے حق میں فرمایا ہے کہ وہ تمہارے بھائی ہیں (بوجہ انسان ہونے کے) جو تمہاری خدمت کرتے ہیں، تمہارے کاموں کو سنوارتے ہیں، اللہ نے ان کو تمہارا تابع کر دیا ہے، پس جو شخص کہ اس کا بھائی اس کے تابع ہو تو اس کو چاہیے کہ جو آپ کھاتا ہے اس میں سے اس کو کھلا دے اور جو آپ پہنتا ہے اس میں سے اس کو پہنا دے، اور ان سے ایسی تکلیف کے کام نہ لے جو ان کو تھکا دیں، اور اگر ایسی تکلیف کا کام ان کو دیا جائے جو ان کو تھکا دے تو خود ان کی مدد کرے (بخاری باب قول النبی العبید اخوانکم ص ۳۳۶)

اس کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ:

"اس حکم کا لوگوں کے دلوں پر اس قدر اثر ہوا کہ تمام شخص اس زمانے میں اپنے غلاموں کو ویسا ہی کپڑا پہناتے تھے جیسا کہ خود پہنتے تھے، اور ایک خوان میں اپنے ساتھ وہی کھانا ان کو کھلاتے تھے جو آپ کھاتے تھے، اور جب سفر میں جاتے تھے تو غلام کو اپنے ساتھ اونٹ پر بٹھاتے تھے، اور اگر ایک کو نکیل پکڑ کر چلنے کی ضرورت ہوتی تو باری باری سے سوار ہوتے تھے، اور باری باری نکیل پکڑ کر پیادہ پا چلتے تھے، خلیفہ عمرؓ اپنی خلافت کے عروج کے زمانہ میں اپنی باری میں اس اونٹ کی مہار پکڑ کر جس پر ان کا غلام اپنی باری میں سوار ہوتا تھا، عرب کے جلتے ہوئے ریگستان اور جھلستی ہوئی گرم ہوا میں نہایت خوشی اور فخر آمیز خیالات اور نیکی بھرے ہوئے دل سے پیادہ پا اونٹ کو کھینچتے ہوئے چلنا کمال خوشی سمجھتے تھے، فاطمہؓ پیغمبر کی بیٹی، اپنی لونڈی کے ساتھ بیٹھ کر چکی پیستی تھیں کبھی ان کا دست مبارک چکی کو نیچے سے تھامتا تھا اور کبھی لونڈی کا، تاکہ دونوں کو برابر محنت پڑے۔ پس اگر یہی وہ غلامی ہے جس کو سر ولیم میور حسن معاشرت کو ابتر بنانے والی بتاتے ہیں تو ہم نہیں سمجھتے کہ برابری کے حقوق میں اس سے کیا بڑھ کر ہے، ایسی غلامی (اگر اس کو غلامی کہہ سکو) درحقیقت حسن معاشرت کی بے انتہا خوبی اور عمدہ اخلاق کی بنا اور ترقی کا خمیر ہے، پس مذہب اسلام کی غلامی کو ویسٹ انڈیز کی غلامی پر جو عیسائی ملکوں میں جاری تھی قیاس کرنا بالکل غلط ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اسی بات پر بس نہیں کیا، بلکہ

ان کی نسبت رحمدلی و نرمی کے سلوک کے متعلق احکام کے سوا ان کی نسبت [illegible]
شائستہ، مہذب و شفقت آمیز الفاظ سے مخاطب کرنے کی ہدایت فرمائی ۔۔۔ علاوہ اس کے آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں کے آزاد کرنے پر ہمیشہ رغبت دلائی ہے اور فرمایا ہے کہ کوئی کام خدا کے نزدیک
غلاموں کے آزاد کرنے سے زیادہ ثواب حاصل کرنے کا نہیں ہے۔" (ایضاً، ص ۲۷۰ - ۲۷۹)

جو لوگ قدیم رسم جاہلیت کے مطابق غلام ہو چکے تھے، زر معاوضہ لیے بغیر ان کو بطور احسان کے آزاد کرنے کا حکم اسلام نے نہیں دیا، وہ بدستور ان لوگوں کی ملک میں رہے جن کے وہ غلام ہو چکے تھے، اس کی وجہ کیا تھی؟ سر سید مرحوم اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

"اگر کوئی ناسمجھ یہ الزام مذہب اسلام پر دے کہ ان کو بھی دفعتہً کیوں نہ آزاد کر دیا، تو اس کی اس ناسمجھی کا ہمارے پاس کچھ علاج نہیں ہے، مگر اس ناسمجھ کے دل کو ان تمام باتوں کے جاننے سے جو ہم نے اوپر بیان کیں، اس قدر تو ضرور تسلی ہوگی کہ ان بدنصیبوں کی بھی حالت غلامی کی ترمیم اور تخفیف میں جو کچھ اسلام نے کیا وہ کچھ کم نہیں ہے، اور ایسا رحم و شفقت جو اسلام نے ان کی نسبت کیا بے مثل و بے نظیر ہے، اور متعدد تدبیریں اور تاکیدیں اور ہدایتیں ان کی آزادی کی نسبت کیں، اور طرح طرح سے آزاد کرنے پر رغبتیں دلائیں، ہاں بلاشبہ جو سمجھ دار اور دانشمند لوگ ہیں وہ سمجھیں گے کہ آیت حریت کے نازل ہونے سے پہلے جس قدر لوگ غلام ہو چکے تھے، ان کی آزادی کا دفعتہً حکم دے دینا محالات عملی سے تھا، اور غلامی کے معدوم کرنے کی اس سے بہتر کوئی تدبیر نہ تھی کہ آئندہ سے غلاموں کا ہونا بند کر دیا جائے، اور پچھلے غلاموں کی آزادی اور غلامی کی حالت کی ترمیم کی تدبیر کی جائے، پس یہی کام اسلام نے کیا، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کام کسی انسان کا نہیں ہے بلکہ اسی کا ہے جس نے انسان میں حسن معاشرت کو پیدا کیا ہے۔" (ایضاً، ص ۲۸۲)

قرآن مجید کی آیت (فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا ۔۔۔ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً ۴: سورہ محمد)
کی تفسیر میں علماء نے دو مختلف راہیں اختیار کی ہیں [illegible]

بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ ان کو صرف اسی وقت چھوڑنا چاہیے جب کہ وہ مسلمانوں کی رعایا ہو کر مسلمانوں کے ملک میں رہنا قبول کریں، اور بعضوں کی یہ رائے ہے کہ قیدیوں کو بغیر کسی شرط کے چھوڑ دینا چاہیے اور کوئی شرط ان پر نہ لگائی جائے، اور چھوٹ جانے کے بعد ان کو اختیار ہے کہ مسلمانوں کے ملک میں رہیں یا اگر چاہیں تو اپنے ملک چلے جائیں، سرسید مرحوم کے خیال میں یہی رائے بظاہر معقول اور زیادہ مستند، معتبر اور صحیح ہے کہ قیدیوں کو احسان رکھ کر چھوڑ دیتے ہیں، کوئی قید اور شرط نہیں لگائی گئی ہے (ص ۲۴۱)

وہ مسٹر ولیم میور کو یہ جواب دیتے ہیں کہ:

" بقول مسٹر میگنز کے گو حضرت مسیحؑ نے غلامی کو موقوف نہ کیا ہو، مگر ہم نہایت خوشی اور فخر سے کہتے ہیں کہ ہمارے پیارے حضرت محمد رحمۃ للعالمینؐ نے غلامی کو بالکل موقوف کر دیا، تمام قواعد اور قوانین غلامی کے جن کی رو سے ایک شخص دوسرے کا مملوک ہو جاتا تھا، اور جو قدیم زمانے کے بت پرستوں اور اس وقت کی تمام دنیا میں بطور ایک ملکی رسم کے جاری تھی، اور جن رسموں کو اس بڑے مقدس مقنن موسیٰؑ نے بھی بطور ملکی قانون کے اپنی مقدس کتاب میں داخل کیا تھا، اور جن کو حضرت مسیحؑ نے بھی نہیں توڑا تھا، اور جن کو حضرت مسیحؑ کے حواریوں نے بھی تسلیم کیا تھا، دفعتہً منسوخ کر دیا اور تمام پرانی رسموں اور معمول قانونوں کو ایک دو لفظ کے زمانے سے کہ "اَمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً" مٹا دیا۔

پیچیدہ کرنا کردہ قرآں درست   کتب خانہ چند ملت بشست

(قرآن مجید میں) کافروں کے مغلوب ہو جانے پر ان کے قید کرنے کے حکم کا مقصد ان کی جان بچانے اور قید کرنے کے بعد جو حکم ان کی نسبت ہے وہ دو امر میں منحصر ہے، ایک تو احسان رکھ کر چھوڑنے میں اور دوسرے ان سے فدیہ لے کر چھوڑنے میں، جب دو حکم دیے جاتے ہیں تو دونوں میں سے ایک کو بجالانا واجب ہوتا ہے، یہ اختیار نہیں ہوتا کہ دونوں میں سے کسی کو بھی نہ کریں، پس قیدیوں کے ساتھ ان دونوں [illegible] میں سے ایک کا عمل میں لانا واجب ہے، اور احکام [illegible] سے جو خود [illegible]

... جنگ کے قیدیوں کا لونڈی و غلام بنانا بالکل بے سند ہو گیا جب یہ بات ہو گئی
کہ ... کسی قیدی کو فدیہ لے کر چھوڑنا چاہے تو جب تک فدیہ ادا نہ ہو، اس وقت تک
اس کو قید رکھے، مگر وہ قیدی کا بدستور ایک قیدی ہوگا، اور جب قیدی سے فدیہ کا ادا ہونا ناممکن ہوگا
تو درحقیقت تعمیل ایک حکم کی ناممکن ہوگی، اور اسی لیے اس پہلے حکم کی تعمیل واجب ہو گی (ایضاً، ص ۲۰۲)

عیسائی قوموں میں غلامی کا رواج پہلے بھی تھا، اور اس وقت بھی بعض بعض ملکوں میں ان کے یہاں یہ دستور آج تک چلا آتا ہے، سرسید مرحوم کے زمانہ میں کچھ پسماندہ مسلم ریاستوں میں بھی اس رواج کی خبریں ملا کرتی تھیں، چنانچہ وہ اس کی مذمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"جس نالائق اور خراب اور قابل افسوس حالت سے غلامی کا رواج مسلمان ریاستوں میں (اور بعض عیسائی ملکوں میں بھی) ہوتا ہے اس کو دیکھ کر ہم اس خطبہ کے پڑھنے والوں کو یقین دلاتے ہیں کہ جو شخص خود اس کا برتاؤ کرتا ہے یا اوروں کو کرنے دیتا ہے، وہ ٹھیٹ اسلام کے حکم اور اس کے عالی اصولوں کے برخلاف عمل کرتا ہے، اور وہ ضرور ایک دن اس حقیقی شہنشاہ کی ہیبت ناک عدالت میں بطور ایک گنہگار کے حاضر ہوگا، خواہ کہیں جا کر یہ کام کرے یا مدینے میں۔" (ایضاً، ص ۲۰۵)

اسلام میں آزادیٔ رائے سرولیم میور کے نزدیک "اسلام میں مذہب کے بارے میں رائے کی آزادی روک دی گئی ہے، بلکہ بالکل معدوم کر دی گئی ہے۔" مگر سرسید مرحوم فرماتے ہیں کہ سرولیم میور کی اس رائے کا ٹھیک ٹھیک مطلب سمجھنا نہایت مشکل ہے، کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اسلام میں ایسی کون سی چیز ہے جو مذہبی معاملات میں آزادیٔ رائے کو روکتی اور معدوم کرتی ہے، اور دوسرے مذہبوں میں ایسی کون سی بات ہے جو اس آزادی کی اجازت دیتی ہے۔

یہودی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ توریت کا ہر ایک لفظ اپنے تاریخی معنوں سمیت بالہام ہے یہاں تک کہ ان کے معنوں کا معلوم نہیں ہوتا مگر تو معانی ہیں اور اسی لیے یہود خدا کی طرف سے الہام ... ہر ایک انسان کو

کسی قائل، یا کسی حجت، یا اپنے قوائے عقلیہ کا استعمال کیے بغیر ان کے حق ہونے پر یقین کرنا چاہیے۔

کتب مقدسہ کے بارے میں عیسائیوں کے دو فرقے ہیں، ایک وہ جو کتاب مقدس کے تمام و کمال وحی ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں، اور دوسرا وہ جو صرف اس کے ایک حصہ کو جو مسائل و احکام سے متعلق ہے، وحی سمجھتا ہے، اور دوسرے حصے یعنی تاریخی حالات کو وحی نہیں سمجھتا، مگر اس اختلاف سے قطع نظر ان سب کے لیے دو بڑے مذہبی مسائل پر یقین کرنا فرض ہے، جن کی وجہ سے مذہبی معاملات میں آزادی رائے کامل طور پر نیست و نابود ہو جاتی ہے، اس لیے عیسائی خدا کی برگزیدہ قوم (یعنی یہود) سے بھی زیادہ خراب حالت میں ہیں، اور وہ مسئلے یہ ہیں:

ایک مسئلہ توحید فی التثلیث اور تثلیث فی التوحید کا ہے، یہ ایک عجیب مسئلہ ہے، جس کی نسبت عقل کو کام میں لانا منع ہے، خدا کے تین مقدس جسموں کے اظہار کے لیے تثلیث کا لفظ دوسری صدی عیسوی تک (جب کہ تھیوفلس بشپ آف انطیوک نے اس کو ایجاد کیا) جاری نہیں ہوا تھا اور یہ تثلیث کا مسئلہ مذہبی کونسل نائس یا نائسیا میں بھی (جو حضرت عیسیٰ کے ۳۲۵ برس بعد ہوئی تھی، اور جس میں ایریس کے مسائل کی نسبت اعتراض کیا گیا تھا) طے نہیں ہوا تھا، اور کچھ اسی پر موقوف نہیں ہے، کیونکہ پارسن اور دوسرے مشہور و معروف یونانی عالموں کی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ اصل عبارت متن انجیل کی جس سے خاص اس مسئلہ میں استدلال کیا جاتا ہے الحاقی ہے، پس اگر نہایت عجیب و مشکل اور خلاف عقل مسائل پر یقین کر لینے ہی کو اعتقاد کی خوبی قرار دیا جائے تو بلاشبہ عیسائیوں کا اعتقاد بہت بڑا اعتقاد متصور ہوگا، اور کسی کے لیے عیسائی کہلانے اور خدا کی بارگاہ میں عیسائیوں کی طرح حقوق حاصل کرنے سے پہلے اس عجیب و غریب مسئلہ پر پختہ یقین کرنا لازمی ہوگا، بقول سرسید احمد خان:

> "تمام عیسائی یہ بات کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ مسئلہ قانون قدرت اور آئین عقل کے بالکل برخلاف ہے، تاہم آنکھ بند کر کے اور عقل کو محض بیکار و معطل چھوڑ کر نہایت اصرار و تعصب سے اس پر اعتقاد کرنا چاہیے"

دلیل و عقل کے اس سے قتل دینا ہرگز ہرگز جائز نہیں ہے۔" (ایضاً، ص [illegible])

دوسرا مسئلہ فدیہ کا، یعنی حضرت عیسیٰؑ کا تمام بنی نوع انسان کے پچھلے اور حال کے اور آئندہ گناہوں کے عوض صلیب پر چڑھنے اور جان دینے کا ہے، اور یہ بات قدرت اور عقل دونوں کے برخلاف ہے، جس سے معاملات مذہبی میں آزادی رائے بالکل ختم ہو جاتی ہے، اور اس کی وجہ سے انسان اپنے اعمال کا جواب دہ نہیں رہتا، اس کے لیے بدی اور بداخلاقی کے دروازے کھل جاتے ہیں، کیونکہ جس قدر کثرت سے کوئی گناہ کرے گا اسی قدر زیادہ نجات دینے والے کی نیکی کا ثبوت ہوگا۔ (ایضاً، ص ۲۷۷) بہر حال یہودی اور عیسائی مذاہب میں آزادی رائے کے معدوم ہونے بلکہ خلاف عقل عقیدہ رکھنے کی کسی قدر تفصیل کے بعد سر سید مرحوم نے یہ واضح کر دیا ہے کہ:

"مذہب اسلام کی نسبت یہ بات بڑے اطمینان اور بھروسے سے کہی جا سکتی ہے کہ سر ولیم میور نے جو رائے اس کی نسبت لکھی ہے وہ حیثیت اسلام کے بالکل برخلاف ہے، بلکہ مذہبی عقیدہ اور مذہبی معاملات میں جو آزادی رائے اسلام نے دی ہے وہ بے نظیر ہے، اور شاید دنیا میں کوئی مذہب اس معاملہ میں اس سے فائق نہیں ...... ہم اپنی اس تحریر کی تائید میں صرف اپنے ہم مذہبوں ہی کی شہادت کو پیش نہیں کرتے بلکہ اور مذہب خصوصاً مذہب عیسائی کے فیاض اور دانشمند، بے تعصب معتقدوں کی بھی شہادت پیش کر سکتے ہیں، مشہور و معروف فرانسیسی عالم ایم ڈی سینٹ ہلیر نے لکھا ہے کہ "اسلام میں کوئی بات مشتبہ یا قدرت کی باتوں سے بڑھ کر بطور اعجوبہ کے نہیں ہے، مذہب اسلام خود اس بات کا مخالف ہے کہ وہ کسی پردہ میں پوشیدہ کیا جائے، اور اگر اب تک اس میں چند شبہات موجود ہیں تو اس کا الزام مذہب اسلام پر نہیں ہے، کیونکہ وہ ابتداء ہی سے ایسا صاف اور سچا ہے جتنا کہ ہونا ممکن ہے۔" (ایضاً، ص ۲۷۹)

انھوں نے یہ بھی وضاحت کی ہے کہ دین محمدی کی رو سے تمام مذہبی روایتوں اور حدیثوں کی نسبت، راویوں اور روایت کے مضمون کی نسبت آزادانہ تحقیقات اور بے تعصبانہ رائے اور تحقیق کے بعد نامعتبر

[illegible]نے میں ہر شخص کو کیسا اختیار ہے، جو روایتیں کہ غور و فکر اور نہایت تحمل اور بردباری سے تحقیق کے بعد عقل اور
قدرت کے خلاف ثابت ہوں یا اور کسی طرح موضوع قرار پائیں، یا جو روایتیں اور حدیثیں بے سند ہوں ان سب کو
رد کر دینے کا کلیۃً مجاز ہے، قرآن مجید کی نسبت بھی جس کے ہر ایک لفظ کو مسلمان وحی سے مانتے ہیں مذہب اسلام
میں جس قدر آزادی حاصل ہے، کسی دوسرے مذہب میں نہیں ہے، ہم نے قرآن مجید کے سچ ہونے کو بھی
اس کی سچائی ثابت ہونے پر چھوڑا ہے، مذہب اسلام کی رو سے ہر ایک شخص کو آزادی حاصل ہے کہ خود قرآن مجید
کے احکام پر غور کرے اور جو ہدایت اس میں پاوے اس پر عمل کرے، اسلام میں ایسی قوت کسی کو بھی حاصل نہیں
ہے کہ وہ دوسرے کو اپنی اطاعت اور اپنے اجتہاد کی پیروی پر مجبور کرے، مذہب اسلام میں یہ بھی ہدایت
نہیں ہے کہ اس کا جو سب سے بڑا اصول ہے یعنی خدا کا وجود اور اس کی وحدانیت' وہ بھی عقل کی مداخلت
کے بغیر' اندھا دھند اعتقاد اور بے سمجھے غلامانہ طور پر تسلیم کر لیا جائے، کیونکہ خود قرآن مجید اس بڑے مسئلہ کو جبر
و سختی و ناسمجھی سے نہیں بلکہ دلیلوں اور قدرتی نشانیوں سے اس کو سکھاتا ہے، قرآن مجید میں سب سے پہلے
خدائے تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت کو تمام قدرتی چیزوں کے وجود سے ثابت کیا ہے اور اس کے
بعد اس لازوال ہستی اور ہمہ راستی پر یقین کرنے کی ہدایت کی ہے، پھر خدا کی وحدانیت کی دلیلیں عام فہم طریقے
پر بیان کی ہیں، پس امور مذہبی میں جیسی آزادی رائے اسلام میں ہے اس سے زیادہ اور کیا ہو گی۔ (ایضاً
ص ۸۸ ـــ ۲۸۰ ملخصاً)

<u>تلوار کی کاوش</u> اسلام پر ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا ہے کہ اس کو قبول نہ کرنے کی لازمی سزا تلوار ہے، مگر جیسا کہ سرسید
مرحوم فرماتے ہیں:

(یہ اعتراض نہایت سخت ہے جو مسلمانوں کے ایک الزام ہے جو غیر مذہب والے لگاتے ہیں، انصاف سے
[illegible]
[illegible]

کہ اسلام زبردستی اور تلوار سے پھیلایا جاتا ہے "قرآن مجید کے اس صاف اور روشن حکم کے بالکل برخلاف ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے کہ "دین پر لانے میں کچھ دباؤ ڈالنا نہیں ہے، کیونکہ سیدھی راہ گمراہی سے علاحدہ کھل گئی ہے۔ (بقرہ : ۲۵۷)

جب کافر خدا کے نام کی منادی کے مانع ہوں اور خدا پرستوں کو جان و مال کے امن سے نہ رہنے دیں جیسے کہ مکہ کے کافروں نے کیا، اور پھر جہاں گئے وہ بھی تعاقب میں دوڑے، اسی وقت بلاشبہ اپنا بچاؤ کرنے کا اور خدا کے نام کو بلند کرنے کی غرض سے اسلام نے تلوار نکالنے کی اجازت دی ہے، مگر اسی وقت تک جہاں تک یہ مقصد حاصل ہو جائے، تا کہ مسلمانوں کو جان و مال کی حفاظت ہو اور بذریعہ وعظ و تلقین خدائے واحد کا جلال لوگوں کے دل میں بٹھا دیں۔ ..... ہمارے اس قول کی تصدیق کہ وہ تلوار صرف اسی مقصد کے حاصل ہونے تک نکالی جاتی ہے، نہ کافروں کے زبردستی مسلمان ہونے کے مقصد سے، وہ اس بات سے ہوتی ہے کہ تنہا اسی مقصد کے حاصل ہوتے ہی تلوار میان میں رکھ لی جاتی ہے اگرچہ ایک کافر بھی مسلمان نہ ہوا ہو۔ جس اصول پر حضرت موسیٰ نے کافروں پر تلوار کھینچی تھی اور یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک خدا کے حکم سے وہ تلوار کھینچی گئی تھی، کہ تمام کافروں اور بت پرستوں کو بغیر کسی استثناء کے قتل و غارت و نیست و نابود کر دیں، اس اصول پر مذہب اسلام نے کبھی تلوار کو میان سے نہیں نکالا۔ اس نے کبھی تمام کافروں اور بت پرستوں کے نیست و نابود کرنے کا یا کسی کو تلوار کی دھار سے مجبور کر کے اسلام قبول کروانے کا ارادہ نہیں کیا۔" (ایضاً ص ۹۰ - ۲۰۰)

دوسرے مذہبوں کے لیے آزادی

ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا ہے کہ اسلام میں دوسرے مذاہب کو آزادی نہیں دی گئی ہے، چنانچہ سرسید یہ بتاتے ہیں کہ اسلام میں تلوار کا استعمال محدود مقاصد کے لیے تھا، اور وہ یہ کہ مسلمان امن سے رہیں، خدائے واحد کی پرستش کیا کریں، خدا کا نام لوگوں میں بلند کریں، اور اپنے چال چلن اور عادات و عبادات و محبت [illegible] سے اسلام کی عمدگی لوگوں کو دکھلا دیں اور ان کی

تین ہی صورتیں ممکن ہیں:

ایک یہ کہ مذہب ہو جائے اور لوگ مسلمان ہو جائیں، جیسا کہ مدینہ میں ہوا، دوسری صورت یہ ہے کہ صلح رہے، کفار فرائض مذہبی کی ادائیگی پر معترض نہ ہوں، جیسا کہ ابتداءً مکہ میں تھا، یا جس طرح کہ مسلمان حبشہ میں ہجرت کے بعد امن سے رہے، یا کسی جنگ کی صورت میں کفار صلح کے طور پر تسلیم کر لیں کہ مسلمانوں کو ملک میں رہنے، آمد و رفت رکھنے، ان کی جان و مال کی حفاظت اور فرائض مذہبی کی ادائیگی میں ان پر معترض نہ ہوں گے، تیسری صورت یہ ہے کہ ملک فتح ہو جائے اور فرائض مذہبی کی ادائیگی اور اعلائے کلمۃ اللہ پر مسلمانوں سے تعرض کرنے کی کسی میں کوئی طاقت ہی باقی نہ رہے، اس کے بعد جیسا کہ سرسید مرحوم نے تصریح کی ہے:

"ان تینوں صورتوں میں سے کسی صورت سے مقصد حاصل ہونے کے بعد فوراً تلوار میان میں رکھ دی جاتی ہے گو کہ ایک کافر بھی مسلمان نہ ہوا ہو، اور اگر پچھلے دونوں طریقوں میں سے کسی ایک طریقے میں امن قائم ہوا ہو تو کسی کو کسی کی مذہبی رسومات میں دست اندازی کا اختیار حاصل نہیں ہوتا، ہر شخص کو آزادی حاصل رہتی ہے کہ بغیر اس کے کوئی شخص اس کو ایذا پہنچائے، اپنے مذہب کی تمام رسومات کو ادا کرے۔" (ایضاً، ص ۲۹۱)

سرسید اس بات سے تو انکار نہیں کرتے کہ "مسلمان فتحمندوں میں سے بعضوں نے نہایت بے رحمی کی اور دوسرے مذہب کی آزادی کو برباد کر دیا" مگر وہ یہ کہتے ہیں کہ مذہب اسلام کا اندازہ ان کے افعال سے نہ کرنا چاہیے، بلکہ ہم کو یہ تحقیق کرنی چاہیے کہ انھوں نے مذہب اسلام کے مطابق عمل کیا یا نہیں، اس وقت ہم کو صاف یہ بات معلوم ہوگی کہ ان کے افعال مذہب اسلام کے بالکل برخلاف تھے، مگر وہ مسلمان فتحمند جو اپنے مذہب کے بھی پابند تھے، دوسرے مذہب کی آزادی میں خلل انداز نہ تھے اور اپنی تمام رعایا کو ہر طرح کا امن اور آزادی بخشتے تھے، چیمبرز ان سائیکلو پیڈیا میں ایک عیسائی مصنف نے جس کی ذات سے بہت کم توقع ہو سکتی ہے کہ وہ اسلام کا طرفدار ہو، اسپین کے علم و تاریخ پر ایک آرٹیکل لکھا ہے

جس میں یہ ہے کہ:

"اسپین کے بنی امیہ خلفاء کی حکومت کی ایک مشہور و معروف بات بیان کے قابل ہے کہ نہ صرف اسپین کے ہم عصر (یعنی عیسائی) اور پچھلے مسلمان بادشاہوں کے مقابلے میں بلکہ اس زمین پر عمدہ سے عمدہ زمانے تک اسکے بادشاہوں میں یہ خوبی پائی جاتی ہے کہ انہوں نے عام طور سے دوسرے مذہب کو مذہبی معاملات میں آزادی دیا۔" (ایضاً ص ۲۹۳)

مذکورہ بالا اقتباس کے جواب میں موصوف نے ایک مسیحی عالم گاڈفری ہیگنز کی یہ رائے بھی درج کی ہے کہ "کوئی بات ایسی عام نہیں ہے، جیسا کہ عیسائی پادریوں کی زبانی مذہب اسلام کی مذمت یا عجیب ظلم اور محض ریاکاری ہے، وہ کون تھا (عیسائی) جس نے مور مسلمان باشندگان اسپین کو اسپین سے اس لیے جلاوطن کر دیا تھا کہ وہ عیسائی مذہب نہیں قبول کرتے تھے، اور وہ کون تھا (عیسائی) جس نے میکسیکو اور پیرو کے لاکھوں باشندوں کو قتل کیا تھا اور ان سب کو بطور غلام کے دیدیا تھا، اس وجہ سے کہ وہ عیسائی نہ تھے۔ مسلمانوں نے اس کے برخلاف یونان میں کیا کیا؟ کئی صدیوں سے عیسائی امن و امان کے ساتھ اپنی ملکیت پر قابض چلے آتے ہیں اور ان کے مذہب، ان کے پادریوں، ان کے بشپ، ان کے بزرگوں، ان کے گرجاؤں کی نسبت دست اندازی نہیں کی گئی ہے، جو لڑائی بالفعل (یعنی مسٹر ہیگنز کی اس تحریر کے زمانہ میں) یونانیوں اور ترکیوں میں ہو رہی ہے، وہ بہ نسبت اس لڑائی کے جو حال میں دیمرارا کے حبشیوں اور انگریزوں میں ہوئی تھی کچھ زیادہ مذہب کی وجہ سے نہیں ہے، یونانی اور حبشی اپنے تحکمندوں کی اطاعت سے آزاد ہونا چاہتے ہیں، اور ان کا ایسا کرنا واجب ہے، جب کبھی خلیفہ فتحیاب ہوتے تھے، اور وہاں کے باشندے مسلمان ہو جاتے تھے تو فوراً ان کا رتبہ بالکل تحکمندوں کے برابر ہو جاتا تھا، ایک نہایت دانشمند عالم نے مسلمانوں کے ذکر میں بیان کیا ہے کہ "وہ کسی شخص کو ایذا نہیں دیتے تھے، اور یہودی اور عیسائی سب ان میں خوش و خرم تھے"

گاڈفری ہیگنز نے اسپین سے مور مسلمانوں کے جلاوطن کیے جانے کے بارے میں ایک دلچسپ مگر حقیقت پسندانہ بات یہ بھی لکھی ہے کہ:

• بلکہ جو لوگ [illegible] سے مجبور کیے گئے تھے کہ وہ عیسائی مذہب قبول نہیں کرسکتے تھے
مگر جو لوگ یہ سمجھتے کہ اس کا سبب یہ ہوا تھا، یعنی میں خیال کرتا ہوں کہ وہ اپنی دلیلوں سے عیسائیوں پر
اس قدر غالب آگئے تھے کہ تمام عیسائی سمجھتے تھے کہ ان کی دلیلوں کا جواب صرف مذہبی عدالت
سے سزا دینا اور تلوار سے ہو سکتا ہے، اور مجھ کو کچھ شبہ نہیں ہے کہ جہاں تک ان کی ناقص قوت جواب
دینے کے باب میں تھی، وہاں تک ان کا یہ خیال صحیح تھا، جن ملکوں کو خلیفہ فتح کرتے تھے، وہاں کے غریب
باشندے خواہ یونانی، ایرانی، اسپین، خواہ ہند قتل نہیں کیے جاتے تھے، جیسا کہ عیسائیوں نے بیان
کیا ہے، بلکہ فتح ہوتے ہی وہ سب بہ امن و امان اپنی ملکیت اور اپنے مذہب پر قابض چھوڑ دیے
جاتے تھے، اور اس پچھلے حق کی بابت ایک محصول دیتے جو اس قدر خفیف ہوتا ہے کہ کسی کو گراں نہیں معلوم
ہوتا، خلفاء کی تمام تاریخ میں کوئی ایسی بات نہیں مل سکتی جو ایسی رسوائی کا باعث ہو جیسے کہ عیسائیوں میں
مذہبی عدالت سے سزا دینا تھا، اور نہ کوئی مثال بھی ایسی پائی جاتی ہے کہ کوئی شخص اپنا مذہب چھوڑنے کے
سبب جلا گیا ہو، نہ مجھ کو یہ یقین ہے کہ زمانۂ امن میں صرف اس وجہ سے قتل کیا گیا ہو کہ اس نے مذہب
اسلام قبول نہیں کیا۔" (ایضاً ص ۲۹۵)

جزیہ کے بارے میں ہیگنز کے خیال کی تردید

ابھی مذکورۂ بالا اقتباس میں گاڈفری ہیگنز کا ایک فقرہ یہ تھا کہ (مفتوح قوم کے غیر مسلم) پچھلے حق کی بابت ایک محصول دیتے، اس جملے سے یہ شبہہ ہوتا ہے کہ غیر مسلم رعایا کو اپنے مذہب پر باقی رہنے کی وجہ سے اس کے معاوضہ کے طور پر جزیہ ادا کرنا ہوتا تھا، حالانکہ جزیہ کی یہ توجیہ درست نہیں، چنانچہ سرسید احمد خاں مرحوم اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

" مسٹر ہیگنز نے بیان غلطی کی ہے، کافروں میں جو مفتوح ہو جاتے ہیں، اس معاوضہ میں کہ ان کو
ان کے مذہب پر چھوڑ دیا گیا ہے جزیہ نہیں لیا جاتا ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ مثل مسلمانوں کے بے تنخواہ
یا قلیل تنخواہ پر فوجی خدمت پر مجبور نہیں کیے جاتے اور حکومت اسلامی کے قائم رکھنے اور امن و امان کے

عمال رجسٹر کے آرڈیننس کے مقصد اور غرض [illegible] بلکہ گورنمنٹ ان کے

حفظ و امن کی ذمہ دار ہوتی ہے، ان سب باتوں کے معاوضہ میں ان سے چندہ لیا جاتا ہے اور یہ چندہ

لازمی نہیں ہے، بلکہ خلیفہ کو کسی مصلحت کے پیش نظر بالکل اختیار ہے، چاہے لے، چاہے نہ لے،

پس یہ امر سیاست مدن سے متعلق ہے، نہ مذہب سے، مسلمانوں پر اس سے بہت زیادہ سخت محصول

ہے، یعنی ہر سال چالیسواں حصہ اپنے مال کا۔" (ایضاً ص ۲۹۳۔ حاشیہ)

اسلام کی دی ہوئی مذہبی آزادی اور عیسائیوں کا طرز عمل

اسلام میں دوسرے مذہبوں کو آزادی دی گئی ہے، لیکن اس کے برخلاف عیسائیوں کا طرز عمل بڑا افسوسناک رہا ہے، چنانچہ جان ڈیون پورٹ نے اپنی کتاب "اپالوجی" میں لکھا ہے کہ "نائیسا کی کونسل میں کانسٹنٹائن نے پادریوں کی جماعت کو وہ اختیار دیا تھا کہ جس سے نہایت ہیبت ناک نتیجے پیدا ہوئے تھے، یعنی خوں ریزی اور بربادی' ان احمقانہ جہادوں کی جو عیسائیوں نے قریباً دو سو[۲۰۰] برس تک ترکوں پر کیے تھے، اور جس میں کئی لاکھ آدمی ہلاک ہوئے، ان لوگوں کا قتل جو اس بات کو تسلیم نہیں کرتے تھے کہ انسان کا دوبارہ اصطباغ ہونا چاہیے، لوتھر کے پیروؤں اور رومن کیتھولک مذہب والوں کا دریائے راین سے لے کر انتہائے شمال تک قتل ہونا، وہ قتل جس کا حکم ہنری ہشتم اور اس کی بیٹی نے دیا، فرانس میں سینٹ بارتھو لومیو کا قتل ہونا، اور چالیس[۴۰] برس تک اور دوسری بہت سی خوں ریزیوں کا ہونا، فرانسس اول کے عہد سے ہنری چہارم کے پیرس میں داخل ہونے تک، عدالت مذہبی کے حکم سے قتل کا ہونا جو اب تک قابل تعریف ہے، کیونکہ وہ عدالت کے حکم سے ہوا تھا، اس کے علاوہ دوسری بے انتہا بدعتوں اور ان بیس[۲۰] برس کی خرابیوں کا تو کچھ ذکر ہی نہیں ہے جب کہ پوپ پوپ کے مقابلہ میں اور بشپ بشپ کے مقابلہ میں تھے' زہر دے کر یا دوسرے طریقوں سے قتل کی واردات میں، تیرہ، چودہ پوپ کی بے رحم لوٹ اور گستاخانہ دعوے جو ہر قسم کے گناہ، عیب اور بدکاری میں ایک نیرو یا ایک کیلیگیولا سے بڑھ کر تھے، اور آخر کار

اس خوفناک غیر رسم کا خاتمہ ہونے کے لیے ایک کروڑ بیس لاکھ نئی دنیا کے باشندوں کا صلیب ہاتھ میں لیے قتل ہونا، ایک ایسا مکروہ اور تقریباً ایک غیر منقطع مذہبی لڑائیوں کا سلسلہ جس کے بارے میں تسلیم کرنا چاہیے کہ چودہ سو برس تک سوائے عیسائیوں کے اور کہیں ہرگز جاری نہیں رہا، اور جن قوموں کی نسبت بت پرست ہونے کا طعن کیا جاتا ہے ان میں سے کسی قوم نے ایک قطرہ خون کا بھی مذہبی دلائل کی بنا پر نہیں بہایا (ایضاً، ص ۲۹۷)

لیکن عیسائیوں کے برعکس مسلمانوں کا دوسرے مذہب والوں کے ساتھ جو برتاؤ تھا، اس کے بارے میں سرسیدؒ نے مشہور مورخ گبن کا یہ اعتراف درج کیا ہے کہ:

"آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو اپنی حیات میں مختلف نصیحتیں کیں اور نظیریں قائم کیں، ان سے خلفائے دوسرے مذہب کو آزادی دینے کی نصیحت پائی، ... ملک عرب میں جو حضرت محمدؐ کے خدا کی عبادت گاہ اور اس کا ملک تھا، بہت سے دیوتاؤں کے ماننے والے اور بت پرست جو ان کو مانتے تھے شرعاً نیست و نابود کیے جا سکتے تھے، مگر انصاف کے فرائض سے نہایت عاقلانہ تدبیر اختیار کی گئی، ہندوستان کے مسلمان فتحمندوں نے اس مرتاض اور آباد ملک کے مندروں کو چھوڑ دیا۔" (ایضاً ص ۲۹۸)

وہ ایک دوسرے مصنف کے آرٹیکل سے جو ایسٹ اینڈ ویسٹ اخبار میں شائع ہوا تھا، یہ اقتباس بھی پیش کرتے ہیں کہ:

"اسلام نے کسی مذہب کے مسائل میں دست اندازی نہیں کی، کسی کو ایذا نہیں پہونچائی، کوئی مذہبی عدالت مخالف مذہب والوں کو سزا دینے کے لیے قائم نہیں کی، اور کبھی اسلام نے لوگوں کے مذہب کو بجبر تبدیل کرنے کا قصد نہیں کیا، ہاں اس نے اپنے مسائل کو جاری کرنا چاہا، مگر [illegible]

[illegible]

[illegible] تھیں۔" یہی مصنف [illegible] لکھتا ہے کہ فلسطین میں ایک [illegible]

شاہ ولیم [illegible] نے علانیہ یہ کہا تھا کہ صرف مسلمان ہی تمام روئے زمین پر ایک قوم ہیں جو دوسرے

مذہب کو آزادی دے سکتے ہیں۔" اور ایک انگریز مصنف [illegible] نے صاف طور پر تسلیم کیا ہے

کہ وہ سب سے زیادہ دوسرے مذہب کو آزادی دیتے ہیں۔" (ایضاً صفحہ ۲۹۹)

مندرجہ بالا اقتباسات پیش کرنے کے بعد سرسید فرماتے ہیں کہ:

"اب دیکھو کہ بہت سے نامور، فیاض طبع، عیسائی مصنفوں کی یہ رائیں مسٹر ولیم میور کے اس

بہتان سے کہ اسلام میں دوسرے مذہب کو آزاد رکھنے کا نام بھی نہیں ہے، کتنی مختلف ہیں"

(ایضاً ص ۳۰۰)

سرسید نے مذکورہ اعتراض کا جواب دیتے ہوئے ان دوسرے فائدوں کا بھی ذکر کیا ہے جو اسلام کی وجہ سے دوسرے مذاہب کو پہونچے، اس نے دراصل یہودیوں اور عیسائیوں کے یہاں جو ناقص اور نامکمل پہلو رہ گئے تھے، ان کی تکمیل کی۔ اسلام سے پہلے یہودی اور عیسائی اکثر پیغمبروں اور پاکیزہ لوگوں سے نہایت بداخلاقی کے افعال قبیحہ کو منسوب کرتے تھے، جن کو الہام ربانی سے کچھ تعلق نہ تھا، اسلام نے ان خداپرست لوگوں اور پاک خصلت بزرگوں کو ان تہمتوں سے بچایا، اور ان کے معصوم اور بےگناہ ہونے کا اعلان کیا، اور عیسائیوں اور یہودیوں کی تمام غلطیوں کو ظاہر کیا۔ حضرت ابراہیم، حضرت لوطؑ اور ان کی بیٹیوں، حضرت اسحاقؑ، حضرت یہوداؑ، حضرت یعقوبؑ کی بیویوں اور بیٹیوں، اور حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ وغیرہم کی ان کے بابت باوجودیکہ انہوں نے ان کو پیغمبر تسلیم کیا تھا اور مقدس جاننے کے ایسی تصویر کھینچی تھی کہ وہ [illegible]

[illegible]

[illegible] یہودی جن کے وہ حق تھے، یہود عیسائیوں کے مقدس بزرگوں حضرت عیسیٰؑ اور حضرت یحییٰؑ کے سخت مخالف اور دشمن تھے، جن کی طرف سے اسلام نے صفائی پیش کی، جو عیسائیوں پر ایک بڑا احسان ہے، اس نے عیسائیوں کو پوپ کے بے انتہا اختیارات سے نجات دی اور عیسائیوں میں زندگی کی روح پھونک دی، ورنہ آج تمام دنیا کے عیسائی ایسے ہی بت پرست ہوتے، جیسے کہ اب تک رومن کیتھولک فرقے کے لوگ ہیں، درحقیقت لوتھر نے اسلام سے یہ مدد پائی تھی جس پر اس کے مخالف اس پر یہ الزام لگاتے تھے کہ وہ دل سے مسلمان تھا، تاہم اس نے اپنی کوششوں کو نہیں چھوڑا، اور آخرکار وہ عظیم الشان اصلاح کرنے پر قادر ہوا، جو عموماً مذہب پروٹسٹنٹ یا ریفارمیشن کے نام سے مشہور ہے، اور طبیعت انسانی کو تمام غلامیوں کی بدترین غلامی سے آزاد کر دیا، ہم کو یقین ہے کہ اگر "لوتھر مقدس" اور زندہ رہتے تو ضرور مسئلہ تثلیث کے بھی مخالف ہوتے، اور اسلام کی ہدایت سے خدا کی وحدانیت کے مسئلہ کو بھی جو درحقیقت حضرت عیسیٰؑ نے بھی تلقین کیا تھا، لوگوں میں پھیلاتے، اور آخر اس نبی آخر الزمانؐ پر یقین کرتے جس نے ایسی ایسی بڑی غلطیوں سے عیسائی مذہب کو بچایا تھا، پس مذہب عیسوی کو ہمیشہ اسلام کا احسان مند رہنا چاہیے" (ایضاً ۲۰۱)

کچھ مذہبی کتابوں کے بارے میں

ابتدائے عہد اسلام تدوین علوم کا دور تھا، جس میں ہر طرح کے علوم و فنون کی تدوین ہوئی، کچھ لوگوں نے ثقہ راویوں کے بیانات قلمبند کیے، کچھ نے ثقہ اور غیر ثقہ، صادق و کاذب ہر طرح کے راویوں سے حاصل کردہ معلومات یکجا کر دیں، اور ان کے راویوں کا ذکر بھی درج کر دیا، کچھ مصنفین کی غرض نہ تو کسی قصے کی تصدیق تھی، اور نہ کسی روایت کی اصلیت کی تحقیق، بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ جو کچھ ہر ایک واقعہ کی نسبت مشہور اور زبان زد ہے، اس کو لکھ لیں اور ایک جگہ جمع کر دیں، اور ان قصوں کی صحت یا عدم صحت کی چھان بین پڑھنے والے کی جان فشانی اور تحقیق اور رائے پر چھوڑ دیں، بعد کے علماء نے متن اور راویوں پر نظر کر کے صحیح، ضعیف، اور موضوع روایتوں

کے الگ الگ مجموعے تیار کیے، اور راویوں کے حالات میں مفصل کتابیں تحریر کیں، جس کا نتیجہ اب صحیح اور غلط کی تمیز کا کام آسان ہو گیا، اور یہ واضح ہو گیا کہ کون سی کتابیں اور کون کون سے راوی معتبر ہیں اور کون غیر معتبر۔ روایت کے قبول کرنے کے بارے میں سر سید مرحوم فرماتے ہیں:

"جن احادیث کو ہم مسلمان قابل سند خیال کرتے ہیں ان میں کم سے کم مندرجہ ذیل امور کا ضرور لحاظ ہونا چاہیے، راوی نے صاف اور صریح طور پر بیان کر دیا ہو کہ فلاں بات پیغمبر خدا نے فرمائی تھی یا کی تھی، سلسلہ راویوں کا پیغمبر خدا تک غیر منقطع (یعنی مسلسل) ہو، پیغمبر خدا سے لیکر اخیر راوی تک جملہ راوی تقوی اور دین اور نیک اعمال کے لیے مشہور ہوں، ہر راوی کو اپنے ما سبق راوی سے ایک سے زیادہ حدیثیں پہونچی ہوں، ہر راوی لیاقت علمی اور تفقہ میں ممتاز ہو، تاکہ یہ امر متیقن ہو جائے کہ اس نے حدیث کے صحیح معنی کو سمجھ لیا ہوگا اور دوسروں کو بھی ٹھیک طور سے سمجھا دیا ہوگا، وہ قرآن مجید میں درج احکام یا قرآن مجید سے معلوم ہونے والے مذہبی عقائد یا مستند حدیث کے مضمون سے متناقض (مخالف) نہ ہو، اس میں عجائب و غرائب، دور از عقل بیان نہ ہوں، بلکہ مفہوم حدیث ایسا ہو جس کے تسلیم کرنے میں لوگوں کو کلام نہ ہو، کوئی حدیث جس کی صحت اس طرح ثابت ہو جائے کسی عقیدۂ مذہبی کی بنیاد بن سکتی ہے، لیکن اگر وہ حدیث ایک ہی شخص کی روایت ہے تو مفید یقین (یعنی عقیدہ کی بنیاد) نہیں ہو سکتی، بلکہ افادۂ ظن کرتی ہے۔" (خطبات احمدیہ، ص ۲۵۴)

اسی بنا پر علمائے اسلام نے احادیث کی قسمیں، ان کے درجات، قبول کی شرطیں، کتب احادیث کی تفصیل، ان کے درجہ و معیار کی وضاحت، راویوں کی قسمیں، ان کے تفصیلی حالات، سب ہی پر کام کیا ہے، اور حق اور ناحق، صحیح اور غلط کی تمیز، قرآنی احکام، قرآنی عقائد، مستند احادیث اور غیر معتبر روایات پر اتنا زبردست کام ہوا ہے کہ اب مسلم اور غیر مسلم محقق کے لیے اصلیت کا پتہ لگانا کچھ بھی دشوار نہیں، مگر مستشرقین رطب و یابس میں تمیز نہیں کرتے، اور نہ ہی راویوں کے حالات اور روایت کے معیار سے کچھ غرض رکھتے ہیں، بلکہ وہ بقول سر سید مرحوم:

"ہمارے جناب پیغمبر خدا کی سوانح عمری لکھنے میں اور کتب سیر سے ان حالات کو منتخب کرنے میں بد دینی مصنفوں نے اس قدر مستقل تحقیقات کو اختیار نہیں کیا ہے جو اس مضمون کی عظمت کے شایان ہے، بلکہ برخلاف اس کے بغض اور تعصب کی وجہ سے انھوں نے دیدہ و دانستہ اس روشنی سے آنکھ چرائی ہے، جس کی شعاعیں ان کے چہرہ پر پڑ رہی تھیں، اور اس طرح پر انھوں نے اپنے حق میں اس مثل کی تصدیق کی ہے کہ "کوئی شخص ایسا اندھا نہیں ہے جیسے کہ وہ لوگ جو ارادۃً نہیں دیکھتے۔" (ایضاً ص ۳۲۲)

مقدس جھوٹ | غلط روایات کے قبول کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں علمائے اسلام اور علمائے مسیحیت یا مستشرقین کے درمیان ایک بنیادی فرق سرسید مرحوم کے نزدیک یہ بھی ہے کہ:

"علمائے اسلام نے مقدس جھوٹ کو کبھی اپنے مذہب کے عقائد میں قرار نہیں دیا، بلکہ وہ ایسے کام کو ہمیشہ گناہ عظیم سمجھتے رہے، اور اس لیے انھوں نے جھوٹی روایتوں کے بنانے والوں کو، گو کیسے ہی پاک اور نیک ارادے سے انھوں نے ایسا کیا ہو، جہنم کے سوا اور کوئی جگہ نہیں دی، مگر برخلاف اس کے علمائے مذہب عیسوی نے مثل آرجن وغیرہ کے صریح اپنے باطنی عقائد کے خلاف معاملات مذہبی میں مقدس جھوٹ کو کچھ جائز ہی نہیں رکھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول خیال کیا۔" (ایضاً ص ۳۴۰)

سرسید مرحوم نے اس بارے میں خود سر ولیم میور کی اردو کتاب "تاریخ دین مسیحی" سے یہ تصریح نقل کی ہے کہ "دوسری صدی میں مسیحیوں میں گفتگو رہی کہ جب بت پرست فیلسوف اور حکیموں کے ساتھ دین کا مباحثہ کیا جائے، تو انھی کے بحث کا طرز اور طریقہ اختیار کرنا جائز ہے کہ نہیں، آخر کار آرجن وغیرہ کی رائے کے مطابق طریقۂ مذکور تسلیم ہوا، اس سے البتہ مسیحی بحاثوں کی تیز عقلی، نکتہ سنجی نے بحث میں زیادہ رونق پائی، لیکن راستی اور صفائی میں کچھ خلل پڑا، پھر اسی سبب سے بعض لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ جعلی تصنیفات پیدا ہوئیں جو اس زمانہ کے بعد کثرت سے لکھی گئیں، اس طرح سے کہ فیلسوف لوگ جب کسی طریقے کی پیروی کرتے تھے تو کبھی کبھی اس کے حق میں کتاب لکھ کے کسی معروف حکیم کے نام سے اجرا کرتے تھے کہ اس حیلہ سے

[illegible] کی زبان سے ... عیسائی مسیحی جو فلسفیوں کی طرح بحث کرتے تھے، کتاب لکھ کے کسی حواری یا خادم حواری یا معروف اسقف کے نام سے رواج دیتے تھے۔ ایسا دستور تیسری صدی میں فروغ میں ہوا اور کئی سو برس تک رومی کلیسا میں جاری رہا، یہ بات بہت ہی خلاف حق اور الزام شدید کے قابل تھی" (تاریخ دین عیسوی حصہ دوم باب ۳، مولفہ سر ولیم میور) اسی سلسلہ میں سرسیدؒ نے موشیم کی کتاب تاریخ مذہبی سے یہ عبارت بھی درج کی ہے وہ لکھتا ہے کہ میں نہیں کہتا کہ کچھ عیسائیوں نے اس قسم کی سب کتابوں کو موضوع کیا تھا.... مگر اس بات سے کہ کچھ عیسائی اس قصور سے مبرا نہ تھے، صریحاً انکار نہیں ہو سکتا" (ایکلیزیاسٹکل ہسٹری باب ۳ ص ۰۷، مطبوعہ سنہ ۱۸۶۰ء) وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کے صعود کے بعد بھی ان کی سوانح عمری اور احکامات کی بہت سی تواریخیں جن میں جھوٹے قصے اور کہانیاں بھری ہوئی تھیں، ایسے لوگوں نے شاید مرتب کی تھیں جن کے ارادے شاید برے نہ تھے، بلکہ وہ بھی سادہ مزاج اور مقدس جھوٹ کے عادی تھے اور بعد ازاں مختلف موضوع تصنیفات حواریان مقدس کے نام سے سارے جہان میں مشہور کی گئیں"
(کتاب مذکور حصہ دوم باب ۲ ص ۳۶)

مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کے معیار اور رتبہ سے عیسائی عالموں کی ناواقفیت

دوسرے مذہب والوں یا حکیموں اور فلسفیوں کے مقابلہ میں "مقدس جھوٹ" کا اثر مستشرقین پر بھی پڑا، جو ان کے لیے کوئی مستحسن بات نہ تھی، اس سے مسلمانوں میں ان کے بارے میں اچھی رائے قائم نہیں ہوتی، سرسید مرحوم فرماتے ہیں:

"عیسائی عالم جو کسی حدیث کے درجہ صحت اور تحقیق کے ان قواعد سے جو علمائے اسلام نے مقرر کیے ہیں محض ناواقف ہوتے ہیں، اور درایت کے قواعد سے بھی واقف نہیں ہیں، وہ جب کوئی دینی کتاب پڑھتے ہیں جس میں بجز بدترین احادیث اور روایات کے اور کچھ نہیں ہوتا تو اپنے دل میں سمجھ لیتے ہیں کہ جزئیات اسلام سے واقف ہو گئے اور ہمارے مذہب کی نکتہ چینی اور تضحیک شروع کرتے ہیں اور

...کیں یا خود تصنیفیں مسلمانوں کی نظر سے گذرتی ہیں تو ان کا تمام صرف یہ ہوتا ہے کہ
...لیاقتی اور تعصب پر جو ان کی تصنیفات سے مترشح ہوتا ہے ہنستے ہیں اور ان کی بے نا
...ت پر افسوس کرتے ہیں۔" (خطبات ص ٣٥٦)

...ٹر اسپرنگر کے بارے میں بھی ان کی رائے یہ ہے کہ "اسپرنگر نے مسلمانوں کی روایتوں اور
...بہت تھوڑا بیان کیا ہے، اور اس تھوڑے ہی بیان سے ان کے اس مضمون سے
...بت ظاہر ہوتی ہے، یہاں تک کہ ان کی مثال ٹھیک اس شخص کی سی ہے جو
...ن پڑا ہو اور نور کی حقیقت کی تلاش میں تعصب اور کم فہمی سے جھوٹے شبہوں سے
...گم کر گیا ہو اور بے اصل چیزوں کی پیروی میں اصل چیز کو بھی ہاتھ سے کھو دیا ہو۔"

(خطبات ص ٣٥٧)

...یو | تاریخ اور سیرت کے بارے میں دور اول کے مسلمانوں کی روایتوں پر سر ولیم میور
| نے بڑی تفصیل سے اعتراضات کیے ہیں اور سر سید مرحوم نے ان کے جوابات بھی
...ے دیے ہیں، اس بارے میں انھوں نے پہلے تو سر ولیم میور کے طرز فکر پر ان الفاظ
...کہ :

...س کے ساتھ یہ بیان کرتے ہیں کہ ان کی طرز تحریر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ غیر متعصبانہ اور
...تحقیق اور جائز اور منصفانہ دلیل سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے سے پہلے ہی ان کے دل میں یہ
...ی ہوئی ہے کہ یہ سب روایتیں جھوٹی، لوگوں کی محض بناوٹ اور ایجاد ہیں، انھوں نے
...ت اس بات کا قصد کر لیا ہے کہ ان سب روایتوں کو ایسا ہی ثابت کریں، وہ امر حق کو
...نا نہیں چاہتے، جس کی تحقیق ہر بے غرض مصنف کا اصلی منشا ہوتا ہے، یا کم سے کم ہم کہہ سکتے ہیں کہ
...ہے۔" (خطبات : ص ٣٥٨)

سر ولیم میور نے ایک بات یہ کہی ہے کہ "ان روایات ہی نے امتداد زمانہ کی وجہ سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو عجیب و غریب اوصاف سے متصف کر دیا، ان کے پیرووں کے دل میں نادانستہ یہ خیال گذرا کہ محمد کو انسانی طاقت سے بڑھ کر قدرتیں حاصل ہیں، جس سے اس قدر کثیر روایتیں وجود میں آئیں، جب کبھی ان بیانات کے امتحان کے لیے واقعات کا کوئی اندازہ سردست موجود نہ ہوتا تو حافظہ کی قوت کو ان ہی بے روک کوششوں سے مدد دی جاتی"۔

مذکورۂ بالا اعتراض میں اصل نکتہ یہ ہے کہ صحابۂ کرام کی روایتوں کی تعظیم اور احترام و توقیر جو زمانۂ مابعد کے لوگوں میں تھی وہ سر ولیم میور کے الفاظ میں "امتداد ایام کا اثر تھا" جو لوگوں کے دلوں میں اور روایتوں پر خود بخود ہوا ہوگا، سر سید مرحوم فرماتے ہیں کہ:

"اب کہ سر ولیم میور اس طرح پر استدلال کرتے ہیں تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں زیادہ نیک اور پرہیزگار شخص کا کیا حال ہوگا، اگر اس کی ہر بات اور عمل کو دغابازی اور ریاکاری کی دھندلی اور خواب عینک سے دیکھیں اور اس کے جملہ کلمات اور افعال کی غلط تاویل کریں، اور جس قدر خراب معنی ہمارا تعصب اور حسد ایجاد کر سکے ان کے اوپر عائد کریں"۔

وہ سر ولیم میور سے یہ سوال کرتے ہیں کہ "حضرت موسیٰؑ کے تمام معجزات، ان کے عصا کا سانپ کی شکل میں ہو جانا، ان کا "ید بیضا"، "دریا کا خون کی مانند ہو جانا"، "مینڈکوں کی وبا"، اور دوسرے معجزات جو ان سے مصر میں ظہور پذیر ہوئے تھے، بحر احمر میں بنی اسرائیل کے لیے رستہ کا کھل جانا، من و سلویٰ کا آسمان سے نازل ہونا، پتھر کی منقش لوحوں کا ملنا جن پر خدائے تعالیٰ نے اپنی انگشت مبارک سے لکھا تھا، خدائے تعالیٰ کا بنی اسرائیل کو تمام قوموں پر ترجیح دینا، اور ان کو "میری منتخب قوم" کے خطاب سے سرفراز کرنا، اور اس قدر برکتیں ان کو عطا فرمانا اور حضرت اسرائیل کو "میرا پہلوٹھا بیٹا" کہہ کر ممتاز کرنا، کیا ان سب باتوں کو دل لگی کے تھیے اس طرز استدلال کے طور پر جس کو سر ولیم میور نے

[illegible] ہے، نہیں کہہ سکتے، جن کو اس نبی کے سرگرم پیروؤں یعنی بنی اسرائیل نے ایجاد اور وضع کیا ہو جنھوں نے "شکرانۂ تعظیم" اور "شائقانۂ تکریم" کے سبب "امتدادِ زمانہ میں اپنے نبی کو عجیب وغریب اوصاف سے متصف کر دیا؟ کیا یہ بات بھی حضرت موسیٰؑ پر اسی طرح صادق نہیں آسکتی (جو دراصل سرولیم میور ہی کے طریقِ استدلال اور زبان اور اسلوبِ بیان کے مطابق یہ ہوگی) کہ "ان کی وضع کی شان کو دھیان اور مرتبے سے عروج حاصل ہوا، اور زمانہ ان کے پیروؤں سے ان کو جس قدر دور کرتا گیا، اس عجیب وغریب انسان کا نقشہ جو آسمان کے فرشتوں سے (بلکہ خود خدا ہی سے) بے تکلف پیغام وسلام رکھتا تھا، زیادہ دھندلا لیکن زیادہ بڑا تناسب حاصل کرتا گیا، دل میں نادانستہ یہ خیال گذرا کہ ان کو انسانی طاقت سے زیادہ قدرتیں حاصل ہیں، اور وہ ایسے سامانوں سے گھرے ہوئے اور آراستہ ہیں جو انسان کے امکان سے باہر ہیں، حضرت عیسیٰؑ اور ان کے عقیدت مند اور سرگرم متبعین کا اس وقت کیا حال ہوتا اگر ہر شخص ان روایات کو محض بناوٹی ایجادیں سمجھ کر مضحکہ میں ڈال دیتا، جن میں حضرت عیسیٰؑ کی کراماتی پیدائش اور ان کا (عیسائیوں کے خیال میں) از سرِ نو زندہ ہونا اور اپنے مجروح ہاتھ اپنے متبعین کو دکھلانا اور ان کا آسمان پر چڑھ جانا اور اللہ تعالیٰ کے دستِ راست کی طرف بیٹھنا، یعنی حسب قانون "وحدت فی التثلیث" اپنے ہی دستِ راست کی طرف بیٹھنا مذکور ہے۔"

سیرت وتاریخ کے ابتدائی راوی یعنی صحابۂ کرام اپنے کردار اور بلندئ اخلاق میں ممتاز ترین افراد تھے، اس لیے سرسید مرحوم بجا طور پر فرماتے ہیں کہ "عقل وفہم کی تعظیم ہم کو ان لوگوں کی احادیث اور افعال پر عیب رکھنے اور ان کی بدترین تاویل کرنے سے مانع ہے جنھوں نے تقویٰ اور نیک اعمال کی وجہ سے شہرت اور عظمت حاصل کی ہو، البتہ اس بات سے بھی انکار

نہیں ہو سکتا کہ ہر مصنف کو یہ لازم ہے کہ جب وہ مذہب کی قدیم تصنیفات کو جانچنے کا ارادہ کرے تو اپنے آپ کو تعصب اور کٹر پن سے بالکل صاف کر لے۔"

(ایضاً، ص ۳۰۰ - ۳۰۹)

سرسیدؒ صاف اور واضح الفاظ میں یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ:

"محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اور خلفاء ایسے لوگ تھے جنھوں نے اپنے آپ کو محض خدا تعالیٰ کی طرف منسوب اور مصروف کر دیا تھا، وہ امرِ حق کو مانتے تھے، اور اس جہانِ فانی کو نظرِ حقارت سے دیکھتے تھے، وہ دیانتدار، صادق القول اور نیک طینت تھے؛ اور ہمارے احادیث کے جمع کرنے والوں نے اس غرض سے کہ احادیثِ نبویؐ کا ایک مجموعہ تیار ہو جائے، دور دراز کے سفر اختیار کیے تھے، انھوں نے حکامِ وقت کے ہاتھ سے سخت تکلیفیں برداشت کی تھیں، ان کو بے شمار دقتیں پیش آئیں اور ایسی ایسی مصیبتیں اور اذیتیں سہنی پڑیں جو بمشکل خیال میں آ سکتی ہیں، مگر اس کے باوجود انھوں نے کبھی اپنے کام سے پہلو تہی نہیں کی، اور اس کو انجام تک پہونچایا، جس سے صریح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کو دینی سبب اور مخلصانہ طریقوں سے اس امر کی تحریک ہوئی تھی، اور ہم کسی طرح مجاز نہیں ہو سکتے کہ ان کے افعال کو ریاکاری اور فریب کی طرف منسوب کریں، اور اس طرح کے بے بنیاد بیان پر کہ "وہ محض بناوٹی ایجاد ہیں" ان تصنیفات کی بے جا تحقیر کریں۔" (خطبات، ص ۳۶۱)

(باقی)

اسلامی تمدن میں علم کی روایت
اور اس سے متعلقہ مسائل

از ڈاکٹر نذیر احمد، علی گڑھ

(۲)

قرآن کریم کی نسبت سے فن خطاطی کو بڑا عروج نصیب ہوا، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اسی مصحف کے صدقے میں یہ فن ایجاد ہوا، اور اس نے اسی کے توسط سے ارتقا کے منازل طے کئے، دراصل خطاطی و خوشنویسی ہمارے رسم خط کی تخصیص ہے، ورنہ دنیا کے تمام رسم خطوں کا مقصود محض مفاہیم کا ضبط تحریر میں لانا ہے، یہ بات اور ہے کہ ہر شخص کی تحریر مختلف ہونے کی وجہ سے تحریر کے ہزاروں لاکھوں نمونے ہر ترقی یافتہ زبان میں مل جائیں گے، لیکن ان میں بذات خود ایسا ہنر نہ ہوگا، جس سے علم کے اصول منضبط ہو سکیں، اسکے برخلاف عربی و فارسی رسم خط کی بدولت خطاطی و خوشنویسی کا فن وجود میں آیا، اس میں وسعت پیدا ہوئی، یہاں تک کہ یہ فن نہایت وسیع علم قرار پایا، اس کے اصول و ضوابط مقرر ہوئے، اس کے اقسام الگ الگ خواص قرار پائے، اس طرح جدا جدا مکاتب وجود میں آئے، بے جا نہ ہوگا کہ چند سطروں میں اس کے بارے میں کچھ تفصیل درج کر دی جائے،

خط عربی ابتداءً سادہ نسخ تھا، یہی سادگی حضور اکرمؐ کے فرامین میں موجود ہے منجملہ ان کے حضورؐ کا نامۂ مبارک ہے، جو حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے نام جنوری سنہ ۱۹۴۰ء میں ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے مجلے میں شائع ہوا، دوسرا نامۂ مسعود قبط کے بادشاہ مقوقس کے نام ہے۔

پیش رہیں۔ (۳) نسخہ قرآن خط کوفی یا مذہب کتابت خانہ پیرس مکتوبہ [illegible]ھ (۴) نسخہ قرآن خط کوفی یا مذہب کاتب بوبکر بن احمد بن عبید اللہ غزنوی، مصر میوزیم کتابت سنہ ۴۶۶ھ چھٹی صدی ہجری میں خط نسخ میں ریحان، رقاع، توقیع کی آمیزش ملتی ہے، اس کی نمائندگی محمد بن عیسیٰ بن علا نیشاپوری کے قرآن پاک مکتوبہ سنہ [illegible]ھ سے ہوتی ہے، جو سلطان غیاث الدین محمد بن سام کیلئے تیار ہوا تھا، اور جو اب ایران باستان کے میوزیم میں محفوظ ہے۔

اسلامی دور کی خطاطی کی سات سو سالہ تاریخ بڑی اہمیت کی حامل ہے، ابتداء میں نسخ سادہ کا رواج تھا، پھر نسخ آمیختہ بکوفی کا رواج ہوا، پھر کوفی سادہ، پھر کوفی مزدوج بہ نسخ، پھر کوفی تزیینی، اور نسخ تزیینی رواج پذیر ہوئے، لیکن ان میں جو ذرا ذرا سا فرق ہے، اس کے اعتبار سے الگ الگ نام ہوئے، جن کی تعداد پچاس تک پہنچتی ہے، لیکن اوائل تیموری دور میں صرف چھ خط زیادہ متداول تھے، ثلث، ریحان، محقق، نسخ، توقیع، رقاع، اس کے بعد نستعلیق خط وجود میں آیا جو فارسی خط ہے، لیکن اس میں بھی قرآن کریم کے نسخے ملتے ہیں۔

قرآن کریم کی آرائش و زیبائش پر جتنی توجہ ہوئی وہ دنیا کی کسی ایک کتاب کا کیا ذکر سارے ذخیرہ پر نہ ہوئی ہو، ہزاروں فن کاروں نے اپنے ہنر کی نمائش کے لئے قرآن کو منتخب کیا، اس کے نتیجے میں خود قرآن کے ایسے ایسے نادر نسخے وجود میں آئے ہیں جو اسلامی خطاطی کی تاریخ کے لیے اہم مواد کا کام دیتے ہیں، لیکن ابھی خطاطی کی تاریخ اس اہم ماخذ کی روشنی میں لکھی نہیں جا سکی ہے، قرآن مجید کے جتنے نسخے ملتے ہیں، اتنے نسخے دنیا میں کسی ایک . . . کتاب کا کیا ذکر مقدس کتابوں سے مل کر نہ ہوں گے، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب قرآن مجید ہے، اور اسی پر سب سے زیادہ ہنر صرف ہوا ہے۔

اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ اسلام میں ایسے ایسے نئے علوم ایجاد ہوئے جن کا نام و نشان بھی

دو سرے فنون میں ہیں، اس کے نتیجے میں ہزاروں علما اور لاکھوں کروڑوں کتابیں معرض وجود میں آئیں جو موضوع کے لحاظ سے بھی بالکل نادر تھیں، تہذیب انسانی اسلام کے اس احسان عظیم سے گراں بار ہے۔

علوم شرعی میں جن امور و مسائل پر علماے اسلام نے کتابیں تصنیف کیں ان مسائل سے تہذیب بشری دوچار نہیں ہوئی تھی، اس لحاظ سے یہ دنیاے علم میں زبردست اضافے کا موجب اور اسی اعتبار سے تاریخ بشر پر اسلام کا احسان عظیم ہے، نئے علوم کی دریافت اور ان سے متعلقہ امور کا نہایت درجہ عمیق مطالعہ مسلمانوں کا اتنا عظیم کارنامہ ہے، جس کی مثال تاریخ عالم میں کہیں نہیں مل سکتی، علوم شرعیہ کا یہ رخ صدر جہ قابل توجہ ہے۔

علوم عقلی میں مسلمانوں نے جو کارنامے انجام دئے وہ اس لحاظ سے بڑے اہم ہیں کہ پورے عالم میں اس لحاظ سے ان کا کوئی مدمقابل نہ تھا۔ جب عالم اسلام میں بیت الحکمۃ قائم ہو رہے تھے اور ان میں اہم علمی مسائل کی تحقیق و تدقیق انجام پا رہی تھی، یورپ تعلیم کے ابتدائی مراحل سے بھی نہیں گذرا تھا، مسلمانوں نے یونانی علوم کو عربی میں اس طرح منتقل کیا، اور اس پر بھرپور اضافہ کرکے ان میں نئی جہتیں پیدا کیں، یونانی علوم کا بیشتر حصہ اصل زبان میں زمانہ کی نذر ہو گیا تھا، البتہ عربی زبان میں وہ سارا کا سارا محفوظ رہا، اور یہی یورپ میں نشأۃ ثانیہ کا موجب ہوا، اہل مغرب کے اب سارے عالم کی علمی سربراہی حاصل ہوئی، اور ان کی یہ بالادستی کئی صدی تک قائم رہی، چنانچہ مشرق اور مغرب کے سارے دانشوروں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر عربوں نے علم کی حفاظت میں ایسی جان توڑ کوشش نہ کی ہوتی تو یورپ ابھی تک . . . دور تاریکی میں ہوتا، تہذیب عالم اسلام کے بار احسان سے کیوں کر سبکدوش ہو سکتی ہے، اب میں جستہ جستہ چند علما کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن کی وجہ سے یونانی علوم نہ صرف محفوظ رہ گئے، بلکہ ان پر اضافے ہوئے، اور ان کی نئے سرے

تجربے اور تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا گیا، اس طرح وہ لوگ دنیائے علم میں زبردست اضافے کا موجب ہے، علوم کی ترقی میں خلفائے عباسی نے جو کارنامے انجام دیئے وہ ہمیشہ زندہ اور تابناک رہیں گے،

مشاہیر علمائے ریاضی میں یوں تو کئی نام ملتے ہیں لیکن سب سے زیادہ قابل ذکر شخصیت ابوعبداللہ محمد بن موسیٰ خوارزمی معاصر خلیفہ مامون (۱۹۰ – ۲۱۸ھ) کی ہے، اس کی کتاب حساب کا عربی متن مفقود ہے لیکن اس کا بارہویں صدی عیسوی کا لاطینی ترجمہ موجود ہے، اس کی دوسری اہم کتاب کتاب المختصر فی حساب الجبر والمقابلہ موجود ہے، یہ کتاب لاطینی اور انگریزی دونوں یورپی زبانوں میں منتقل ہو گئی ہے، خوارزمی نے ان دونوں کتابوں کے ذریعے اسلامی نقطۂ نظر کو یورپ سے روشناس کرایا، اہل یورپ اس کو الخوارزم کہتے ہیں۔

خوارزمی کے معاصرین میں محمد بن کثیر فرغانی ہے، جس کے ۲ دو رسالے اسطرلاب پر اور ایک کتاب اصول علم نجوم پر ہے، یہ کتاب لاطینی میں ترجمہ ہو چکی ہے۔

قرن سوم کے دانشوروں میں بنی موسیٰ بن شاکر قابل ذکر ہیں، ان کی ایک کتاب معرفۃ الاشکال البسیطۃ والکریۃ موجود ہے، اس کا ایک بیٹا محمد بن موسیٰ ہے، متوفی ۲۵۹ھ جس کی مشہور تصنیف کتاب المخروطات ہے۔

اسی دور کا ایک ریاضی دان و منجم عمر بن الفرخان الطبری ہے، جس نے کتاب الاربعہ بطلیموس العلوذی کی تشریح لکھی ہے، وہ متعدد کتابوں کا مصنف ہے، اس کی نجوم پر ۲ دو کتابیں جوامع الاسرار وکتاب مختصر باقی ہیں۔

اسی صدی کا سب سے مشہور فلسفی یعقوب بن اسحاق الکندی ہے۔ (د ۲۵۸ھ) اس کے تین ۳۲ رسالے موجود ہیں، بعض کی اصل عربی باقی ہے اور بعض کے محض لاطینی ترجمے، اس کی اکثر تصانیف ۱۲ویں صدی میں Geradus Cremonesio کے وسیلے سے لاطینی میں منتقل ہوتی تھیں،

دوسرے عنوان میں نہیں، اس کے نتیجے میں ہزاروں علما اور لاکھوں کروڑوں کتابیں معرض وجود
آئیں جو موضوع کے لحاظ سے بھی بالکل نادر تھیں، تہذیب انسانی اسلام کے اس احسان عظیم سے
گراں بار ہے۔

علوم شرعی میں جن امور و مسائل پر علماے اسلام نے کتابیں تصنیف کیں ان مسائل سے
تہذیب بشری دو چار نہیں ہوئی تھی، اس لحاظ سے یہ دنیاے علم میں زبردست اضافے کا موجب
اور اسی اعتبار سے تاریخ بشر پر اسلام کا احسان عظیم ہے، نئے علوم کی دریافت اور ان سے
متعلقہ امور کا نہایت درجہ عمیق مطالعہ مسلمانوں کا اتنا عظیم کارنامہ ہے، جس کی مثال تاریخ
عالم میں کہیں نہیں مل سکتی، علوم شرعیہ کا یہ رخ صدر جہ قابل توجہ ہے۔

علوم عقلی میں مسلمانوں نے جو کارنامے انجام دئے وہ اس لحاظ سے بڑے اہم ہیں کہ پورے
عالم میں اس لحاظ سے ان کا کوئی مدمقابل نہ تھا۔ جب عالم اسلام میں بیت الحکمۃ قائم ہو رہے
تھے اور ان میں اہم علمی مسائل کی تحقیق و تدقیق انجام پا رہی تھی، یورپ تعلیم کے ابتدائی مراحل
سے بھی نہیں گذرا تھا، مسلمانوں نے یونانی علوم کو عربی میں اس طرح منتقل کیا، اور اس پر جزئیات
اضافہ کر کے ان میں نئی جہتیں پیدا کیں، یونانی علوم کا بیشتر حصہ اصل زبان میں زمانہ کی نذر ہو گیا
تھا، البتہ عربی زبان میں وہ سارا کا سارا محفوظ رہا، اور یہی یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا موجب ہوا، اہل عرب کے
اب سارے عالم کی علمی سربراہی حاصل ہوئی، اور ان کی یہ بالادستی کئی صدی تک قائم رہی، چنانچہ
مشرق اور مغرب کے سارے دانشوروں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر عربوں نے علم کی حفاظت
میں ایسی جان توڑ کوشش نہ کی ہوتی تو یورپ ابھی تک ... دور تاریکی میں ہوتا، تہذیب عالم اسلام
کے بار احسان سے کیوں کر سبکدوش ہو سکتی ہے، اب میں جستہ جستہ چند علما کا ذکر کرنا چاہتا ہوں
جن کی وجہ سے یونانی علوم نہ صرف محفوظ رہ گئے، بلکہ ان پر اضافے ہوئے، اور ان کی نئے سرے

تجربہ اور تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا گیا، اس طرح وہ لوگ دنیائے علم میں زبردست اضافے کا موجب ہے، علوم کی ترقی میں خلفائے عباسی نے جو کارنامے انجام دیئے وہ ہمیشہ زندہ اور تابناک رہیں گے۔

مشاہیر علمائے ریاضی میں یوں تو کئی نام ملتے ہیں لیکن سب سے زیادہ قابل ذکر شخصیت ابوعبداللہ محمد بن موسیٰ خوارزمی معاصر خلیفہ مامون (۱۹۰-۲۱۸ھ) کی ہے، اس کی کتاب حساب کا عربی متن مفقود ہے لیکن اس کا بارہویں صدی عیسوی کا لاطینی ترجمہ موجود ہے، اس کی دوسری اہم کتاب کتاب المختصر فی حساب الجبر والمقابلہ موجود ہے، یہ کتاب لاطینی اور انگریزی دونوں یورپی زبانوں میں منتقل ہوگئی ہے، خوارزمی نے ان دونوں کتابوں کے ذریعے اسلامی نقطۂ نظر کو یورپ سے روشناس کرایا، اہل یورپ اس کو الخوارزم کہتے ہیں۔

خوارزمی کے معاصرین میں محمد بن کثیر فرغانی ہے، جس کے دو رسالے اسطرلاب پر اور ایک کتاب اصول علم نجوم پر ہے، یہ کتاب لاطینی میں ترجمہ ہوچکی ہے۔

قرن سوم کے دانشوروں میں بنی موسیٰ بن شاکر قابل ذکر ہیں، ان کی ایک کتاب معرفۃ الاشکال البسیطۃ والکریۃ موجود ہے، اس کا ایک بیٹا محمد بن موسیٰ ہے، متوفی ۲۵۹ھ) جس کی مشہور تصنیف کتاب المخروطات ہے۔

اسی دور کا ایک ریاضی دان ومنجم عمر بن الفرخان الطبری ہے، جس نے کتاب الاربعۃ بطلیموس العلوذی کی تشریح لکھی ہے، وہ متعدد کتابوں کا مصنف ہے، اس کی نجوم پر دو کتابیں جوامع الاسرار وکتاب مختصر باقی ہیں۔

اسی صدی کا سب سے مشہور فلسفی یعقوب بن اسحاق الکندی ہے۔ (م ۲۵۸ھ) اس کے ۳۰ رسالے موجود ہیں، بعض کی اصل عربی باقی ہے، اور بعض کے محض لاطینی ترجمے، اس کی اکثر تصانیف ۱۲ ویں صدی میں Geradus Cremonesio کے وسیلے سے لاطینی میں منتقل ہوتی تھیں۔

[illegible] علم کا زبردست ماہر تھا، اس کے ذریعے سے علوم تک رسائی ہو سکی، اس کے شاگردوں میں ابو معشر بلخی (۲۷۲ھ) احمد بن عبد اللہ حبش اور احمد بن سہل بلخی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

اس دور میں یونانی اور دوسری زبانوں کی علمی کتابوں کے ترجمے ہوئے، ان مترجمین میں ثابت بن قرہ حرانی کا نام قابل ذکر ہے، اس نے ریاضی، ہندسہ اور طب کی متعدد کتابوں کا ترجمہ کیا، جو اکثر موجود ہیں۔

اس دور کی علمی تصانیف میں منصور عباسی کے طبیب جورجیس بن بختیشوع کی کتاب الکناس موجود ہے، ابو زکریا یوحنا بن ماسویہ (م ۲۴۳) کی کتاب الحمیات الشجرباقی رہ گئی، حنین بن اسحاق نے یونانی اور سریانی سے طب کی متعدد کتابیں عربی میں منتقل کیں، لیکن تیسری صدی کا سب سے مشہور طبیب ابوالحسن علی بن سہل ابن طبری ہے، اس کی مشہور کتاب فردوس الحکمۃ ہے جو طبع ہو چکی ہے۔

چوتھی اور پانچویں صدی علوم اسلامی خصوصاً علوم عقلی کی ترقی کا دور ہے، اس دور میں محمد بن زکریا رازی، ابو نصر فارابی، علی بن عباس مجوسی، ابن سینا، ابوریحان بیرونی، ابن مسکویہ، ابو سہل مسیحی، وغیرہ دانشوروں کی وجہ سے علوم اسلامی نے وہ درجہ حاصل کر لیا، جو اسے کبھی نصیب نہ تھا، اور انہی کی کوششوں سے مشرق کو علم کے میدان میں وہ امتیاز حاصل ہوا جو اسے پھر کبھی نہ ملا، اور اسی وجہ سے سارے عالم کی علمی سربراہی کئی سو صدی تک مشرق کے حصہ میں رہی، طب، حکمت، ریاضی، جغرافیہ، ایسے علوم ہیں جن میں مسلمانوں نے نہایت درجہ ناموری حاصل کی اس سلسلے کے بعض مشاہیر کا نام درج کیا جاتا ہے۔

حکمائے بزرگ میں محمد بن زکریا رازی، ابو نصر فارابی، ابو سلیمان منطقی، ابن رشد، ابن طفیل، ابو حیان توحیدی، ابن مسکویہ، ابن سینا خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، علوم ریاضی میں ابوالوفا بوزجانی، ابو جعفر الخازن الخراسانی، ابو سعید احمد بن عبد الجلیل سگزی، عبد الرحمن صوفی، ابوالحسن کوشیار گیلی

ابوریحان محمد بن احمد بیرونی قابل ستائش ہیں، طب میں محمد بن زکریا رازی، علی بن عباس مجوسی ابوسہل مسیحی جرجانی، ابن سینا کا نام کبھی بھلایا نہیں جاسکتا، علم جغرافیہ میں ابوالقاسم محمد بن خردادبہ ابوالقاسم محمد بن حوقل، ابواسحاق ابراہیم اصطخری، شمس الدین مقدسی، ابوعبداللہ احمد بن محمد جیہانی، ابوالحسن علی مسعودی، ابوزید بلخی، ابوریحان بیرونی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔

علم تاریخ میں مسلمانوں نے بڑے کارنامے انجام دئے ہیں، اسلامی تمدن کی برتری کے زمانہ میں بڑے بڑے مورخین گذرے ہیں، ان میں چند کا نام یہ ہے،

ابن اسحاق، سیرت سنہ ۷۶۸ء۔ بلاذری، فتوح البلدان سنہ ۸۹۲ء۔ ابن قتیبہ کتاب المعارف سنہ ۸۸۹ء۔ ابوحنیفہ دینوری، الاخبار الطوال سنہ ۸۹۵ء۔ یعقوبی سنہ ۸۹۷ء حمزہ اصفہانی سنہ ۹۶۱ء۔ مسکویہ۔ سنہ ۱۰۳۰ء۔ محمد بن جریر طبری تاریخ الرسل والملوک سنہ ۹۲۳ء۔ ابوالحسن علی المسعودی مروج الذہب سنہ ۹۵۶ء۔ ابن الاثیر الکامل فی التاریخ سنہ ۱۲۳۴ء۔ ابن خلکان وفیات الاعیان۔ سنہ ۱۲۸۲ء۔ ابن خلدون سنہ ۱۴۰۶ء۔ یاقوت حموی، معجم البلدان سنہ ۱۲۲۹ء، ابن عساکر تاریخ دمشق سنہ ۱۱۷۶ء۔ ابن خطیب بغدادی۔ تاریخ بغداد وغیرہ

ان کے ساتھ فارسی زبان کے چند مورخین کے نام کا اضافہ غیر ضروری نہ ہوگا۔

ابوالفضل بیہقی تاریخ مسعودی۔ گردیزی۔ زین الاخبار۔ عطا ملک جوینی، جہان کشا۔ رشید الدین فضل اللہ۔ جامع التواریخ۔

ان کے علاوہ طبقات کے سیکڑوں مولفین کے کارنامے ہیں، جو تاریخ کے اہم ماخذ ہیں، اور جن کے بغیر اسلامی علوم کی تاریخ نامکمل رہے گی۔

مسلمانوں نے علوم و فنون کی ترقی میں جو قابل ذکر کارنامے انجام دئے ہیں، ان کا اعتراف اہل مغرب نے بھی کیا ہے، یہاں تک کہ بعض مصنفین کو یہ قول دہرانا پڑا۔

"بنی نوع انسان کے عظیم کام مسلمانوں کے واسطے سے انجام پذیر ہوئے، عظیم ترین فلسفی الفارابی مسلمان تھا، سب سے بڑے ریاضی دان، ابو کامل اور ابراہیم بن سنان مسلمان تھے سب سے بڑا جغرافیہ دان اور دائرۃ المعارف پر صلاحیت کامل مسعودی مسلمان تھا اور سب سے بڑا مورخ الطبری بھی مسلمان تھا۔"

غرض اسلامی تمدن کی علمی برتری ایسے دانشوروں کے کارناموں کی وجہ سے ہے، جن کی اہمیت آج بھی برقرار ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ اس تمدن کی سب سے زیادہ قابل توجہ تخصیص کتابوں کی کثرت اور تنوع میں ہے، تہذیب بشری میں کسی مخصوص قوم کے یہاں نہ اتنے دانشور ملیں گے، نہ ان کے یہاں علوم و فنون میں اتنا تنوع ہوگا، نہ ان کے یہاں اتنا علمی سرمایہ ہوگا، اگرچہ اس علمی سرمایے کا بیشتر حصہ مفقود ہو چکا ہے، اور جو موجود ہے، وہ مفقود حصے کا محض ایک حقیر جز ہے، اگر کسی طرح مفقود اور معلوم سرمایے کا احاطہ ہو سکے تو معلوم ہوگا، کہ کتابوں کی تعداد کئی کروڑ تک پہنچ جائے گی، ان کتابوں کی ایک بڑی خصوصیت ان کی ضخامت ہے، بعض علما کی کتابیں ۸۰ مجلدات سے زیادہ ہیں، ابن عساکر کی تاریخ دمشق اور زکریا رازی کی الحاوی اس زمرے میں آتی ہیں، طبری کی تاریخ الرسل والملوک ۱۵ جلدوں میں لائڈن سے ۱۸۷۹ء تا ۱۹۰۱ء شائع ہوئی ہے، اور اس کی تفسیر جامع البیان فی تفسیر القرآن، ۴۰ مجلدات پر مشتمل تھی، سامانی امیر ابو صالح منصور بن نوح (۳۵۱-۳۶۵ھ) نے دیکھی تو کہا کہ اتنی ضخیم تفسیر کا مطالعہ میرے بس کا نہیں، پھر اس نے ماوراء النہر اور خراسان کے علما کو جمع کیا، اور اس کے ترجمے کے جواز میں کوئی قطعی فیصلہ چاہا، علما کی ایک جماعت نے غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ فارسی زبان میں قرآن کی تفسیر جائز ہے، اس کے چند علما اس کام کے لیے منتخب ہوئے، اور انھوں نے فارسی میں تفسیر طبری کا خلاصہ مرتب کیا، جو ۱۰ مجلدات پر مشتمل تھا۔

امیر خلف بن احمد (م ۳۹۰ھ) سیستان کا نامور حکمراں گذرا ہے، جو ۳۹۳ھ میں محمود غزنوی سے شکست پا چکا ہے، اس کے بعد محمود کا قبضہ سیستان پر مستحکم ہوتا ہے، امیر خلف نہایت سخی اور عادل بادشاہ تھا، علوم کا بڑا قدرداں اور علما و فضلا کا مربی تھا، مشہور مورخ عتبی نے تاریخ یمینی میں اس کے فضائل کے ذکر میں ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ امیر مذکور نے اپنے زمانے کے مخصوص علما کو جمع کیا، اور قرآن مجید کی ایک ایسی مفصل و جامع تفسیر لکھنے کی فرمائش کی جو مفسرین کے اقوال، متقدمین و متاخرین کی تاویلات مختلف قرأتوں کے وجوہ اور نحو کے اسباب کے بیان، اشتقاق لغات، امثال و شواہد نظم و نثر، اخبار و احادیث سے آراستہ ہو۔ راوی لکھتا ہے، کہ اس کے مولفین کو بیس ہزار اشرفیاں دی گئیں، اس تفسیر کا ایک نسخہ مدرسہ صابونی نیشاپور میں غزوں کے حملے (۵۴۸ھ) تک موجود تھا، اس کے بعد وہ اصفہان منتقل ہوا، اور آل خجند کے کتاب خانے کی زینت بنا۔ تاریخ یمینی کے مترجم ابو شرف ناصح جربادقانی نے اضافہ کیا ہے کہ (اواخر چھٹی صدی ہجری) جب وہ اپنے وطن سے نکل کر اصفہان میں مقیم ہوا، اس نے تفسیر مذکور کا وہ نسخہ دیکھا تھا، سو جلدوں میں تھا، اس کے استنساخ کے لیے ایک عمر درکار ہے۔ اور اس کام کے لیے نہ جانے کتنے کاتبوں کی ضرورت ہوگی۔

طبری نے علم کی جتنی خدمت کی ہے اس کا اندازہ اس سے ہوگا، کہ اس کی ابتداے تحریر سے موت تک جو حساب کیا گیا تو ۱۴ ورق فی روز کا اوسط نکلا، عبدالرحمٰن بن الجوزی (م ۵۹۷ھ) کے بارے میں خود ان کے نواسے کا بیان ہے کہ انھوں نے دو ہزار مجلدات اپنے ہاتھ سے لکھے تھے، اور ہر روز ۴ تختے لکھتے اور سالانہ ۵۰ تا ۶۰ مجلد ہو جاتے۔

اسلامی تمدن کی برتری کے دور میں کروڑوں کتابیں لکھی گئیں، چونکہ اس زمانے میں پریس نہ تھا، اس لئے قلمی نسخے تیار ہوتے تھے۔ مخطوطے اچھے بُرے سبھی قسم کے تھے، یہ مخطوطے

جہاں جہاں مختلف علوم کی قلمی کتابوں کی دنیا لگ گئے ہیں، وہاں بیشمار خطاط اور کاتب پیدا ہوئے داستان اپنی زبان اپنے ذخیرہ سے دہراتے ہیں، اس طرح لاکھوں کاتب، خطاط، خوشنویس وغیرہ اس کام پر مامور ہوتے، آپ غور کریں جس معاشرے میں کتابوں کی تعداد کروڑوں سے متجاوز ہو اور وہ سب کی سب قلمی شکل میں ہوں، اور اکثر و بیشتر کا حجم ہزار صفحے سے زیادہ ہو تو ان کے لئے کتابت کے کتنے وسائل درکار ہونگے، جس طرح لاکھوں خطاط اس کام میں مصروف ہوتے تھے اتنی ہی تعداد میں جدول کش، سیاہی بنانے والے، کاغذ تیار کرنے والے بھی درکار ہوتے، بعد کے دوروں میں مصور بھی وجود میں آجاتے ہیں، وہ بھی قلمی کتابوں کی توضیح کے لیے ان میں تصویر کشی کرتے ہیں، غرض لاکھوں کروڑوں فنکاروں کی پیہم کوشش کا نتیجہ اسلامی تمدن کے کروڑوں مخطوطات ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارا معاشرہ تعلیم (تعلم) میں مصروف تھا، آپ اگر اس وقت کے اسلامی ممالک کی آبادی کو ذہن میں رکھیں تو دنیا کے تمدن میں جو علمی انقلاب ہوا وہ زیادہ عبرت آموز معلوم ہوگا۔ اور موجب صد افتخار بھی۔

مخطوطات کے سلسلے میں چند باتیں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں:

۱۔ لاکھوں سے زیادہ مخطوطات ضائع ہو چکے ہیں، اور ان کی وجہ سے بہت سا علم بھی ضائع ہو گیا۔ بعض مخطوطات کے ساتھ تو نادر علم بھی دفن ہو گیا۔ عام مخطوطے بھی کسی نہ کسی درجے میں نئی معلومات کے حامل ہوتے ہیں، اس لیے کوئی دو مخطوطے یکساں نہیں ہوتے، اختلاف نسخ میں علم روپوش ہوتا ہے۔

۲۔ اسلامی مخطوطات جو باقی رہ گئے ہیں، وہ اپنی کثرت اور تنوع مضامین کے اعتبار سے دوسری تمام تہذیبوں پر فوقیت رکھتے ہیں۔

۳۔ ہزاروں کتابیں ایسی ہیں جن کی بنیاد محض ایک ہی مخطوطہ پر ہے، ایسے مخطوطات

۔۔۔ چکے ہیں، ان کی حفاظت کی فوری تدبیر ہونی چاہیے۔

۴۔ ہزاروں کتابوں کا محض ایک جز محفوظ رہ گیا ہے۔

۵۔ مصنف کے خود نوشت مخطوطے خاصی تعداد میں موجود ہیں، لیکن ان کے مقابلے میں جو ضائع ہو چکے ہیں بہت زیادہ ہیں، اس لیے تقریباً ہر مصنف کوئی نہ کوئی مسودہ ضرور تیار کرتا ہے، اس لحاظ سے خود نوشت مخطوطات کی تعداد مصنف کی تعداد سے کم نہ ہونا چاہیے، لیکن موجود اور مفقود میں ایک اور ہزار کی نسبت سے بڑی نسبت ہوگی۔

۶۔ اسلامی دور کے مصنفین اور قارئین کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ مخطوطات پر دوران مطالعہ اپنی یادداشت ثبت کرتے رہے ہیں، اس سے مخطوطہ کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا تھا، ذیل میں بعض چند ایسے مخطوطات کا ذکر کیا جاتا ہے جو یا تو خود نوشت مخطوطے ہیں یا اہم مصنفین کی یادداشت سے مزین ہیں، یہ مثالیں بعض نمونوں سے ماخوذ ہیں:

کتاب تفسیر غریب القرآن علی حروف المعجم، تالیف ابوبکر محمد بن عزیر احمد بن عزیز السجستانی (م ۳۳۰ھ) اس کو مشہور مصنف ابن الجوالیقی (م ۵۳۹ھ) نے ۵۱۴ھ میں پڑھا، مخطوطہ مکتوب ۴۹۹ھ میں، پھر زید بن حسن بن زید الکندی (م ۶۱۳ھ) کی یادداشت کے مطابق ربیع الثانی ۶۰۹ھ میں اس کے مطالعے میں رہا۔ (چسٹر بیٹی، ڈبلن، پلیٹ نمبر ۱)

النہایہ فی غریب الحدیث تالیف مجد الدین ابو السعادات المبارک بن محمد بن الاثیر الشیبانی الجزری (م ۶۰۶) مؤلف کا خط (چسٹر بیٹی نمبر ۳)

حلیۃ الابرار تالیف محی الدین ابو زکریا یحییٰ بن شرف النووی (م ۶۷۶)، اس کی کتابت نووی کے شاگرد علی بن ابراہیم بن داؤد بن العطار نے ۶۷۲ھ میں کی۔ (ایضاً: نمبر ۶)

کشف الالہام، تالیف بدر الدین ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ الشبلی بن قیم الشبلیہ (۶۱۲ھ – ۶۶۹ھ) خود مؤلف کا نسخہ کتابت رجب ۶۳۸ھ (ایضاً: نمبر ۷)

ہدایۃ الساری لفتح الباری، تالیف شہاب الدین ابوالفضل احمد بن علی بن حجر العسقلانی الکنانی (م: ۸۵۲ھ) کی کتابت ۸۸۸ھ میں مشہور محدث القسطلانی (م: ۹۲۳) نے کی۔ (ایضاً نمبر ۱۲)

ادب الکاتب، تالیف ابن قتیبہ (م: ۲۷۰) تاریخ کتابت محرم ۵۴۳ھ کاتب جمال الدین ابوالفرج عبدالرحمن بن الجوزی (وفات ۵۹۷ھ) عالم اسلام کی اس عظیم المرتبت شخصیت نے ۳۳ سال کی عمر میں اسے نقل کیا تھا۔ (ایضاً نمبر ۳۲)

احیاء علوم الدین کا یہ نسخہ ۵۴۲ھ اور ۵۵۴ھ میں مشہور مورخ احمد بن یوسف بن الازرق کے مطالعے میں رہا۔ (نمبر ۴۳)

کتاب شفاء الصدور تالیف ابوبکر محمد بن حسین بن زیاد المعروف بالنقاش، اس نسخے پر دو یادداشتیں ہیں، ایک شوال ۵۳۲ھ کی جو ابوالبرکات بن المبارک الانماطی (م: ۵۳۸) استاذ ابن الجوزی کے خط میں اور دوسری سند مالک مخطوطہ کی ہے، جو عبدالمالک بن سعید کے بیٹے تھے۔ (م: ۵۶۰) (نمبر ۴۶)

کتاب الفوائد، تالیف ابوبکر بن عبیداللہ بن محمد بن الشاکر اسیرانی (م: ۳۷۸) کے کاتب ابن عساکر مؤلف تاریخ دمشق ہیں۔ اس پر متعدد یادداشتیں ہیں۔ ۵۹۶ھ کی تحریر ابن عساکر کے پوتے علی بن القاسم (م ۶۱۶) کی ہے۔ (نمبر ۵۰)

مشارق الانوار، تالیف حسن بن محمد بن حسن الصغانی (م: ۶۵۰) پر خود مصنف کی یادداشت ہے۔ اس کا کاتب عبداللہ بن محمد بن ابی بکر الغسانی الاندلسی ہے، اس کو خود مصنف کے گھر پر مختلف علما نے پڑھا، صغانی اصلاً لاہوری ہیں۔ (نمبر ۵۱)

ترجمۂ اقلیدس نصیرالدین طوسی کے شاگرد نجم الدین علی بن عمر قزوینی کے خط میں ہے۔ (نمبر ۵۴)

اطراف الصحیحین تالیف ابونعیم عبیداللہ بن الحسن بن احمد بن الحداد الاصفہانی (م: ۵۱۷) خود مؤلف کے خط میں مکتوبہ ۵۱۱ھ۔ (نمبر ۵۷)

[illegible] الاکباد تالیف شمس الدین السخاوی (م: ۹۰۲) اس کے کاتب ابوبکر بن عبدالرحمن بن محمد بن ابی بکر بن عثمان بن محمد السخاوی الشافعی (م: ۸۹۳ھ) برادر مؤلف۔ (نمبر ۵۹)

ابن القلقشندی (م: ۸۷۱) کے خطبات کا مجموعہ جو ربیع الثانی ۸۵۳ھ میں مسجد جامع ازہر مصر میں دیے گئے تھے۔ (نمبر ۶۰)

ابوخیثمہ زہیر بن حرب النسائی الشیبانی (وفات ۲۳۴ھ) پر ابن حجر عسقلانی (م: ۸۵۲) کی یادداشت سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس کو مجدالدین بن ابراہیم کے ساتھ پڑھا، اور سخاوی کی ایک تحریر سے واضح ہے کہ انھوں نے اس نسخے کو ۱۳ رجادی الثانیہ ۸۵۰ھ میں ابن حجر کے ساتھ مطالعہ کیا۔ (نمبر ۶۴)

اس نسخے میں سخاوی کے خط میں ان کے متعدد معاصرین کے نام ہیں، جو خود صاحب تصنیف بزرگ ہوئے ہیں۔ (نمبر ۶۵)

ابن قتیبہ کی غرائب الحدیث، کتابت ۲۷۹ھ، جو عبدالعزیز بن الحسین بن علی الزبیری کے مطالعہ میں ۵۴۲ھ میں رہی۔ (نمبر ۶۸)

دارقطنی الحافظ (م: ۳۸۵) کی کتاب المجتنا من السنن المطہرہ کے کاتب عبیداللہ بن ابراہیم بن مطہر الدقاق (م: ۶۱۹) ہیں اس پر متعدد فضلاء کی تحریریں ہیں، عمادالدین ابواسحاق ابراہیم بن عبدالواحد ابن علی بن سرور المقدسی کے مطالعہ میں یہ نسخہ ۵۹۸ھ میں رہا، دوسری یادداشت شوال ۶۰۷ھ کی ہے، خط عبدالرحیم بن عبدالواحد بن احمد المقدسی برادر ضیاء الدین محمد المقدسی (م: ۶۴۳ھ) استاد جو کلاس لیتے ان کا نام موفق الدین ابو محمد عبداللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ المقدسی (م: ۶۲۰) تھا، ایک شاگرد ابوالفتح محمد بن عبدالغنی الجماعیلی (م ۶۱۳) پسر عبدالغنی المقدسی الجماعیلی، (م: ۶۰۰ھ) (نمبر ۷۰)

مخطوطہ نمبر ۳۶۶۴ بخط تقی الدین ابوبکر بن محمد بن ابی بکر البسطامی الحلبی، معروف بہ ابن العجمی شاگرد سخاوی، یہ مخطوطہ سخاوی کی بھی تحریر سے مزین ہے۔ (نمبر ۹۱)

جمال الدین ابو الفرج ابن الجوزی (م: ۵۹۷ھ) کی تنظیم کا مخطوطہ [illegible]
المعالی بن یحییٰ بن محمد الشہرزوری کے خط میں ہے۔ (وفات ۶۰۱ھ) (نمبر ۱۱۰)

ابن فارس (م: ۳۹۵) کے تتمہ فصیح الکلام کا مخطوطہ یاقوت بن عبد اللہ الرومی الحموی (م ۶۲۶)
کے خط میں (نمبر ۱۳۴) مخطوطہ نمبر ۳۹۹۹۔

اس مخطوطے کے جزو اول پر یاقوت الحموی کی ۶۱۲ھ کی تحریر ہے، جس کی تصدیق ابن شداد نے
کی ہے (ابن شداد کے لیے دیکھیے بروکلمن)

مختصر کتاب العین الزبیدی، علامہ بقاعی کے خط میں احمد تیمور پاشا کے کتاب خانے میں۔

شرح جوالیقی، ادب الکاتب، تالیف ابن قتیبہ (م ۲۷۶ھ) شارح کے بیٹے اسماعیل کے خط
میں مورخ ۵۵۳ھ (ویانا میں)

ابن الاثیر کی البسیط نسخہ قاہرہ پر مؤلف کی یادداشت موجود ہے۔

منتخب نزہۃ الالبار، عبد العزیز بن جماعہ کے خط میں احمد تیمور پاشا کے کتاب خانے کا نسخہ۔

ابن شاکر کی عیون التواریخ کی بارہویں اور بیسویں جلدیں خود مصنف کے خط میں احمد زکی پاشا کے
کتاب خانے میں ہیں۔

ابو عبید القاسم بن سلام کی تالیف، کتاب الاموال پر ذیل کا نسخہ بخط مؤلف علی ابن ایوب [illegible]
[illegible] پاشا کے یہاں ہے۔

تاریخ النسابہ تالیف یاسین العمری الموصلی خود مؤلف کے خط میں احمد زکی پاشا کے کتب خانے میں ہے۔

کتاب الابنیہ عن حقائق الادویہ، تالیف ابو منصور موفق ہروی کا واحد نسخہ جو فارسی کے مشہور شاعر
اسدی طوسی (م ۴۶۵ھ) کے خط میں ویانا میں ہے، اس کی تاریخ کتابت ۴۴۷ھ ہے، اور اس کا
فارسی زبان میں سب سے قدیم مخطوطہ ہے، [illegible]۔

ترجمان البلاغہ تصنیف محمد بن عمر الرادویانی نسخہ منحصر بفرد کتب خانہ فاتح استنبول میں موجود ہے، اس کی کتابت سنہ ۵۰۷ھ میں ہوئی، کاتب ابوالہیجاء اردشیر بن دیلمیار القطبی شاعر ہے، جس کے شعر نے ... اسدی طوسی نے لغت فرس لکھی تھی، ترجمان البلاغہ مدتوں فرخی سیستانی کی تصنیف سمجھی جاتی رہی ہے،

وفیات الاعیان تالیف ابن خلکان (۶۸۳) کا نسخہ متحف برطانیہ بخط مولف ہے۔

ان چند مثالوں سے اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارے فضلاء نے قلمی نسخے اپنے ہاتھ سے تیار کیے، مطالعہ کے دوران ان پر یادداشتیں لکھیں، ان سے نہ صرف مخطوطات کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا ہے، بلکہ وہ خود ادبی تاریخ کے ماخذ کا کام کرتی ہیں۔

لیکن افسوس کی بات ہے کہ ان مخطوطات کا بیشتر حصہ برباد ہو چکا ہے، ابن ندیم کی روایت پر کہ جو کتابیں دستبرد زمانہ سے بچی ہیں، جو ہزار میں ایک کی نسبت سے ہیں، یہ چوتھی صدی کی بات ہے، اگر اس کو انتہائی مبالغہ پر محمول کیا جائے تو شاید سو اور ایک کی نسبت میں مبالغہ نہ ہو، یہ تو حملۂ تاتار سے پہلے کا حال ہے، اس سانحے سے اسلام کے مشرقی حصے کو جو جانی، مالی، علمی، تہذیبی نقصان پہونچا ہے اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، ایک طرف تو لاکھوں آدمی موت کے گھاٹ اتار دیے گئے تو دوسری طرف سیکڑوں عظیم کتب خانے نذر آتش ہوئے، اور اس طرح اسلامی علوم کا بڑا سرمایہ ضائع ہو گیا، حملۂ تاتار سے اسلامی تمدن کو جو نقصان پہونچا اس کی تلافی ناممکن ہے، کتابوں کے اس عظیم سرمایے سے قطع نظر اس کے بعد کے ادوار کا علمی معیار بھی پست ہو گیا،

مخطوطات کی بربادی میں سیاسی اسباب کے علاوہ اور دوسرے عوامل کا بھی دخل ہوتا ہے، اور سب سے بڑی بات جہل اور عام آدمیوں کی غفلت ہوتی ہے، وہ اچھی اور بری کتابوں میں تمیز نہیں کر سکتے، یہی وجہ ہے کہ اہم مخطوطات کے ساتھ وہی سلوک ہوتا ہے جو کسی غیر ضروری کتاب کے ساتھ ہو، حالانکہ یہی

بات ہے کہ لاہور کے مشہور پروفیسر مولوی محمد شفیع صاحب ایک کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے جو ان
میں اس کی چھٹی جلد کے اندر ان کو کوئی قدیم تحریر نظر آئی، جلد کے اوراق کھول لے گئے تو اس سے مثنوی کا
مفقود مثنوی وامق و عذرا کے خاصے اوراق برآمد ہوئے، پروفیسر صاحب نے ان اوراق کو بڑی
توجہ سے پڑھ کر شایع کر دیا، اس طرح ایک گم شدہ کتاب کا پتہ چل گیا۔

ایک عجیب بات ہے کہ مخطوطات کی حفاظت کی ہر چند کوشش کی جائے، مگر وہ زیادہ سود مند
نہیں ہوتی، رشید الدین فضل اللہ طبیب غازان خان کا دانشمند وزیر تھا، وہ جامع التواریخ کا مصنف ہے،
جو عالمی تاریخ نویسی کی زندہ مثال ہے، فضل اللہ کی اور دوسری تصانیف بھی ہیں، اس نے تبریز میں ایک
کالونی آباد کی، اس کا نام ربع رشیدی رکھا، اس کا ایک حصہ کاتبوں اور خطاطوں کے لیے وقف تھا، جو
اس کی کتابوں کے نسخے تیار کرنے پر مامور تھے، اس طرح اس کی تصانیف کے سیکڑوں نسخے تیار ہو گئے،
اس کے علاوہ اس نے ایک تدبیر یہ بھی کی تھی کہ اپنی ساری کتابوں کو عربی و فارسی دونوں زبانوں میں منتقل کرا
دیا تھا، لیکن جس وقت پروفیسر براؤن تاریخ ادبیات ایران لکھ رہے تھے، رشید کی کتاب کا کوئی نسخہ
مکشوف نہ تھا، بہرحال اس کے چند سال بعد جامع التواریخ کے نسخے ملے، اور اب یہ کتاب شایع ہو چکی
ہے، اس کے مجموعہ رسائل کے نسخے بھی مل چکے ہیں، اور ربع رشیدی کا تیار کیا ہوا ایک نسخہ (عربی زبان والا)
راجہ صاحب محمود آباد کے کتاب خانے میں بھی موجود ہے، اس کی ایک ضخیم کتاب "اسولہ واجوبہ" ہے، اس کے
نسخے بھی مکشوف ہوئے ہیں، ایک نسخہ اٹاوہ میوزیم میں بھی تھا، جو اب مسلم یونیورسٹی میں منتقل ہو چکا ہے۔

باوجود اس امر کے کہ اسلامی علوم کا بیشتر خزانہ ضائع ہو چکا ہے، اور جو باقی ہے وہ محض ایک حقیر
چیز ہے، اور اس باقی ماندہ چیز کا بڑا حصہ قلمی شکل میں ہے، اور یہ قلمی کتابیں اس گئی گذری حالت میں بھی اتنی
ہیں کہ کسی دوسرے تمدن میں نہ ہوں گی، یہ مخطوطے مشرق اور مغرب کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں، مغرب کے
بیشتر کتب خانوں کی فہرستیں بھی شایع ہو گئی ہیں، محض یورپ میں قلمی کتابوں کی تعداد لاکھ سے متجاوز ہو چکی

مجلہ التراث العربی کے حالیہ شمارے کی ایک اطلاع کے مطابق چالیس ہزار سے زیادہ عربی مخطوطات دنیا کے مختلف علاقوں میں ہیں، ان میں فارسی اور ترکی کے مخطوطات جو اسلامیات سے تعلق رکھتے ہیں شامل نہیں، اقبالؒ نے یورپ کے کتاب خانوں میں جب اسلامی خزانے دیکھے تو ان کی آنکھیں چکاچوند ہو گئیں، اس وقت انھوں نے قطعہ لکھا، جس کے یہ شعر قابل ملاحظہ ہیں: ؎

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی ۔۔۔ جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ
غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن ۔۔۔ کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

واقعی اہل یورپ کی کتابوں کے محفوظ کرنے اور پھر ایک حد تک ان کے متعارف کرانے کی سعی مشکور ہوئی، البتہ مشرقی ممالک میں قلمی کتابیں نسبۃً منتشر ہیں، اور ان سے استفادہ آسان نہیں، اکثر کتاب خانوں کی فہرستیں نہیں چھپی ہیں، ذاتی ذخائر کے بارے میں معلومات ہی نہیں، ضرورت ہے کہ ان ذخائر کا پتہ چلایا جائے، اور سب کتاب خانوں کی خواہ عمومی ہوں یا شخصی فہرستیں مرتب ہوں، اس کے بعد صحیح طور پر اندازہ ہو سکے گا کہ ہمارے ذخائر کی کیا نوعیت ہے، اور ہمارے علوم کا کتنا سرمایہ مشرق میں موجود ہے، ادھر چند سالوں سے عرب ممالک میں کچھ ملی احساس بیدار ہوا ہے، اور اپنے علمی ورثہ کی بازیافت اور اس کے متعارف کرنے کی سعی ہو رہی ہے۔

اسلامی علوم سے متعلق جو قلمی ذخیرے ہیں، وہ اس لحاظ سے نہایت درجہ اہم ہیں کہ اتنے متنوع قسم کے مخطوطات کسی دوسرے معاشرے میں نہیں ملیں گے، اور تعداد کے اعتبار سے وہ ساری تہذیبوں پر فائق ہیں، صرف قرآن کریم کے مخطوطات پر غور کریں تو اسلامی تمدن کی علمی برتری پوری طرح واضح ہو جائے گی، اس صحیفے کے جتنے نسخے دنیا میں ہیں، کسی ایک کتاب کا کیا ذکر، متعدد فنی کتابوں کے سارے مخطوطات اتنے نہ ہوں گے، پھر ان پر جتنی فنکارانہ مشق ہوئی ہے اس کی مثال سارے عالم میں نہیں ملے گی، قرآن مجید کے نسخوں سے خطاطی کی تاریخ مرتب ہو سکے گی۔

[illegible] طبقات پر نظر ڈالنے سے ایک لحاظ سے اطمینان ہوتا ہے کہ باوجود اسکے کہ بہت سے مختصر تذکرے ہیں لیکن معلومات اتنی بھی وہ زیادہ وسیع ہیں، لیکن ساتھ ہی اتنے سرمایے کی بربادی پر بڑا افسوس ہوتا ہے اور جیسا کہ عرض ہو چکا ہے برباد شدہ حصہ باقی حصے کا کئی گنا ہے، اگر بعض عظیم مصنفین کے آثار پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کی تمام تصانیف ہم تک پہونچی ہوں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی علوم سے متعلق ہمارا علم کتنا ناقص و نامکمل ہے، گم شدہ مواد کا ایک نقشہ ہمارے ذہن میں اس طرح قائم ہو سکتا ہے اگر ہم چند کتابوں کے مآخذ و منابع پر ایک نظر ڈال لیں، فی الحال میں تین کتابوں کا مطالعہ اس لحاظ سے پیش کرتا ہوں :

۱۔ فضائل بلخ، تالیف شیخ الاسلام صفی الدین ابوبکر عبد اللہ بن عمر بن محمد بن داؤد واعظ بلخی، تالیف [illegible] ۲۔ طبقات الصوفیہ خواجہ عبد اللہ انصاری، تالیف [illegible]۔ ۳۔ العباب الزاخر تالیف امام صغانی (م [illegible])

فضائل بلخ عربی زبان میں تھی، یہ کتاب مفقود ہے، اس کا فارسی ترجمہ باقی ہے، مترجم عبد اللہ محمد بن محمد بن حسین بلخی اور ترجمہ کی تاریخ ۶۷۶ھ ہے، فضائل بلخ میں ستر ایسے مشائخ بلخ کا تذکرہ ہے جن سے حدیث روایت ہے، ان میں پہلے شیخ رواد بلخی ہیں جو صحابی تھے، فضائل بلخ کے مآخذ میں حسب ذیل کتابیں تھیں :

۱۔ مناقب بلخ، ناپید ہے۔ ابو زید بلخی، ۲۔ تاریخ بلخ محمد بن عقیل بلخی، ناپید ہے، ۳۔ کتاب البہجہ، ناپید ہے، ۴۔ طبقات عبد اللہ جویباری، ناپید ہے، ۵۔ المعجم الکبیر ابو اسحاق مستملی ۱۴ دفتر میں تھی، سمعانی نے کتاب الانساب میں تذکرہ کیا ہے، اب ناپید ہے، ۶۔ طبقات علی بن فضل، چار جلد میں تھی اب ناپید ہے، ۷۔ قواریخ بلخ، ناپید ہے، ۸۔ تاریخ بلخ ناصر الدین سمرقندی، ناپید ہے، ان کے علاوہ حسب ذیل کتابوں کا نام آیا ہے : ۱۔ سلوۃ العارفین، ناپید ہے، ۲۔ رسالہ قشیریہ، موجود ہے، ۳۔ تذکرۃ الاولیاء موجود ہے، ۴۔ الحقائق لاہل الحقائق، موجود ہے، ۵۔ کتاب ضحاک، ناپید ہے، ۶۔ نزہۃ [illegible] ناپید ہے، ۷۔ کتاب النوازل، موجود ہے، ۸۔ کتاب النوادر، ۹۔ جل الزوائد، موجود ہے، ۱۰۔ حلیۃ الاولیاء

[illegible] ۱۱۔ کتاب العافیہ، ناپید ہے۔ ۱۲۔ تصانیف ہر محمہ، ناپید ہے، ۱۳۔ امالی شیخ الشیوخ، ناپید ہے، ۱۴۔ امالی شیخ الاسلام محمد بن احمد ملیحی، ناپید ہے، ۱۵۔ امالی قاضی القضاۃ ابوبکر، ناپید ہے؛ ۱۶۔ کتاب الدلائل البینات، ناپید۔

مؤلف کے آٹھ[۸] اہم منابع میں کوئی موجود نہیں، بقیہ سولہ[۱۶] کتابوں میں سے چھ[۶] موجود ہیں، اور ۱۰ مفقود۔

خواجہ عبداللہ انصاری کی طبقات الصوفیہ کے قبل کے متعدد صوفیہ کے تذکرے لکھے گئے تھے، ان میں سے سوائے سلمی (م: ۴۱۲) کے طبقات کے کوئی باقی نہیں ہے، خواجہ صاحب نے حسب ذیل ماخذ سے اپنا تذکرہ تیار کیا تھا:

۱۔ تاریخ مشائخ یا طبقات الصوفیہ، تالیف محمد بن علی حکیم ترمذی، ان کی وفات سنہ ۲۵۵ھ میں ہوئی، ابوالحسن علی ہجویری صاحب کشف المحجوب نے یہ کتاب دیکھی تھی، یہ کتاب مفقود ہے۔

۲۔ اخبار الصوفیہ والزہاد، تالیف ابوبکر محمد بن داؤد بن سلیمان، متوفی سنہ ۳۴۲ھ سلمی کے استاد تھے، یہ کتاب بھی مفقود ہے۔

۳۔ طبقات النساک، تالیف ابوسعید احمد بن محمد غزنی، متوفی سنہ ۳۴۱ھ، ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء میں اس سے استفادہ کیا ہے، اب ناپید ہے۔

۴۔ کتاب اسماء مشائخ فارس، تالیف ابوعبداللہ محمد بن خفیف، متوفی سنہ ۳۷۱ھ یا ۳۸۲ھ، یہ کتاب اب موجود نہیں۔

۵۔ کتاب اللمع، تالیف محمد بن احمد بن ابراہیم معروف بہ ابوبکر مفید، ابونصر سراج نے اپنی تصنیف اللمع میں اس سے استفادہ کیا ہے۔

۶۔ معجم الشیوخ، تالیف ابواسحاق ابراہیم بن احمد بن داؤد مستملی بلخی، متوفی سنہ ۳۷۶ھ، اس کا

مصنف کی ایک دوسری کتاب طبقات اہل بلخ تھی جو ابن حجر عسقلانی کے مطالعہ میں رہی تھی، مگر اس کے کسی نسخے کا علم نہیں۔

۷۔ طبقات الصوفیہ، تالیف ابو العباس احمد بن محمد بن زکریا زاہد نسوی (س ۳۹۶ھ)

۸۔ تاریخ ابوبکر محمد بن عبداللہ رازی شیخ خراسان استاد سلمی (سنہ ۳۴۰ھ)

۹۔ طبقات الصوفیہ، تالیف ابو عبدالرحمٰن محمد بن حسین سلمی (م ۴۱۲ھ)

یہی آخر الذکر کتاب[1] باقی ہے، بقیہ کسی ایک کا پتہ نہیں۔

امام حسن بن محمد بن حسن صغانی لاہوری (م: ۶۵۰) مشارق الانوار کے لائق مصنف ہیں، ان کی کتاب العباب الزاخر لغت کی مشہور کتاب ہے، اس کے مقدمہ میں سو سے زیادہ کتابوں کا ذکر ہے، ان میں سے نصف کے قریب فنا ہو چکی ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

محمد بن حبیب بغدادی کی حسب ذیل کتابیں: کتاب المنمق، موشح، موتلف، المؤتلف و المختلف، کتاب ایام العرب، ابو حاتم سجستانی کی حسب ذیل کتابیں: کتاب الطیر، کتاب النخل، ابن الصائب کلبی کی کتاب المعمرین، کتاب الافراق العرب، کتاب القاب الشعراء، ابن السکیت: کتاب الصغیر، کتاب البحث، کتاب الفرق، اخفش: کتاب النوادر، کسائی: کتاب النوادر وغیرہ وغیرہ۔

تفصیلات بالا سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ائمۂ فن کا کتنا بڑا حصہ مفقود ہے، اس میں کلام نہیں کہ ان مفقود مخطوطات میں کچھ ایسے ضرور ہیں جو گوشۂ گمنامی میں پڑ گئے ہیں، تحقیق و تلاش سے ان میں سے کچھ ضرور معلوم ہو سکتے ہیں، اور خوشی کی بات ہے کہ اب ایک نہضت شروع ہو چکی ہے، اس کے نتیجے میں کئی ہزار نئے مخطوطات سامنے آ گئے ہیں، خصوصاً عربوں میں اپنے ورثہ کی بازیافت اور ان کو عام کرنے کا شدید جذبہ

---

[1] یہ پوری کتاب پروفیسر Johannes Pedersen دانش گاہ کوپن ہیگن کے مقدمے کے ساتھ لیڈن سے [illegible] میں چھپی، پہلا [illegible] حصہ ۱۹۶۰ء میں مصر سے شائع ہو چکا تھا۔

پیدا ہو چکی ہے، اس کے نتیجہ میں شام، عراق، لبنان، مصر، سعودی عرب، کویت، یمن وغیرہ ممالک میں تحقیقی ادارے کھلے جا رہے ہیں، اور ان اداروں کے توسط سے نئے نئے مخطوطات سامنے آ رہے ہیں، ان کو متعارف کیا جا رہا ہے، کتاب خانوں کی فہرستیں شایع ہو رہی ہیں، اور دنیا کے مختلف حصوں میں جو اسلامی علوم سے متعلق ہیں، ان سے رابطے قائم ہو رہے ہیں، ان ہی میں کویت کا ادارہ معهد المخطوطات العربية ہے، اس سے ایک نہایت عمدہ علمی و تحقیقی مجلہ اخبار التراث العربی کے نام سے شایع ہو رہا ہے، اس میں نئے نئے مخطوطات اور نادر کتابوں کی اشاعت، کتاب خانوں کی فہرستوں کے بارے میں دلچسپ اطلاعات درج ہوتی ہیں، اسلامیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس مجلہ کا مطالعہ ناگزیر ہے، اس سے اس نہضت کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا جو عالم عرب میں خصوصاً اور دنیائے اسلام میں عموماً شروع ہو چکی ہے یہ بڑی نیک فال ہے، اور اس سے واضح ہے کہ عالم اسلام کو اپنے ماضی کی شاندار علمی روایات کا احساس بخوبی ہو چکا ہے، اور امید کی جا سکتی ہے کہ ان شاء اللہ چند سالوں میں اسلام کی علمی روایت کی عظمت کا احساس عام ہو جائے گا، اور احساس زیاں سے جو نقصان پہونچا ہے اس کی تلافی ہو سکے گی، اس سلسلہ میں دو تین باتیں ضروری ہیں، اول یہ کہ دوسرے ممالک میں بھی اسی نوعیت سے کام کی رفتار تیز کر دینی چاہیے، دوسرے یہ کہ ان تمام ممالک کے درمیان ایک علمی رابطہ قائم کرنا چاہیے، اس کے لیے ایک عالمی ادارے کے قیام کی ضرورت ہے، تیسری گذارش یہ ہے کہ در اصل عرب علوم اسلامی کو عربی ورثہ کہتے ہیں، یہ نام صحیح نہیں، اس کو اسلامی ورثہ کہنا چاہیے، اس لیے کہ ان علوم کا تعلق نہ صرف عرب ممالک اور عربی زبان سے ہے، بلکہ غیر عرب ممالک خصوصاً ایران، ترکی، ہندوستان، پاکستان وغیرہ مشرقی ممالک کا اسلامی علوم کی ترقی میں برابر کا حصہ ہے، اور اسی اعتبار سے عربی کے علاوہ فارسی، ترکی، اردو کا مطالعہ اس سلسلہ میں ناگزیر ہے، بلکہ میں تو یہاں تک عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ ملایا اور انڈونیشیا کو بھی اسی زمرے میں شامل کرنا چاہیے، اس نہضت جہانی کی ابتدا ہو چکی ہے، اس میں ہر شخص کو اپنی استعداد کے مطابق حصہ لینے کا ازبس ضرورت ہے۔

یہ [illegible] مسلّم ہے کہ اسلامی علوم نے تہذیبِ عالم کی ترقی میں اہم حصہ لیا ہے لیکن ان علوم کا بیشتر حصہ مخفی ہے، اور جو معلوم ہے، وہ گم شدہ حصے کا محض ایک قلیل جزو ہے، اور ان علوم کا بڑا حصہ مخطوطات کی شکل میں ہے جن کی کثرت کا عالم یہ ہے کہ بعض بعض ممالک میں ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچ جائے گی، مخطوطات میں بیشتر ایسے ہیں جہاں تک عوام کا کیا ذکر، فضلاء تک کی رسائی نہیں، ہمارا علم صرف مطبوعات تک محدود ہے، اور یہ مطبوعات کا حصۂ کثیر انتقادِ متن کے اصولوں پر پورا نہیں اترتا، اس سلسلہ میں حسب ذیل امور از بس ضروری ہیں:

۱. اسلامی مخطوطات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ اطلاعات بہم پہونچائی جائیں۔

۲. اہم مخطوطات کو چھاپ کر عام کیا جائے۔

۳. چھپی ہوئی کتابوں کو انتقادِ متن کے اصول پر پھر سے چھاپا جائے۔

۴. گم شدہ مخطوطات کی بازیافت کی کوشش کی جائے۔

خوشی کی بات ہے کہ اس سلسلہ کی نہضت کا آغاز ہو چکا ہے، اور اہل عرب بخصوصیت سے اس طرف متوجہ ہیں، ان میں اپنے ورثہ کی بازیافت کا جذبہ شدت سے پیدا ہو گیا ہے، یہ بڑی خوش آئند علامت ہے، مستقبل قریب میں اچھے نتائج کے سامنے آنے کی پوری توقع ہے۔

اسلام اور عربی تمدن

یہ کتاب شام کے مشہور فاضل محمد کرد علی کی کتاب الاسلام والحضارۃ العربیۃ کا ترجمہ ہے، جس میں مصنف نے اسلامی تہذیب و تمدن پر علمائے مغرب کے اہم اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے اور عہد بہ عہد مسلمانوں کے اخلاقی، علمی اور تمدنی احسانات اور ان کے اثرات و نتائج کی تفصیل بیان کی گئی ہے اور [illegible] مسلمانوں کی علمی و تمدنی تاریخ پر اجمالی تبصرہ بھی آ گیا ہے، از شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم، قیمت [illegible]

مولانا سید سلیمان ندویؒ

نذرانۂ عقیدت

از

عالی جناب سید مظفر حسین برنی صاحب گورنر ہریانہ

"یہ افتتاحیہ خطبہ ہے جو انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی صد سالہ سالگرہ کے ایک سیمینار میں ۹ر مارچ ۱۹۸۴ء کو انجمن کے دفتر اردو گھر، راؤز ایونیو نئی دہلی میں عالی جناب گورنر صاحب نے پڑھا۔ (ص۔ع)

سب سے پہلے مجھے انجمن ترقی اردو (ہند) کا شکریہ ادا کرنا چاہیے، کہ اس نے دہلی میں علامہ سید سلیمان ندویؒ مرحوم کی صد سالہ تقریباتِ ولادت منانے کا اہتمام کیا، انجمن پر سید صاحب کا حق بھی تھا، اس لیے کہ وہ ماضی میں اس تہذیبی اور علمی ادارے کے بڑے قدردان رہے، اور ان کے نامور استاد علامہ شبلی نعمانی مرحوم اسی انجمن کے پہلے سکریٹری تھے، مولانا سید سلیمان ندویؒ مرحوم نے اردو زبان ہی نہیں تمام مشرقی علوم پر جو احسانِ عظیم کیا ہے، اس کا اعتراف نہ کرنا بڑی ہی احسان فراموشی ہوتی۔

میرے لیے یہ واقعی عزت و افتخار کی بات ہے کہ ایسی جلیل القدر علمی شخصیت سے منسوب ان تقریبات کا افتتاح کروں، اگرچہ میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کے علمی مراتب کے سامنے خود کو بالکل ہیچ پاتا ہوں، لیکن یہ سوچ کر راضی ہوگیا کہ مجھے تو علم و فضل کا دعویٰ بھی نہیں ہے، جن کو بجا طور پر بھی یہ دعویٰ ہوسکتا ہے وہ بھی مولانا سید سلیمان ندوی

کی قدر اور علمی شخصیت کے سامنے بونے ہی نظر آئیں گے، کچھ اسی طرح کا جذبہ پیدا کر کے میں نے ہامی بھر لی تھی، اور ایک محرک یہ خوشی بھی تھی کہ اس بہانے تھوڑا سا وقت ایک علمی مجلس میں اہل علم کے ساتھ گذرے گا، اور میں ایسے لمحوں کو اپنی تمام مشغولیتوں میں سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں،

اردو زبان کی علمی روایات کا تسلسل پورے مشرق سے جڑا ہوا ہے، عربی میں علمی تحقیق کی ڈیڑھ ہزار سال پر پھیلی ہوئی شاندار تاریخ ہے، تو فارسی میں شعر و ادب کا ایسا گنج گراں مایہ موجود ہے جس میں فردوسی، حافظ، سعدی اور رومی جیسے کتنے ہی لعلِ شب چراغ جگمگا رہے ہیں، یہ ساری تکوینی اور تحقیقی روایات تہذیب و معاشرت کی چھلنی میں چھن چھن کر اردو زبان کے دامن تک پہونچی ہیں، اس لیے خواہ اردو کی عمر ڈیڑھ دو سو سال سے زیادہ نہ ہو، مگر اس کی علمی و تہذیبی روایات ڈیڑھ ہزار برسوں پر پھیلی ہوئی ہیں، اسی لیے ان میں تب و تاب ہے، اور یہی سبب ہے کہ عہد زوال میں بھی یہ زبان اپنی نشو و نما سے محروم نہیں رہی ہے، انیسویں صدی کے نصف آخر سے مغربی افکار نے بھی ان علمی روایات میں نئی جلا اور تازگی پیدا کی ہے، اس لیے اردو کی کوئی علمی شخصیت جسے مشرقی علوم یعنی عربی و فارسی کے علمی خزانوں سے استفادہ کا موقع ملا ہو اور جس نے جدید مغربی افکار سے بھی کسی حد تک فیض حاصل کیا ہو، اس میں ایک خاص جامعیت کی شان پیدا ہو جاتی ہے، اس کا علم وسیع بھی ہوگا، گہرا بھی، فکر انگیز و روح پرور بھی ہوگا، اور بوقلمون و شاداب بھی۔

اس علمی جامعیت کا سب سے شاندار مظہر مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کی شخصیت ہے، ان کے کمالات کا ایک مختصر تقریر میں تو کیا ضخیم کتابوں میں بھی احاطہ نہیں کیا جا سکتا، وہ عالم بھی ہیں، شاعر بھی ہیں، صاحب طرز انشا پرداز بھی، مورخ بھی ہیں، جغرافیہ دان بھی، لسانیات کے رمز آشنا بھی ہیں، عمرانیات کے دقیقہ رس بھی، وہ نقاد ہیں، محقق ہیں، مبصر ہیں، صحافی ہیں اور صوفی بھی، علوم اسلامیہ میں ان کے درک و بصیرت کا اعتراف علامہ اقبال نے ان لفظوں میں کیا تھا:

”آج سید سلیمان ندوی ہماری علمی زندگی کے سب سے اونچے زینے پر ہیں، وہ عالم ہی نہیں امیر العلماء ہیں،“

> مصنف ہی نہیں، رئیس المصنفین ہیں، ان کا وجود علم و فضل کا ایک دریا ہے جس سے سیکڑوں نہریں نکلی ہیں اور ہزاروں سوکھی کھیتیاں سیراب ہوتی ہیں۔

ان کے بارے میں ڈاکٹر اقبالؔ کا یہ ریمارک بھی ضرب المثل کی طرح مشہور ہو گیا ہے کہ "علوم اسلامی کے جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سوائے سید سلیمان ندوی کے اور کون ہے؟" علوم اسلامی کے بہت سے باکمال عالم اور محقق گذشتہ صدیوں میں پیدا ہوئے ہیں، جنھوں نے اپنی بیش بہا علمی کاوشوں سے اردو زبان کے خزانے کو شاندار اور بھرپور بنایا ہے، مگر آپ موازنہ کریں گے تو یہ پائیں گے کہ مولانا سید سلیمان ندوی کی شان ہی کچھ اور ہے، وہ کسی میدان میں بند نہیں ہیں، اور جدھر نکل جاتے ہیں اپنے نقشِ پا چھوڑ جاتے ہیں، ایسے نقشِ پا کہ ع

سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد شد

علوم قرآنیہ، تفسیر، حدیث، سیرت، فن رجال، تاریخ اسلام، تاریخ افکار اسلامی، منطق و فلسفہ، علم الکلام، علم لغت، غرض ماضی کے شاندار تہذیبی ورثہ کا کوئی ایسا اہم پہلو نہ رہا ہوگا، جس میں مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے اپنی بصیرت اور گہری فراست کا ثبوت نہ دیا ہو، اس کا اندازہ اس بات سے ہو جائے گا کہ اپنے خطوط میں علامہ اقبالؔ جن کو مشرقی اور مغربی علوم دونوں پر عبور حاصل تھا، مولانا سید سلیمان ندوی سے مختلف علمی اور ادبی امور میں بہت ہی عجز و انکسار کے ساتھ معلومات حاصل کرتے ہیں، افسوس یہ ہے کہ مولانا کے جوابات اب تک منظر عام پر نہ آسکے، ورنہ علم و ادب کا ایک چمنستان کھل جاتا۔

ان کی تصانیف کی ایک طویل فہرست ہے، انھوں نے ۱۹۱۶ء میں "ارض القرآن" جیسی محققانہ کتاب دو جلدوں میں لکھی، جس میں ان مقامات اور اقوام و قبائل کی تاریخی و اثری تحقیق ہے، جن کا حوالہ قرآن مجید میں آیا ہے، لینڈ آف دی بائبل پر ایسے کئی کام ہو چکے ہیں، اور زیادہ تر ان لوگوں نے کیے ہیں جن کا تعلق ارض شام و فلسطین کی حفری مہموں (EXCAVATIONS) سے رہا ہے، لیکن ان کی

تحقیقات سے ہمیشہ رد و بدل ہوتی رہتا ہے۔ اور آج سے ۳۰ - ۲۵ سال قبل مصر میں جو ذخیرہ Papyri کا دریافت ہوا اس نے تو بیشتر محققین کو اپنی کتابوں پر نظر ثانی کرنے کے لیے مجبور کر دیا ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے EXCAVATIONS کی عملی مہموں میں حصہ نہیں لیا، مگر جغرافیۂ قرآن کے سلسلہ میں جن نتائج تک وہ ۱۹۱۵ء میں پہونچ گئے تھے، ان میں نہ کوئی اہم اضافہ ہو سکا ہے، نہ کسی تحقیق کو مکمل طور پر رد کیا جا سکا ہے۔

ان کا دوسرا اور سب سے اہم کارنامہ جو انھیں ہمارے علماء کی صف میں ہمیشہ ممتاز و منفرد رکھے گا وہ سیرۃ النبیؐ ہے، اردو زبان میں ایک جامع اور مکمل کتاب سیرت لکھنے کا پلان علامہ شبلی مرحوم نے اپنی زندگی کے آخری دور میں بنایا تھا، اور اس کی سرپرستی ریاست بھوپال کی علم دوست فرماں روا نواب سلطان جہاں بیگم نے کی تھی، شبلیؒ نے بڑی لگن اور عقیدت کے ساتھ اسی کام کو شروع کیا تھا، اور کہا تھا ؎

عجم کی مدح کی، عباسیوں کی داستاں لکھی	مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم	خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

انھوں نے تمام معروف و غیر معروف مستند ماخذوں سے سیرت طیبہ کا مواد اکٹھا کرنا شروع کیا، پہلی جلد مرتب ہو چکی تھی، دوسری جلد ابھی پوری طرح مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ علامہ شبلیؒ کو سفرِ آخرت کا بلاوا آ گیا، انھیں اپنے اس منصوبے کی تکمیل کا بہت خیال تھا، مولانا سید سلیمان ندویؒ اس وقت دکن کالج پونا میں لکچرر تھے، علامہ شبلیؒ نے انھیں بلایا، اور وصیت کی کہ جس طرح بھی ہو اس منصوبے کو مکمل کر دیں، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے استاد کے حکم کی تعمیل کی، اور کالج کی ملازمت ترک کر کے سیرۃ النبیؐ لکھنے میں مشغول ہو گئے، پھر انھوں نے جس شان سے اس کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا، وہ آپ سب جانتے ہیں، دنیا کی کسی زبان میں ایسی جامع اور منفرد کتاب سیرت کے موضوع پر موجود نہیں ہے، صرف یہی ایک کارنامہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کی حیات جاوداں کی ضمانت بن سکتا تھا، مگر ان کے قلم سے نکلی ہوئی ہر کتاب کا یہی حال ہے کہ وہ ان کے فضل و کمال اور بے مثال صلاحیتوں پر گواہ بن گئی ہے۔

سیرۃ النبی کی پانچ جلدوں میں انھوں نے جس طرح سیرت اور فلسفۂ سیرت کو پیش کیا ہے، اسے پڑھ کر یہ تاثر ہوتا ہے کہ اب اس موضوع پر لکھنے کی گنجائش نہیں رہ گیا ہے، مگر اس خیال کی تردید بھی مولانا سید سلیمان ندویؒ ہی کر سکتے تھے، انھوں نے اکتوبر، نومبر ۱۹۲۵ء میں سیرت ہی کے موضوع پر آٹھ لکچر دیے، جو خطبات مدراس کے نام سے چھپے ہیں، ان میں جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں اور مغربی فکر سے متاثر مسلمانوں کو اپنا مخاطب بنایا ہے، اس لیے تمام انداز وہی ہے جو ایک مغرب زدہ ذہن کو اپیل کر سکتا ہے، یہ خطبات انگریزی اور عربی میں ترجمہ ہو کر بھی مقبول ہوئے ہیں، اور عربی ترجمہ پڑھ کر عرب علما نے بھی اعتراف کیا ہے کہ اس انداز کی کوئی کتاب سیرت طیبہ کے موضوع پر عربی زبان میں بھی موجود نہیں ہے۔

سیرت کے علاوہ وہ سوانح نگاری کے میدان کے بھی شہسوار ہیں، "حیات مالکؒ" (۱۹۱۷ء)، "سیرت عائشہؓ" (۱۹۲۴ء) اور "حیات شبلیؒ" (۱۹۴۳ء) انھیں اردو کا بہترین سوانح نگار ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔

انھوں نے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی فرمائش پر مارچ ۱۹۲۹ء میں "عرب و ہند کے تعلقات" پر جو لکچر دیے تھے، وہ آج تک اس موضوع پر سب سے زیادہ مفصل عالمانہ اور محققانہ خطبات ہیں، اسی طرح ۱۹۳۰ء میں انھوں نے اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن کے ایما پر "عربوں کی جہاز رانی" پر چار لکچر بمبئی میں دیے، جن سے اس موضوع پر بہت سی نئی باتیں پہلی بار سامنے آئیں۔

عربی زبان پر ان کی قدرت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے ۱۹۱۲ء میں طلبہ کی رہنمائی کے لیے جدید عربی کی ایک لغت چند ماہ میں تیار کر لی تھی، جس میں اخبار اور موجودہ دور میں استعمال ہونے والی زبان کا اندراج کیا گیا ہے، اور برسوں تک اردو میں یہ واحد لغت رہی، جس سے جدید عربی کے الفاظ کو سمجھا جا سکتا تھا۔

فارسی میں ان کی گہری واقفیت کا حال "خیام" سے معلوم ہوتا ہے، خیام پر مشرق و مغرب میں بہت کام ہوا ہے، مگر مولانا سید سلیمان ندویؒ کی علمی تحقیقات سب سے ممتاز ہیں، اقبال نے یہ کتاب دیکھ کر کہا تھا کہ اب

اور موضوع پر اب تک کچھ اضافہ نہیں کیا جا سکے گا، یہ کتاب ۱۹۳۳ء میں چھپی تھی، آدھی صدی سے زیادہ عرصہ گزر گیا ہے مگر کوئی اسکالر نہ ایران میں، نہ ہندوستان میں، اس پر ایک سطر کا اضافہ نہیں کر سکا ہے، البتہ انگلستان میں ایک مشہور جدید شاعر Robert Greves نے رباعیات کے ایک قدیم نسخہ پر کچھ تحقیق کی ہے جو ایک ایرانی امیر کے قبضہ میں تھا، لیکن اس کا درجہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی معرکۃ الآرا تصنیف کے مقابلہ میں درخور اعتنا نہیں۔

یہ ان کی چند تصانیف کے نام ہیں، ان کے علاوہ اردو زبان اور لغت سے متعلق مسائل پر ان کے مضامین "نقوشِ سلیمانی" اپنی جداگانہ شان رکھتے ہیں، وہ لسانیات کے مرد میدان نہیں تھے، اور یہ ایک جدید ترین شاخ ہے، جس میں اب تو سائنسی آلات اور کمپیوٹر کی مدد سے ریسرچ ہو رہا ہے، سید صاحبؒ نے لسانیات اور علم اللغۃ (فیلالوجی) میں بھی جو کچھ لکھا ہے، وہ ان کے زمانہ کے وسائل کو دیکھتے ہوئے صد درجہ قابل تعریف کوشش ہے۔

اس کے علاوہ انھوں نے جولائی ۱۹۱۶ء سے رسالہ "معارف" شایع کیا، اور چالیس سال تک اس کے ایڈیٹر رہے، اس میں شذرات کے علاوہ وہ "یادِ رفتگان" کا بھی ایک کالم لکھتے تھے، "باب التقریظ والانتقاد" میں سیکڑوں کتابوں پر عالمانہ تبصرے کیے، اور "معارف" کا ایسا بلند علمی معیار قائم کر دیا کہ اردو کا کوئی دوسرا مجلہ اس کی گرد کو نہیں پہونچ سکا، "معارف" میں جو علمی مضامین شایع ہوتے رہے ہیں، ان کی وجہ سے اس رسالہ کے فائل اب علوم مشرقی کی ایک بھرپور انسائیکلوپیڈیا نظر آتے ہیں، اگر انھی مضامین کو معمولی قطع و برید کے بعد ابجدی ترتیب میں شایع کر دیا جائے تو نہایت اعلیٰ پایہ کی انسائیکلوپیڈیا بنی بنائی موجود ملے گی۔

موضوع بہت وسیع ہے اور مجھے اپنی بے بضاعتی کا اعتراف ہے، پھر بھی مولانا سید سلیمان ندویؒ کی شخصیت، سیرت اور علمی کارناموں کے اتنے وسیع اور رنگارنگ پہلو نگاہوں کے سامنے آتے ہیں کہ فیصلہ کرنا سخت دشوار ہے، کیا کہا جائے، کیا نہ کہا جائے ؎ خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست۔

سید صاحبؒ انشا پرداز بھی ایسے تھے کہ سیرۃ النبی میں انھوں نے اپنا اسلوب علامہ شبلی نعمانیؒ کے اسلوب سے ملا دیا ہے[1] اور آج یہ تمیز کرنا دشوار ہے کہ علامہ شبلیؒ کا قلم کہاں ہے، اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کہاں بول رہے ہیں، اسی طرح انھوں نے جب مولانا آزاد کے اخبار "الہلال" میں علمی و سیاسی موضوعات پر مضامین لکھے تو ایک دھوم مچ گئی، "الہلال" میں مضمون نگار کا نام نہیں ہوتا تھا اس لیے ساری تحریریں مولانا آزاد ہی کی سمجھی گئیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ جن بعض مضامین نے اپنے زمانہ میں بے حد مقبولیت حاصل کی، اور مولانا آزاد کی تحریر سمجھ کر انھیں "مقالات آزاد" کے مجموعوں میں شامل کر لیا گیا، وہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے قلم سے لکھے گئے تھے، ان میں "اسلام اور سوشلزم" (البلاغ، فروری سنہ ۱۹۱۱ء) "الحریۃ فی الاسلام" (الہلال، جون سنہ ۱۹۱۳ء تا اکتوبر سنہ ۱۹۱۳ء) "مشہد اکبر" (الہلال، اگست سنہ ۱۹۱۳ء) کا بطور مثال ذکر کیا جا سکتا ہے۔

مولانا کو شعر و سخن سے باضابطہ تعلق تو نہیں رہا، البتہ طبیعت موزوں پائی تھی، مثال کے طور پر سفر گجرات کے دوران جب بھڑوچ پہونچے اور دریائے نربدا کے کنارے کھڑے ہوئے تو جذبات کے تلاطم نے ایک خوبصورت نظم کی شکل اختیار کر لی، چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نربدا! اے نربدا! اے جادۂ بحر عرب	گرچہ تو ہندی ہے، لیکن زادۂ بحر عرب
تو گذشتہ کاروانوں کا نشانِ راہ ہے	ہند میں اسلام کی تاریخ سے آگاہ ہے
رشتۂ ہند و عرب تجھ سے ہوا تھا استوار	تیرے ساحل کا ہر اک ذرہ ہے اس کی یادگار
تو ہے دریائی پری یا شاہدِ عالم ہے تو	اس سمندر کے گلے کی شہ رگِ اعظم ہے تو
تیرا ہر قطرہ حیاتِ نو کا اک سرشار جام	اس ترو آبی میں تیرا خون دوڑانا ہے کام

مولانا کا مجموعۂ کلام "ارمغانِ سلیمان" کے نام سے کراچی میں چھپ چکا ہے۔

---

[1] نقوش سلیمانی، ص ۲۷۲

چنانچہ یہ بھی عرض کر دوں کہ مولانا شعر و شاعری کا بھی ستھرا ذوق رکھتے تھے۔

اسی طرح جب جگر مرادآبادی کا کلام پہلی بار سنتے ہیں تو اس کی سرمستی اور سرشاری سے اسی درجہ متاثر ہوتے ہیں کہ کلام جگر کے مجموعہ "شعلۂ طور" پر ایک بے مثال تعارف لکھتے ہیں، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:[1]

"جگر مست ازل ہے، اس کا دل سرشار الست ہے، وہ محبت کا متوالا ہے، اور عشق حقیقی کا جویا، وہ مجاز کی راہ سے حقیقت کی منزل تک، اور بت خانہ کی گلی سے کعبہ کی شاہراہ کو، اور خمخانہ کے بادۂ کیف سے خود فراموش ہو کر بزم ساقی کوثر تک پہونچنا چاہتا ہے، جگر بظاہر سرشار مگر درحقیقت بیدار ہے، اس کی آنکھیں پرخمار مگر اس کا دل ہشیار ہے، اور کیا عجب کہ خود جگر کو بھی اپنے دل کا تجربہ ہو، اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کے کلام میں اثر نہ ہوتا"

کیا طرز ادا ہے، کیا ندرت بیان ہے، کیا روانی ہے اور کیا حسین تجزیۂ کلام جگر ہے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ ندوۃ العلماء سے بھی وابستہ رہے، اور اس کے مجلہ "الندوۃ" کی ادارت کئی بار انھیں سونپی گئی، وہاں وہ تفسیر، فقہ اور حدیث کا درس بھی دیتے رہے، پھر انھوں نے دارالمصنفین اعظم گڈھ کو ایک بے مثال علمی ادارہ بنانے میں اپنی زندگی کا بہترین حصہ وقف کر دیا، آج بھی ندوۃ العلماء یا دارالمصنفین کا جو علمی وقار ہے، اس میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کی بے لوث خدمات کا بہت بڑا حصہ ہے، انھیں شاگردوں اور مخلص رفیقوں کی بھی ایک ایسی جماعت مل گئی کہ ان حضرات نے دنیا کے طمطراق سے آنکھیں بند کر کے قلندرانہ وضع میں ساری زندگی گذار دی اور علم کی خدمت کر کے مگن رہے۔

انھوں نے قابل رشک وقار و تمکنت کے ساتھ پوری زندگی صرف کتابوں اور کتب خانوں کے درمیان گذاری، اور اب وہ ہمیشہ ان کتب خانوں میں زندہ رہیں گے اور ان کی کتابوں کی ایک ایک سطر ان کے علم و فضل اور پاکیزہ مذاق کی گواہی دیتی رہے گی۔

---

[1] نقوش سلیمانی، ص ۳۶۳۔

ہم مولانا محمد علی جوہرؔ سے کیا سیکھ سکتے ہیں؟

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

"یہ مقالہ کلکتہ کی مولانا محمد علی لائبریری کے اس سیمنار میں پڑھا گیا جو مولانا محمد علی جوہرؔ پر ۱۷ر ۱۸ر فروری ۱۹۸۰ء کو کلکتہ میں ہوا"

مولانا محمد علی جوہرؔ پر یہ سیمنار اس وقت ہو رہا ہے جب ہمارا ملک بقول ہمارے وزیر اعظم مساجیو گاندھی اکیسویں صدی میں داخل ہونے والا ہے، گذشتہ دسمبر میں ہمارے ملک میں جو انتخاب ہوا، اور اس میں اندرا کانگریس کو غیر معمولی فتح و کامرانی ہوئی ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شریمتی اندرا گاندھی کی اچانک وفات کے بعد ہمارا ملک از سرنو تازہ دم ہو کر جاگ اٹھا ہے، اس جاگ کے بعد یہ سوچنا ہے کہ اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت یعنی مسلمانوں کو اپنی سیاسی زندگی کو کس طرح سنوار کر کے رکھنا ہے، اس سنوارنے میں کیا مولانا محمد علی جوہرؔ کی زندگی مدد دے سکتی ہے؟ کیا ان کی سیاسی زندگی سے ہم کچھ سبق سیکھ سکتے ہیں؟ کیا وہ ہمارے لیے کوئی پیام چھوڑ گئے ہیں؟

جہاں تک میری ذاتی رائے ہے کہ میں ان کو مسلمانوں کا ایک ایسا قائد سمجھتا ہوں جن سے بہتر ان سے پہلے کوئی پیدا نہیں ہوا، آپ کو حق ہے کہ آپ اس رائے سے اختلاف کریں، لیکن آپ کو اس کا حق نہیں کہ مجھ کو اپنی رائے بدلنے پر مجبور کریں، یہ تسلیم کہ ان کی سیاسی زندگی شکستوں سے معمور رہی، انھوں نے کامیابیاں

[illegible] کاری کو انگریزوں نے بھی تسلیم کیا، لیکن یہ وہ بہت دنوں نہ نکال سکے، انھوں نے اردو [illegible] لیکن یہ بھی بہت دنوں تک جاری نہیں رہ سکا، وہ خلافت تحریک کے علمبردار رہے [illegible] کو قائم نہ کرا سکے، حجاز میں جب شاہ سعود کا تسلط ہوا، تو ان کی کوشش تھی کہ وہاں شرعی جمہوریت قائم ہو، لیکن یہ بھی نہ کرا سکے، وہ شاردا ایکٹ کے خلاف لڑے، لیکن اس کو بھی منسوخ نہ کرا سکے، وہ گاندھی جی مل کر ہندو مسلمان اتحاد قائم کرکے ہندوستان کو جنت نشان بنانا چاہتے تھے لیکن نہ بنا سکے، وہ غلام ہندوستان کی آزادی کی جنگ میں شریک ہوئے، لیکن اپنی زندگی میں ہندوستان کو آزاد نہ دیکھ سکے، وہ زندگی بھر دوسروں سے لڑتے ہی رہے، کبھی انگلستان کے وزیر اعظم لائڈ جارج، کبھی ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ریڈنگ، کبھی حجاز کے ابن سعود، کبھی ترکی کے مصطفےٰ کمال، کبھی گاندھی جی، کبھی موتی لال نہرو، کبھی اپنے مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محلی، کبھی پنڈت مدن موہن مالوی، کبھی کسی عالم، کبھی کسی ایڈیٹر، کبھی اپنے مخلص ترین دوست، کبھی اپنے بڑے بھائی مولانا شوکت علی سے لڑتے، کبھی ان پر یہ الزام آیا کہ خلافت تحریک کے فنڈ کو بے دردی سے خرچ کیا، اور جب وہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں گول میز کانفرنس کی شرکت کے لیے لندن جا رہے تھے، تو لکھنؤ کے اخبار پانیر نے ان پر ایک مضمون لکھا جس میں ان کے نام کے ساتھ یہ سرخی لکھی کہ

A "brilliant man without any achievement"

ہاں! یہ ضرور ہے کہ ان کی زندگی شکستوں، نامرادیوں اور ناکامیوں سے معمور رہی، لیکن یہ کیا بات ہے کہ جب ان کی وفات ہوئی تو اس زمانہ کے ہندوستان کے سکریٹری آف اسٹیٹ مسٹر بن نے کہا کہ محمد علی ایک عظیم مسلمان، ایک عظیم محب وطن اور انسانیت کا ایک عظیم پیامبر تھا، انگریزی زبان کے مشہور مصنف ایچ۔ جی۔ ولیس نے کہا کہ محمد علی کا دل نپولین کا دل تھا، ان کی زبان برک کی زبان تھی، اور ان کا قلم میکالے کا قلم تھا، ان کی میت لندن سے بیت المقدس لے جائی گئی، جب یہ پورٹ سعید پہونچی تو مصر کے وزیر اعظم اور مشائخ جنازہ کی پیشوائی کے لیے آئے، اس کو لے جا کر مسجد عباس میں نماز جنازہ پڑھی، مصری پولیس نے سلامی دی، شہزادہ محمد علی نے

خلافت کمیٹی کا ایک شعبہ بہت پرجوش تھا، اور جب یہ میت یروشلم پہنچی تو اس کے آگے آگے فلسطین کے مفتی اعظم تھے اور ان کے پیچھے دو لاکھ سے زیادہ مردوں اور عورتوں کا سوگوار مجمع تھا، قاہرہ، عمان، ٹیونس وغیرہ سے آئے ہوئے لوگوں نے پُردرد مرثیے پڑھے، مختلف حکومتوں کے نمائندوں نے آخری خراج عقیدت پیش کیا، مسجد اقصیٰ میں جنازہ کی آخری نماز ادا کی گئی، علامہ محمد اقبالؒ نے ان پر ایک نظم لکھی جس کا آخری شعر یہ تھا:

خاکِ قدس اورا بہ آغوش تمنا گرفت　　　سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبرؐ گذشت

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ان کی وفات پر لکھا کہ امت محمدیہ کے سوگوار، ہندوستان کے ماتم دار، طرابلس کے سوگوار، عراق کے لیے غم زدہ، بلقان کے لیے اشکبار، یونان و انگورہ کے مرثیہ خوان، حجاز کے سوختہ غم، اور بیت المقدس کے لیے وقف الم کے لیے اولین قبلۂ اسلام کا سینہ پھٹ گیا، اور وہ اس میں سما گیا، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ان کی وفات سے متاثر ہو کر یہ بھی لکھا کہ افسوس وہ پُردرد آواز جو ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۰ء تک ہندوستان اور دنیائے اسلام کے ہر قیامت آفریں سانحہ میں صدائے صور بن کر بلند ہوتی رہی، ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی، وہ بے قرار دل جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بیتاب ہو جاتا تھا اور ان کو بے تاب کرتا تھا، دنیا کے قیامت تک کے لیے ساکن ہو گیا، وہ اشک آلود آنکھیں جو دین و ملت کے ہر ماتم میں آنسوؤں کا دریا بن جاتی تھیں، حسرت کہ ان کی روانی ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی، وہ مترنم لب جو ہر بزم میں خوش نوا بلبل بن کر چہکتے تھے، ان کے ترانے اب ہمارے کان نہ سنیں گے، وہ آتشیں زبان جو ہر رزم میں تیغ براں بن کر چمکتی تھی، اس کی تابش اب کسی معرکہ میں ہماری آنکھوں کو نظر نہ آئے گی، وہ پرجوش سینہ جو ہمارے مصائب کے پہاڑوں کو سیلاب بن کر لے جاتا تھا، اس کا تلاطم ہمیشہ کے لیے تھم گیا۔

مولانا مناظر احسن گیلانی نے ان کا ماتم ایک نظم لکھ کر کیا، جس کے دو تین اشعار یہ ہیں:

بہ دین مصطفیٰ دیوانہ بودی　　　فدائے ملت جانانہ بودی

بہ دل بودی فقیرِ بے نوائے　　　بہ قالب پیکر شاہانہ بودی

سیاست و انقلاب کے پیچ و خم		و گرنہ عاشق ہست سعدی

ہندوستان کے بہترین طنز نگار جناب رشید احمد صدیقی نے ان پر ایک مضمون لکھتے ہوئے تحریر کیا:

"محمد علی کے یہاں بھی جنگ ملتی ہے کہ وہ لڑے تھے، لیکن ان کا کوئی کارنامہ نہیں ہے، یہ جنگ بدر اور جنگ خندق کا فیصلہ ہے، مرد غازی کے کارنامے کا اندازہ مفتوحات کی وسعت، مال غنیمت کی فراوانی، جشن و جلوس کی ہاؤ ہو، ضرب انگیزی، تمغہ و اسلحہ کی چمک اور جھنکار سے نہیں کیا جاتا، بلکہ اس کا اندازہ کیا جاتا ہے کہ ٹوٹی ہوئی تلوار، بکھری ہوئی زرہ، بہتے ہوئے لہو، رکتی ہوئی سانس، دمکتے ہوئے چہرے اور ڈوبتے ہوئے سورج کے وقت اس نے جنگ کیسے کی؟"

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:

"کس بلا کے بولنے والے اور لکھنے والے تھے کہ بولتے تو معلوم ہوتا کہ ابو الہول کی آواز اہرام مصر سے ٹکرا رہی ہے، لکھتے تو معلوم ہوتا کہ کسی کے کارخانے میں توپیں ڈھلنے والی ہیں، یا پھر شاہجہاں کے ذہن میں تاج کا نقشہ مرتب ہو رہا ہے، حق و صداقت کی جنگ اب بھی جاری ہے، لیکن نبرد جنگ خاموش ہے، فتح و شکست تو اسی کے لیے بنائی گئی ہیں کہ فتح و شکست تو ہوتی رہتی ہیں، لیکن جنگ جو کہاں ہے، شہادت کس کو نصیب ہوگی، ایسا حسین کہاں جس کو خود یزید کی تلاش ہے۔"

مولانا محمد علی کا ماتم جس طرح ہوا، اس سے اندازہ ہوگا کہ وہ کیا تھے، ان کی قیادت کی کیا شان تھی، اور وہ کیا چاہتے تھے، وہ اپنی زندگی میں کہہ گئے تھے ؎

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر		مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے

وہ جوہر کیا تھے، اس کا اس طرح تجزیہ کرنے میں تامل نہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کو عرصۂ دراز کے بعد یہ سالار ملا تھا، جو سیاست کے میدان میں خالد بن ولید کی طرح جری اور بہادر بن کر آیا تھا، اور اپنی قیادت میں صدیقیت پیدا کی، فاروقیت بھی، حیدریت بھی اور ابو ذر غفاریت بھی، ان کی سیاست مسلمانوں کی سیاست کی

بانگِ درا تھی۔ وہ مسلمانوں کے لیڈر، ہمت مردانہ، مرد قلندر کے انداز ملوکانہ کے ساتھ بنے، بے باکی اور سرفروشی کے ساتھ مسلمانوں کو للکارا، دین مصطفےٰ کی دیوانگی کے ساتھ مسلمانوں کے لیے سینہ سپر ہوکر جرأت، ہمت، پامردی اور بلند حوصلگی کے ساتھ ہر محاذ پر لڑے، اسی لیے ان پر وطنی محبت کا کیف، نشہ اور خمار بھی چھایا رہا، یہی محمد علی جوہر کا اصلی جوہر تھا۔

جس معیار سے بھی ان کو پرکھا جائے وہ وطن دوست کی حیثیت سے کسی بھی ہندوستان کے عظیم ترین رہنما سے کم نظر نہیں آئیں گے، انھوں نے اپنے بھائی مولانا شوکت علیؒ سے مل کر برطانوی حکومت کے خلاف جو بیزاری، بلکہ نفرت مسلمانوں میں پیدا کر دی تھی، وہ اس وقت تک ہندوستان کے اور باشندوں میں پیدا نہ کی جا سکی تھی جب ہندوستان کے پانچ سو علماء کے دستخط سے یہ فتویٰ شائع ہوا کہ برطانوی حکومت کا تعاون اور موالاۃ حرام ہے، سرکاری خطابات واعزازات قبول کرنے والوں کو کافر قرار دیا گیا، برطانوی حکومت کے خلاف جان ومال کی قربانی اسلام کی نشانی بتائی گئی، تو اس تحریک کو کامیاب بنانے میں اس طرح آگے بڑھے کہ علی برادران کو اس وقت مسلمانوں میں جو مقبولیت حاصل ہوئی، وہ گاندھی جی یا کسی اور ہندو لیڈر کو ہندوؤں میں نہ تھی، گاندھی جی جلسوں میں کہا کرتے کہ مولانا شوکت علی کی لمبی چوڑی جیب میرا مسکن ہے، اسی زمانہ میں ۱۹۲۱ء میں مولانا محمد علی نے کراچی میں خلافت کانفرنس کی صدارت کی تو اس میں یہ تجویز منظور ہوئی کہ قرآن پاک اور احادیث سے برطانوی حکومت کی فوج میں ملازمت کرنا بدترین گناہ ہے، چند روپیوں کی خاطر ہمیشہ کے لیے دوزخ میں اپنا گھر بنانا ہے، برطانوی حکومت نے اس کو فوج میں بغاوت پھیلانے کا مترادف قرار دیا، اور مولانا محمد علی کو ان کے اور ساتھیوں کے ساتھ والٹیر میں گرفتار کر لیا، کراچی میں اسی پر فوج میں بغاوت کرانے کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا، انھوں نے اس مقدمہ میں جس جرأت، بے باکی، مردانگی، وطنی محبت، مذہبی حمیت اور ایمانی غیرت وحرارت کے ساتھ انگریز کا مقابلہ کیا وہ جنگ آزادی کی تاریخ کی بڑی زریں سرخیاں ہیں، انگریز حاکم نے ان کو اور ان کے ساتھیوں کو دو دو سال کی سزا دی، اس سزا سے وہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں

اور بھی مقبول ہو گئے۔ جب وہ جیل چلے گئے تو ان کی بوڑھی ماں بی اماں اور بیوی آزادی کی جنگ لڑنے کے لیے
بڑھیں، پورے ہندوستان کا دورہ کیا، جس سے تحریک بڑی جاندار رہی۔

وہ جیل سے چھوٹے تو ان کو سنہ ۱۹۲۳ء میں کانگریس کے سالانہ جلسہ کا صدر کوکناڈا میں بنایا، اس میں
انھوں نے جو خطبہ دیا وہ آج بھی پڑھ کر فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ کسی عظیم ترین محب وطن کے جذبات سے کم نہیں،
اس میں گاندھی جی کو اپنا سردار، سردار اعظم کہا، اور اپنے زمانہ کا سب سے بڑا مسیح نما شخص اور شاہ معترا
دیا، اور یہ بھی لکھا کہ جو نسخہ انھوں نے ہندوستان کے امراض کے لیے منتخب کیا وہ وہی تھا جو حضرت عیسیٰ نے
یہودیت کے لیے منتخب کیا، اس سے ظاہر ہوگا کہ ان کے دل میں گاندھی جی کی کتنی محبت اور وقعت تھی، وہ ایک
موقع پر یہاں تک کہہ گئے کہ وہ تو گاندھی جی کو اپنی والدہ ماجدہ سے بھی زیادہ قابل احترام اور اپنے پیر و مرشد
مولانا عبد الباری فرنگی محلی سے بڑھ کر قابل احترام سمجھتے ہیں، ایک موقع پر یہ بھی کہا کہ اللہ اور اس کے رسول کے
بعد گاندھی جی ہی کے حکم کو ماننا پسند کرتا ہوں، ان پر یہ الزام آیا کہ انھوں نے ہندوؤں کی غلامی قبول کر لی اور
گاندھی پرست ہو گئے ہیں، مگر خود مولانا محمد علی کو فخر تھا کہ کانگریس کو انڈین نیشنل کانگریس فی الحقیقت مسلمانوں
نے بنایا، اس سے پہلے تو خوش وضع عافیت پسندوں کی تفریح گاہ تھی، اور اپنے اخبار ہمدرد کی ایک تحریر میں لکھا
کہ یہ حقیقت ہمیشہ یاد رہے کہ مہاتما گاندھی ہمیشہ خلافت کے سرمایہ سے دورہ کرتے رہے، حتیٰ کہ کانگریس کے لیے
ایک کروڑ روپیہ جمع کرنے کے دوروں کے مصارف بھی مجلس خلافت نے ادا کیے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ
کانگریس کی روح رواں تحریک خلافت اور مجلس خلافت تھی۔ (ہمدرد، ۲۵ر ستمبر ۱۹۲۶ء)

مگر ان کی زندگی کا یہ سانحہ بھی رہا کہ ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ وہ کانگریس سے دور ہو گئے، یا کانگریس ان سے
دور ہو گئی، اس کے اسباب کے تجزیہ کرنے کا یہ موقع نہیں، لیکن اس سے علیحدگی کے باوجود جب سائمن کمیشن کا تقرر
ہوا، تو اس سلسلہ میں انگریزوں کے خلاف سینہ سپر ہو گئے، انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں یہ پیام دیا
کہ اس وقت ہندو اور مسلمان دونوں نے مل کر سائمن کمیشن کی آمد کو ناکام بنا دیا تو ہندوستان کی تاریخ میں بڑا اہم

ریں حروف سے لکھا جائے گا۔

اس وقت تک ہندو مسلم کے اختلافات بہت بڑھ گئے تھے، مسجد کے سامنے باجہ، مخلوط یا جداگانہ

تخاب، پنجاب اور بنگال میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی، ہندوؤں کی نمایندگی کتنی ہو، سرحد اور بلوچستان

اصلاحات دیے جائیں کہ نہیں؟ بمبئی سے سندھ علیٰحدہ کیا جائے کہ نہیں؟ مرکز میں مسلمانوں کی نمایندگی کتنی ہو،

ران صوبوں میں جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہو وہاں کی قانون ساز اسمبلیوں میں مسلمانوں کی کیا حیثیت ہو وغیرہ

غیرہ، ان تمام معاملات میں مولانا محمد علی مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے رہے، لیکن ان اختلافات کے

ا تھ وہ آزادی کے لیے بھی بے قرار رہے، ایک ایسا موقع بھی آیا کہ ہندو آزادی سے مایوس ہوئے تو نہرو رپوٹ

ے ذریعہ سے درجۂ مستعمرات کے طالب ہوئے، لیکن مولانا محمد علیؒ نے یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ جو لوگ آزادی

ے مخالف اور درجۂ مستعمرات کے حامی ہیں، وہ ملک کے بہادر فرزند نہیں بلکہ بزدل ہیں، جس جلسہ میں یہ تقریر کی

ہاں ان کے خلاف بڑا ہنگامہ ہوا، اور ان پر نفریں کی بوچھار برسائی گئی، اور جب ۱۹۳۰ء میں گول میز کانفرنس

ں شرکت کے لیے لندن گئے تو وہاں اپنی معرکۃ الآرا تقریر میں بہ بانگ دہل کہا کہ:

"میں جس مقصد سے یہاں آیا ہوں، وہ یہ ہے کہ میں اپنے ملک کو اسی حالت میں واپس جا سکتا ہوں جب کہ
میرے ہاتھ میں آزادی کا پروانہ ہوگا، ورنہ میں ایک غلام ملک میں واپس نہیں جاؤں گا، میں ایک غیر ملک
میں جو اگر آزاد ہے، مرنے کو ترجیح دوں گا، اور اگر آپ نے ہندوستان کو آزادی نہیں دی تو پھر آپ کو یہاں
مجھے قبر کے لیے جگہ دینی پڑے گی۔"

اس سے بڑھ کر ایک مسلمان کیا وطن دوست اور ہندوستانی ہو سکتا ہے، وہ وطن دوست اور حریت پرور

ہندوستانی بن کر حق دوست اور خدا پرست مسلمان بن کر رہنا چاہتے تھے، اور اسی طرح زندگی گذاری، جہاں

وطن کی آزادی کی خاطر سربکف رہے، وہاں طرابلس کے لیے سوگوار، عراق کے لیے غم زدہ، بلقان کے لیے اشکبار،

انگورہ کے لیے مرثیہ خوان اور حجاز کے لیے سوختہ غم رہے، اور ہندوستان کے مسلمانوں کے مفاد کی خاطر تو ہندوستان کے

چپہ چپہ پر سیاسی جنگ کی، اور انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ اچھا مسلمان ہی اچھا ہندوستانی ہو سکتا ہے

گرل میز کانفرنس کی تقریب میں ان کا یہ کہنا بہت ہی معنی خیز ہے :

"جو لوگ سیاست سے مذہب کو الگ کرتے ہیں، وہ مذہب کا غلط تصور رکھتے ہیں۔ مذہب عقیدہ یا رسول
تک محدود نہیں، مذہب میرے خیال میں زندگی کی ایک تعبیر ہے، میں ایک کلچر رکھتا ہوں، اصول سیاست اور
زندگی کا ایک مطمح نظر رکھتا ہوں، اور ان ہی چیزوں کے مکمل امتزاج کا نام اسلام ہے، جہاں تک خدا کے احکام
کا تعلق ہے میں اول مسلمان ہوں، بعد میں مسلمان ہوں، آخر میں مسلمان ہوں، اور کچھ بھی نہیں، صرف مسلمان
ہوں، اگر آپ اپنے امپائر میں اور اپنی قومیت میں مجھ کو اس مکمل چیز یعنی اس اصول سیاست، اس کلچر اور
اس اخلاق کو چھوڑ کر داخل ہونے کو کہیں تو میں داخل ہونا پسند نہ کروں گا، میرا پہلا فرض میرے خالق کے لیے
ہے، بادشاہ سلامت کے لیے نہیں ہے، اور نہ اپنے ساتھی ڈاکٹر مونجے کے لیے ہے، میرا پہلا فرض میرے
پیدا کرنے والے کے لیے ہے، اور یہی حال ڈاکٹر مونجے کا بھی ہے، ان کو پہلے ہندو ہونا چاہیے، جیسا کہ
میں اپنے اس فرض کو بجا لانے کے لیے پہلے مسلمان ہوں، لیکن جہاں ہندوستان کا مسئلہ آتا ہے، جب اس کی
آزادی کا سوال آتا ہے، جب اس کی فلاح و بہبود کی بحث آئے گی تو میں پہلے ہندوستانی ہوں، بعد میں
ہندوستانی ہوں، آخر میں ہندوستانی ہوں اور کچھ بھی نہیں، صرف ہندوستانی ہوں، میرے دو
دائرے ہیں، جو برابر ہیں، ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں،"

یہ محض زور خطابت میں نہیں کہا گیا، بلکہ زندگی بھر کے تجربے کے بعد ایک سچے، مخلص اور دیانت دار
ہندوستانی یا ہندوستانی مسلمان رہنما نے کہا ہے، یہ ہندوستان کے ہندو مسلمان دونوں کے لیے ایک پورا
فلسفہ بن سکتا ہے، ہندو اس کو اپنا پولیٹیکل فلسفہ بنانا پسند نہ کریں، لیکن ہندوستان کے بدلے ہوئے حالات
مسلمانوں کے لیے یہی پولیٹکل فلسفہ ان کے وجود کا ضامن بن سکتا ہے، کچھ لوگ اس کو فرقہ واریت کا
دے کر رد کرنے کی کوشش کریں گے، مگر خوشی کی بات ہے کہ ہمارے مسلمان سیکولرسٹ اور وطن دوست

ڈیل کو پسند کرنے لگے ہیں، مولانا ابوالکلام آزاد سے بڑھ کر کون وطن دوست اور سچا ہندوستانی ہو سکتا ہے
نے بھی اسی رنگ میں سوچنے کی کوشش کی ہے، ان کے یہ خیالات تھے:

"میں ایک مسلمان ہوں، اور اس خیال سے مجھ کو فخر محسوس ہوتا ہے کہ گذشتہ تیرہ سو برس کی جو اسلامی روایات
ہیں وہ میری وراثت ہے، میں اس کو بال برابر بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں، اسلامی تاریخ، اسلامی تعلیم،
سلامی آرٹ، اسلامی سائنس اور اسلامی کلچر میری دولت کے اجزاء ہیں، اور ایک مسلمان کی حیثیت سے
یرا یہ فرض ہے کہ میں ان کو محفوظ رکھوں، ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں تہذیبی اور مذہبی حلقوں
یں ایک مخصوص حیثیت رکھتا ہوں، اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتا ہوں کہ میرے اس روحانی ورثہ میں
وئی مداخلت کرے۔ ان جذبات کے ساتھ میں ایک اور چیز کا بھی مالک ہوں جو میری خارجی زندگی کے
قائق ہیں، اسلام کی روح میرے اس دوسرے عقیدہ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتی، اسلام مجھ کو اس کی
رت مائل کرتا ہے، مجھ کو فخر ہے کہ میں ہندوستانی ہوں، میں یہاں کی متحدہ قوم کا ضروری جزو ہوں، اس
وم کی شوکت میرے جیسے قیمتی جزو کے بغیر نامکمل ہے، میں اس قوم کی تشکیل کا بہت ضروری حصہ ہوں،
س اپنے اس دعویٰ کو ترک کرنے کے لیے تیار نہیں، ہم اپنے ساتھ یہاں بہت بڑا خزانہ لائے، یہ سرزمین
ی بھی بڑی دولت سے مالا مال تھی، ہم نے اپنی دولت اس ملک کو دی، اور ہندوستان نے اپنے
زانہ کا دروازہ ہمارے لیے کھول دیا، ہم نے اس ملک کو اپنے ورثہ کی بہت کچھ قیمتی چیزیں دیں، جن کی
ضرورت اس کو تھی، ہم نے اس کو جمہوریت اور مساوات کا پیام دیا۔"

ولانا ابوالکلام آزادؒ نے یہ سب جو کچھ کہا، وہ ان ہی جذبات کی ترجمانی ہے جس کا اظہار مولانا محمد علیؒ نے
انفرنس کی تقریر میں کیا تھا، گو اس کے کہنے میں ابوالکلامیت ہے، پھر اسی بات کو ڈاکٹر ذاکر حسین نے
واضح طور پر اپنے رنگ میں کہا ہے، وہ ایک اچھے مسلمان تھے اور ان کے بہت اچھے ہندوستانی
کسی کو شک نہیں ہوا، اسی لیے حکومت نے ان کو بہار کا گورنر، پھر جمہوریہ ہند کا نائب صدر

[illegible] صدر بنایا، انھوں نے کاشی ودیا پیٹھ بنارس میں اپنا خطبہ دیتے ہوئے پوری دردمندی اور دل سوزی سے فرمایا:

"کیا ہندوستان کا قومی نظام تعلیم مسلمانوں کو اس بات کا موقع دے گا کہ وہ اپنی تمدنی زندگی کو اپنی تعلیم کا ذریعہ بنائیں، آپ جانتے ہیں کہ یہ مسئلہ ہماری قومی زندگی کے لیے کتنا اہم ہے، ممکن ہے کہ بعض نیک نیت اور انتہا پسند قوم پرست متحدہ ہندوستانی قومیت کی ایسی تصویر اپنے ذہن میں رکھتے ہوں جس میں مسلمانوں کو یہ حق دینا قوم کی قوت اور قوم کی ترقی کے لیے مضر ہو، مگر ہمارے ماہرین تعلیم اگر نیک نیتی سے ہندوستان کی تعلیم کا نظام بنائیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ مسلمانوں کی اس خواہش کو خوشی سے قبول کر لیں گے کہ وہ اپنی تعلیم کی بنیاد اپنے تمدن پر رکھیں کہ صحیح تعلیم اور صحیح سیاست دونوں کا یہی تقاضا ہے، آپ مجھے معاف فرمائیں گے اگر میں اس مجمع کے سامنے صفائی سے یہ بات پیش کر دوں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندوستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے، اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں، تنگ نظری اور اس کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قائم کر سکنے کو دخل ہے، وہاں اس شدید شبہہ کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی فنا ہونے کا ڈر ہے، اور مسلمان کسی حال میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں، اور میں بہ حیثیت مسلمان ہی نہیں، سچے ہندوستانی کی حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان یہ قیمت ادا کرنے پر تیار نہیں، اس لیے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا سو ہوگا ہی، ہندوستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہونچ جائے گا۔

گرچہ مثل غنچہ دل گیریم ما   گلستاں میرد اگر میریم ما

یہی وجہ ہے کہ مسلمان اپنی مذہبی روایات، اپنی تاریخ، اپنی تمدنی خدمات اور اپنے تمدن سے تعلق کی وجہ سے اپنے ملی وجود کو اپنے لیے ہی بے بہا نہیں سمجھتے، بلکہ ہندوستانی قومیت کے لیے بھی نہایت بیش قیمت جانتے ہیں، اور اس کے مٹتے جانے یا کمزور کیے جانے کو اپنے ہی ساتھ ظلم نہیں، بلکہ

ہندوستانی قوم کے ساتھ ہم سخت خیانت سمجھتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمان کو اپنا دیش کسی اور سے کم عزیز نہیں ہے۔ وہ ہندوستانی قوم کا جز ہونے پر فخر کرتے ہیں، مگر وہ ایسا جز بننا کبھی گوارا نہ کریں گے جس میں ان کی اپنی حیثیت بالکل مٹ چکی ہو۔" (منقول از یادوں کی دنیا، از ڈاکٹر یوسف حسین صفحہ ۲۱۰-۲۱۱)

ڈاکٹر ذاکر حسین نے اوپر جو کچھ کہا ہے اس میں اور مولانا محمد علیؒ کے فرمودات میں کوئی فرق نہیں۔

ذرا اسی بات کو اور دوسرے انداز میں سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہاں پر اس کی وضاحت کرنے میں پروفیسر ہمایوں کبیر کی کچھ تحریروں کا سہارا لیں گے۔ ان سے بڑھ کر کوئی سیکولرسٹ نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے ہندو مسلم کے میل ملاپ کا تاریخی تجزیہ بڑی غیر جانبداری سے کیا ہے۔ انھوں نے ایک بہت ہی پر مغز مضمون ہندوستانی مسلمان کے عنوان سے ایک انٹرنیشنل کمیشن کے لیے لکھا، جو پیرس کے جرنل آف ورلڈ ہسٹری میں شایع ہوا، پھر کلکتہ کے رسالہ انڈو ایرانیکا (ستمبر ۱۹۵۵ء) میں لکھا۔ اس میں انھوں نے اس کی ابتدا اس طرح کی ہے:

"ہندوستان کی قومی اقتصادیات میں مسلمان اس کے اہم ترین اجزا میں سے ہیں۔ وہ کم سے کم ایک ہزار برس تک خاص طور پر شمالی ہند میں بڑی قوت بن کر ہندوستان کی اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی تاریخ کی تعمیر میں لگے رہے..... وہ ہندوستانی زندگی میں ضرور گھل مل گئے، لیکن انھوں نے اپنی انفرادیت کو باقی رکھا۔ انھوں نے ہندوستانی زندگی کو بہت کچھ دیا، اپنی ان خصوصیات کو باقی رکھا جو صاف طور پر پہچانے جا سکتے ہیں۔ وہ ہندوستانی زندگی کے جز بن گئے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ اپنی واضح حیثیت بھی برقرار رکھی۔ اور یہ بات ایسی ہے کہ جس کی مثال دوسری جگہ نہیں ملے گی۔"

مگر اس کے بعد انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کو مورخانہ تجزیہ بھی کہہ سکتے ہیں، اور یہ بڑی اہم حقیقت ہے، جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ وہ لکھتے ہیں:

"ہندوستان نے ان تمام بیرونی قوموں کو جو مختلف اوقات میں اپنے ساتھ کوئی تہذیب بھی لائے، اپنے

معاشرتی اسلام کو ہندو سماج نے مدغم کر لیا ہے، مسلمانوں نے دوسرے ملکوں کے تمدن کو اپنے اسلامی ثقافت سے اپنے اندر جذب کر لیا، لیکن ہندوستان ہی ایسا مستثنیٰ ملک ہے جہاں اسلام کو ہندوستان اپنے میں ضم نہ کر سکا، اور نہ اسلام ہندوستان کو اپنے میں مدغم کر سکا۔"

پروفیسر ہمایوں کبیر نے اسی مضمون میں بحث کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے کلچر میں fusion ضرور ہوتا رہا، لیکن Absorption نہیں ہوا، یعنی ہندوستان کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ ایک دوسرے سے قریب ہونے اور رہنے کی کوشش کریں، ایک دوسرے کو اپنے میں ضم اور مدغم کرنے کی فکر نہ کریں۔ یہ بھی گویا مولانا محمد علی کے سیاسی جذبات کی آواز بازگشت ہے، وہ جب کوکناڈا میں کانگریس کے سالانہ اجلاس کے صدر ہوئے تھے تو اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا:

"یہ بات مسلم اور یقینی ہے کہ نہ تو ہندو ہی مسلمانوں کو معدوم کر سکتے ہیں اور نہ مسلمانوں کو ہندوؤں سے نجات مل سکتی ہے، اگر ہندو اس قسم کی تدبیر سوچتے ہیں تو ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ انھوں نے اس موقع کو اس وقت کھو دیا جب کہ محمد بن قاسم نے بارہ سو سال قبل سرزمین سندھ پر اپنا قدم رکھا، اس وقت تو مسلمان قلیل تعداد میں تھے، اور اب تو ان کی تعداد سات کروڑ سے بھی زیادہ ہے، اور اگر مسلمانوں کو اس قسم کا خیال ہے تو انھوں نے بھی اپنا موقع ہاتھ سے کھو دیا، جب کہ وہ کشمیر سے راس کماری اور کراچی سے چاٹگام تک حکمراں تھے، اس وقت اگر وہ چاہتے تو ہندوؤں کی نسل کو فنا کر سکتے تھے، فارسی کی کیا خوب مثل ہے:

مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید بر کلۂ خویش باید زد

جب کوئی چارۂ کار نہیں کہ دونوں فریق ایک دوسرے سے چھٹکارا پا سکیں تو ان کو ایسی صورت نکالنی چاہیے کہ ایک دوسرے کی معاونت تسلیم کی جائے۔"

اسی معاونت میں ہندوستان کی اکثریت اور اقلیت کے تعلقات کی پوری مکمل فلاسفی بنائی جا سکتی تھی مگر افسوس کہ گذشتہ برسوں میں اس کا نشو و نما نہ ہو سکی، جس کے نتیجہ میں ہندوستان میں اب بھی ہولناک اور

دو ما زمانہ واقعات پیش آئے جن کی تفصیل لکھنے میں قلم رکتا ہے۔

اس سے ہندوستان میں جنگ پسند قوم پرور اور قوم پرست جھگڑا رہے ہیں، خود مسلمانوں کو سوچنا ہے
کہ ان کا کیا رد عمل ہو۔ آج کل کے دبے مسلمانوں کے دبے ہوئے جذبات تو وہی ہیں جو مولانا محمد علیؒ نے گول میز
کانفرنس کی تقریر میں کہا تھا، اور جس کی وضاحت مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر ہمایوں کبیر
نے کی ہے۔ ان کا لب لباب یہ ہے کہ مسلمانوں کی اصلی خواہش یہ ہے کہ وہ اپنے ملی وجود اور تمدنی ہستی کو
برقرار رکھ کر سچے اور اچھے ہندوستانی بنے رہیں، مولانا محمد علیؒ نے جب جامعہ ملیہ قائم کیا تھا تو انھوں نے
اعلان کیا تھا کہ یہاں ہندوستان کے مسلمانوں کو حق دوست و خدا پرست مسلمان بنایا جائے، اور اس
کے ساتھ ان کو وطن دوست و حریت پرور بنایا جائے۔

ہم اگر موجودہ ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کر سکتے ہیں تو برملا یہ کہہ سکتے ہیں کہ
اس وقت کے مسلمان یہی چاہتے ہیں کہ وہ خدا پرست مسلمان بن کر وطن دوست ہندوستانی بنے رہیں، کیا
ایسا ہونا ممکن نہیں؟ ممکن ہے خود مولانا محمد علی اس کی تعلیم یہ لکھ کر دے گئے ہیں:

"ایک مسلمان قوم پرور اور محب وطن اس لیے ہے کہ اسلام نے نہایت کشادہ دلی سے حقوق جار کو
تسلیم کیا ہے، اور جس مذہب کے قانون نے غیر مسلموں کو بھی حق شفعہ دے کر پڑوسی کے بعض حقوق
کو سگے بھائی اور مسلمانوں کے حقوق پر بھی ترجیح دی، وہ قومیت مشترکہ کے خلاف نہیں ہو سکتا،
ہر حالت میں غیر مسلموں کے ساتھ ناانصافی اسلام اور ایمان کے منافی ہے، حقیقتاً ایک مسلمان
کے لیے حب الوطن من الایمان ہے۔"

مگر اسی کے ساتھ وہ یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ:

"ایک فرقہ پرست، ریاکار، مفاد پرست اور بدکردار سیاست داں ملک کے لیے مفید نہیں ہو سکتا
چاہے وہ اپنے کو خاص ہندوستانی ہونے کا ڈھنڈورا کیوں نہ پیٹتا ہو، جو شخص اپنے نفس کی

مطبوعات جدیدہ

تاریخ اوقاف، مرتبہ جناب شفیق علی صاحب متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ بہتر،
صفحات ۲۰۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت تین روپیہ، پتہ: جناب اشفاق علی صاحب نظیرآباد، لکھنؤ۔

وقف یعنی کار خیر اور رفاہ عام کے لیے اپنی کوئی چیز مخصوص کر دینا اسلام کے خصائص میں ہے، جس کا اس نے بڑا اجر و ثواب بتایا ہے، فقہ کی کتابوں میں اس کے ضروری مسائل درج ہیں، مگر اوقاف کی [illegible] کوئی تاریخ اردو میں نہیں لکھی گئی تھی، یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کے لیے لکھی گئی ہے اور کئی حصوں پر مشتمل ہے، پہلے اوقاف کی اہمیت اور فائدے بیان کیے ہیں، آج بھی ایسے کتنے [illegible] کی بدولت [illegible] ملی اور قومی کام انجام پاتے رہتے ہیں، اور ناداروں اور محتاجوں کی اس کے ذریعہ امداد بھی کی جاتی رہتی ہے، پہلے انھوں نے وقف کا مفہوم واضح کرنے کے بعد صدقہ اور انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت میں وارد قرآنی آیات و احادیث نقل کرکے ان کا ترجمہ اور مختصر تشریح کی ہے، پھر عہد بعہد اوقاف کی تاریخ بیان کی ہے، پہلے دور رسالت اور صحابۂ کرام کے زمانہ کے اوقاف کا حال لکھا ہے، پھر اموی، عباسی اور ترکی خلفاء کے زمانہ کے اوقاف کا ذکر ہے، نور الدین زنگی، صلاح الدین ایوبی اور ہندوستان کے بادشاہوں میں فیروز تغلق، شیر شاہ سوری، اکبر، جہانگیر، شاہجہان اور عالمگیر کے اوقاف کے بارہ میں بھی صفحات تحریر کیے ہیں، [illegible] کی بعض مسلم ریاستوں بھوپال اور رامپور کے علاوہ کشمیر کے بعض اوقاف کا ذکر بھی ہے، دنیائے اسلام کے [illegible] آٹھ اہم اوقاف کا ایک مستقل عنوان کے تحت ذکر ہے، وقف کعبہ شریف، وقف مسجد نبوی، وقف قبرستان جنۃ البقیع، وقف جامع ازہر (مصر)، وقف جامع دمشق (شام)، وقف جامع قرطبہ (اندلس)، [illegible]

(مسودہ مرتب وقت بورڈ ... انگریزی) آخر میں اوقاف آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس (علی گڑھ) اور وقف مساجد ... کا تذکرہ کیا ہے، اسی سلسلہ میں نظام بیت المال اور ہندوستان میں مسلمانوں کے دور حکومت میں اوقاف کے نظام کی اہمیت و کیفیت بھی بیان کی ہے، اور چند مغل فرماں رواؤں کے فرامین واسناد کے نمونے بھی دیے ہیں، لائق مصنف نے جن اوقاف کا تذکرہ کیا ہے ان کی مختصر تاریخ اس طرح لکھی ہے کہ اس سے ان کی نوعیت و کیفیت اور مقاصد و شرائط کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے، جن صحابہ کرام کے اوقاف کا تذکرہ ہے ان کا سرسری ذکر بھی کیا ہے، اور بعض اوقاف کی عمارتوں کے عکسی فوٹو بھی دیے ہیں، یہ کتاب وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے، جس کے لائق مرتب تحسین کے مستحق ہیں، وہ یوپی سنی سنٹرل وقف بورڈ لکھنؤ کے سکریٹری ہیں، اس لیے اوقاف کے عملی پہلوؤں پر بھی ان کی نظر ہے، انھوں نے اپنے تجربہ اور واقفیت کی بنا پر اوقاف کے نظام کی اصلاح اور اسے دین و ملت اور قوم کے لیے زیادہ بہتر اور مفید بنانے کے مسئلہ پر بھی توجہ دی چاہیے، جن کی حالت آزادی کے بعد بہت ابتر ہو گئی ہے۔

توریت اور یہود، اپنے آئینے میں، مرتبہ مولوی عبدالحفیظ رحمانی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، مجلد، صفحات ۲۱۲، قیمت ۱۲ روپیہ، پتہ: مرکز دعوت اسلام جمعیۃ علمائے ہند دیوبند (یوپی)

اس میں توراۃ کی نوعیت اور یہودیوں کی مکروہ اور گھناؤنی تصویر خود تورات اور علمائے یہود کی کتابوں سے دکھائی گئی ہے، مقدمہ میں قرآن مجید میں کثرت سے یہود کا تذکرہ کیے جانے اور نبوت محمدی کی تکذیب کی وجہیں بیان کی گئی ہیں، اس سلسلہ میں اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ان کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں، آیات الٰہی میں تغییر و تحریف، احکام الٰہی سے سرتابی اور بدکرداری کا اجمالی ذکر بھی آگیا ہے، یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں توراۃ کے غیر معتبر اور محرف ہونے پر بحث کی ہے، پہلے بائبل کے دونوں حصوں عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید میں شامل کتابوں کی فہرست دی ہے، پھر تورات کے نزول، اس کی گم شدگی اور بازیابی، اس کے جلائے جانے، حضرت عزیر کے اسے از سر نو مرتب کرنے، اور اس کے ضائع و محرف ہو جانے کی داستان

شغل بعض جگہ [illegible] کا سرگزشت ۱۷۰ صفحات میں ذکر آچکا ہے، اس میں مصنف نے
زیر نظر کتاب میں [illegible] شاہ بدیع الدین سے [illegible] افراد کا ذکر کیا ہے، اور ان کی قرابتوں کی تفصیل تحریر
کی ہے، [illegible] کا نام "انقلاب شاہ بدیع الدین" اس لیے رکھا ہے کہ سب متعلقین کے جد اعلیٰ وہی ہیں، یہ دو حصوں
پر مشتمل ہے، پہلے حصہ کی ابتداء سید عالم حضرت شاہ عبد اللطیف سے کی ہے، جن کے ذریعہ دائرہ کی بنیاد
پڑی، اس میں ان کے اور ان کے رفقاء کے علاوہ دارا گنج، سید سراواں، پچی نرور (نرول) کڑا، مانک پور اور
موجودہ الہ آباد اور فتح پور کی مختلف تحصیلوں میں آباد سادات کے خانوادوں کے افراد اور ان کے باہمی رشتوں
اور قرابتوں کا حال بیان کیا ہے، اور سلاطین بادشاہوں اور اودھ کے حکمرانوں کے زمانہ میں انھیں جو جاگیریں
اور معافیاں ملی تھیں ان کا بھی تذکرہ کیا ہے، دوسرے حصہ میں شاہ بدیع الدین کے پوتے شاہ محمد زمان کے
اعقاب اور ان کے رشتوں اور قرابتوں کا حال درج ہے، پہلے حصہ میں جن افراد کا تذکرہ ہے، ان کے عام حالات
بہت کم درج ہیں، مگر دوسرے حصہ میں بعض بعض اشخاص کے کسی قدر حالات بھی دیے ہیں، دونوں حصوں میں
اشخاص کا ذکر باہم ایسا خلط ملط ہو گیا ہے کہ جب تک اس خانوادہ سے متعلق دوسری کتابیں بھی پیش نظر نہ ہوں
اس کتاب کے سمجھنے میں سخت دشواری ہوتی ہے، اگر مصنف نے ابتدا میں خانوادہ کا مکمل شجرہ درج کر دیا ہوتا
تو قارئین کو کسی قدر سہولت ہو جاتی، تصنیف و تالیف ان کا خاص شغل نہیں، اس لیے یہ کتاب علمی حیثیت سے
چاہے معیاری نہ ہو، تاہم اس میں اس خانوادہ اور اس کے افراد کے متعلق مفید باتیں دی گئی ہیں، بعض جگہ
حوالے درج نہیں ہیں، اور بعض جگہ کتابوں کی جلدوں اور صفحات کی تعیین کے بغیر ہی حوالے دیے گئے ہیں
ایک جگہ لکھا ہے "مولانا حبیب الرحمن دیوبندی اپنے دونوں صاحبزادوں قاری محمد طیب اور محمد طاہر
کے ساتھ تھے"۔۔۔ (ص ۲۳۰) یہ دونوں حضرات تو مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند
کے صاحبزادے اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے پوتے تھے، ایک جگہ تحریر ہے کہ "معاصر صدیقی (نواب صدیق حسن
خان) (ص ۱۹۱) [illegible] نواب صاحب کے فرزند [illegible] حسام الملک نواب

غالب کے بعض [illegible] کیا ہے، جن شعراء پر مضامین لکھے گئے ہیں ان کے مختصر حالات تحریر کیے ہیں اور ان کی تصنیفات کا تعارف کرایا ہے اور ان کی شاعری و نثر نگاری پر اظہار خیال بھی کیا ہے، یہ سب مضامین زیادہ بلند پایہ تو نہیں ہیں، تاہم ان سے مختلف دلچسپ باتیں اور بعض گمنام ادیبوں کے بارہ میں مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں، لیکن مصنف کی تحریر میں بعض جگہ اعتدال قائم نہیں رہا ہے، اسی لیے انھوں نے بدایون کے مرثیہ نگار شاعر حاتم بدایونی کو اکبر اور اقبال جیسے شاعروں کا ہم پایہ قرار دے دیا ہے، بعض جگہ ان کی تحریر میں دوسروں پر خواہ مخواہ طنز و تعریض کی گئی ہے، ایک جگہ مولانا عبد السلام ندوی مصنف شعر الہند پر سہل انگاری کا الزام عائد کیا ہے، (ص ۸۳) جس کو پڑھ کر غالب کی یہ نصیحت یاد آگئی کہ ع شکوۂ بے جا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور، ان کو ہندی کا لفظ انیک بہت پسند ہے، جسے کئی جگہ لکھا ہے، بعض لفظوں میں املا کی غلطی بھی ہے، جیسے معرکۃ الارئی (ص ۱۱۴) آبا بجائے ابا، ایک جگہ فضا کو مذکر لکھا ہے (ص ۱۰۳) ایک جگہ لکھتے ہیں: "مگر ذوق خانہ فرسائی ہر جگہ مانی آئی" (ص ۱۲۰) خانہ ممکن ہے کتابت کی غلطی ہو، مگر مانع کو مانی لکھنا کیا سہل انگاری ہے؟

لائبریرین شپ:- مرتبہ جناب سید مقیت الحسن صاحب ایم۔ اے، ڈیپ لب، تقطیع متوسط کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۱۱، مجلد، قیمت ۲۰ روپیہ، پتہ:- عثمانیہ بک ڈپو ۱۰۴، نورچیت پور روڈ کلکتہ ملے

اس کتاب میں کتب خانے کے تنظیمی امور و مسائل کے بارہ میں مفید معلومات درج ہیں، پہلے کتب خانہ کی ضرورت اور اس کی مختصر تاریخ بیان کی ہے، جس میں مختلف ملکوں کے علاوہ خاص طور پر ہندوستان کے کتب خانوں کا ذکر ہے، اس سے یہاں مختلف عہد میں کتب خانوں کے قیام و رواج کا پتہ چلتا ہے، لائق مصنف نے لائبریرین شپ (علم کتاب داری) کے اصول و ضوابط تفصیل سے قلمبند کیے ہیں، کتاب کا یہی حصہ زیادہ اہم اور مفید ہے، اس میں کتابوں کے انتخاب اور فراہمی سے ان کے حصول کے طریقے

[illegible]

[illegible]

ضرورت کیا ہے بتائی ہیں۔ "لائبریرین شپ اور ضابطۂ اخلاق" کے زیر عنوان لائبریرین کو قارئین کی سہولت و سہولت کا خیال کرنے اور ان کی خدمت کرنے اور ضمیمہ [illegible] کی تاکید کی گئی ہے، پھر مختلف کتب خانہ کی مختلف قسموں کا ذکر ہے، پھر بعض ممتاز ہندوستانی کتابداروں کے مختصر حالات دیئے گئے تحریر کیے ہیں، آخر میں انگریزی اصطلاحات کے بالمقابل ان کے متبادل اردو الفاظ و اصطلاحات دیے ہیں۔ اردو میں اس موضوع پر پہلے بھی کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن یہ کتاب اپنی نوعیت اور فائدہ کے لحاظ سے زیادہ بہتر ہے، اور اس میں لائق مصنف نے جدید معلومات سے خاص طور پر فائدہ اٹھایا ہے، کتب خانوں کے ذمہ داروں اور ان سے وابستہ لوگوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

مولانا شمس الحق عظیم آبادی : مرتبہ مولوی محمد عزیر صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۴۴، قیمت ۳۵ روپیے، پتہ: علمی اکیڈمی، کراچی۔

مولانا شمس الحق ڈیانوی عظیم آبادیؒ ہندوستان کے ممتاز علماء اور جماعت اہل حدیث کے اساطین میں تھے، ہونہار مصنف نے ان کے علمی و تصنیفی کارناموں کو اپنی بحث و تحقیق کا خاص موضوع بنایا ہے، پہلے انھوں نے اس پر معارف میں ایک مضمون لکھا، پھر عربی میں ایک کتاب لکھی، جس پر معارف میں مفصل تبصرہ کیا جا چکا ہے، اب اس کو حذف و اضافہ کے بعد اردو میں شائع کیا ہے، اس میں مولانا شمس الحقؒ کے خاندانی حالات، واقعات زندگی اور علمی کارناموں کے متعلق تلاش و تفحص سے معلومات جمع کیے ہیں، آخر میں مولانا کے آٹھ اردو اور ایک عربی خط کے علاوہ ان کے سلسلۂ اسانید کا خاکہ اور شجرۂ نسب بھی دیا ہے، شروع میں ایک مبسوط مقدمہ بھی ہے، اس میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے دور سے اب تک کے اہل حدیث علماء کی علمی سرگرمیوں اور حدیث کی کتب میں تصنیفات کا اجمالی جائزہ لیا ہے، مقدمہ خصوصیت سے مفید اور مصنف کی تلاش و جستجو اور علمی شوق و محنت کا [illegible] زیادہ [illegible]

حیات سلیمان

[illegible]

ضمناً [illegible] ہندوستان کی ایک [illegible] تاریخ بھی ہے جس میں سید صاحبؒ کے دور کی تمام اہم علمی، ادبی، دینی و سیاسی [illegible]، ہندوستانی تحریکوں مثلاً ہنگامہ مسجد کانپور، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، جنگ آزادی، مسئلہ ترکیت، حجاز وغیرہ کی تفصیل بھی ضمناً آگئی ہے، اسی کے ساتھ دارالمصنفین جو سید صاحبؒ کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اس کی تاسیس، سال بہ سال اس کی ترقی کی روداد کے ساتھ ان کے قیام بھوپال، سفر پاکستان، قیام پاکستان کے دوران کی علمی خدمات کا تذکرہ اور مختلف وفود کے رکن و صدر کی حیثیت سے سفر یورپ، سفر حجاز، سفر افغانستان وغیرہ کی مفصل روداد بھی سید صاحبؒ کے خطوط اور تحریروں کی روشنی میں قلمبند ہوگئی ہے، یہ کتاب اپنے اسلوب و طرز نگارش کے لحاظ سے بالکل حیات شبلی کا مثنیٰ ہے، ویسی ہی دلکش، دلچسپ اور دلنشین۔

مؤلفہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی قیمت ۴۴ روپے

سلوک سلیمانی

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے عزیز ترین پاکستانی مسترشد مولانا سید سلیمان اشرف خان صاحب سلیمانی صدر شعبہ عربی پشاور یونیورسٹی نے سلوک سلیمانی پر یک اجمالی تبصرہ کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا تھا جو معارف میں ستمبر ۱۹۸۵ء سے جنوری ۱۹۸۶ء تک مسلسل نکلتا رہا، یہ علمی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، اسی مضمون کو مزید اضافوں کے ساتھ مولانا اشرف صاحب نے کتابی صورت میں سلوک سلیمانی کے نام سے دو جلدوں میں شائع کیا ہے جس میں حضرت سید صاحبؒ کی سلوک و معرفت سے متعلق تعلیمات کو مرتب کی توضیحات و تعبیرات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے، ان دونوں جلدوں کو افادۂ عام کی خاطر دارالمصنفین نے بھی چھاپ کر شائع کیا ہے

قیمت جلد اول ۳۰ روپے   قیمت جلد دوم ۲۵ روپے

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

(مرتبہ)

سید صباح الدین عبد الرحمن

قیمت تیس ۳۰ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(پن ۲۷۶۰۰۱)

مجلسِ ادارت

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

تاریخ ہندوستان کا سلسلہ ابتک اٹھائیس کتابوں تک پہونچ چکا ہے، اس ضمن میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے، جس کی اب تک تین ۳ جلدیں شایع ہو چکی ہیں۔

جلد اوّل

اس میں مغل دور سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی اور وطن دوستی، رعایا پروری کے دلچسپ واقعات مستند ماخذوں کی مدد سے پیش کیے گئے ہیں، قیمت ۱۲ روپیے

جلد دوم

اس میں مغل فرماں روا بابر، ہمایوں، سوری خاندان کے شیر شاہ اور اسلام شاہ، پھر مغل شہنشاہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کی مذہبی رواداری، فراخ دلی، وطن دوستی، رعایا پروری کے سبق آموز واقعات پیش کیے گئے ہیں، قیمت ۲۳ روپیے۔

جلد سوم

اس میں جدو ناتھ سرکار کی کتاب کا جواب خود اس کی کتاب کے حوالوں سے اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اورنگزیبؒ عالمگیر اور اسکے بعد کے مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی، وطن دوستی اور رعایا پروری کی تفصیلات آگئی ہیں۔　مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ قیمت ۳۰ روپیے۔

جلد ۱۳۵ ماہ شعبان المعظم ۱۴۰۵ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۸۵ء عدد ۵

مضامین

شذرات

ہم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نئے وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی اختر کا دلی خیر مقدم ان کے اس احاطہ میں تشریف آوری پر کرتے ہیں،

اسی کے ساتھ ان کی خدمت میں یہ بھی گذارش ہے کہ وہ یہاں اس تصور سے قیام نہ کریں کہ ان کی کوٹھی کا نرم اور گداز بستر ان کے لیے استراحت کا سامان فراہم کرے گا، یا وہ کنیڈی ہال کے جلسوں میں عطر اور نکہت بیز پھولوں کا ہار پہنتے رہیں گے، یا یونیورسٹی کی لائبریری کے لہلہاتے ہوئے سبزہ زاروں پر ایٹ ہوم میں شرکت کرکے محظوظ ہوتے رہیں گے، یا اپنے حاشیہ نشینوں کی باتوں سے اپنی نجی محفلوں کو گرماتے رہیں گے، یا حکومت کی چشم و ابرو پر نگاہ رکھ کر اپنے اعزاز و مرتبے میں اضافہ کرتے رہیں گے، اس کے برخلاف وہ یہاں آئے ہیں تو وہ برابر یہ خیال رکھیں کہ وہ کانٹوں کی سیج پر لیٹنے، راتوں کو اپنی نیند حرام کرنے، اپنے جسم کے ہر بن مو کو چنگاریوں اور شعلوں کی نذر کرنے آئے ہیں۔

مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری ملک کی اور یونیورسٹیوں کی وائس چانسلری سے بالکل مختلف ہے، یہ آٹھ کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کی تمناؤں کا مرغزار، ان کی آرزوؤں کا گلزار اور ان کی خواہشوں کا سبزہ زار ہے، پھر انہی مسلمانوں کی اولادوں کے جذبات کا مے کدہ، ان کے احساسات کا گلکدہ ہے اور ان کے تخیلات کا عشرت کدہ ہے، اس رنگا رنگی کے ساتھ اس کو سرسبز اور شاداب رکھنا آسان نہیں۔

اس تعلیمی ادارہ کے سربراہ سے یہ بلند توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ سرسید کی مآل اندیشی، وقار الملک کی معاملہ فہمی، محسن الملک کی ہوشمندی، طلبہ کے ساتھ سر ضیاء الدین کی بے پناہ ہمدردی اور سر شاہ سلیمان کے کردار کی بلندی کا مجموعہ بن کر آئے۔ ایسا بننا آسان نہیں، لیکن ان روایتوں کو سینے سے لگا کر رکھنا مشکل بھی نہیں، اگر وہ اپنے جان و دل ہی کو عزیز رکھنا گوارا کرتا ہو، تو پھر اس گلی میں آتے کیوں۔

مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی حکومت ہے، احادیث میں حکومت کے سربراہ کو

راعی بھی کہا گیا ہے، جس کے معنی چرواہے کے ہیں، یعنی اس کی حیثیت ایسے محافظ کی ہوتی ہے جو اپنے گلہ کو سرسبز چراگاہوں میں لے جاتا ہے، ان کی شکم سیری کا سامان کرتا ہے، درندوں سے ان کی حفاظت کرتا ہے اور حادثات سے ان کو بچاتا ہے، حدیث میں یہ بھی ہے کہ سب سے بُرا راعی وہ ہے جو اپنی رعیت کو توڑ ڈالے۔

ہر یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو بالک ہٹ کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ہمارے نئے وائس چانسلر کو بھی اس سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ہر خاندان میں بھی یہ مسئلہ اٹھتا رہتا ہے، اس کے مضرت رساں پہلوؤں سے انکار نہیں، مگر اس سے عہدہ برآ ہونے میں خاندان کا شفیق بزرگ پولیس اور فوج کو طلب نہیں کرتا، بلکہ اپنی شفقت اور محبت کو بروئے کار لا کر اس پر قابو پا لیتا ہے، مسلم یونیورسٹی بھی ہندوستانی مسلمانوں کا ایک بڑا خاندان ہے، اس کے بالکوں کی ہٹ سے ہر زمانہ میں ناخوشگوار اور تکلیف دہ فضا پیدا ہوتی رہی ہے، مگر ان کی ہٹ سے نپٹنے کے لیے اس کے سربراہ سے وہی توقع کی جاتی ہے، جو ایک خاندان کے شفیق بزرگ سے کی جاتی ہے۔

بگڑوں کو سنوارنا، بدکرداروں کو باکردار بنانا اور روٹھوں کو منانا بہت مشکل کام ضرور ہے، مگر اس پر قابو پانا اپنی کارکردگی، کارگذاری اور زیرکی کا بھی ثبوت دینا ہوتا ہے، مگر ان کو مطعون کرکے اور ناہنجار قرار دے کر پولیس اور فوج کے حوالہ کر دینے میں اپنی فرض شناسی، جذبۂ خدمت گزاری اور مخلصانہ ہوشمندی کو متازعہ فیہ بھی بنانا ہے، اور مسائل در مسائل بھی کھڑے کر دینا ہے، نظم و نسق قائم کرنے میں تنقیدوں اور خطروں سے ڈرنا بھی صحیح نہیں، مگر تنقید جب غیر معمولی تنقیص میں تبدیل ہو جائے، یا خطرہ مول لینے کے بعد تباہی سامنے آجائے تو پھر اس کی تاویل کی نہ گنجائش ہوتی ہے اور نہ اس کا کوئی جواز ہوتا ہے۔

یہ ضرور ہے کہ مسلم یونیورسٹی کی بہت سی باتیں اصلاح طلب ہیں، اس کو گلزار بنانے کی

کوشش میں اس کو رواداری، بخاوت اور بے جا تدبر کی دلیل نہیں، کوئی کام خواہ کتنے ہی اخلاص سے کیا جائے، لیکن اس سے طرح طرح کی پیچیدگیاں اور گتھیاں پیدا ہو جائیں، تو ایسے اخلاص کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ سچا اخلاص اس وقت سونا بن جاتا ہے جب یہ پچھلے طور پر کارفرما بھی ہو، لیکن کوئی مجادلہ مباہلہ، مناقشہ اور ہنگامہ بھی نہ ہو۔

ہمارے نئے محترم وائس چانسلر کو علی گڑھ کے قیام میں معلوم ہو جائے گا کہ کون وائس چانسلر کامیاب اور کون ناکام رہا، اب ان کی آزمائش اس میں نہیں ہے کہ یونیورسٹی سے باہر انھوں نے کیا عزت پائی، اور کس طرح سر آنکھوں پر بٹھائے گئے، بلکہ ان کا امتحان اس میں ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پیچیدہ اور صبر آزما مسائل کو حل کرنے میں اپنے تدبر، فہم اور ادراک کا ثبوت کس کس طرح سے دیتے ہیں، اور وہاں کے طلبہ، اساتذہ اور ادنیٰ ملازموں کے دلوں کی تسخیر کے لیے کیا کیا حکمت عملی اختیار کرتے ہیں، مفتوح کرکے فاتح بننا، مغلوب کرکے غالب ہو جانا، جھکا کر سربلند ہونا حقیقی کامیابی نہیں ہوتی، بلکہ مفتوح ہو کر فاتح ہونے، مغلوب ہو کر غالب آ جانے اور جھک کر سربلند تسلیم کیے جانے میں بڑی اور قابل قدر کامرانی کا راز پوشیدہ ہے، یہ کوئی کوہ سینا کا وعظ نہیں، بلکہ یہی اسوۂ محمدیؐ ہے، جس سے ساری مشکلیں حل ہوتی رہی ہیں۔

مقالات

سرسیّد احمد خانؒ اور مستشرقین

از عبید اللہ کوٹی ندوی رفیق دارالمصنفین

(۴)

کیا حدیثیں سیاسی ضرورت کی وجہ سے سامنے آئیں؟

سر ولیم میور کا یہ بھی خیال ہے کہ "ترقی پذیر سلطنت کی ضرورتیں قرآن کے مجموعۂ سیاست میں ایجاد اور اضافہ کا سبب بنیں، جو چیز کہ پہلے عربوں کی سادگی اور محدود نظام تمدن کے لیے کافی تھیں، ان کی اولاد کی روز افزوں ضرورتوں کے لیے اب ناکافی ہوگئیں"۔ وہ کہتے ہیں کہ "یہ اور اسی قسم کے اسباب قرآن کے محدود اور معرا (یعنی گنے چنے اور صرف اصولی احکام و) مسائل کی توسیع اور اس کے اخلاق کے غیر مکمل مجموعہ کی تکمیل کے متقاضی ہوئے"۔ لیکن بقول سرسید احمد خان:

"اس بیان میں سر ولیم میور نے دو طرح کی غلطیاں کی ہیں، ایک تو یہ کہ جامعین حدیث کو ترقی سلطنت یا مجموعۂ سیاست سے کچھ سروکار نہ تھا، یہ لوگ محض دین کی طرف متوجہ تھے، انھوں نے احادیث نبویؐ کو صرف دینی اغراض سے جمع کیا تھا، ان کی جمع کی ہوئی حدیثوں میں دین ہی کو بہت بڑی نسبت ہے، یعنی ان کا بیسواں حصہ بھی امور سیاست سے متعلق نہیں ہے، دوسرے یہ کہ کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا جب کہ مسلمانوں نے امور سیاست کو الہامی سمجھا ہو، خود جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زمانہ میں ایسے امور میں صحابہؓ سے صلاح لیتے تھے اور اس کے مطابق کاربند ہوتے تھے، قرآن مجید اور نیز پیغمبر خدا نے سیاست اور انتظام مدن کے کبھی معاملات کو چند

[illegible] بالکل زمانہ دانوں کی رائے پر چھوڑ دیا ہے، اور صرف یہ حکم دیا ہے کہ ذی فہم لوگوں سے مشورہ کر کے وہ کام کریں جو زمانہ کے حالات اور ڈھنگ کے واسطے ضروری ہیں، پس مسلمانوں کو اور ان کی اولاد کو اپنی روز افزوں ضرورتوں میں قرآن کی تکمیل کے لیے حدیثوں کو تلاش کرنے کی کچھ ضرورت نہ تھی، ہاں بلاشبہہ مسلمانوں میں یہ خواہش تھی کہ ہر امر میں خواہ وہ دین سے متعلق ہو یا دنیا سے، اسی طرح کی کارروائی کریں جس طرح کہ پیغمبر خدا نے کی تھی، اور یہ اس محبت اور عشق کا تقاضا تھا جو ہم مسلمان اپنے پیغمبرؐ کے ساتھ رکھتے ہیں، اور اسی لیے ہر قسم کی احادیث کو جمع کرتے تھے، پس یہ عشق اور محبت نہایت قابل ستائش تھی مگر افسوس ہے کہ سر ولیم میور نے مسلمانوں کی اس عمدہ صفت کو بھی بدترین معنے میں بیان کیا ہے۔"

(خطبات احمدیہ: ص ۳۶۲)

انھوں نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ "کسی خلیفہ یا کسی مسلمان حاکم نے ان لوگوں کے کام میں، جو بطور خود حدیثیں جمع کرتے تھے کبھی دخل نہیں دیا، ہم علانیہ کہتے ہیں کہ لوگ ہم کو حدیث کی کوئی ایک کتاب بھی تمام کتب احادیث میں سے ایسی نکال دیں جو کسی خلیفہ یا حاکم کے حکم سے جمع کی گئی ہو، اس کے برعکس ہم یہ بات اعتماد سے کہتے ہیں کہ یہ کل کتابیں بلا استثنا ایسے مقدس لوگوں نے مرتب کی تھیں جو اپنے زمانہ کے خلفاء کے دربار میں جانے سے بھی از حد پرہیز کرتے تھے، اس زمانہ کے خلفاء، جناب پیغمبرؐ خدا کے خلیفہ نہ تھے، بلکہ سلاطین اور بادشاہ تھے، کیونکہ سلسلۂ خلافت (یعنی پیغمبرؐ خدا کے جانشین خلفاء کا زمانہ) جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے تیس برس بعد ختم ہو گیا (ایضاً ص ۳۶۴)

سر ولیم میور کا واقدی سے استناد

سرسید فرماتے ہیں کہ "سر ولیم میور اپنی کتاب کے حاشیہ میں نہایت ضعیف اور نہایت غیر مستند روایتیں واقدی سے نقل کرتے ہیں"، پھر چند سطروں کے بعد وہ واقدی سے استناد پر گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"ہم کو اس بات کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اگرچہ سر ولیم کے نزدیک قریب قریب تمام موجودہ روایاتِ اسلام محض بناوٹی ہیں، لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنے سب بیانات کو واقدی کی روایت پر مبنی کیا ہے جس میں

ضعیف ترین روایات منقول ہیں، اور طرفہ یہ ہے کہ ان سب روایتوں کو ہمارے خلاف استعمال کرتے ہیں؛ حالانکہ تحقیق اور غیر متعصبانہ تصنیف کے مسلّم قوانین کی رو سے نیز اپنے عقیدے کے مطابق ان کو لازم تھا کہ اول احادیث صحیحہ اور موضوعہ کی تحقیق اور تمیز کرتے اور پھر مذہب اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کی نسبت معترض ہوتے، تمام عیسائی مصنفوں کی تصنیفات میں، جنھوں نے دین اسلام کی نسبت لکھا ہے اسی ضروری امر میں کوتاہی پائی جاتی ہے، مگر وہ اپنے عیبوں کو نہایت خوشگواری سے ہضم کر جاتے ہیں؛ اور دوسروں کی نسبت عجیب وغریب پیرایے میں نکتہ چینی کرنے کو موجود ہوتے ہیں۔"

(خطبات احمدیہ: ص ۳۶۵)

مسلمانوں میں جو لغو، غیر معتبر اور موضوع روایتیں پیدا ہوئیں ان کی حقیقت کو بھی واضح کر دیا گیا ہے؛ چنانچہ اکثر کتابیں صحیح اور غلط روایتوں میں تمیز کرنے کی غرض سے لکھی گئی ہیں، اور ان کی صحت اور وجہ اعتبار کے جانچنے کے لیے اصول و قواعد اور سخت معیار مقرر کیے گئے ہیں، اور جھوٹی حدیثوں کے بنانے والے گنہگار ٹھہرائے گئے ہیں، لیکن اس موقع پر سرسیدؒ اس حقیقت کی طرف بھی متوجہ کرتے ہیں کہ جھوٹی روایتوں کے باب میں یہود کے مذہب کا حال بدتر اور عیسائی مذہب کا حال بدترین ہے، مذہب عیسوی میں دینی کتب کے نام سے جو روزانہ ہر کلیسا میں پڑھی جاتیں؛ بے شمار رسالوں اور موضوع کتابوں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی تھی، جن کی وجہ سے ان کے دیندار حلقوں میں بے انتہا مناقشے اور قضیے پیدا ہو گئے، قسطنطین اعظم نے دین عیسوی قبول کیا تو اس نے ۳۲۰ء میں مجلس نیس (نسیا) منعقد کی، جس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ صحیح اور موضوع انجیلوں میں تمیز کی جائے، بقول والٹیر عیسائیان سابق پر اس لیے نفریں کی گئی کہ انھوں نے عیسیٰؑ کے نام پر چند اشعار لکھ کر ایک پرانی کاہنہ کی طرف منسوب کیے تھے، اور حضرت عیسیٰؑ کی طرف سے بادشاہ اوڈیسا کے نام جعلی خطوط بنائے جب کہ اس زمانہ میں کسی ایسے بادشاہ کا وجود بھی نہ تھا، حضرت مریمؑ کے خطوط، سنیقا کی جانب سے پولس کے نام خطوط، پلاطس کے خطوط اور اعمال، مصنوعی اناجیل، جھوٹے معجزات اور دوسری ہزاروں جعل سازیوں

اور مختلف اوقات میں لکھے گئے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد دو یا تین صدیوں کے اندر اس قسم کی کتابوں کی تعداد کثیر ہو گئی تھی۔

مجلس نیس میں جو روم کے بادشاہ قسطنطین نے ۳۲۵ء میں منعقد کی تھی الوہیت مسیحؑ کا وہ مسئلہ طے ہوا جس نے کلیسائے نصاریٰ میں ہلچل ڈال دی تھی، اس مجلس میں اٹھارہ بشپ اور دو ہزار پادریوں نے حضرت مسیحؑ کی الوہیت سے انکار کیا، اور اس پر دلیلیں دیں، لیکن سخت مباحثوں اور مناظروں کے بعد یہ بات قرار پائی کہ حضرت مسیحؑ خدا کے اکلوتے بیٹے ہیں، خدائے پدر سے پیدا ہوئے ہیں، اریس جو اٹھارہ بشپوں معترضین میں سے ایک تھا فرقہ یونیٹرین (موحدین) کا سرغنہ ہوا، جو حضرت مسیحؑ کی الوہیت کے منکر تھے۔ وہ بے دینی کے اسی الزام کی وجہ سے جلا وطن کر دیا گیا، لیکن پھر تھوڑے ہی عرصے کے بعد اس کو قسطنطنیہ بلا لیا گیا جہاں اس کے عقیدے کو بالا تری حاصل ہوئی، اور تمام صوبہ جات روم میں اس نے رواج پایا، جبکہ اتاناسیوس نے جو فرقہ تثلیثیہ کا سرگروہ تھا اس کے خلاف سخت جد و جہد کی، اسی مجلس نیس کی کارروائی کے تتمہ میں یہ بھی تحریر کیا گیا ہے کہ آبائے کلیسا، توریت اور انجیل کے صحیح اور غیر صحیح صحیفوں کے انتخاب و تصحیح میں نہایت حیران اور ششدر ہوئے، چنانچہ ان سب کو بلا لحاظ و تمیز ایک قربان گاہ پر رکھ دیا، اور کہا جاتا ہے کہ جو صحیفے لائق تنسیخ تھے، زمین پر گر پڑے۔

دوسری مجلس ۳۸۱ء میں قسطنطنیہ میں منعقد ہوئی تھی جس میں روح القدس کے بارے میں ان امور کی تشریح کی گئی جن کو مجلس نیس میں غیر منفصل رہنے دیا گیا تھا، اب اس موقع پر یہ عقیدہ قرار پایا کہ روح القدس وہ رب ہے جو باپ سے نفاذ پاتا ہے، اور باپ اور بیٹے کے ساتھ باہم مخلوط ہو کر اس نے احترام حاصل کیا ہے۔ ۴۳۱ء میں تیسری عام مجلس نے جو بمقام افسیس ہوئی یہ فیصلہ کیا کہ حضرت مریمؑ ام اللہ (مادر اللہ) تھیں خلاصہ یہ کہ حضرت عیسیٰؑ میں دو صفتیں تھیں، اور ایک وجود، نویں صدی میں کلیسائے روم اور یونان کے مابین وہ عظیم تفرقہ اور اختلاف واقع ہوا جس کے بعد شہر روم میں پوپ کے عہدے کے لیے تقریباً

انھیں خون پرجھگیں ہونگی۔ (خطبات احمدیہ: ص ۳۶۴-۳۶۵)

سر ولیم میور تورات و انجیل کی مذکورہ بالا ناگفتہ بصورت حال سے نظریں بچا کر اسلامی روایات کو اسی سطح پر لانے کی کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں، چنانچہ انھوں نے بعض یوروپین اہل تحقیق کی یہ رائے درج کی ہے کہ وہ بخاری کی درج کردہ روایات میں سے نصف کو لائق اعتبار نہیں سمجھتے، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ سر ولیم میور نے ان روایات سے استدلال نہیں کیا ہے جن کو خود انھوں نے بھی معتبر مانا ہے بلکہ بقول سرسید:

"یوروپین محققوں نے جن میں سر ولیم میور سب سے نمبر اول ہیں بخاری کی چار ہزار روایات پر بھی قناعت نہ کر کے اپنی تصنیفات کو واقدی، مولود نامہ، معراج نامہ اور دوسری ان کتابوں پر مبنی کرنے کی جانب مائل ہوئے ہیں جن میں بیہودہ باتوں کے سوا کچھ نہیں ہے، اور جن کو خود مسلمانوں ہی نے خارج کر دیا ہے۔ (ایضاً: ص ۳۶۹)

سر ولیم میور کا یہ بیان بھی درست نہیں کہ "جامعین حدیث نے اگرچہ وہ غیر معتبر روایات کے اخراج میں بے دھڑک تھے، معتبر روایتوں کی تمیز میں کسی عمدہ قانون کو نہیں برتا" کیونکہ جمع روایات کا کام شروع ہوا تو اول یہ کوشش ہوئی کہ معتبر راویوں کی تحقیق کر کے ان کی روایتوں کو قلمبند کر لیا جائے، قرآن و حدیث کے مقصد اور اصول و کلیات کی روشنی میں بھی غلط اور نامعتبر روایتوں کی تمیز کا کام کیا گیا، چنانچہ بہت سے علمائے محققین ایسے گذرے ہیں جنھوں نے اس دوسرے فرض کو بھی ادا کیا ہے، اور اس کے لیے قواعد بھی منضبط کیے ہیں، اور اصول حدیث کی کتابیں تصنیف کی ہیں، اور مضامین حدیث کے لحاظ سے حدیث کے اعتبار و عدم اعتبار کو پرکھنے کے لیے ایک مستقل فن کی بنیاد رکھی جسے فن درایت کہا جاتا ہے، ہر ایک مسلمان کے اختیار میں ہے کہ ان اصول درایت سے جس کتاب کی حدیث پرچاہے، معتبر اور نامعتبر ہونے کے بارے میں روشنی حاصل کرے (ایضاً، ص ۳۷۱)

اور خود مسیح کے ملفوظات بھی لکھے گئے تھے، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد دو یا تین صدیوں کے اندر اس قسم کی کتابوں کی تعداد کثیر ہو گئی تھی۔

مجلس نیس میں جو روم کے بادشاہ قسطنطین نے ۳۲۵ء میں منعقد کی تھی الوہیت مسیحؑ کا وہ مسئلہ طے ہوا جس نے کلیسائے نصاریٰ میں ہلچل ڈال دی تھی، اس مجلس میں اٹھارہ بشپ اور دو ہزار پادریوں نے حضرت مسیحؑ کی الوہیت سے انکار کیا، اور اس پر دلیلیں دیں، لیکن سخت مباحثوں اور مناظروں کے بعد یہ بات قرار پائی کہ حضرت مسیحؑ خدا کے اکلوتے بیٹے ہیں، خدائے پدر سے پیدا ہوئے ہیں، اریس جو اٹھارہ بشپ معترضین میں سے ایک تھا فرقہ یونیٹرین (موحدین) کا سرغنہ ہوا، جو حضرت مسیحؑ کی الوہیت کے منکر تھے، وہ بے دینی کے اسی الزام کی وجہ سے جلا وطن کر دیا گیا، لیکن پھر تھوڑے ہی عرصے کے بعد اس کو قسطنطنیہ بلا لیا گیا جہاں اس کے عقیدے کو بالاتری حاصل ہوئی، اور تمام صوبہ جات روم میں اس نے رواج پایا، جبکہ آتھاناسیس نے جو فرقہ تثلیثیہ کا سرگروہ تھا اس کے خلاف سخت جد و جہد کی، اسی مجلس نیس کی کارروائی کے تتمہ میں یہ بھی تحریر کیا گیا ہے کہ آبائے کلیسا، توریت اور انجیل کے صحیح اور غیر صحیح صحیفوں کے انتخاب و تعیین میں نہایت حیران اور ششدر ہوئے، چنانچہ ان سب کو بلا لحاظ و تمیز ایک قربان گاہ پر رکھ دیا، اور کہا جاتا ہے کہ جو صحیفے لائق تنسیخ تھے، زمین پر گر پڑے۔

دوسری مجلس ۳۸۱ء میں قسطنطنیہ میں منعقد ہوئی تھی جس میں روح القدس کے بارے میں ان امور کی تشریح کی گئی جن کو مجلس نیس میں غیر منفصل رہنے دیا گیا تھا، اب اس موقع پر یہ عقیدہ قرار پایا کہ روح القدس وہ رب ہے جو باپ سے نفاذ پاتا ہے، اور باپ اور بیٹے کے ساتھ باہم مخلوط ہو کر اس نے احترام حاصل کیا ہے۔

۴۳۱ء میں تیسری عام مجلس نے جو بمقام افسس ہوئی یہ فیصلہ کیا کہ حضرت مریمؑ ام اللہ (مادر اللہ) تھیں خلاصہ یہ کہ حضرت عیسیٰؑ میں دو صفتیں تھیں، اور ایک وجود، نویں صدی میں کلیسائے روم اور یونان کے مابین وہ عظیم تفرقہ اور اختلاف واقع ہوا، جس کے بعد شہر روم میں پوپ کے عہدے کے لیے تقریباً

انتہیں خوں ریز جنگیں ہونگی۔ (خطبات احمدیہ: ص ۳۶۴-۳۶۵)

سر ولیم میور توریت وانجیل کی مذکورہ بالا ناگفتہ بہ صورت حال سے نظریں بچا کر اسلامی روایات کو اسی سطح پر لانے کی کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں، چنانچہ انھوں نے بعض یوروپین اہل تحقیق کی یہ رائے درج کی ہے کہ وہ بخاری کی درج کردہ روایات میں سے نصف کو لائق اعتبار نہیں سمجھتے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ سر ولیم میور نے ان روایات سے استدلال نہیں کیا ہے جن کو خود انھوں نے بھی معتبر مانا ہے بلکہ بقول سرسید:

"یوروپین محققوں نے جن میں سر ولیم میور سب سے نمبر اول ہیں بخاری کی چار ہزار روایات پر بھی قناعت نہ کرکے اپنی تصنیفات کو واقدی، مولود نامہ، معراج نامہ اور دوسری ان کتابوں پر مبنی کرنے کی جانب مائل ہوئے ہیں جن میں بیہودہ باتوں کے سوا کچھ نہیں ہے اور جن کو خود مسلمانوں نے ہی خارج کر دیا ہے۔ (ایضاً: ص ۳۶۹)

سر ولیم میور کا یہ بیان بھی درست نہیں کہ "جامعین حدیث نے اگرچہ وہ غیر معتبر روایات کے اخراج میں بے دھڑک تھے، معتبر روایتوں کی تمیز میں کسی عمدہ قانون کو نہیں برتا" کیونکہ جمع روایات کا کام شروع ہوا تو اول یہ کوشش ہوئی کہ معتبر راویوں کی تحقیق کرکے ان کی روایتوں کو قلمبند کر لیا جائے، قرآن و حدیث کے مقصد اور اصول و کلیات کی روشنی میں بھی غلط اور نامعتبر روایتوں کی تمیز کا کام کیا گیا، چنانچہ بہت سے علمائے محققین ایسے گذرے ہیں جنھوں نے اس دوسرے فرض کو بھی ادا کیا ہے، اور اس کے لیے قواعد بھی منضبط کیے ہیں، اور اصول حدیث کی کتابیں تصنیف کی ہیں، اور مضامین حدیث کے لحاظ سے حدیث کے اعتبار و عدم اعتبار کو پرکھنے کے لیے ایک مستقل فن کی بنیاد رکھی جسے فن درایت کہا جاتا ہے، ہر ایک مسلمان کے اختیار میں ہے کہ ان اصول درایت سے جس کتاب کی حدیث پر چاہے، معتبر اور نامعتبر ہونے کے بارے میں روشنی حاصل کرے (ایضاً، ص ۳۷۱)

اوائل عمر سے متعلق روایتوں پر اعتراض

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی عمر سے متعلق روایتوں پر بھی سر ولیم میور نے یہ اعتراض کیے ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر صاحب کے اس زمانے کے حالات جن لوگوں نے بیان کیے ہیں وہ لوگ آپ سے عمر میں یا تو چھوٹے تھے یا برابر، اس لیے پیغمبر صاحب کی ولادت سے پیشتر کے واقعات، یا ان کی طفولیت کے حالات کے باب میں ان کی شہادت معتبر نہیں ہے، اور آپ کی نوجوانی کے سوانح بھی ان میں سے بہت کم اشخاص نے مشاہدہ کیے ہوں گے۔ مگر

"بظاہر یہ بیان لوگوں کے خیال میں صحیح معلوم ہوتا ہوگا، لیکن اس میں غلطی یہ ہے کہ سر ولیم میور نے سب سے پہلے یہ فرض کر لیا ہے، جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے کہ "روایت کی سب سے پہلے تدریج کا زمانہ پیغمبر صاحب کی وفات کے بعد ہوا تھا" مگر اس رائے کے برخلاف محکم ترین دلائل موجود ہیں اور ثابت ہے کہ روایات کے بیان کرنے کی رسم جناب پیغمبر خدا کی حیات میں شروع ہوئی تھی، دوم یہ کہ موصوف نے اس بات کو ایک امر واقعی تسلیم کر لیا ہے کہ جملہ اصحاب اور وہ بھی جنھوں نے پیغمبر خدا کی حیات میں وفات پائی تھی یا تو جناب پیغمبر خدا سے چھوٹے تھے یا ان کے ہم عمر تھے، یہ امر تاریخی واقعہ کے خلاف ہے، اور صحابہ بھی بلحاظ عمر کے اتنے تو ضرور ہی تھے کہ جناب پیغمبر خدا کی ولادت سے ذرا پیشتر کے واقعات اور ان کے بچپن اور جوانی کے حالات کو بچشم خود دیکھا اور ان کو صحیح صحیح یاد رکھ کر، اوروں سے بے کم و کاست نقل کیا ہو، اور ایسے ہی لوگوں کے بیان کو ہم مستند قرار دیتے ہیں۔" (خطبات احمدیہ، ص ۳۰۲)

سرسید یہ بھی وضاحت کرتے ہیں کہ کسی واقعہ کے صدق کی تحقیق کو محض گواہان معائنہ کی موجودگی پر موقوف رکھنا، شہادت کے قواعد معینہ سے جن کو تمام شائستہ اور مہذب قوموں نے تسلیم کر لیا ہے، سراسر انحراف ہے، گواہان معائنہ کے سوا اور بھی چند امور ہیں جن کا حل ایسا ہی مستحکم ہوتا ہے، اور جن سے کسی واقعہ کے صدق یا کذب کا فیصلہ ہو سکتا ہے، صرف اس قدر فرق ہے کہ ہر واقعہ جس کے بارے میں کوئی معتبر گواہ معائنہ تصدیق

کسے فوراً تسلیم کرلیا جاتا ہے، اور دوسری صورت میں راویوں کی کثرت اور تواتر سے اس کی صحت معلوم ہوتی ہے، لہٰذا جناب پیغمبر خدا کے زمانہ کے واقعات کی تصدیق کے لیے یہی صورت لازم اور ممکن ہے کہ انسان نے اپنی عقلی صلاحیتوں کے ذریعہ کسی مذہب کا لحاظ کیے بغیر جو سچے اور مسلمہ قوانین شہادت مرتب کیے ہیں ان ہی کی روشنی میں گواہوں کے بیان صدق کا امتحان کریں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوائل عمر میں جو واقعات پیش آئے، سر ولیم میور کے نزدیک "ان کے بارے میں کامل اور ٹھیک بیان کی امید رکھنی بے فائدہ ہوگی"۔ اس اصل کو سر ولیم، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور نبوت کے ابتدائی عرصہ تک وسعت دیتے ہیں، جب کہ آپؐ نے علانیہ دعوائے نبوت کیا، شرک سے ممانعت فرمائی، اور باشندگان مکہ سے لڑائی کے حالات پیدا ہوئے، وہ اپنے بیان سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جناب پیغمبر خدا کے ان حالات کا ٹھیک ٹھیک اور قرار واقعی دریافت ہونا جب کہ انھوں نے عام شہرت حاصل نہیں کی تھی غیر ممکن ہے، لیکن بقول سر سید:

> "سر ولیم میور کا یہ فرضی اصول جو انھوں نے اپنی ذہانت سے ایجاد کیا ہے، اگر مان لیا جائے تو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کی اس سوانح عمری کی نسبت جو ان کی شہرت حاصل کرنے سے پہلے وجود میں آئی تھی کیا کیا جائے گا، کیا ان کی نسبت بھی کامل اور ٹھیک ٹھیک بیان کی امید رکھنی بے فائدہ ہوگی، اور کیا ان حالات کا ٹھیک ٹھیک اور قرار واقعی دریافت ہونا غیر ممکن ہوگا؟ ..... ہم کو آنحضرتؐ کے تمام حالات زندگی میں ایک امر بھی ایسا نہیں دکھائی دیتا جس کی اصلیت آنحضرتؐ کی عمر کے غیر مشہور زمانہ کے کسی واقعہ کی صحت پر موقوف ہو، مگر حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے باب میں ایسا نہیں ہے، ان دونوں کی عمر کے تمام مشہور زمانہ کی اصلیت ان کی عمر کے غیر مشہور زمانہ کی صحت پر منحصر ہے، ہم کو کس طرح یہ یقین ہو سکتا ہے کہ وہ نامعلوم بچہ جس کو فرعون کی بیوی نے دریائے نیل میں ایک صندوق میں بہتا ہوا پایا تھا عمران کا حقیقی بیٹا تھا، جس کو تمام دنیا حضرت موسیٰ کہتی ہے، اور ہم کو

کس طرح اس بات کا کبھی یقین ہو سکتا ہے کہ وہ بچہ جسکو ہم کلمۃ اللہ اور روح اللہ اور عیسائی اس کو ابن اللہ کے نام سے مخاطب کرتے ہیں اور جس کی نسبت یقین ہے کہ بن باپ کے پیدا ہوا تھا داؤد کی نسل سے تھا، اور وہ وہی تھا جس کو اب عیسیٰ مسیح کے نام سے تعبیر کرتے ہیں یہ دونوں امر جو موسوی اور عیسوی مذہب کی بنیاد ہیں ایسے اسرار سے بھرے ہوئے ہیں جن کا ثابت کرنا ایسا محال اور غیر ممکن ہے جیسا کہ دنیا میں کسی بھی محال اور غیر ممکن چیز کا ثابت کرنا۔"

(خطبات احمدیہ: ص ۲۷۵)

مسلمان تو حضرت موسیٰؑ و حضرت عیسیٰؑ پر کامل ایمان رکھتے ہیں، لیکن سر ولیم میور کا اصول خود ان کے حق میں سخت مضر ہے جس سے ان کی اپنی مذہبی بنیادیں ہل جاتی ہیں، پھر یہ اصول شہادت کے مسلمہ قوانین کے بھی برخلاف ہے، جہاں تک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی واقعات کا تعلق ہے تو "بہت سے برسوں کے گذرنے کے بعد" ان کی روایت کا افسانہ بھی ناواقفیت اور جہالت پر مبنی ہے، اس لیے کہ:

"پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے غیر مشہور زمانۂ حیات کو اس قدر عرصہ نہیں گذرا تھا، زمانۂ روایت میں بہت سے آدمی زندہ موجود تھے، جنھوں نے جناب پیغمبرؐ خدا کی پیدائش، ان کا بچپن، ان کا لڑکپن اور ان کی نوجوانی دیکھی، اور گو بقول سر ولیم میور "ان کا حافظہ اور خیال پیغمبر صاحب کی زندگی کے حالات کو بتفصیل ذہن نشین کرنے میں مصروف نہ تھا" تاہم اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ وہ تمام چشم دید باتوں کو بھول گئے ہوں، برخلاف اس کے جب کہ ایک بے کس یتیم بچہ، ایک ایسا شخص جس کی نسبت تمام باشندگان کہ میں سب سے کم یہ گمان ہو سکتا تھا کہ ان کے پڑوسیوں کی آنکھیں اس کی طرف متوجہ ہوں، اور ایسا غیر مشہور شخص وہ چال چلن اختیار کرے جو اپنی نوعیت میں نہایت جلیل القدر ہو اور جو اس کے خاندان، اس کے ہمسایوں اور اس کے ہم وطنوں پر بالعموم شاق ہو تو قیاس کا تقاضا ہے کہ ہر شخص جو اس سے قرابت رکھتا ہوگا اس کی زندگی کے غیر مشہور زمانے کے حالات اور

خفیہ اور معاشرت کی سخت چھان بین کرے گا، اور اس کی خفیہ معاشرت کے ہر ہاتھ کا اسی طرح کے ان واقعات سے مقابلہ کرے گا جو ان سب کے روبرو واقع ہوئے ہیں، اور جن کی نسبت وہ سب معائنہ کے گواہ ہوں۔" (خطبات احمدیہ، ص ۳۷۶)

لیکن سر ولیم میور اس دور سے متعلق کسی بھی طرح کی "صراحت کو بناوٹ کی ایک بڑی علامت" تصور کرتے ہیں، حالانکہ یہ اصول واضح طور پر مسلمہ قانون شہادت کے خلاف ہے، اور وہ نتیجہ جو انھوں نے عیسائیوں کے فن تحقیق کے قانون کو روایات اسلام پر جاری کر کے حاصل کیا ہے یہ ہے کہ بیہودہ قصوں کی ایک تعداد کثیر سے ان کا پیچھا چھوٹ جائے گا، جن میں کہ گندھے ہوئے بیان اور بگڑے ہوئے کلام کی علامتیں کل کی تازگی کے ساتھ موجود ہوں، لیکن بقول سرسید، سر ولیم کا یہ اصول پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ غیر مشہور پر ٹھیک ٹھیک صادق نہیں آتا، اور جب کبھی کوئی ایسی روایت بیان کی جاتی ہے جس میں کہ تمام جزوی علامتیں کل کی تازگی کے ساتھ موجود ہوں اور جو امتداد زمانہ کی وجہ سے غیر ممکن معلوم ہوتی ہیں، تو اس بنا پر جو شبہہ ہوتا ہے، راوی کی نسبت ہوتا ہے، کیونکہ اس کو تفصیل یاد رہی، نہ کہ مضمون روایت کے بارے میں، کیونکہ اس کا صحیح ہونا غیر ممکن نہیں، اور اسی لیے اس سے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر جامعین روایت کے نزدیک، قواعد کی روشنی میں راوی کا چال چلن ہر طرح درست ثابت ہو، اس کے حافظہ پر اعتماد ہو، اور ان واقعات کے یاد رہنے کا بھی امکان ہو تب مضمون روایت کے صحیح تسلیم کر لینے میں کچھ شک و شبہہ باقی نہیں رہتا۔ (ایضاً، ص ۳۷۷)

دور نبوت کے اہل کفر کے بارے میں

مکہ کے دور نبوت، بلکہ فتح مکہ سے پہلے تک کے زمانہ نبوت کو بھی سر ولیم نے اپنے قیاس و تخمین کا نشانہ بنایا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مکہ اور مدینہ کے کفار یا تو ایمان لا چکے تھے یا وہاں سے نکال دیے گئے تھے۔ اور اب کوئی ایسا شخص وہاں نہ رہا تھا جو ان کے بارے میں یک طرفہ بیانات، بے بنیاد اتہامات اور مبالغہ آمیز الزامات کی تردید کرتا، اور چونکہ خود رسول اکرم

ہم واقعات کیا کرتے تھے کہ کبھی کبھی خیال کسی مسلمان کو ان کی حمایت کی جرأت ہوتی، اور اسی وجہ سے اہل روایت ان کی قباحت سے نفرت کرتے تھے، اور مورخین ہمیشہ اس شہادت پر جو اس کے خلاف ہوتی تھی آنکھ لگائے رہتے تھے، لیکن سر ولیم کا یہ اعتراض نہ صرف یہ کہ بادہوائی ہے، بلکہ اس سے خود ان کے مسلمہ عقائد اور اصولوں کی بھی مخالفت لازم آتی ہے، بقول سرسید:

> صاحب موصوف کا یہی قول انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبعین پر بھی صادق آتا ہے، خصوصاً اس زمانے پر جبکہ حضرت موسیٰ نے نہایت بے رحم لڑائیوں کے بعد تمام کفار کو نیست و نابود کر دیا تھا اور جب کہ قسطنطین اعظم کے زور سے تمام لوگوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا، اگر ہم اس امر کو اس کتاب کے پڑھنے والوں کی منصفانہ رائے پر چھوڑتے ہیں، اور یہ سوال کرتے ہیں کہ آیا یہ ممکن ہے کہ نیکی، ایمانداری اور صداقت کے کل آثار یعنی قانون قدرت کے وہ بیش بہا جوہر جو انسان کے قوائے اخلاقی کا مادہ ہیں لاکھوں ذی فہم اشخاص کے سینوں سے یکلخت محو ہو گئے ہوں، اور وہ سب یک دل، یک زبان ہو کر بدترین افعال کی طرف مائل ہوئے ہوں، یعنی دروغ گوئی اور واقعات کی غلط بیانی کی طرف جو ان سب کے روبرو واقع ہوئے ہوں اور جن کو ان سب نے بچشم خود مشاہدہ کیا ہو، یہی امر یعنی ان واقعات کے گواہان معائنہ کی تعداد کا ہزارہا اور لاکھوں کو پہنچنا ان واقعات میں غلط بیانی کے عدم امکان کا ثبوت ہے۔ (خطبات احمدیہ ص ۳۰۹)

ہوس مادی کا الزام

سر ولیم اپنے تعصب اور جوش میں عجیب و غریب باتیں تراشتے چلے گئے ہیں، وہ یہ لکھتے ہیں کہ محمدؐ صاحب کی صحبت میں مادی کی ہوس نے بار پایا" کیونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ شرافت و عزت وابستہ تھی، اور ان کی دوستی حصول مال و عزت کا سبب تھی، اور اسی ہوس نے محمدؐ صاحب کے کسی فرضی الہام یا معجزے سے تعلق پیدا کرنے اور وحی میں مذکور ہونے کی سب سے بڑی ممکن تحصیل عزت کا امکان پیدا کر دیا تھا جو غلط مصنوعی اور فطرت واقعات کے ایجاد یا سراہنے کا باعث ہوئی، اور روایات میں غلط بیانی کا سبب بنی"

اس موقع پر سرسید کا جواب پڑھنے کے لائق ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"جب کوئی مصنف ایسے میلان رائے اور تعصب کی وجہ سے بالکل گرفتار بن جائے تو اس میں کچھ چارہ نہیں، یہ کس طرح خیال میں آسکتا ہے کہ کسی مذہب کے ابتدائی زمانہ کے معتقدین جو اپنے مذہب پر سچا اعتقاد رکھتے ہوں اور جن کے دلوں کے مخفی سے مخفی کونوں میں بھی یہ اعتقاد ہو کہ پیغمبر خدا کی سنت کی پیروی ہماری نجات کا یقینی اور محفوظ راستہ ہے، اور ان کے احکام سے سرتابی کرنا ابدی گمراہی کا موجب ہے، یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایسے پاک اور پرہیزگار آدمی سب کے سب اپنے نبی کے زمانے کو بالائے طاق رکھ کر اور اپنی مقدس کتاب کے احکام اور نصائح سے آنکھ بند کر کے دروغ گوئی، فریب دہی اور ریاکاری میں یکلخت مبتلا ہو گئے ہوں، خلاصہ یہ کہ ہر طرح کی بداعمالیاں اور گناہ ان سے سرزد ہوئے ہوں، بطور مثال کسی مذہب کو لو، ہندو مذہب کو، بدھ مذہب کو، دیگر مشرک مذاہب کو، یہودی مذہب کو، عیسوی مذہب کو اور اس کے بہت سے فرقوں کیتھولک، پروٹسٹنٹ، یونی ٹیرین، ٹرینیٹیرین، ویزلینز، بیپٹسٹ، جمپرز، مورمنز وغیرہ کو تو تم ان میں سے ہر مذہب کے ابتدائی زمانہ کے معتقدین میں نیکی، صداقت، ایمانداری، راست بازی، سرگرمی، راسخ الاعتقادی اور جاں نثاری کو پاؤ گے، اور اپنے نبی کے احکام اور اپنے مذہب کے قوانین سے انحراف کرنے کے خیال ہی سے ان کو خائف اور ہراساں پاؤ گے، ہم کو اپنے اس بیان کی تائید اور تصدیق کے لیے ہزاروں مثالوں میں سے صرف ایک ہی مثال کافی ہوگی، اور وہ یہ ہے کہ جب زید بن ثابتؓ سے حضرت ابوبکرؓ نے قرآن کے منتشر اجزاء کو ایک جگہ جمع کرنے کے لیے فرمایا تو کچھ عرصہ تک زید بن ثابت خوف کے مارے ہی عالم سکوت میں رہے، اور پھر جب ہوش و حواس درست ہوئے تو حضرت ابوبکر سے خوف اور غصہ اور بے صبری کے جوش میں سوال کیا کہ ایسے کام کو جو خود پیغمبر خدا کی موجودگی میں نہیں کیا گیا، آپ کیونکر جسارت کرتے ہیں؟ اس طرح کی ہزاروں مثالوں کی موجودگی میں یہ بات کس طرح ذہن میں آسکتی ہے کہ لوگوں نے جو پیغمبر خدا سے

[illegible] اس قدر تعظیم کرتے تھے [illegible]

زندگی [illegible] سر ولیم کا بیان کہ (م) برائیوں کے اختیار کرنے سے اپنے آپ کو ذلیل و خوار کر دیا ہو، اور ایسے

بیہودگی و ظلم ان سے سرزد ہوتے ہوں۔ (خطبات ، ص ۱۸۱)

موضوع روایات کو خارج کیے جانے کی وجہ

راویوں کے عدم اعتبار یا بہت سی روایتوں کے بالکل بے اصل ہونے کی وجہ سے محدثین نے اپنی کتابوں میں بہت سی روایتوں کو درج نہیں کیا، یا ان کو موضوع اور جعلی قرار دے کر نظر انداز کر دیا ہے، سر ولیم میور نے ان کے بارے میں بھی اپنے قیاسی گھوڑے دوڑائے ہیں، اور تعصب کی وجہ سے ان روایتوں کے خارج کیے جانے کی عجیب توجیہ کی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "وہ روایتیں جو عمدہ شہادت پر مبنی اور مسلم تھیں، اس لیے کہ اوائل اسلام میں مشہور تھیں، بے اعتبار یا بالکل خارج ہو گئیں، کیونکہ ان سے محمد صاحب کی تحقیر یا کسی فاسد عقیدہ کی تائید معلوم ہوئی۔" پھر وہ کہتے ہیں کہ اس معاملہ کو اس قدر کامل طور سے ثابت کرنا جیسا کہ مقامات گذشتہ کو ثابت کیا گیا غیر ممکن ہے، کیونکہ اب ہم کو ان روایتوں کا جو اوائل میں ترک کر دی گئیں، کچھ پتہ نہیں معلوم ہوتا۔

سرسید نے میور کے "ایک طول طویل بیان کا خلاصہ" درج کرنے کے بعد تفصیل کے ساتھ اس کا جائزہ لیا ہے، ان کے خیال میں سر ولیم میور کے مذکورۂ بالا بیان سے "صریح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ کوئی محققانہ تحریر نہیں ہے بلکہ ایک مخالف مذہب کی تحریر ہے، اور ایسے طرز میں لکھی گئی ہے جو ایک متعصب مخالف کے مناسب اور موزوں ہے، جو اپنے بیانات، اپنی زبان اور جائز تحقیق کی رعایت میں محتاط نہیں ہے، اور جو اپنے مذہب کے سوا اور مذاہب کی باتوں پر اور بالخصوص اس مذہب کی باتوں پر جس سے اس کے مذہب کو کسی طرح پر مضرت پہونچی ہو، نہایت حقارت اور بے اصل شبہہ کی نظر سے دیکھتا ہے، اگر ہم سے ایسے بے تحقیق اور غیر معتدل بیانات کی نظیر طلب کی جائے تو ہم ان سخت اور کفر آمیز کلمات کا حوالہ دینگے جو یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے مذہب کے بارے میں استعمال کیا کرتے تھے، سر ولیم میور کہتے ہیں کہ "روایتیں

جو محمد ؐ کی اہانت پر مبنی تھیں کیونکہ وہ اوائل اسلام میں مشہور تھیں لہٰذا بے اعتبار بالکل خارج ہو گئیں، کیونکہ ان سے محمد صاحب کی تحقیر یا کسی فاسد عقیدہ کی تائید معلوم ہوتی۔" مگر اس کے جواب میں سرسید فرماتے ہیں:

"یہ کیسا غلط بیان ہے اور کیسی عجیب بات ہے کہ جس امر کو وہ خود اس قدر اعتماد اور گھمنڈ کے ساتھ صاف اور بے لاگ زبان میں بیان کرتے ہیں، گویا کہ وہ درحقیقت ایک مسلم تاریخی واقعہ ہے، اور شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رکھتا۔ اس کی نسبت کوئی سند نہیں پیش کرتے، بلکہ صرف اس قدر کہہ کر ہی اس کو طے کرنا چاہتے ہیں کہ "اس کو کامل طور سے ثابت کرنا ... غیر ممکن ہے، کیونکہ اب ہم کو ان روایتوں کو جو اوائل میں ترک کر دی گئی تھیں کچھ پتہ معلوم نہیں ہوتا"۔ کیا اس طرح پر دلیل لانا تعصب کا اثر نہیں ہے، جب کہ سر ولیم میور کا یہ بیان صحیح بھی نہیں ہے، کیونکہ وہ تمام اتہامات اور تحقیر کے الفاظ جو مشرکین اور یہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت استعمال کیا کرتے تھے مسلمانوں کی کتابوں میں بلکہ خود قرآن مجید میں بھی بیان ہوئے ہیں۔ اور کوئی بات نہ خارج کی گئی ہے اور نہ مخفی کی گئی، رہی یہ بات کہ مسلمانوں کی روایات میں اختلافات واقع ہوئے تھے، ہم تسلیم کرتے ہیں، مگر ہم ان بے وجہ اسباب منسوب کرنے سے جو سر ولیم میور صاحب نے بیان کیے ہیں، اعتماد کے ساتھ انکار کرتے ہیں۔" (خطبات احمدیہ ص ۳۸۴)

ڈاکٹر اسپرنگر کے ساتھ سر ولیم کی ہم نوائی

ان مستشرقین نے ایک اور بے اصل قصہ کو خوب ہوا دی ہے، جو کسی معتبر سند کے بغیر ایک کتاب مواہب لدنیہ میں درج ہو گیا، مگر مستشرقین کو روایت کے معیار یا اس کی صحت کے امکان سے کچھ بحث نہیں ہوتی، وہ اپنے تعصب کی وجہ سے ایسی روایت کو کسی تحقیق اور چھان بین کے بغیر ہی اچک لیتے ہیں، اور سادہ لوح عوام کو فریب دینے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں، چنانچہ ڈاکٹر اسپرنگر سورۃ والنجم کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ "محمد ؐ صاحب نے قریش کے بتوں اور معبودوں کی نہایت تعریف کی، اور ان کو تسلیم کر لیا، اور جب وہ سجدہ میں گئے قریش نے بھی سجدہ کرنے میں ان کا اتباع کیا۔" اس تمام قصہ کی صحت کو وہ مصنف مواہب لدنیہ سے منسوب کرتے ہیں، سر ولیم میور نے اس قصہ کو نقل کرنے

کہ میور لکھتا ہے کہ بظاہر ایک عجیب حیرت انگیز قصہ موجود ہے، جس سے محمد صاحب کا کفار کے ساتھ ایک بار ضمنی موافقت اور مصالحت کرنا ثابت ہوتا ہے۔" وہ اس کے لیے واقدی اور طبری کا حوالہ بھی درج کرتے ہیں۔

مواہب لدنیہ کے مؤلف نے اس مضمون سے متعلق تمام مختلف روایتوں اور علماء کے خیالات کو یکجا جمع کر دیا ہے، جس کو سر سید نے پوری تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب میں درج کیا ہے، اس روایت کا خاص اور اہم جزو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بتوں کی تعریف میں "تلک الغرانیق العلی وان شفاعتھن لترتجی" کا فقرہ منسوب کیا گیا ہے، اور یہ روایت خود صاحب مواہب لدنیہ کے الفاظ میں تین سندوں سے مروی ہے جن کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہونچا، پھر مواہب لدنیہ کے مؤلف یہ بھی لکھتے ہیں کہ جب مشرکوں کو یہ بات معلوم ہوئی کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ لفظ نہیں فرمائے تھے تو انھوں نے پہلے سے بھی زیادہ دشمنی اختیار کی" (خطبات احمدیہ: ص ۲۹۵ - ۹۶) مواہب لدنیہ کے مؤلف کو بھی اس روایت کے کئی سلسلوں کو دیکھ کر غلط فہمی ہوئی ہے، چنانچہ ان کا خیال یہ ہے کہ "جو لوگ ایسی روایتوں کو جن کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ پہونچا ہو صحیح تصور نہیں کرتے، وہ بھی اس کے متعدد ہونے کے سبب اس کو تسلیم کر لیں گے، مگر سر سید نے مواہب لدنیہ کی مذکورہ بالا تصریحات کی روشنی میں اس کی تردید کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

"یہ بیان اس کا محض غلط ہے جو روایتیں کہ اس باب میں ہیں، اور جو خود اس نے بیان کی ہیں باہم مختلف ہیں، اور ایک دوسرے مختلف روایتوں کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے متعدد سلسلے ہیں، اور مرسل روایتیں یعنی جن کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ پہونچا ہو، گو اس کو متعدد لوگوں نے بیان کیا ہو، سند اور اعتبار کے قابل نہیں جب تک کہ اس کی تائید کے لیے کوئی روایت مستند موجود نہ ہو مزید یہ کہ وہ روایت قرآن مجید کی مخالف نہ ہو، لیکن جب کوئی روایت مذکورۂ بالا روایت کی طرح قرآن مجید کے احکام کے خلاف ہو، اور جب کہ وہ جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ان تمام حالات کے

خلاف ہو جو شرک کے مٹانے اور خدائے واحد کی عبادت کرنے سے متعلق ہیں، اور جب کہ وہ اسلام کے اصلی اصولوں سے اتفاق نہ رکھتا ہو پھر ایسی مشتبہ اور مختلف ہو جس کا مدار صرف اس بات پر ہو کہ وہ الفاظ کس نے کہے تھے، اور کہنے والا بھی واضح نہ ہوا ہو تو ایسی روایت از روئے عقل و انصاف کس طرح ان قواعد میں داخل ہو سکتی ہے جن میں اس روایت کو داخل کرنے کی مصنف مواہب لدنیہ نے کوشش کی ہے، وہ لوگ بھی جو اس روایت کے حامی ہیں اس بات کا صاف صاف اقرار کرتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ اس کی تائید میں کوئی کافی ثبوت اور کوئی قابل اعتماد سند موجود نہیں ہے۔"

(خطبات احمدیہ: ص ۳۹۵)

اصل واقعہ جیسا کہ سرسید نے وضاحت کی ہے یہ ہے کہ "جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ایک ایسا زمانہ گذرا ہے جب آپ مکہ میں تشریف رکھتے تھے، کفار مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہایت جفا اور بے رحمی سے پیش آتے تھے اور اپنے وحشیانہ بغض سے ہر نئے ڈھنگ سے آنحضرتؐ کو ایذا اور تکلیف دیتے تھے، وہ جناب پیغمبر خدا کے وعظ میں خلل انداز ہونے کے کسی موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے، نماز پڑھتے وقت تنگ کرتے، اور جب آپ خدائے واحد کی حمد و ثنا بیان فرماتے تھے تو مشرکین بھی جھوٹے معبودوں کی تعریف کیا کرتے تھے، پس مذکورہ بالا روایت سے جو منصفانہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ جب آنحضرتؐ سورۂ نجم پڑھ رہے تھے تو کفار مکہ حسب عادت مخل ہوئے اور اپنے بتوں کی تعریف کی اور یہ کہا: "تلک الغرانیق العلیٰ وان شفاعتھن لترتجی۔" اور جب پیغمبر خدا نے سجدہ کیا مشرکین نے بھی اپنے بتوں کو سجدہ کیا، مشرکین میں اس بات پر اختلاف ہوا کہ وہ جملہ کس نے کہا۔ کچھ عجب نہیں کہ مشرکین یہ سمجھے ہوں کہ وہ جملہ پیغمبر خدا ہی نے فرمایا تھا، مگر ان کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ پیغمبر خدا نے وہ جملہ نہیں کہا (جیسا کہ خود صاحب مواہب لدنیہ نے نقل کیا ہے) اور اس لیے مشرکین آنحضرتؐ سے اور زیادہ دشمنی پر آمادہ ہو گئے، اس وقت کے مسلمان ہرگز

یہ یقین نہیں کر سکتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ جملہ فرمایا ہو، اور چونکہ طالات بھی تعین اور واضح نہیں ہوا، اس لیے انھوں نے کہا یا شیطان نے کہوا دی، اس کے بعد جب روایات کے بیان کرنے اور لکھنے کی نوبت آئی تو مسلمان عالموں میں اختلاف ہوا، جو لوگ شیطان کے زیادہ معتقد تھے اور اس بات پر یقین کرتے تھے کہ شیطان پیغمبروں کے کلام میں اس طرح پر اپنا کلام ملا سکتا ہے کہ پیغمبر ہی کی زبان سے نکلتا ہوا معلوم ہو، انھوں نے کہا کہ پیغمبر ہی کی زبان سے وہ لفظ نکلے تھے، کیونکہ شیطان نے وہ لفظ ملا دیے تھے، مگر دونوں فریق اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ پیغمبر خدا نے وہ لفظ کہے تھے، بایں ہمہ اس امر میں کچھ شک نہیں کہ جناب رسول خدا کے اصحاب میں سے کسی نے ان الفاظ کا کسی طرح پر بھی پیغمبر خدا کی زبان مبارک سے نکلنا نہیں خیال کیا، کیونکہ کوئی روایت ایسی نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ ان صحابہ میں سے جو اس وقت ایمان لا چکے تھے کسی نے اس بات کو بیان کیا ہو، بلکہ کسی نے صحابہ میں سے اور نہ کسی نے کبار تابعین میں سے اس کو بیان کیا ہے، یہی بے سر و پا تمثیلی روایتیں ہیں جن کا ذکر طبری، واقدی اور ابن اسحاق نے اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ (خطبات احمدیہ ص ۲۹۰-۲۹۲)

(باقی)

سلسلہ اسلام اور مستشرقین

جلد اوّل

دار المصنفین میں "اسلام اور مستشرقین" کے موضوع پر جو نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے، اس کی پہلی جلد مرتب ہو کر چھپ گئی ہے، یہ فروری ۱۹۸۲ء میں اس موضوع پر جو سیمینار ہوا تھا اس کی بہت ہی مفصل اور دلچسپ روداد ہے، قیمت ۱۵ روپیے۔

"منیجر"

اسلامی شریعت کا نفاذ
اور
تجدید و اجتہاد کے معنی

از

ڈاکٹر صلاح الدین ندوی، الازہر یونیورسٹی مصر

وقت حاضر میں اسلامی شریعت کی تنفیذ کی ضرورت اور اس کی اہمیت پر نظر ڈالتے ہوئے ہم یہ عرض کریں گے کہ بےشک اسلامی شریعت کا نفاذ عصر حاضر کے فرزندان ملت کی ایک امید اور امت توحید کا ایک خواب ہے، مگر اسلامک کانفرنس آرگنائزیشن سے متعلق چند اسلامی ممالک ایسے ہیں جہاں کے تجدد پسندوں کا یہ دعویٰ ہے کہ "اسلامی شریعت کا نفاذ ہر زمان و مکان کے لیے غیر نافع اور ناممکن ہے"[1] ان کا یہ مطالبہ ہے کہ اسلامی قوانین اور شرعی احکام کو عصر حاضر کے وضعی قوانین کے دوش بدوش چلنا چاہیے، اسلامی شریعت میں اصلاح کرنی چاہیے، اور عصر حاضر کی تہذیب و تمدن سے استفادہ کرنا چاہیے، کیونکہ امت اسلامیہ تہذیب نو کا ساتھ نہ دینے کی وجہ سے پسماندہ رہ گئی ہے، اور تہذیب و تمدن کا زمانہ اسے پس انداز کر کے بہت آگے نکل گیا۔

یہ درست ہے کہ اصلاح و تجدید کی ضرورت اسی وقت سامنے آتی ہے جب دینی اور عقلی مسائل باہمدگر نبرد آزما ہوں، یا دین اور انسانی تہذیب و تمدن میں باہم تضاد و تعارض ہو یا دین ضروریات زندگی کی تکمیل سے قاصر ہو، مگر افسوس کہ تجدد کے علمبرداروں کو قطعاً اس کا علم نہیں کہ آج کی تہذیب نو کی بنیاد جس سائنسی فضا

---

[1] اسی بات پر ابھی حال ہی میں سوڈان میں تجدد پسندوں کے ایک لیڈر رہنما کو سزائے موت دی گئی ہے۔

سائنٹفک نظام پر ہے، وہ دراصل اسلامی نصاب ہے، اور یورپ کی تہذیب و تمدن کی نشو و نما سے بہت پہلے مسلمان اس نصاب پر گامزن اور کاربند رہے ہیں۔

مورخین لکھتے ہیں کہ اسلام کی ابتدائی چھ صدیاں علوم و فنون اور تہذیب و تمدن میں تاریخ انسانی کے روشن ابواب ہیں، لیکن وہی زمانہ فرنگ میں مغربی تہذیب و تمدن کے جمود و زوال کا دور ہے، اور اس دور کو خود اہل فرنگ "ازمنہ مظلمہ" یعنی تاریکی کا دور کہتے ہیں، عیسائیت کے غلبہ کے بعد یونانی اور رومی تہذیب اور اس کی شان و شوکت نحوست و ادبار میں بدل گئی، کلیسا کے استبداد نے تحقیق اور آزادیٔ فکر کا دروازہ بند کر دیا، پھر علوم و فنون کے خاتمہ کے بعد یورپ کے تمام ملوک اپنی باقی ماندہ قوت کو جمع کر کے فلسطین میں ایک مسلمان مجاہد سلطان کے مقابلہ کی تاب نہ لاسکے، مغربی فرنگ میں اندلس پر مسلمان قابض ہو گئے، جہاں انھوں نے ایک عظیم الشان تہذیب و تمدن کو جنم دیا جو تمام فرنگ کیلیے قابل رشک تھا، اور علوم و فنون کے فرنگی شائقین یہیں سے کسب فیض کرتے تھے، اور سترہویں صدی تک یورپ مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنے آپ کو بے بس پاتا تھا پھر ترکوں کی فوجی طاقت ابھی زوال پذیر نہیں ہوئی تھی کہ مغرب میں بیداری شروع ہوئی، مغرب کی اسی بیداری کو نشاۃ ثانیہ کہتے ہیں، عصر حاضر میں مغرب کے بعض مورخین نے فراخدلی اور آزادانہ تحقیق سے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ فرنگ کی نشاۃ ثانیہ میں اسلامی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا ایک موثر حصہ ہے، سارٹون نے جو سائنس کی بسوط تاریخ لکھی ہے اس میں ریاضیات اور تجربی سائنس میں مسلمانوں کے کارناموں کی اچھی طرح داد دی ہے[1]

اور یہی نہیں بلکہ اہل مغرب نے بذات خود اس بات کو بھی تسلیم کیا ہے کہ اسلام نے ہی عقل اور تجربہ کا نصاب وضع کیا ہے، انھوں نے یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ یورپ کے نصاب عقل و تجربہ کے بانیٔ اول روجر بیکن[2] نے اپنا وہ نصاب عربوں سے اخذ کیا ہے، یورپ کے ایک مشہور سائنسدان (بریفولٹ) نے اپنی کتاب

---

[1] مزید تفصیل کیلیے ملاحظہ ہو "فکر اقبال" از خلیفہ ڈاکٹر عبدالحکیم ص ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸ [2] روجر باکن (۱۲۱۴ء-۱۲۹۲ء)

(بقیہ ص ۳۴۳ پر)

"انسانیت کی بنیاد" میں یہ تحریر کیا ہے کہ روجر بیکن اور اس کے بعد آنے والے سائنسدان (فرانسیس بیکن[1]) نے اس علمی میدان میں جو کچھ کیا ہے وہ نامور عرب شخصیتوں کے علمی کارناموں اور ان کے علمی نتائج کے فیضان سے ہی کیا ہے، اس لیے وہ دونوں اس بات کے مستحق نہیں کہ نصاب عمل و تجربہ کا سہرا ان کے سر پہ باندھ جائے، اسی طرح یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ سائنس ہی کی بدولت یورپ کی نشأۃ ثانیہ ہوئی، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تہذیب و تمدن کے روشن نقوش و اثرات سے بلاد یورپ میں زندگی کی لہریں دوڑ گئیں۔

یورپی تہذیب و تمدن ہی جن کا موضوع سخن رہا ہے ان میں بیشتر مورخین کا یہی خیال ہے کہ روجر بیکن کی کتاب "حرارت اور روشنی" بعینہ الحسن بن الہیثم[2] کی اس کتاب کا ہی ایک نسخہ یا کاپی ہے جو "بصریات" کے عنوان پر مشتمل ہے، اور سبھی اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ جس طرح طبی علوم میں رازی[3]

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) ... قرون وسطیٰ کا مشہور سائنسدان سمجھا جاتا ہے، اس نے پیرس اور آکسفورڈ میں فلسفہ کی تعلیم حاصل کی تھی اور علوم و فلسفہ کے کچھ اصول وضع کیے تھے۔ [1] فرانسیس بیکن (۱۵۶۱ - ۱۶۲۶) انگریز فلسفی تھا جو لندن میں پیدا ہوا تھا، اور عملی طور پر فلسفہ اور سائنس کو از سر نو زندہ کرنے کے لیے کوشاں رہا تھا [2] ابو علی الحسن بن الہیثم (تقریباً ۹۶۵ - ۱۰۳۹) فلکیات و ریاضیات و طبیعیات کے ایک مشہور عرب عالم تھے، بصرہ میں پیدا ہوئے تھے، فاطمی خلیفہ الحاکم باءمر اللہ (منصور بن العزیز) کے زمانہ میں قاہرہ آئے تھے انھوں نے اپنی کتاب "علم المناظر" کا ترجمہ "بصریات" کے عنوان سے لاطینی زبان میں کیا تھا، وہ کتاب ۱۲۱۳ء تک یورپ کے علمی حلقوں میں بیحد مقبولیت اور اہمیت رکھتی تھی۔ [3] ابوبکر محمد بن زکریا الرازی (۸۶۴ - ۹۳۲) ایک مشہور عرب طبیب تھے، رَیّ میں پیدا ہوئے تھے، حکیم جالینوس کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے، انھوں نے رَیّ اور بغداد میں "بیمارستان" کے نام سے شفاخانہ قائم کیا تھا، ان کی بہت سی کتابیں ہیں جن میں برء الساعۃ، الکافی، الجدری والحصبۃ قابل ذکر ہیں، اور خاص طور سے الحاوی کو طب کی قدیم کتابوں میں سب سے عمدہ کتاب سمجھی جاتی ہے۔

اور ابن سینا کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح کیمیا سے متعلقہ علوم میں جابر بن حیان اور ریاضیات کے میدان میں ابو یعقوب کندی کے علمی کارناموں کو ہرگز فراموش نہیں کیا جا سکتا، اہل یورپ صراحت کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں کہ بلاد یورپ پر ان نامور عرب شخصیات کا احسان عظیم ہے جن سے اہل یورپ اب تک علمی اور عملی تجربات کے میدان میں فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

مگر اس کے باوجود احساس کمتری میں مبتلا مغربی تہذیب تمدن کے متوالے اپنی ہستی و وجود کی حقیقتوں سے ناآشنا ہو کر اسلامی شریعت کی تجدید اور مغربی تہذیب و تمدن سے استفادہ کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں اور اس طرح کی آواز اٹھا رہے ہیں کہ اسلامی شریعت کے احکام افیون اور نشہ آور دواؤں سے کم نہیں، انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ علمائے دین کو بھی برا بھلا کہا اور ان کی توہین و مذمت میں کچھ اس طرح کے الفاظ استعمال کیے کہ یہ علمائے دین ایسے حکماء و اطباء ہیں جو قوم کو نشہ، بیہوشی اور خواب آور دوائیں دیتے ہیں جبکہ حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے، اس طرح کی آواز اٹھانے والے بذات خود تہذیب نو کی مسکن دواؤں سے متاثر ہو کر بے خبری اور خود فراموشی کا شکار ہو گئے ہیں، بھلا وہ قوم کو اپنی اس طرح کی آواز سے کب بیدار کر سکتے ہیں ؏

خفتہ را خفتہ کے کند بیدار

جو لوگ بھی اس طرح کی آواز اٹھا رہے ہیں، وہ بالقصد اسلامی اصول و مبادی پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کر رہے ہیں، وہ شرعی احکام و فقہ اسلامی کے موضوعات کو غلط بحث کر کے پیش کر رہے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تجدد کے پس پردہ وہ اپنی خواہشات کے اشاروں پر اسلامی قوانین کی پیروی سے رستگاری حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس اندیشہ کا اظہار علامہ اقبال نے بھی اپنے کلام میں ایک مقام پر کیا ہے،

ملاحظہ ہو : ؎

اس قوم کو تجدید کا پیغام مبارک ہے جس کے تصور میں فقط بزم شبانہ
لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید مشرق میں ہے تقلید فرنگی کا بہانہ

---

[۱] ضرب کلیم ص ۱۷، کلیات اقبال ص ۴۹۰، کتب خانہ حمیدیہ حویلی اعظم خاں، چتلی قبر، دہلی، طبع ۱۹۸۱ء۔

جو لوگ تجدید و اجتہاد کا نعرہ لگا رہے ہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ تجدید و اجتہاد کے نام پر ہی مغربی تہذیب و تمدن سے متعلقہ وضعی قوانین و افکار (جنھیں وہ لوگ ترقی یافتہ یا ترقی کے لیے مفید سمجھتے ہیں) شرعی احکام میں داخل کرکے تحریف و تبدیلی کی جاسکتی ہے، ان کا خیال ہے کہ عصر حاضر میں قوموں کی گوناگوں ضروریات کی تکمیل کے لیے انسانی عقل و دماغ نے جو افکار و نظریات وضع کیے ہیں، انھیں شرعی احکام میں داخل کرکے اسلامی اصول و مبادی کو ترقی پذیر بنایا جاسکتا ہے، انھیں اب صرف مغربی افکار و نظریات پر ہی انسانی زندگی اور اس کی ضروریات کی تکمیل کا انحصار نظر آتا ہے جو قطعاً درست نہیں۔

بیشک قرآن کریم کا نزول عقل انسانی کی ہدایت کے لیے ہوا ہے خصوصاً ان امور میں جن میں عقل کو اگر مطلق العنان چھوڑ دیا جائے تو بلاشبہہ گمراہ ہوجائے گی، ان ہی امور میں عقیدہ، اخلاقی اصول و مبادی، شرعی احکام اور اجتماعی نظام سے متعلقہ موضوعات بھی شامل ہیں، دین نے مادی امور میں عقل کو آزادی دی ہے بشرطیکہ غور و فکر کا مقصد انسانی فلاح و بہبود ہی ہو، اور اسی وجہ سے اسلاف نے یہ سبق دیا ہے کہ اللہ جل شانہ کی قدرت و جبروت اور کائنات کے ذرے ذرے میں اس کے جلال و جمال اور دیگر اوصاف کمالیہ اور اس کی عظمت و شان کے مظاہر کا انکشاف کرنے کا ہی نام مادی علوم ہے، اس طرح مادی علوم کے ذریعہ کائنات میں غور و فکر کرنا بھی ایک عبادت ہے، جو لوگ قرآنی نصوص و آیات اور عقل میں بظاہر تضاد محسوس کرتے ہیں انھیں چاہیے کہ وہ اپنی عقل کو خواہشات سے دور رکھ کر غور و فکر کریں تاکہ انھیں یہ معلوم ہوجائے کہ صرف عقل ہی کو دینی امور میں حکم نہیں بنایا جاسکتا بلکہ دینی امور کے سہارے ہی انسانی عقل و دماغ کو راہ راست پر لایا جاسکتا ہے، اور عقل انسانی کو دین اسلام سے جو ہدایت نصیب ہو رہی ہے یہ بشریت کو ہمیشہ ہر زمانے میں اور ہر جگہ میسر رہے گی، بشرطیکہ نسل انسانی دینی امور کو طاق پر رکھ کر اپنی عقل کو خواہشات نفسانی کی تکمیل اور ذاتی اغراض و مقاصد کی دستیابی کے لیے استعمال نہ کرے۔

اپنی عقل پر نازاں و از خود فریفتہ حضرات نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ انھوں نے سلف صالحین کی

بھی زبان درازی کی، اور انھیں برا بھلا کہا، جنھوں نے ایمانداری اور دیانتداری کے ساتھ جو کچھ بنیاد پڑھا، اور اپنی کاوشوں سے جو کچھ استنباط کیا اسے دوسروں تک پہونچا دیا، اس طرح اسلاف نے اسلامی شریعت کی بنیادوں کی حفاظت کی اور انھیں مستحکم و مضبوط بنا کر تحریف و آمیزش سے محفوظ رکھا شریعت کی بنیاد قرآن مجید ہے جو جذبۂ ایمانی سے معمور قلوب میں صدیوں سے محفوظ ہے، شریعت کی بنیاد احادیث نبویہ ہیں، جو انتہائی محتاط کاوشوں سے صحیح اسناد پر اعتماد کر کے کتابوں کی شکل میں محفوظ کر لی گئی ہیں، جو صرف امت محمدیہ کی خصوصیت ہیں، ہاں اگر ان اسناد کا وجود نہ ہوتا تو پھر منکرین حدیث یا دہریت پسند کچھ کہہ سکتے تھے، اسلامی شریعت اپنی انھی بنیادوں پر ایک کامل اور مکمل نظام حیات ہے جو ہر فرد بشر، ہر جماعت اور ہر ملک کے لیے مفید ہے، اور ہر زمانے میں انسانیت کے لیے سودمند رہیگا

کتنی عجیب بات ہے کہ تجدد کے علمبردار حضرات اپنے اجتہاد کے ذریعہ اسلامی شریعت میں ترمیم و تبدیلی کرنا چاہتے ہیں، ان کا یہ دعویٰ ہے کہ قرآن کریم ہم سب کی کتاب ہے، قرآنی آیات کو سمجھنے میں ہم بھی اپنی عقل کی استعمال کر سکتے ہیں، ہماری عقل بھی قرآنی آیات کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہے، فہم و ادراک کی استطاعت کے مطابق ہم بھی احکام کا استنباط یا استخراج کر سکتے ہیں، اسلاف ہمارے لیے حجت اور دلیل نہیں، ہم اسلاف کے دائرۂ معلومات سے مقید و مربوط نہیں رہ سکتے، ہم سے پہلے بھی بہت سے لوگوں نے اصلاح و تجدید کی آواز اٹھائی تھی، مصر میں شیخ محمد عبدہٗ، افغانستان میں شیخ جمال الدین افغانی اور ہندوستان میں علامہ اقبال وغیرہ نے بھی مختلف مقامات اور ادوار میں اصلاح و تجدید کی دعوت دی تھی۔

اس میں دو رائے نہیں کہ عصر حاضر کی مادی تہذیب و تمدن کی بنیاد جن افکار و نظریات یا آئیڈیالوجی پر ہے ان میں جدید ترین، ترقی پذیر سائنسی ایجادات کے زیر اثر تغیرات رونما ہو سکتے ہیں، اور انھی تغیرات کی روشنی میں انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں جب صنعتی ترقی اور انقلاب کا دور دورہ ہوا تو اسلامی مصلحین و مفکرین بھی الجھن میں پڑ گئے، کیونکہ یورپی مفکرین نے جو

ہرے باغ[1] دکھلائے تھے، مسلم نوجوانوں کا طبقہ بھی تیزی کے ساتھ ان کی طرف بھاگنے لگا تھا، اور یورپ کی یونیورسٹیوں میں وہ گرٹ ڈیمس، والٹیر، روسو، ہیوم اور کانٹ کی تعلیمات سے متاثر ہو کر کفر و الحاد کا سبق سیکھنے لگا تھا، بہرحال اسلامی مصلحین و مفکرین نے اپنی میراث سمجھ کر دینی اصول و عقائد کی حفاظت کی، مگر چند مصلحین و مفکرین ایسے بھی تھے جن کے ذہن میں یہ خلش باقی رہی کہ دینی عقائد اور زندگی کے جدید ترین طور طریقے اور نظریات میں کس طرح ہم آہنگی پیدا کی جائے، کچھ مفکرین نے یہ کہا کہ اس وقت دینی مسائل اور احکام کی از سرِ نو تشکیل قرآن و حدیث کی روشنی میں ضروری ہے، تاکہ دینی اصول و عقائد کو فکر انسانی کی ترقی پذیر ایجادات اور زمانے کی علمی اور فکری تیز رفتاری کے دوش بدوش اور رواں دواں رکھا جا سکے، چنانچہ دونوں کو ہم آہنگ کرنے کے لیے مصلحین کی جو کوششیں سامنے آئیں ان کا مقصد یہی تھا کہ اسلامی شریعت کی حفاظت کے لیے دینی امور کی عقلی توجیہات کی جائیں اور بظاہر اسلام اور انسانی تہذیب و تمدن میں جو تعارض یا تضاد نظر آتا ہے اس میں تطبیق کی صورتیں پیدا کی جائیں، تجدید کے علمبردار حضرات یہ بھول گئے ہیں کہ شیخ محمد عبدہٗ جمال الدین افغانی اور علامہ اقبال جیسے دیگر مصلحین و مفکرین نے جو اصلاح و تجدید کی دعوت دی تھی اس کا اولین مقصد یہی تھا کہ اسلامی شریعت کی حفاظت کے لیے اسلامی معاشرہ میں عزم و ولولہ پیدا کیا جائے، تاکہ اسی طور طریقے پر شریعت کی بنیادوں کو قوی اور مستحکم کیا جا سکے جس پر اسلاف نے اس کو قوی و مستحکم رکھا تھا۔

تجدید کے علمبرداروں کا یہ کہنا ہے کہ تجدید و اجتہاد کا دروازہ ابھی بند نہیں ہوا ہے، ابھی اجتہاد کے

---

[1] "ہرے باغ" کا اشارہ اس طرف ہے کہ یورپی مفکرین نے اٹھارہویں صدی میں جسے انلائٹنمنٹ یا دورِ تنویر کہتے ہیں، مذہب، فلسفہ، سیاست اور معیشت کے اہم مسائل آزادانہ طور پر حل کرنے کی کوششیں کی تھیں، اور ان کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسان کے بنیادی حقوق کسی قدر وضاحت سے متعین ہو گئے۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "فکرِ اقبال" از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم۔

ذریعہ شرعی احکام میں تجدید و ترمیم کی جاسکتی ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا ہے، یا اب کوئی بھی دینی امور میں اجتہاد نہیں کر سکتا، بشرطیکہ وہ ان شرائط پر مکمل اترے، جن پر علمائے دین کا اتفاق ہے، مثال کے طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو جب یمن میں والی اور قاضی بنا کر بھیجنے کیلئے منتخب کیا تھا تو آپؐ نے ان سے یہ دریافت کیا تھا کہ

كيف تقضى اذا عرض لك قضاء ؟ فاجابه اقضى بكتاب الله ، فسأله الرسول قائلا : فان لم تجد ؟ قال فبسنة رسول الله ، قال الرسول فان لم تجد ؟ قال اجتهد برأيي و لا آلو ، فضرب الرسول صلى الله عليه وسلم صدره وقال الحمد لله الذى وفق رسول رسول الله الى ما يرضى الله ورسوله ۔ ...

اگر تمہارے سامنے کوئی مسئلہ رکھا جائے تو تم کیسے فیصلہ کروگے؟ انہوں نے عرض کیا کہ میں کتاب اللہ سے فیصلہ کروں گا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دریافت کیا کہ اگر تم کو (اس میں حکم) نہ ملے؟ انہوں نے عرض کیا کہ پھر میں رسول اللہ کی سنت سے فیصلہ کروں گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم کو (اس میں بھی کوئی حکم) نہ ملے تو؟ انہوں نے عرض کیا کہ میں اجتہاد کروں گا اور (مسئلہ کو سمجھنے میں) کوتاہی نہیں کروں گا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سینہ پر تھپکی دیتے ہوئے یہ فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے جس نے رسول اللہ کے ایلچی کو خدا اور اس کے رسول کی خوشنودی حاصل کرنے کی توفیق دی۔

(رواہ ابو داؤد والترمذی)

اور مسلم سے روایت ہے کہ:

انہ علیہ الصلوٰۃ والسلام قال لعبد اللہ بن مسعود اقض بالکتاب والسنۃ اذا وجدت فیہما الحکم، فان لم تجد فیہما اجتہد رأیک۔ (رواہ مسلم)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ ابن مسعودؓ سے فرمایا کہ اگر کتاب وسنت میں تمھیں حکم مل جائے تو ان دونوں کے ذریعہ ہی فیصلہ کرو، اور اگر ان دونوں میں کوئی حکم نہ ملے تو اجتہاد کے ذریعہ اپنی رائے قائم کرو۔

اجتہاد کا معنی ومفہوم مذکورہ احادیث کی روشنی میں اجتہاد کا معنی ومفہوم یہ نکلتا ہے کہ ہر اس مسئلہ میں جس میں قرآن اور حدیث میں کوئی حکم یا اشارہ موجود نہ ہو تو مجتہد کو چاہیے کہ وہ کسی حتمی نتیجہ تک پہونچنے کے لیے حتی الامکان کوشش وکاوش کرے، اور کوئی بھی رائے قائم کرنے میں اس بات کو ہمیشہ ملحوظ رکھے کہ خدا اور اس کے رسولؐ کی منشا ومراد کیا ہے'

صحیح اور غلط رائے کا اعتبار اجتہاد کرنے میں مجتہد کی رائے درست بھی ہو سکتی ہے اور غلط بھی، جیسا کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ نے فرمایا ہے کہ کل مجتہد مصیب والحق عند اللہ وحدہٗ، (ہر مجتہد (اپنی دانست میں) درست رائے قائم کرتا ہے، مگر حق بات کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہوتا ہے، یعنی مجتہد سے نادانستہ طور پر غلطی بھی ہو سکتی ہے، اس سلسلہ میں عبد اللہ بن عمرؓ سے بھی روایت ہے کہ:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعمرو بن العاص اقض بین ھذین قال اقضی وانت	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن العاصؓ سے فرمایا کہ ان دونوں میں فیصلہ کرو، انھوں نے کہا کہ آپ کی موجودگی میں

حاضر ؟ قال نعم ! علی ماذا اقضی ؟ قال علی انك اذا اجتهدت فاصبت فلك عشر حسنات وان اخطأت فلك حسنة ۔

میں فیصلہ کروں ؟ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ ہاں، کس بنیاد پر فیصلہ کروں ؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس بنیاد پر کہ اگر اجتہاد کرنے میں تم نے درست رائے قائم کی تو تمھیں دس نیکیاں ملیں گی اور اگر غلطی کی تو ایک نیکی ۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ مجتہد کسی مسئلہ میں درست بھی فیصلہ کر سکتا ہے، اور کسی مسئلہ میں اس کی رائے غلط بھی ہو سکتی ہے، درست فیصلہ کرنے میں اسے دس نیکیاں ملیں گی اور غلطی کرنے میں صرف ایک ہی نیکی ملے گی، لیکن بہر صورت صحیح فیصلہ کرنے کے لیے وہ جو کوشش کرے گا اور اس کے بعد جو بھی رائے قائم کرے گا، اس کا اعتبار کیا جائے گا، مگر اجتہاد کرنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں، بہت سے لوگ علمائے دین کی شکل وصورت اختیار کر لیتے ہیں، انکی جیسا لباس پہنتے ہیں (جسے عام طور سے لوگ علمائے دین کا لباس سمجھتے ہیں) مگر ان کے اندر اتنی صلاحیت یا لیاقت نہیں ہوتی کہ وہ صحیح طریقہ سے قرآن وحدیث کے نصوص کو سمجھ سکیں، پھر بھلا وہ لوگ ان مسائل کو سمجھنے میں جن میں آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ خاموش ہیں کیسے خدا اور اس کے رسول کی خوشنودی حاصل کر سکتے ہیں، یا مراد ونشا کی تہ تک پہونچ سکتے ہیں، تاہم وہ لوگ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے، اور جب ان کو متوجہ اور متنبہ کیا جاتا ہے تو زبان درازی کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم اجتہاد کرتے ہیں، ہمیں اللہ بدلہ دے گا، ان ہی میں سے بہت سے لوگ اپنی نام نہاد مقبولیت سے ایسے مواقع پر اپنے مؤیدین کو دھوکا دے کر ناجائز فائدہ بھی اٹھاتے ہیں، جب کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے بخوبی واقف ہے (واللہ من خلفهم محیط) اس لیے دینی مسائل میں ایسے لوگوں کی رائے اور انھیں حکم بنانے سے پرہیز کرنا چاہیے، اور اس بات پر توجہ دینا چاہیے کہ جو لوگ تجدید و اجتہاد کا نعرہ لگا رہے ہیں کیا ان کے اندر اسلامی شریعت کے اسرار و رموز اور

جملہ اصول و قواعد کو سمجھنے نیز ہر مقام پر انھیں ملحوظ رکھنے کی صلاحیت ہے۔

مجتہد کی صلاحیت اور اس کے اوصاف

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ائمہ حضرات بھی اجتہاد کرتے تھے، ان سے ہم یہ عرض کریں گے کہ بیشک ائمہ حضرات اجتہاد کرتے تھے مگر معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام کے آنے کے بعد ابتدائی صدیوں میں شرعی علوم کے درس و تدریس کا جو منہج یا نصاب تھا وہ اس شخص کے لیے اجتہاد کے درجہ پر تھا جس کے اندر اس نصاب کو سمجھنے کیلئے خاص قسم کی صلاحیت، لیاقت اور قدرت موجود تھی، بایں ہمہ جو لوگ اس نصاب تعلیم پر عمل پیرا ہوتے تھے ان کے اندر روحانیت اور پرہیز گاری بھی بدرجۂ اتم موجود تھی، مجتہد کے اندر ایسی صلاحیت ہونی چاہیے کہ وہ اس کے ذریعہ مجہول احکام کا استنباط کر سکے، وہ استنباط کرنے میں ان وسائل کو قطعاً نظر انداز نہ کرے جن کے ذریعہ ان احکام کے معنی و مفہوم تک اس کا پہونچنا ممکن ہے، اسے ان احکام سے متعلقہ قرآنی آیات اور احادیث نبویہ کا بخوبی مطالعہ کرنا ہوگا، انھیں سمجھنے اور ان سے استنباط کرنے کے جو طریقے ہیں ان کا مطالعہ کرنا ہوگا، اسے علم ہونا چاہیے کہ کس طرح مختلف قسم کی دلیلوں میں تطبیق دی جاتی ہے اور ترجیحی صورتوں پر نظر رکھی جاتی ہے؟ اسے خبر ہونی چاہیے کہ اسلاف نے اپنے اجتہاد اور استنباط میں کس قسم کا اسلوب اختیار کیا تھا؟ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اسلامی شریعت کے مقاصد کو مد نظر رکھتے ہوئے مختلف قسم کے احکام میں ربط و تنسیق کے کیا طریقے ہیں، استقراء کسے کہتے ہیں؟ کلیات و جزئیات کا معنیٰ و مفہوم کیا ہے؟ کیونکہ کلیات و جزئیات کے استیعاب پر ہی احکام کے استنباط کا دارومدار ہوتا ہے، اسے جاننا چاہیے کہ لفظ کا استعمال لغوی اور شرعی اعتبار سے کیا ہے؟ احکام پر نصوص کی دلالت کا معنیٰ و مفہوم کیا ہے؟ آیات اور احادیث میں کب، کیسے اور کسے مخاطب بنایا گیا ہے، اور ان کا شان نزول کیا ہے؟ غرضکہ مجتہد کو حدیث اور اصول حدیث، فقہ اور اصول فقہ کے جملہ مذاہب سے باخبر ہونا چاہیے، نیز ان کے دلائل پر کلی طور پر نظر بھی ہونی چاہیے، جن پر ان مذاہب کے فقہاء، محدثین اور مجتہدین نے استنباط

کرنے میں اعتماد کیا ہے، وغیرہ، وغیرہ ..... یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا لوگ تصور کرتے ہیں، بہرحال تجدید و اجتہاد کا منصب دشوار کام جن کے بس سے باہر ہے انھیں خاموش رہنا چاہیے۔

تجدید کے علمبرداروں کا یہ خیال ہے کہ ان کا دین سے مربوط رہنا ہی ان کی پس ماندگی اور تخلف کا سبب ہے، اور اسی بنا پر انھوں نے اسلامی شریعت کو ترک کر کے عصر حاضر کے وضعی قوانین کو اپنا مذہب بنالیا ہے، ان میں کچھ لوگوں نے ترقی و آزادی کے نام پر دینی قید و بند سے راہ فرار اختیار کر لی ہے، اور حلال و حرام کے درمیان کوئی تمیز نہیں رکھ چھوڑی ہے، ان کو مخاطب بنا کر ہم یہ عرض کریں گے کہ اسلامی عقیدہ میں ایسی کوئی بات نہیں جس کا عقل سے تعارض ہو بلکہ اس کے برعکس دیگر ادیان و عقائد میں عقل کی راہ دور سے مشکل ہی سے نظر آتی ہے، اسلام میں فکر و نظر کی جو دعوت دی گئی ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام میں عقل و علم کی حیثیت و اہمیت سے انکار نہیں، اسلامی فقہ یا اسلامی شریعت اسلاف فقہاء کے موجودہ مذاہب کا ہی نام نہیں بلکہ اسلام کے فقہی علوم کی ماضی میں جن بنیادوں پر ترقی حاصل تھی وہ آج بھی انھی قرآنی آیات اور احادیث نبویہ کی مضبوط بنیادوں پر قائم ہیں اور تاابد قائم رہیں گے۔

جو لوگ جہالت کی بنا پر یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی فقہ عصر ماضی میں امت اسلامیہ کے لیے مفید تھی، مگر اب وقت حاضر میں ناقص و ناتمام اور انسانی ضرورت کی تکمیل سے قاصر نظر آتی ہے، اب امت اسلامیہ کے لیے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس کی مثال ان تدریجی امور کی مانند ہے جن کا ایک دور ہوتا ہے جو گذر جاتا ہے، اسی طرح اسلامی فقہ و شریعت کا بھی ایک دور تھا جب فقہاء نے اس وقت کی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے اسے وضع کیا تھا، اب اس کی وہ وضع اور ساخت قدیم ہو گئی ہے، صدیاں گذر چکی ہیں، مگر اسلامی فقہ اپنے اسی قدیم پیکر و پیرہن میں نظر آتی ہے، جبکہ زمانہ بدل گیا ہے، اور لوگوں کی ضروریات میں غیر معمولی تغیر آ گیا ہے، کیا یہ ممکن ہے کہ اس قدیم فقہی نصاب کو آج بھی اس دور میں نافذ کریں جس کی تنفیذ چودہ صدی قبل کی گئی تھی، جبکہ قانون کی شان تو ایسی ہونی چاہیے کہ اس میں زمانہ کے تغیرات اور انسانی ضروریات کو

پیش نظر رکھتے ہوئے ترمیمات اور تبدیلیاں کی جاسکیں، تاکہ اسے جامع اور ترقی یافتہ بنایا جاسکے ۔

جن حضرات کا بھی یہ خیال ہے ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ فقہاء و مجتہدین نے اپنے مذاہب کی بنیاد جن احکام الٰہیہ یا احادیث نبویہ پر رکھی ہے ان کا دائرہ محدود نہیں، بلکہ وہ شرعی حدود و بے حد وسیع و عریض ہیں، جو شخص بھی فقہ و اصول فقہ سے متعلقہ مؤلفات کا مطالعہ کرے گا، نیز جو بھی امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام محمد بن حسن شیبانیؒ، امام ابویوسفؒ، امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کی فقہی تصنیفات و تحقیقات کا ایک دوسرے سے موازنہ و مقابلہ کرے گا اس کی نظر سے ہرگز یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی، کہ علمائے اسلام اور ائمہ کرام نے فقہ و اصول فقہ کی تالیف اور مسائل کی تحقیق میں کتنی محنت اور کیسی کاوش کی ہے، اور کب اور کیسے فقہ اسلامی کی تکوین و تشکیل اور اس کی نشوونما ہوئی، نیز کیسے کیسے مختلف ادوار میں اس میں ترقی دیکھنے میں آئی، ہاں البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب سے اسلامی ممالک میں وضعی قوانین کی تنفیذ ہوئی ہے اس وقت سے اسلامی فقہ اور اسلامی شریعت کی تنفیذ حکومتی سطح پر معطل نظر آتی ہے، مگر یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہیے کہ اسلامی فقہ پر وضعی قوانین کی تنفیذ سے جمود چھا گیا، کیونکہ اسلامی فقہ اور شرعی احکام کی بنیاد قرآن اور سنت پر ہے جو تا ابد قائم و دائم رہیں گے اور ان پر کسی بھی دور میں جمود طاری نہیں ہو سکتا ۔

ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ہر مسئلہ میں احکام الٰہی کا پابند اور شرعی احکام پر کاربند رہے، فقہ اسلامی کے کچھ احکام ایسے ہیں جو ثابت اور دائم ہیں، ان میں کہیں بھی اور کسی دور میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی، اور کچھ ایسے ہیں جو تغیر پذیر ہیں، جن میں ہر دور کی انسانی ضروریات کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے، اور ان کے دائرے کی توسیع و ترقی ممکن ہے، اسلامی شریعت قرآن و حدیث کے جن نصوص اور محکم کلیات پر مبنی ہے وہ کلیات ان سبھی انسانی ضروریات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں جو کسی بھی جگہ اور کسی بھی دور میں بشریت کو پیش آسکتی ہیں، اس لیے یہ کہنا کہ اسلامی فقہ پر جمود طاری ہو گیا ہے یہ دعویٰ درست نہیں، بلکہ باطل ہے ۔

اسلامی شریعت میں ہر دور میں رونما ہونے والی خصوصیات کو رعایت پہلے سے ہی موجود ہے، جن کے حل کے لیے فقہ اسلامی کو عصر حاضر کے تواتین وضعیہ کا پابند قانون وان کی عقلی پیچیدگیوں اور حیلہ جوئیاں کی چنداں ضرورت نہیں، اسلامی شریعت کی بنیاد جن محکم کلیات پر ہے ان کا مقصد یہ ہے کہ کوئی اپنی خواہشات نفسانی کی پیروی میں گمراہ نہ ہو جائے، کیونکہ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ جنھوں نے بھی قرآن فہمی کے سلسلہ میں عقلی گھوڑے دوڑائے ہیں وہ صحیح راستہ سے بھٹک گئے ہیں۔

متشابہ آیات کے بعض فوائد

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام میں جتنے بھی فرقے اور مذاہب خیال معرض وجود میں آئے ہیں ان سب کا منبع و مصدر قرآن و حدیث ہے، پھر بھی جو مختلف افکار و نظریات دیکھنے میں آتے ہیں ان کا سبب یہ ہے کہ قرآن مجید میں محکم اور متشابہ دو طرح کی آیات موجود ہیں، جو فتنہ پرور عناصر ہیں متشابہ آیات کا معنی و مفہوم اپنی خواہش کے مطابق ڈھال لیتے ہیں، خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ

هُوَ الَّذِیٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ، وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ؕ	اس نے تم پر کتاب نازل کی جس کے ایک حصہ (میں) وہ آیتیں ہیں جو اشتباہ مراد سے محفوظ ہیں، وہی آیتیں اس کتاب کی بنیاد ہیں، اور دوسرے حصہ میں وہ آیتیں ہیں جو مشتبہ المراد ہیں، اس لیے جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ فتنہ کی غرض سے اس کے اسی حصہ کی پیروی کرتے ہیں جو مشتبہ المراد آیتوں پر مشتمل ہے، اور ان کا غلط مفہوم ڈھونڈتے ہیں، حالانکہ ان کا صحیح مطلب اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔
(آل عمران : ۷)	

مثال کے طور پر نصاریٰ اسلام کے ابتدائی دور کے مسلمانوں کے ساتھ مسائل لاہوت اور عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی حقیقت و ماہیت سے متعلقہ موضوعات پر جدل و تکرار کیا کرتے تھے، اور حضرت مسیح علیہ السلام کی صفات کے بارے میں قرآن مجید میں جو آیت کریمہ موجود ہے اسے اپنی خواہش کے مطابق معنی کا جامہ پہنانے کی کوشش کرتے تھے، جبکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ :

یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ	اے اہل کتاب! تم اپنے دین میں حد سے مت نکلو
دِیْنِکُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ	اور اللہ تعالیٰ کی شان میں غلط بات مت کہو
اِلَّا الْحَقَّ ۔ اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی	مسیح عیسیٰ بن مریم تو اور کچھ بھی نہیں، البتہ
ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَ	اللہ کے رسول ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے ایک
کَلِمَتُہٗ اَلْقٰھَآ اِلٰی	کلمہ ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے مریم تک پہنچایا
مَرْیَمَ وَرُوْحٌ مِّنْہُ فَاٰمِنُوْا	تھا، اور اللہ کی طرف سے ایک جان ہیں
بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَلَا تَقُوْلُوْا	اس لیے اللہ اور اس کے سب رسولوں پر ایمان
ثَلٰثَۃٌ ۔ (النساء : ۱۷۰)	لاؤ، اور یوں مت کہو کہ تین ہیں۔

غرض کہ اہل سنت والجماعۃ، معتزلہ، حشویہ اور دیگر متکلمین کے جتنے بھی مذاہب کلامیہ معرض وجود میں آئے، ان سب کا مصدر قرآنی آیات ہی ہیں، ان میں کا ہر فرقہ قرآنی آیات کو اپنے مذہبی عقائد کی روشنی میں سمجھنے اور انھیں دلائل کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کرتا تھا، اور آیات ہی کی تاویل میں مختلف مذاہب اور فرقوں کے مابین نظریاتی اختلافات رونما ہوئے جو آج بھی تفسیر کی کتابوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

امام فخر الدین رازیؒ[1] نے قدریہ، جبریہ اور شبہ جیسے مختلف الخیال مذاہب کے اقوال و دلائل کو

---

[1] فخر الدین محمد بن عمر التیمی البکری (المتوفی ۶۰۶ھ / ۱۲۱۰ء) اپنے زمانہ کے مشہور امام اور مفسر قرآن تھے، ۵۴۴ھ میں پیدا ہوئے تھے، اور "ہراۃ" میں انتقال ہوا تھا، شیخ الاسلام کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے، انھیں معقولات

(بقیہ ص ۳۵۶ پر)

نقل کیا ہے جو قرآنی نصوص و آیات سے ماخوذ ہیں، انھوں نے اس زعم کے رد میں یہ لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جو متشابہ آیات ہیں ان کے بھی بہت سے فوائد ہیں، انھوں نے اس سلسلہ میں یہ ذکر کیا ہے کہ اگر قرآن مجید کی سبھی آیات محکم کلیات کی شکل میں ہوتیں تو وہ صرف کسی ایک ہی فرقہ یا مذہب کے افکار و نظریات سے مطابقت رکھتیں، اور اس کے علاوہ سبھی فرقے اور مذاہب جو معرض وجود میں آئے ہیں باطل اور لغو قرار دے دیے جاتے جسے دیگر مذاہب یا فرقے کسی حال میں بھی تسلیم نہ کرتے، اس لیے محکم و متشابہ ہردو طرح کی آیات کا فائدہ یہ ہوا کہ جو فرقے اپنے مذاہب کو قرآنی آیات سے مستحکم اور مدلل بنانے کے خواہاں تھے، انھوں نے قرآنی نصوص و آیات میں غور و فکر کرکے اپنے مذہب کے مطابق آیات تلاش کرلیں۔

اس سے قطع نظر ہر زبان کی وضع یا ساخت اور اس کی طبیعت محسوسات اور مادی اشیاء و واقعات کے مطابق ہوتی ہے، وہ باطنی اسرار و رموز کے حقایق کی ترجمانی سے قاصر رہتی ہے، باطنی اور روحانی حقائق کی تعبیر زبان اور اہل زبان کے لیے مجاز، استعارہ اور تخیل کے بغیر مشکل بلکہ ناممکن ہے، کیونکہ یہ انسانی جہان رنگ و بو محسوسات و مادیات پر مشتمل اور محدود ہے، اور اس عالم محدود کی زبان محدود ہے پھر اللہ تعالیٰ کے لامحدود و لامتناہی منشا و مراد کی تعبیر بغیر مجاز، استعارہ اور تخیل کے کیسے ممکن ہے انھی سب وجوہ کے بموجب قرآن فہمی کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوگیا، بلکہ ایک مستقل شعبۂ تفسیر بن گیا اور آج اس شعبہ میں مختلف مذاہب کی مختلف کتابیں دارسین اور متخصصین تفسیر کے سامنے ہیں۔

علت اور معلول | جو لوگ اپنی عقل پر ناز کرتے ہیں انھیں فقہی اصول و قواعد میں علت و معلول کی حیثیت کا علم ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ٣٥٥) ---- اور معقولات پر کافی دسترس تھی، عربی اور فارسی میں ان کی دسیوں کتابیں ہیں جنھیں فضائل الصحابہ، المحصول فی الفقہ، الاربعین فی اصول الدین، ابطال القیاس، الہندسہ، الملل والنحل، لب الاشارات الطب الکبیر اور مفاتیح الغیب جو تفسیر الکبیر کے نام سے مشہور ہے قابل ذکر ہیں، انھوں نے عربی اور فارسی میں اشعار بھی کہے ہیں۔ لہ التفسیر الکبیر ص ٦٢ - ١٠٣ -

علم ہونا چاہیے، اسلامی شریعت میں کسی پر آنکھ بند کر کے حد کی تنفیذ کا حکم صادر نہیں ہوتا، بلکہ ہر چیز کی کوئی نہ کوئی علت ہوتی ہے، جب بھی کوئی حکم صادر ہوگا تو یہ دیکھا جائے گا کہ علت پائی جاتی ہے یا نہیں، اگر علت موجود ہے تو حکم کی تنفیذ ہوگی، اگر فی الواقع کوئی علت موجود نہیں تو صرف شکوک و شبہات کی بنا پر حکم یا حد کی تنفیذ ہرگز نہیں ہوگی۔

جو لوگ بھی اسلامی شریعت سے برگشتہ ہیں انھیں یہ بخوبی جاننا چاہیے کہ اسلامی شریعت کی تنفیذ کا مقصد کیا ہے، اسلامی شریعت کا عظیم مقصد یہ ہے کہ معاشرہ میں اصلاح کی جائے اور اسے شر و فساد سے دور رکھا جائے، اور خدا تعالیٰ نے اسلامی شریعت کا جنھیں مکلف بنایا ہے انھیں اس بات پر عقیدہ رکھنا چاہیے کہ شریعت الٰہی کی تنفیذ ہر مقام پر، ہر زمانے میں، ہر فرد بشر، ہر جماعت، ہر معاشرہ اور ہر ملک کے لیے مفید ہے اور سود مند رہے گی۔

اسلامی شریعت کی جو کلیات ہیں وہ زمانہ کے حوادث اور انسانی ضروریات کے دوش بدوش چل رہی ہیں، اور صرف یہی نہیں کہ ان کلیات سے امت اسلامیہ کی ضروریات کی تکمیل ہوتی ہے بلکہ ان کلیات میں غیر مسلم قوموں کے حقوق و ضروریات کی مراعات اور ان کی دادرسی بھی ملحوظ رکھی گئی ہے اسلام کے دشمن عناصر کو اس بات سے بخوبی واقف ہونا چاہیے کہ اسلام ایک ہمہ گیر مذہب اور عالمگیر نظام حیات ہے' اور جن کو اسلامی شریعت کے متعینہ اصول و ضوابط کا مکلف اور مخاطب بنایا گیا ہے' ان میں کسی فرد یا جماعت کی کوئی تخصیص نہیں، بلکہ تکلیف و تخاطب عام ہے، اور ہر فرد بشر اس کا مکلف و مخاطب ہے۔

جن حضرات کی مطمح نگاہ اہل مغرب کی موجودہ تہذیب و تمدن پر ہے اور جو تجدید و اجتہاد کا نعرہ لگا رہے ہیں' ان سے ہم یہ کہیں گے کہ اجتہاد صرف تجدید و تطور اور ترمیم و تبدیلی ہی کا نام نہیں' بلکہ اجتہاد اس راہ حق تک پہونچنے کے لیے کی جانے والی کوشش و کاوش کا نام ہے جس پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کاربند تھے' مجتہد کو ہر اس مسئلہ میں جس میں قرآن و حدیث خاموش ہیں سب سے پہلے

یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان اس وقت تشریف فرما ہوتے تو اس مسئلہ میں کون سا موقف اختیار کرتے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم عصر حاضر کے تہذیب و تمدن سے پیچھے رہ گئے اور جدید ترین سائنس اور اس کی ترقی کے وسائل کو اختیار کرنے میں ہم نے غیر معمولی تاخیر کر دی، ان لوگوں سے ہم یہ عرض کریں گے کہ اگر مسلمانوں نے علوم و فنون کے مختلف میدانوں میں آگے بڑھنے میں سستی اور تساہل برتا تو اس میں اسلام یا قرآن و حدیث کا کوئی قصور نہیں، بلکہ یہ مسلمانوں کی اپنی سستی و تساہل اور علمی و عملی زندگی سے پہلو تہی کا نتیجہ ہے، اسلام تو چاہتا ہے کہ مسلمان اس جہان میں سب سے طاقتور اور قوی ریاست کے اہل بن جائیں، اگر مسلمان خود ہی اپنی صلاحیتوں اور طاقتوں کو ضعیف بنا دیں گے تو اسلام کی نظر میں وہ قصور وار کہلائیں گے، کیونکہ مسلمان احکام الٰہی کا پابند اور ان کی تبلیغ کا مکلف ہے، اور دعوت و تبلیغ کا کام اسی وقت بخوبی انجام پذیر ہو سکتا ہے جب مسلمان اپنی توانائی اور اپنی علمی و عملی صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں۔

جب آپ انفس و آفاق میں خدا تعالیٰ کی قدرت و عظمت کی نشانیوں کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ بھی اسلامی دعوت و تبلیغ سے متعلقہ موضوعات ہیں، خدا تعالیٰ کی نشانیوں اور تسخیر فطرت سے متعلقہ آیات کو بغیر فکر و عمل کے نہیں سمجھا جا سکتا، اس کے لیے فطرت اور نظام فطرت کو سمجھنا ہوگا، اور اس کا انکشاف کرنا ہوگا، کیونکہ فطری عناصر کی بحث و جستجو کائنات میں قدرت الٰہی کی بحث و جستجو کے مترادف ہے، اور نظام فطرت کو سمجھنے کا مطلب کائنات میں نظام الٰہی کا فہم و ادراک کہلائے گا.....

اس طرح جب ہم مادی علوم و سائنس کے دوش بدوش چل کر اگر جدید ترین چیزوں کا انکشاف کریں گے، اور مسلمانوں کی نت نئی چیزوں کی اپنی ایجادات ہوں گی، تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہ ہوگا کہ ہم نے یورپی تہذیب و تمدن کی نقل یا تقلید کی ہے، یا یورپی تہذیب و تمدن اختیار کر لیا ہے، کیونکہ کیمیا، کا جہاں کہیں بھی وجود ہوگا وہاں پر وہ کیمیا ہی کہلائے گی، یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ یہ روسی کیمیا ہے اور وہ فرانسیسی کیمیا، ہاں البتہ

کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے اپنے اسلاف کی پیروی کی ہے، جنھوں نے غور و فکر اور کاوش کے ذریعہ تجربہ اور ایجاد کی ابتدا کی تھی، کیونکہ اہل مغرب خود اس کا اعتراف کرتے ہیں اور شہادت دیتے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے زریں عہد میں اپنے علمی و عملی کارناموں اور ایجادات سے انسانیت کو بے حساب فائدہ پہونچایا ہے، اس لیے اگر اس دور میں مسلمان فطری اور مادی میدانوں میں انسانی ایجادات سے فائدہ اٹھاتے ہیں تو اس میں کوئی عیب کی بات نہیں، بلکہ یہ تو ان کا ذاتی حق ہے۔

مگر اخیر میں یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ اسلام سائنس کی اہمیت کا اعتراف کرتا ہے، تاہم اسے قوم کی ترقی و تقدم اور اس کی پسماندگی کا معیار و مقیاس قرار نہیں دیتا کیونکہ اسلام میں بلندی و پستی اور ترقی و پسماندگی کا معیار اخلاق اور تقویٰ ہے۔

مولانا محمد علی جوہر اور کلکتہ

از

جناب محمد اسحاق صاحب، اسمٰعیل اسٹریٹ، کلکتہ

یہ مقالہ کلکتہ کی محمد علی لائبریری کے مولانا محمد علی جوہر کے سیمینار

منعقدہ ۱۷-۱۶ فروری [illegible] میں پڑھا گیا۔

کامریڈ کا اجرا | رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر نے ہفتہ وار کامریڈ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اپنی انگریزی صحافت کا آغاز بنگال کے انقلابی شہر کلکتہ کو بنایا تھا، گرچہ طالب علمی کے ایام ہی سے ایم اے او کالج علی گڑھ کے میگزین اور ملک کے موقر اخبارات و رسائل میں انگریزی مضامین لکھتے رہتے تھے، لیکن ان کی باقاعدہ قومی، سیاسی اور صحافتی زندگی کا پہلا دور اسی شہر سے شروع ہوا، بڑودہ سول سروس سے مستعفی ہوئے تو ناگپور تعلیمی کانفرنس میں شرکت کرنے کے بعد دسمبر ۱۹۱۰ء میں کلکتہ آکر رپن اسٹریٹ میں طرح اقامت ڈالی، اور وہیں اپنا پریس اور دفتر بھی قائم کیا، ان کے ہفتہ وار کامریڈ کا پہلا پرچہ ۱۴ر جنوری ۱۹۱۱ء کو کلکتہ سے جاری ہوا، جو ۴۴ صفحات پر مشتمل تھا، اور جس کی قیمت ۴ آنے فی پرچہ تھی، اور سالانہ ۱۲ روپے تھی، اس اخبار کے پہلے ورق کے بالکل شروع میں ایک انگریزی شاعر ولیم موریس کا یہ بند ہمیشہ چھاپا جاتا:

STAND UPRIGHT SPEAK THY THOUGHT DECLARE

THE TRUTH THOU HAD THAT ALLMAY SHARE

BE BOLD PROCLAIM IT EVERY WHERE

THEY ONLY LIVE WHO DARE

(ترجمہ) "سیدھے کھڑے ہوکر اپنے خیالات کا علانیہ اظہار کرو، جو صداقت تمہارے پاس ہے، اسے
بے خوف چہار دانگ عالم پر ظاہر کردو، تاکہ دوسرے بھی اس کے سننے اور بولنے میں تمہارے شریک
ہوجائیں، کیونکہ وہی لوگ زندہ رہتے ہیں جو ہمت کرتے ہیں"
یہ بھی کبھی کبھی لکھا کرتے "سب کا دوست، بلا وجہ کسی کا طرفدار نہیں"

"طنزیات و مقالات سید محفوظ علی بدایونی" شایع کردہ انجمن ترقی اردو پاکستان میں لکھا ہے کہ کلکتہ
سے کامریڈ کا آخری پرچہ ۱۴ ستمبر ۱۹۱۲ء کو نکلا، اس لحاظ سے تقریباً دو سال سے کچھ کم عرصہ تک کلکتہ میں
مولانا محمد علی کا مسلسل قیام رہا، لیکن اس قلیل مدت میں ان کی علمی فضیلت، خطیبانہ سحر کاری، سیاسی بالغ نظری،
فکری بلندی اور صحافیانہ جادو نگاری کا طوطی پورے ہندوستان میں بولنے لگا، اپنی تصنیف "محمد علی ذاتی
ڈائری" میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا ہے "کامریڈ کی سحر نگاری سے مسلمان تو مسلمان، علی گڑھ کالج
کے ہندو طلبہ بھی متاثر تھے"، سید محمد ہادی مولانا کی صحافتی زندگی میں ایک عرصہ دراز تک صاحب قلم کی
حیثیت سے رفیق کار رہے تھے، وہ اپنی کتاب "علی برادران اور ان کا زمانہ" میں لکھتے ہیں کہ:

"۱۹۱۱ء میں کلکتہ سے مولانا محمد علی نے اپنا بے نظیر ہفت روزہ کامریڈ جاری کیا، حسب توقع
کامریڈ نہایت معیاری اخبار تھا، بلحاظ گٹ اپ اور تنوع مضامین اور طرز نگارش بس وہ
آپ ہی اپنی مثال تھا، جب انھوں نے یہ اخبار جاری کیا تو کوئی بڑی رقم ان کے پاس نہیں تھی، لیکن
ان کا نام نامی مسلمانوں میں اس قدر مشہور و مقبول ہوچکا تھا کہ اخبار نکلتے ہی ہزاروں کی تعداد میں
فروخت ہونے لگا۔ اخبار ٹائپ، کاغذ اور سائز کے لحاظ سے نہایت دیدہ زیب تھا۔
ڈورنٹس کٹنگز (اخباری تراشے) اس زمانہ میں لندن میں ایک ادارہ تھا، جو وہاں کے اخبارات میں

اسلامی ممالک یا ہندوستانی مسائل سے متعلق جو کچھ چھپتا تھا انھیں تراش کر کلکتہ بھیج دیا کرتا تھا، اس طرح ان کو بیک وقت بہت سے اخبارات خریدنے میں خطیر رقم خرچ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی اِن خبروں یا تبصروں کو من وعن یا ان کے اختصارات "تاریخ وار" درج یا "تین اخباری صفحات" پر شایع کرتے تھے اور قارئین ان خبروں کو پسند کرتے تھے۔ ان میں جو اہم خبر ہوتی تھی اس پر وہ خود ہی نہایت اعلیٰ درجہ کی انگریزی میں تبصرہ کرتے، اور بعض پر بے لاگ ایڈیٹوریل لکھتے۔

زورِ صحافت | مولانا کی ذات، مورخانہ بصیرت، عالمانہ ثقاہت اور صحافیانہ ذہانت کی جامع تھی، اس لیے انھوں نے فکری نظر سے گذری ہوئی تاریخ کے پس منظر میں جھانک کر اپنے دور کی سیاست کی نبض شناسی کی ... کاروانِ زمانہ کی رفتار پر اپنی دوررس نگاہیں مرکوز کر کے ہندوستانیوں کی ذہنی وفکری رہنمائی کی، کلکتہ اس وقت ہندوستان کا پایۂ تخت تھا، اور گورنر جنرل اور اعلیٰ انگریز حکام کے دفاتر یہیں تھے اس لیے ان کے قلم کی نشتر زنی سے حکومت برطانوی کے ارباب بست وکشاد چراغ پا ہو جاتے تھے، لیکن ان کی صحافتی مگکاری طرزِ تحریر کی انقلاب آفرینی، الفاظ ومحاورات کی رفعت شان، استدلال کی اصابت، زورِ بیان کی اثر انگیزی سیاسی فکر ونظر کی پختہ کاری اور طنز ومزاح کی سلامت روی کے ساتھ تلخی اور ترشی نے نہ صرف ہندوستان کے سیاسی حلقوں میں ہلچل پیدا کر دی، بلکہ مغرب کے عالی مرتبت ارباب دانش اور اہل سیاست بھی ان کو خراج تحسین پیش کرتے رہے۔

سنہ ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا اور ریگ زارِ افریقہ پر خونِ مسلم کی ارزانی ہونے لگی، ترکی نے جنرل انور پاشا کی رہنمائی میں فوج بھیج کر اس کا دفاع کیا تو ترکی کے فوجی دباؤ کو کم کرنے کے لیے جنگی حکمت عملی کے طور پر شاطران مغرب کی سازش سے دول یورپ نے سنہ ۱۹۱۲ء میں بلقان پر فوج کشی کر دی، اس وقت مولانا اسلامی اخوت اور دینی حمیت کے جذبات سے سرشار ہو کر سیاست کے خضر راہ بن کر اٹھے اور ترکوں کی حمایت میں مضامین لکھ کر برصغیر کے مسلمانوں کے قلوب کو ترکوں کی محبت سے لبریز کر دیا، اور ان کے

ذہن و فکر کو خواب میں بیداری کی ایسی شمع روشن کر دی کہ اس کے بعد وہ جمود و تعطل کی زنجیریں توڑ کر حرکت و عمل کی متحرک مشین بن گئے، ہماری قومی و ملی تاریخ میں مولانا کا یہ کارنامہ ہمیشہ ناقابل فراموش رہیگا

سید محمد ہادی نے "علی برادران اور ان کا زمانہ" میں لکھا ہے: "اس وقت ہفتہ وار جریدہ کے اجراء کا مقصد در اصل جمال الدین افغانی اور عبدالعزیز اشاویش کی تحریک پان اسلامزم کی حمایت تھا، مولانا کی دلی تمنا تھی کہ مسلم ممالک اسلامی اتحاد کو استوار کر کے بنیان مرصوص بن جائیں، تاکہ وہ مغرب کی استعماری طاقتوں کی غلامی کا جوا اپنی گردنوں سے اتار پھینکیں، ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری اپنی تصنیف "مولانا محمد علی اور ان کی صحافت" مطبوعہ ادارۂ تصنیف و تحقیق کراچی میں کامریڈ میں چھپنے والے مضامین کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہیں:

"ان (مولانا) کی ہمہ گیر ذہانت نے انگریزی ادب و انشاء، مصطلحات و محاورات، طرز ادا، اور طریقۂ بیان پر اس درجہ تبحر اور عبور حاصل کیا کہ ان کے قلم و زبان دونوں کی جاہلوں سے لے کر عالموں، گنواروں سے لے کر شہریوں، فقیروں سے لے کر امیروں اور مزدوروں سے لے کر وزیروں تک کے الفاظ و عبارات ادا کرنے پر یکساں قدرت و مہارت حاصل تھی، ملاحوں کے سرود انھیں یاد تھے، آناؤں کی لوریاں انھیں یاد تھیں، لیرک کی وہ ہزلیات جو THERE WAS سے شروع ہوتی ہیں انھیں یاد تھیں، بل سا BILL انھیں یاد تھے، معمہ اور چیستاں انھیں یاد تھے۔ ان ہی کے ساتھ انگریزی کے متقدمین، متوسطین اور متاخرین شعراء و مصنفین کے بہترین علمی و ادبی جواہر پارے ان کی زبان پر یا ان کی نظر میں تھے، انجیل کی کتاب عتیق و جدید پر ان کی نگاہ تھی، سینکڑوں علمی لطیفے ان کی نوک زبان تھے، طبیعت پر چونکہ بذلہ سنجی، ظرافت اور شوخ نگاری کا رنگ غالب تھا، لہٰذا اس صنف میں ایسا بے ساختہ اور اتنا بہتر لکھتے تھے کہ بسا اوقات ان کی اور لندن پنچ کی ظرافت میں مشکل سے امتیاز ہو سکتا تھا، ایک ہندی ہیچ مداں اور جاہل کا والہانہ خیال نہیں

بلکہ بڑے بڑے انگریز ادیبوں کی غیر جانبدارانہ رائے ہے کہ جب تک محمد علی کا نام گورنمنٹ کے معتوبوں کی فہرست میں موٹے موٹے حرفوں میں نہیں لکھا گیا تھا، انگریزوں کی بھی خاصی تعداد کامریڈ کی خریدار اور اس کے مضامین کی عاشق اور اس کے طرز نگارش کی مداح تھی۔ علی پور کلکتہ میں واقع گورنر جنرل ہاؤس سے جس میں آج کل نیشنل لائبریری قائم ہے، وائسرائے کی بیگم صاحبہ وقتاً فوقتاً ٹیلیفون پر دریافت کرتی رہتی تھیں کہ کامریڈ کس وقت چھپ کر ان کے پاس پہونچ جائے گا، سرفلیٹ وڈ ولسن، ہندوستان کے وزیر مالیات جب کلکتہ سے ولایت جانے لگے تو محمد علی ان سے ملنے گئے، باتیں کرتے کرتے وہ محمد علی کو اس کمرہ میں لے گئے جہاں ان کا سامان سفر بندھ رہا تھا، ایک صندوق کو جس کے اوپر کا تختہ کیلوں سے جڑا جارہا تھا کھلوا کر کہنے لگے: محمد علی دیکھو اس میں کیا ہے؟ دیکھا تو کامریڈ کے پرچے تھے، کہنے لگے۔ میں لندن پنچ کے ایڈیٹر کے لیے تحفہ لے جارہا ہوں' محمد علی بولے: پنچ کے ایڈیٹر کو تو برابر کامریڈ جاتا ہے، کہنے لگے، وہ اور بات ہے، مگر میں اپنے دوست سر اون سیمین ایڈیٹر پنچ کو ان کے مذاق کے لائق اس سے بہتر ہدیہ ہندوستان سے نہیں لے جا سکتا، تمھاری اور ان کی طرز تحریر میں جو یک رنگی ہے وہ کہ بعض اوقات تمھاری اور ان کی تحریر میں تمیز کرنا مشکل ہے، اس کی داد دہی دے سکتے ہیں۔

عملۂ ادارت۔ کلکتہ میں کامریڈ کے پرچوں پر محمد علی کا نام ایڈیٹر کی حیثیت سے لکھا رہتا تھا، لیکن ان کے چند اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی تھے، جن کے نام پرچوں پر نہیں چھاپے جاتے تھے، ان میں سب سے اہم اور ممتاز شخصیت ماجد غلام حسین کی تھی، وہ پنجابی تھے، علی گڑھ کالج میں تعلیم پائی تھی، انگریزی بہت اچھی لکھتے تھے، ٹائمز آف انڈیا، سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور اور پائنیر الٰہ آباد میں ان کے بھی مضامین شائع ہوتے تھے، 'مولانا محمد علی اور ان کی صحافت' کے مؤلف ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری کے مطابق ۱۹۱۰ء میں مولانا نے انھیں اپنے پاس کلکتہ بلایا، اور کامریڈ کا اسسٹنٹ ایڈیٹر بنایا، اور چند ہی

دنوں میں ان کی قابلیت، انگریزی زبان پر ان کے عبور اور قدرت تحریر کا ڈنکا پورے ملک کے انگریزی داں حلقہ میں بجنے لگا، جب کامریڈ کا دفتر کلکتہ سے دہلی منتقل ہو گیا تو یہ بھی اپنا رخت سفر باندھ کر دہلی چلے گئے،

دوسرے اسسٹنٹ عبد الرحیم سقے، جو کلکتہ کے رہنے والے تھے، ان کے متعلق ہماری معلومات کا واحد ذریعہ جناب سید ہاشمی فرید آبادی کا وہ مقالہ ہے جو انھوں نے "چند ہفتے محمد علی کے ساتھ" کے عنوان سے لکھا ہے، اور جسے رئیس احمد جعفری نے اپنی تصنیف "علی برادران" میں شایع کیا ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں: "متحدہ بنگال اسمبلی کے اسپیکر عبد الحکیم کے بھائی عبد الرحیم کامریڈ کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے، دبلے پتلے کمزور سے آدمی تھے، چلتے تھے تو شاخ گل کی طرح لچکتے تھے"، ہاشمی فرید آبادی نے کامریڈ سے ان کی علٰحدگی پر بھی روشنی ڈالی ہے، لکھتے ہیں:

"ان (عبد الرحیم) کے بارہ میں محمد علی کو اطلاع ملی کہ کلکتہ کے ایک برہمو سماج لڑکی کو دل دے بیٹھے ہیں، اور ایسے عشق صادق میں مبتلا ہیں کہ ممکن ہے کہ برہمو سماج میں داخل ہو جائیں، یہ خبر سن کر محمد علی نے یہ نہیں سوچا کہ

عشق از یں بسیار کرد است و کند   سبحہ را زنار کرد است و کند

آگ بگولا ہو گئے، فوراً عبد الرحیم کی طلبی ہوئی، اور جرم عشق پر جواب طلب ہوا، وہ بے چارے کیا کہتے، محمد علی کے سامنے اور وہ بھی اس وقت جب وہ بپھرے بیٹھے ہوں، کچھ کہنا آسان بھی تو نہیں تھا، وہ خاموش تھے اور محمد علی گرج رہے تھے، برس رہے تھے، سخت سے سخت لہجہ میں درشت اور نا ملائم الفاظ کا ایک سیل رواں تھا، جس میں عبد الرحیم صاحب تنکے کی طرح بہے چلے جا رہے تھے، محمد علی اسے برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ عشق کی خاطر مذہب بدلا جائے اور یہ مذہب بدلنے والا ایک مسلمان اور کامریڈ کے عملۂ ادارت کا رکن ہو تو محمد علی کے قہر و جلال کو نقطۂ عروج پر پہونچنا ہی چاہیے تھا، چنانچہ وہ پہونچا اور بے چارے عبد الرحیم پھر کامریڈ کے دفتر میں

نظر نہیں آتے۔"

"محمد علی اور ان کی صحافت" کے مصنف کے خیال میں یہ واقعہ کلکتہ میں جولائی تا دسمبر ۱۹۱۲ء میں پیش آیا ہوگا، کیونکہ ہاشمی صاحب محمد علی کی دعوت پر جولائی ۱۹۱۲ء میں کلکتہ آئے تھے۔

مجتبیٰ صاحب بھی کامریڈ کلکتہ کے عملہ میں شامل تھے، لیکن ان کے کچھ زیادہ حالات کہیں نہیں ملے "خطوط محمد علی" مرتبہ محمد سرور مطبوعہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی میں مولانا محمد علی کے ایک خط مورخہ ۱۹ اگست ۱۹۱۲ء بنام سید محفوظ علی بدایونی میں ان کا تذکرہ آیا ہے، لکھتے ہیں "مجتبیٰ صاحب آپ کے بجائے کام کر رہے ہیں، مگر وہ ایک ذرا کام ہیں وہ ان کے سپرد نہیں کر سکتا، دوسرے وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ موجودہ تنخواہ سے کچھ زیادہ ہی کام ہے۔" ہاشمی فرید آبادی کے مقالے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۱۲ء میں جب کامریڈ کا دفتر کلکتہ سے دہلی منتقل ہوا تو مجتبیٰ صاحب بھی راجہ غلام حسین اور دیگر عملہ کے ساتھ دہلی چلے گئے۔

ولایت علی بمبوق کلکتہ میں کامریڈ کے اجرا ہی کے وقت سے مزاحیہ کالم گپ کے کالم نگار تھے، لیکن وہ کلکتہ نہیں آئے تھے، اپنے وطن ہی سے مضامین لکھ کر بھیج دیا کرتے تھے، مولانا عبدالماجد دریابادی نے "محمد علی ذاتی ڈائری" میں ان کے بارہ میں لکھا ہے: "بارہ بنکی کے وکیل اور علی گڑھ کے نامور گریجویٹ شیخ ولایت علی محمد علی کے خاص الخاص دوستوں، رفیقوں اور معتمدوں میں تھے، بمبوق کے عجیب اور فرضی نام سے ان کے ظریفانہ مضمون کامریڈ کے کالموں میں انگریزی کی بہترین انشا پردازی کے ساتھ نکلتے تھے، وہ مشہور کانگریسی رہنما اور ہندوستان کے کامیاب ترین وزیر خوراک رفیع احمد قدوائی کے چچا تھے، پروفیسر رشید احمد صدیقی گنج ہائے گرانمایہ میں لکھتے ہیں" مولانا محمد علی اور ولایت علی بمبوق کے مضامین دیکھنے کے لیے لوگ کامریڈ کے لیے بے تاب رہتے تھے، ان کے علاوہ لکھنے والوں میں شعیب قریشی بھی تھے، جنھوں نے بعد میں مولانا کی سب سے چھوٹی لڑکی گلنار سے شادی کی تھی اور پاکستان کے وزیر بھی منتخب ہوئے تھے، کلکتہ کے نامور انگریزی زبان کے صحافی ڈاکٹر عبدالرحمن صدیقی بھی کامریڈ سے وابستہ تھے، گرچہ وہ کامریڈ کے دوسرے دور میں مولانا سے

ناراض ہو کر دہلی سے کلکتہ چلے آئے تھے، لیکن دسمبر ۱۹۳۰ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے ان کے ہمراہ لندن گئے تھے، اور نزع کے وقت مولانا کی اہلیہ اور ان کے بھائی مولانا شوکت علی کے ساتھ ان کے سرہانے باول بریاں وباچشم گریاں موجود تھے، ایک بار کلکتہ میں یوم مولانا محمد علی کے موقع پر ڈاکٹر عبدالرحمن صدیقی صاحب نے لندن میں مولانا محمد علی کے دم واپسیں کے واقعات رو رو کر بیان کیے تھے، راقم الحروف بھی اس جلسہ میں شریک تھا، صدیقی صاحب نے بعد میں کلکتہ سے انگریزی میں ایک روزنامہ اخبار "مارننگ نیوز" نکالا تھا، تقسیم ہند کے بعد مشرقی پاکستان، موجودہ بنگلہ دیش کے گورنر ہوئے، اور کراچی میں انتقال کیا۔

تقسیم بنگال | "علی برادران اور ان کا زمانہ" میں ہے کہ

"۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن نے بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا، اور آسام کو مشرقی بنگال سے ملا کر ایک نیا صوبہ بنا دیا، گرچہ اس نئے صوبہ کی تشکیل سے مسلمانوں کو خوب فائدہ ہوا لیکن یہ سیاسی تقسیم ہندوؤں اور مسلمانوں میں رخنہ پیدا کرنے کے لیے کی گئی تھی، اس لیے ہندوؤں نے ناپسند کیا۔ بال گنگادھر تلک، بپن چندرپال اور لالہ لاجپت رائے کی قیادت میں آئینی اور غیر آئینی تحریکات چلنے لگیں، ان تحریکوں کا گڑھ کلکتہ تھا، کلکتہ کے اخبارات میں روزانہ ہنگامہ آرائی، بم بازی، گولی چلنے اور گرفتاری کے واقعات تفصیل سے چھپتے تھے، جن کو پڑھ پڑھ کر مولانا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے"۔

"حالات علی برادران" کے مصنف مولانا حافظ سید عزیز حسن بقائی نقشبندی دہلوی نے لکھا ہے:

"آپ (مولانا محمد علی) نے اس وقت اعتدالی اور غیر آئینی ایجی ٹیشن کو مفاد عامہ کے خلاف سمجھ کر ایک نہایت معرکۃ الآرا سلسلۂ مضمون "ٹائمز آف انڈیا" میں شروع کیا، جس کا افتتاح بالماری کے مشہور اخبار "والس آف انڈیا" میں ہوا، کیونکہ اس میں اراکین حکومت پر نکتہ چینی کی گئی تھی، اس کا ایڈیٹر اس کی تاب نہ لا سکا اور بقیہ مضمون چھاپنے سے انکار کر دیا، اس اہم مضمون کا عنوان "موجودہ بدامنی پر کچھ خیالات" تھا، یہ عنوان انگلستان کے مشہور مصنف ایڈمنڈ کی اس کتاب سے لیا گیا تھا جو اس نے انقلاب فرانس کے

زہریلے اثرات سے انگلستان کو محفوظ رکھنے کیلئے لکھی تھی، یہ سلسلہ اس قدر مقبول ہوا کہ صرف ہندوستان میں

وقعت کی نگاہ سے دیکھا گیا، بلکہ انگلستان کے معزز اخبارات اور پارلیمنٹ کے ممبران نے یک زبان

ہوکر تعریف کی، حتیٰ کہ لارڈ منٹو نے جو اس زمانہ میں وائسرائے تھے اور کلکتہ میں رہتے تھے، اور ان کے

چیف سکریٹری نے بھی مولانا ممدوح کی اعلیٰ قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے سراہا۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مولانا کے اس طویل مضمون کا محرک کلکتہ ہی کی آئینی تحریک تھی۔

نظر بندی میں مسلم لیگ کی صدارت

جنگ عظیم کے دوران ترکی کی حمایت میں ہفت روزہ کامریڈ میں لندن ٹائمز کے جواب میں "چوائس آف دی ٹرکس" لکھنے کی پاداش میں ۱۹۱۵ء تا ۱۹۱۹ء چھنڈواڑہ مدھیہ پردیش میں مولانا نظر بند کر دیے گئے، اس نظر بندی کے زمانہ میں ۱۹۱۷ء میں کلکتہ میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا جس میں مولانا کو ان کے دینی جذبات، قومی درد اور ملی خدمات کے صلہ میں مسلم لیگ کا صدر منتخب کیا گیا، جب ان کو اس کی خبر چھنڈواڑہ میں ملی تو انھوں نے اپنے قلبی تاثرات کو یوں شعر کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا:

یہ صدر نشینی ہو مبارک تجھے جوہر لیکن صلۂ روز جزا اور ہی کچھ ہے

سخاوت میموریل گرلس ہائی اسکول

جناب شہید اخوند کی بنگلہ تصنیف "بیگم رقیہ" مطبوعہ شیشو ساہتیہ بہتان چاٹگام بنگلہ دیش میں ہے:

"مولانا محمد علی کی لڑکی سخاوت میموریل گرلس اسکول کی طالبہ تھی۔ مولانا محمد علی دکھ درد کے موقعوں پر ہمیشہ رقیہ بیگم کی مدد کرتے تھے۔ سخاوت میموریل گرلس ہائی اسکول کو رقیہ بیگم نامی ایک عالی حوصلہ غمخوار ملت اور علم دوست عورت نے اپنے شوہر خان بہادر سید سخاوت حسین بی۔اے، ایم۔آر۔اے۔سی ڈپٹی مجسٹریٹ کے ۱۹۰۹ء میں انتقال کے بعد بھاگلپور میں قائم کیا تھا، ۱۶ مارچ ۱۹۱۱ء میں اس اسکول کو رقیہ بیگم نے ۱۳ ولی اللہ لین کلکتہ میں منتقل کیا، مولانا محمد علی نے دسمبر ۱۹۱۰ء میں اپنے خلاف

سے کلکتہ تشریف لا کر رپن اسٹریٹ میں کرایہ کے مکان میں بودوباش اختیار کی اور ۲۰ جنوری ۱۹۱۱ء میں اپنا انگریزی ہفتہ وار کامریڈ جاری کیا۔ ولی اللہ لین رپن اسٹریٹ سے بالکل قریب ہے۔ اسی مولانا نے اپنی لڑکی کو سخاوت میموریل گرلس اسکول میں داخل کیا۔ چونکہ مولانا خود بھی مسلمانوں میں علم و دانش کے فروغ کے زبردست داعی اور خصوصاً تعلیم نسواں کے سرگرم حامی تھے، اس لیے رقیہ بیگم کو عالم ہوگی وہ بے چارگی میں اسکول چلانے میں مالی دشواریوں اور دیگر مشکلات و مصائب میں مولانا جیسی عظیم ہستی کی سرپرستی، اعانت اور حوصلہ افزائی ضرور حاصل رہی ہوگی۔

گمراہ فلسفی | محمد علی نے ذاتی ڈائری میں لکھا ہے:

"۱۹۱۲ء کے اوائل میں کلکتہ میں مولانا کی ظریف محمد ایم۔ اے۔ علیگ سے ملاقات ہوئی تھی، فلسفہ کے گہرے مطالعہ سے ان کے افکار و خیالات منفی طور پر اس قدر متاثر ہو گئے تھے کہ وہ دین سے بیزاری اور وجود باری تعالیٰ سے انکار کرتے تھے۔ مولانا ان کی فلسفیانہ موشگافیوں کو ہذیان سمجھتے تھے، اس لیے وہ مولانا سے مذہب و فلسفہ پر بحث کرنے سے اجتناب کرتے، صرف علمی و ادبی گفتگو کرتے، اور اپنی ظرافت سے انھیں محظوظ کرتے۔ مولانا ان کی تصنیف "اسلام اور عقلیت" کو دہریت و الحاد کا طومار سمجھتے تھے۔ ظریف صاحب ترکوں کے بارہ میں کہتے کہ دعا وغیرہ سے ترکوں کو فتح نہیں ہوگی، جس کے پاس توپ گولہ نہیں ہوگا وہ ہارے گا۔ نہ دنیا کا کوئی خدا ہے اور نہ کوئی اس کا بندہ اور نہ وہ بندہ نواز ہے۔ لیکن اس ارتداد و الحاد اور لاادریت و ارتیاب کی تاریکیوں میں بھٹکنے والا فلسفی قرآن کے بے مثل ادب کا قائل اور اس پر وجد کرتا تھا۔"

دریا کی سیر اور چندر نگر کا سفر | محمد علی کی ڈائری کے مطابق مولانا نے اپنے قیام کلکتہ کے زمانہ میں چندر نگر کا بھی سفر کیا تھا، جو اس وقت فرانسیسیوں کے قبضہ میں تھا، وہ چاندنی راتوں میں

دریائے ہگلی کی سیر سے لطف اندوز ہوتے تھے۔

مولانا کی نظم "شان کلکتہ" کا تاریخی پس منظر

انڈین ڈیلی نیوز نامی ایک انگریزی اخبار کی اشاعت بابت ۲۷ جولائی ۱۹۲۶ء میں ایک مضمون شائع ہوا تھا، جس کے ایک پیراگراف میں پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر نہایت نازیبا اور رکیک حملے کیے گئے تھے، اہانت رسول کے اس دلخراش واقعہ سے کلکتہ کے مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی، انھوں نے پُرامن احتجاج کیا اور گورنر بنگال سے اس دریدہ دہن ایڈیٹر کو قرار واقعی سزا دینے کا مطالبہ کیا، گورنر کے ایما پر ایڈیٹر مذکور نے ۴ ستمبر ۱۹۲۶ء کو اظہار افسوس کیا، جس کے انداز تحریر سے مسلمانوں کو تشفی نہیں ہوئی، اور انھوں نے ہالی ڈے پارک موجودہ محمد علی پارک میں ایک احتجاجی جلسہ منعقد کرنے کا اعلان کیا، لیکن حکومت نے نقض امن کے بہانے اس پر پابندی لگا دی، اس سے مسلمانان کلکتہ میں اور اشتعال پیدا ہوا، گورنر نے کلکتہ کے سربرآوردہ مسلمانوں کو افہام و تفہیم کے لیے ملاقات کی دعوت دی، چنانچہ مختلف علاقوں کے پچاس مسلم رہنماؤں نے گورنر سے اسمبلی چیمبر میں ملاقات کی، مولوی مظہر الدین منیجر "جمہور" نے اردو میں تقریر کی، جس کا انگریزی ترجمہ شیر بنگال آنریبل اے۔ کے فضل الحق نے کیا، گورنر نے جلسۂ احتجاج ملتوی کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کے تہوار بقرعید اور محرم اور ہندوؤں کے تہوار درگا پوجا قریب ہیں، اس لیے ان تہواروں کے پُرامن گذر جانے کے بعد آپ لوگ احتجاجی جلسہ منعقد کریں، مسلمانوں نے نہایت صبر و ضبط سے کام لیا، اسی اثنا میں کچھ شرپسند عناصر کی اشتعال انگیزی سے متعصب یوروپین پولیس افسروں اور گورے فوجیوں نے پُرامن مسلمانوں پر اندھا دھند فائرنگ کر دی تو مسلمانوں کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا، ان کے عشق رسول کے ولولوں نے جنون کا دامن تھام لیا، اور جنون کی سرگشتگی سے آگے بڑھ کر جامۂ ہستی کا گریبان پکڑ لیا اب کیا تھا، مسلمانوں نے دنیا کی زندگی کو دین کی دیوانگی پر قربان کر دیا، تین روز تک کلکتہ میں خاص طور سے

زکریا اسٹریٹ، کولوٹولہ، چیت پورہ، ہالی ڈے روڈ، موجودہ سنٹرل ایونیو اور مچھوا بازار کے کوچہ و بازار میں یوربین پولیس افسروں اور گورے سپاہیوں کی گولی سے شمع رسالت کے جان نثار پروانوں نے جام شہادت نوش کیا، اور سینکڑوں مسلمان زخمی اور گرفتار ہوئے، پولیس کے سپاہیوں کے علاوہ کئی اعلیٰ افسر بھی شدید زخمی ہوئے، صرف زکریا اسٹریٹ اور اس کے اردگرد علاقوں میں مسلمانوں نے گولیاں چلانے والے تین اعلیٰ پولیس افسروں کے ریوالور چھین لیے گئے، میڈیکل کالج اور مومن پور مردہ خانوں میں تیس [۳۰] مسلمانوں کی لاشیں کئی روز تک بے گور و کفن پڑی رہیں، جنھیں بعد میں سولہ آنے قبرستان میں دفن کیا گیا، راجہ بازار، ویلسلی اسٹریٹ، ایسٹ روڈ، ملک بازار، کنڑایہ، لنٹن اسٹریٹ خضرپور اور بھول بگان روڈ میں فسادات ہوئے، آتش زنی بھی ہوتی رہی، خضرپور کے کارخانوں اور ملوں کے پانچ ہزار مسلم مزدوروں نے جلوس نکال کر کلکتہ کے احتجاجی جلسہ میں شرکت کرنا چاہا لیکن راہ میں گارڈن ریچ لیبر بورڈ کے ڈپو کے پاس جلوس کو روک دیا گیا، اہل جلوس دین دین، علی علی کا نعرہ لگاتے، اور نقارہ بجاتے ہوئے آگے بڑھنے لگے، سمرسٹ رجمنٹ کے گورے سپاہیوں نے ان دین کے متوالوں اور نبیؐ کے دیوانوں پر گولیوں کی بوچھار کر دی، ستر [۷۰] مسلمان شہید اور تیرہ [۱۳] زخمی ہوئے، مسلمانوں نے فوجیوں کی شعلہ بار بندوقوں کا مقابلہ ڈنڈوں اور تلواروں سے کیا، تین [۳] روز تک حکومت کا نظام درہم برہم رہا، مسلمانوں نے بلند حوصلگی، شجاعانہ معرکہ آرائی، اور شوق شہادت کا عدیم النظیر کارنامہ انجام دیا، جس کو کلکتہ کے تمام اخبارات نے تفصیل سے شایع کر دیا۔ (ملاحظہ ہو اخبار اسٹیٹسمین اور امرت بازار پتریکا وغیرہ، مورخہ ۱۰/۱۱/۱۲/۱۳/ اور ۱۴/ ستمبر ۱۹۱۸ء، نیوز پیپر سکشن، نیشنل لائبریری، کلکتہ)

علی برادران اور ان کا زمانہ" کے فاضل مصنف کے مطابق مولانا محمد علی کو چھنڈواڑہ کی نظر بندی کے زمانہ میں اخبارات کے مطالعہ کی اجازت تھی، اس لیے ان واقعات کو پڑھ پڑھ کر

محبت رسولؐ کے اس پرستار بادہ کش نے زنداں کے در و دیوار کو گواہ بنا کر ایک دم توڑتی ہوئی ملت کے دامن کو محبت رسولؐ کے آنسوؤں سے بھگو کر کلکتہ کے جیالے مسلمانوں کی متاع حیات کی قربانی و ایثار پر خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے "شان کلکتہ" کے عنوان سے ایک طویل نظم کہی، جس کا مولانا کے تاریخی پس منظر میں مطالعہ کرنے سے الفاظ و معانی کے پیکر میں مولانا کے درد عشق میں ڈوبے ہوئے دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں، نظم ملاحظہ ہو:

اللہ نے بڑھائی ہے کیا شانِ کلکتہ — روحِ رسولؐ آج ہے مہمانِ کلکتہ

یثرب کی خاک پاک کے ہر ذرہ کے لیے — سو جان سے فدا ہیں غلامانِ کلکتہ

ہر سو ہیں لاشہ ہائے شہیدانِ سرخ پوش — ہے آج گل بہار پہ ایمانِ کلکتہ

تھا چونکہ خار راہ سے بے خوف اس لیے — پھولوں سے بھر دیا گیا دامانِ کلکتہ

ہے شور آسمان و زمیں پر ہٹو، بچو! — ہیں عازمانِ خلد شہیدانِ کلکتہ

اب تک دلوں میں باقی ہے قالوا بلیٰ کی یاد — البتہ استوار ہے پیمانِ کلکتہ

ہو زور کفر و شرک سے مرعوب کس لیے — اللہ جب کہ خود ہے نگہبانِ کلکتہ

پہلے سے بڑھ کے آج ہے یہ پایۂ تخت ہند — کل ملک کی سر آنکھوں پہ فرمانِ کلکتہ

ہے امتحاں منافق و مومن کا دوستو! — میزان حشر بن گئی میزانِ کلکتہ

سب جلد تر شریک صلوٰۃ و فلاح ہوں — سن لی ہے اب ہر ایک نے اذانِ کلکتہ

احسان کی جزا انہیں احسان کے سوا — اترے گا سر کے ساتھ ہی احسانِ کلکتہ

ہم سنتِ خلیل کے پابند ہوں تو کیوں — پھولے نہ آگ ہی سے گلستانِ کلکتہ

تقلید اہل بیت کریں ہم تو کیا عجب — میدانِ کربلا بنے میدانِ کلکتہ

مسرور خلد میں ہیں شہیدانِ کانپور — ہوں گے شریک بزم شہیدانِ کلکتہ

شبلی سا شخص نوحہ گر کانپور تھا
لاریب آج تھا وہی شایانِ کلکتہ

دنیا سے اٹھ گیا مگر اب امتیاز شعر
جوہر سا شخص اور ہو شاخوانِ کلکتہ

لیکن ہے اک خفیف سی نسبت سے کچھ امید
میں بھی کبھی تھا ایک مسلمان کلکتہ

آغاز کلکتہ تو میسر ہوا ضرور
یارب نصیب ہو کہیں پایان کلکتہ

(چھندواڑہ ۱۶ ر دسمبر ۱۹۲۰ء)

کانگریس کا اسپیشل اجلاس ۱۹۲۰ء میں کلکتہ میں کانگریس کا اسپیشل اجلاس منعقد ہوا، جس میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خان، ڈاکٹر سید محمود اور دیگر مسلم لیڈروں کے علاوہ علی برادران بھی شریک ہوئے، ان ہی مسلم زعماء سے تبادلۂ خیال کرکے گاندھی جی نے ترک موالات کی تحریک منظور کرائی، اس سلسلہ میں مولانا محمد علی جوہر نے نمایاں کردار ادا کیا، اسی جلسہ میں گاندھی جی نے مولانا ہی کے مشورہ سے تحریک خلافت کو کانگریس کے پروگرام میں شامل کرلیا، گرچہ پنڈت مدن موہن مالویہ اور رابندر ناتھ ٹیگور نے اس کی مخالفت کی۔

خلافت کانفرنس محمد علی کی ڈائری میں درج شدہ مولانا کے مکتوب مورخہ ۱۴ر اپریل ۱۹۲۴ء سے معلوم ہوتا ہے کہ مارچ ۱۹۲۴ء میں کلکتہ میں خلافت کانفرنس ہوئی تھی، جس میں علی برادران نے بھی شرکت کی تھی، اس کانفرنس میں شرکت کرنے والے کچھ لوگ آج بھی پرانی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے کلکتہ میں بقید حیات ہیں، ان کے بیان کے مطابق تحریک خلافت میں مسلمانان کلکتہ نے بڑے جوش و خروش سے حصہ لیا تھا، مولانا کی آمد پر مسلمانوں نے ہر محلہ سے جلوس نکال کر ہوڑہ اسٹیشن پہونچ کر ان کا شاندار استقبال کیا تھا، خصوصاً مچھوا بازار کا جلوس قابل دید تھا، جس کے آگے آگے خلافت کمیٹی کلکتہ کے رضاکار گھوڑوں پر سوار ہو کر نہایت شان سے چل رہے تھے، کلکتہ کی فضا میں ہر طرف اللہ اکبر اور علی برادران زندہ باد کے نعرے گونج رہے تھے، محمد علی کی ڈائری کے مطابق مولانا نے خلافت کمیٹی کے فنڈ کیلئے

تو ہزاروں روپیہ چندہ وصول کیا تھا، ان کا قیام کلکتہ نہایت مختصر تھا، اس لیے وہ چندہ کی رقم میں اضافہ نہ کرسکے، جس کا انھیں افسوس تھا۔

لیتھو مشین | "معاصرین" میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا ہے کہ مولانا نے ۱۹۲۴ء میں کامریڈ اور ہمدرد کا دہلی سے دوبارہ اجرا کیا تو لیتھو مشین کلکتہ سے منگوائی تھی۔

کرزن پارک میں جلسہ | کلکتہ میں عربی وفارسی کے متبحر عالم پروفیسر محمد اسمٰعیل کے بیان کے مطابق علی برادران، پنڈت مدن موہن مالویہ کے ساتھ کلکتہ تشریف لائے تھے۔ کرزن پارک میں جلسہ ہوا تھا، جس میں مولانا محمد علیؒ نے سوراج پر تقریر کرتے ہوئے یہ اشعار پڑھے تھے:

مسلمانو! تعلق چھوڑ دو اقبال برٹش سے — اگر ہے پاسداری تم کو کچھ آیاتِ قرآں کی
بنے گا جس طرح سوراج لے لیں گے دسمبر تک — بتاتی ہے یہ مضبوطی ہیں گاندھی کے پیماں کی

تقریر کے اختتام پر ایک مسلمان نے کھڑے ہو کر ان سے سوال کیا: سوراج سے مسلمانوں کو کیا فائدہ ہوگا؟ مولانا نے جواب دیا: سوراج ملنے پر مسلمان بھی اس ملک کی حکمرانی میں حصہ دار ہوں گے، اس شخص نے پھر کہا: ہندو اکثریت میں ہیں، وہ مسلمانوں کو ان کا جائز حق نہیں دیں گے، مولانا نے جواب دیا: مسلمانوں کو ہندو اکثریت سے خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے، جب خواجہ غریب نواز ہندوستان تشریف لائے تو ان کے ہمراہ چند خاک نشین فقراء تھے، لیکن ان کے زمانہ میں ہندوستان میں اسلامی سلطنت کی ایسی بنیا دپڑی کہ مسلمان چند سو برس تک اس ملک کی تقدیر کے گیسو اپنے شانۂ تدبیر سے سنوارتے رہے، اس شخص نے پھر سوال کیا: اگر ہندو اپنی اکثریت کے زعم میں مسلمانوں کو ان کے جائز حق سے محروم کردیں تو آپ کیا کریں گے؟ اس چبھتے ہوئے سوال سے ان کو جلال آگیا، انھوں نے گرجدار آواز میں کہا: اول تو ہندو ایسی بے انصافی نہیں کریں گے، اگر انھوں نے ایسا کیا تو ہم اپنے حقوق کے حصول کے لیے ان سے جنگ کریں گے، پنڈت مدن موہن مالویہ مولانا کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگے۔

بیکر ہوسٹل میں تقریر | اسی زمانہ میں کلکتہ میں بیکر ہوسٹل کی ڈیبیٹنگ سوسائٹی نے مولانا کو تقریر کرنے کی دعوت دی، بیکر ہوسٹل چونکہ سرکاری ہوسٹل ہے، اس لیے گورنر کے ایگزیکیٹو کونسل کے ممبر شری پی. سی. مترسے انعقاد جلسہ کی اجازت مل گئی، لیکن انھوں نے یہ شرط لگا دی کہ کسی قسم کی سیاسی تقریر کی اجازت نہیں، یہ جلسہ ڈائننگ ہال میں منعقد ہوا تھا، جس میں کلکتہ یونیورسٹی، کالجوں، اسکولوں، مدرسہ عالیہ کے مسلم اساتذہ، سیاسی رہنماؤں، مدیران اخبارات و رسائل، سماجی کارکنوں اور اونچے درجات کے طلبہ نے کثیر تعداد میں شرکت کی، پروفیسر محمد اسماعیل بھی جو اس وقت اسلامیہ کالج، موجودہ مولانا آزاد کالج کے طالب علم تھے، مولانا کی انگریزی تقریر سننے کے شوق میں شریک ہوئے تھے، مولانا کے علمی تفوق اور انگریزی دانی کا ایسا رعب چھایا ہوا تھا کہ کوئی بھی صاحب علم جلسہ کی صدارت کے لیے تیار نہ ہوا، بالآخر مولانا شوکت علی کو باتفاق رائے صدر منتخب کیا گیا، مولانا شوکت علی نے صدارت کی کرسی پر رونق افروز ہوتے ہوئے انگریزی میں کہا: "میرے چھوٹے بھائی محمد علی ایک طوفان ہیں، کوئی انھیں روک نہیں سکتا لیکن میں ان کا بڑا بھائی ہوں اور اتنی طاقت رکھتا ہوں کہ اپنی قوت بازو سے اس طوفان کے جھونکوں کو روک لوں گا۔" مولانا محمد علی نے حاضرین سے دریافت کیا، میں کس موضوع پر تقریر کروں، جلسہ کے منتظمین نے حکومت کی مشروط اجازت کے پیش نظر فرمایش کی کہ آپ عالمی تہذیب کے فروغ میں مسلمانوں کا حصہ، پر روشنی ڈالیں، آپ نے اپنی تقریر کا آغاز تلاوت کلام پاک سے کیا، تقریر کیا تھی، فضیلت علمی، وسعت معلومات، تواریخ عالم کا گہرا مطالعہ، انگریزی زبان پر عالمانہ دسترس، بے مثال قوت حافظہ اور اثر آفریں انداز خطابت کا ایک سیل رواں تھی، سامعین ان کی تقریر سننے میں محویت و استغراق کے ساتھ گوش برآواز تھے، پورے ہال میں سکوت کا عالم تھا، اور صرف ان کی پاٹ دار آواز گونج رہی تھی، انھوں نے اپنی تقریر کے دوران عالمی تہذیب کے فروغ میں مسلمانوں کی گوناگوں خدمات کا حوالہ دیتے ہوئے اول صف میں بیٹھے ہوئے داڑھی مونچھ منڈے مسلمان پروفیسروں اور اسکالروں

کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے طنزاً کہا: "اور یہ داڑھی مونچھ منڈے مسلمان مغربی تہذیب کے پیدا کردہ ہیں"۔ اس وقت یہ بے ریش و بروت تعلیم یافتہ مسلمان خجالت و ندامت سے پانی پانی ہو گئے۔ نماز عصر کے بعد تقریر شروع ہوئی تھی اور اب نماز مغرب کا وقت قریب آگیا تھا، مولانا نے اپنی تقریر ملتوی کر دی اور کہا: مدت ہوئی کہ کسی خوش الحان قاری کی تلاوت سے محظوظ نہیں ہوا، اگر آپ میں کوئی قاری ہوں تو نماز کی امامت کریں، تاکہ میں روحانی تشنگی بجھا سکوں، لیکن اتفاق سے وہاں کوئی قاری موجود نہ تھا، کلکتہ مدرسہ کے پرنسپل خان بہادر مولوی محمد یوسف صاحب کو امامت کے لیے کہا گیا، لیکن انھوں نے انکار کر دیا، آخر کار مولانا ہی نے نماز پڑھائی، نماز سے فارغ ہو کر دوبارہ تقریر کا سلسلہ شروع کیا، انھوں نے چار گھنٹے تقریر کی، اور اپنی بے پناہ قوت گویائی، علمی اہلیت و صلاحیت اور ساحرانہ خطابت کا سکہ بٹھا دیا۔

زکریا اسٹریٹ کی مسجد میں تقریر سید سلیمان داؤد، سابق خزانچی کلکتہ خلافت کمیٹی کا بیان ہے کہ علی برادران جب کلکتہ تشریف لاتے تھے تو کلکتہ خلافت کمیٹی کے دفتر ۴۸ زکریا اسٹریٹ میں بھی ضرور آتے تھے، ملا جان محمد ان کی خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے، ایک بار انھوں نے دفتر میں ہی رات بسر کی تھی، زکریا اسٹریٹ کی مسجد میں نماز کے بعد تقریر بھی کی تھی، یوں تو عام طور سے متولیوں کی طرف سے تقریر کرنے کی ممانعت ہے، لیکن بھلا مولانا محمد علی کو روکنے کی ہمت کس کو تھی، وہ تقریر کے دوران قرآنی آیات کا حوالہ بھی دیا کرتے تھے۔

صاحبزادی کا عقد 'محمد علی کی ڈائری' میں لکھا ہے کہ مولانا کی تیسری صاحبزادی حمیدہ بانو کا عقد رامپور ہی کے ایک عزیز ساجد علی خان سے ہوا تھا، جو الیکٹریکل انجینیرنگ سے واقف تھے، اور اپنا کاروبار رامپور کے علاوہ کلکتہ میں بھی رکھتے تھے، وہ اکثر کاروباری سلسلہ میں کلکتہ میں کئی روز تک قیام بھی کرتے تھے۔

کلکتہ کے قوال مولانا کو نعتیہ قوالی سننے کا بہت شوق تھا، کبھی کبھی غزلیں بھی سن لیتے تھے، خود بھی شعری ذوق رکھتے تھے، مٹیا برج کے جناب ظہیر احسن ہاشمی فرماتے تھے کہ ۱۹۲۶ء میں مولانا جب کلکتہ تشریف لائے تو

جناب شہید سہروردی کے دولت کدہ پر مہمان ہوئے، انھوں نے شہید صاحب سے فرمائش کی کہ میں نے کلکتہ کے پیارے قوال کا بہت شہرہ سنا ہے، اس لیے ان کی قوالی سننے کا خواہشمند ہوں، شہید صاحب نے فوراً موٹر بھیج کر پیارے قوال کو ترکل ڈانگا سے بلوا بھیجا، وہ مولانا کا نام سن کر فوراً ہارمونیم طبلہ لیکر حاضر خدمت ہوگئے، قوالی شروع ہوئی، لیکن چند ہی اشعار سن کر مولانا نے قوالی موقوف کرادی اور پیارے قوال کو رخصت کردیا، اس کے بعد انھوں نے کہا، سنا ہے مٹیا برج میں کوئی گلوکار پیارے صاحب ہیں، جن کی نغمہ سرائی کی بھی کلکتہ میں دھوم مچی ہے، آپ ان کو بھی بلائیں، شہید صاحب نے ان کو بھی بلوایا، پیارے صاحب سے کئی نعتیں اور غزلیں مولانا نے سنیں اور پسندیدگی کا اظہار کیا، جب قوالی کی مجلس برخاست ہوگئی تو شہید صاحب نے مولانا سے دریافت کیا کہ آپ نے پیارے قوال کی قوالی پسند نہیں کی، حالانکہ وہ کلکتہ کے مشہور و معروف قوال ہیں، مولانا نے جواب دیا: بے شک وہ اچھا گاتے ہیں، لیکن نعت گاتے وقت وہ منھ ٹیڑھا کر لیتے تھے، جس کو میں نے پسند نہیں کیا کہ کوئی سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں نعت گاتے وقت منھ ٹیڑھا کرلے، کیونکہ یہ دربار رسالت میں سراسر بے ادبی اور گستاخی کے مترادف ہے، پیارے صاحب نے ایسی بے ادبی نہیں کی، اس لیے میں دیر تک ان کی نعت سرائی سے لطف اندوز ہوتا رہا،

محمد علی کی ڈائری جلد دوم صفحہ ۔ ، میں مولانا محمد علی کا ایک خط مورخہ ۱۶ راگست ۱۹۲۸ء درج ہے، جس میں انھوں نے مولانا عبدالماجد دریابادی کو اپنے اس ذوق کے بارے میں لکھا ہے کہ کلکتہ کی مشہور مغنیہ گوہر جان نے مجھے دعوت دی تھی کہ کبھی کبھی تو گھر آکر سن لیجیے، میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ سوائے اقبال اور حسرت کی غزلوں کے آپ کو اور کچھ نہ سناؤں گی، لیکن میں نے معذوری کا اظہار کیا، البتہ جب کلکتہ جاتا ہوں تو پیارے صاحب کا گانا ضرور سن لیتا ہوں، یہ گوہر جان وہی تھیں جن کی گوہر بلڈنگ لوئر چیت پور روڈ پر مسجد ناخدا کے شمال میں واقع ہے۔

مسٹر جناح | سید محمد ہادی نے "علی برادران اور ان کا زمانہ" میں لکھا ہے کہ ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۸ء میں آل پارٹیز کانفرنسیں منعقد ہوئیں، اور آل مسلم پارٹیز کانفرنسیں بھی ہوئیں، کلکتہ کی ایک ایسی ہی کانفرنس میں جس کے صدر مسٹر جناح تھے، محمد علی تقریر کرنے کے لیے تیار ہوئے تو مسٹر جناح نے مولانا کو تقریر کرنے سے روک دیا۔ ۱۹۲۸ء میں پارک سرکس کے علاقہ میں آل انڈیا کانگریس کا بھی اجلاس منعقد ہوا تھا، جس میں گاندھی جی سے مولانا کا اختلاف پیدا ہوگیا تھا، جو ان کی کانگریس سے علٰحدگی کا سبب ہوا، پارک سرکس میں کانگریس ایگزی بیشن روڈ اسی اجلاس کی یادگار ہے۔

تانتی باغ میں جلسہ | تانتی باغ کے مشہور قومی کارکن ماسٹر شمس الدین صاحب تھے، جو ہر وقت لال ترکی ٹوپی پہنے رہتے تھے، اس لیے 'لال ٹوپی' کے نام سے مشہور تھے، وہ اپنے علاقہ کے تعلیمی، اصلاحی اور فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، دوسرے صاحب سکندر میر پنجابی تھے، جو خلافت تحریک کے سرگرم کارکن تھے، ان دونوں نے مل کر مولانا محمد علی کو تانتی باغ کے جلسہ میں تقریر کرنے کے لیے مدعو کیا تھا، تانتی باغ کے مشہور عالم دین مولانا محمد یحییٰ، سابق ایڈیٹر المومن نے جو اب پیرانہ سالی کے باعث آج کل معذور ہو چکے ہیں، راقم الحروف سے فرمایا کہ ۹ تانتی بگان لین میں مولانا کی تقریر ہوئی تھی جس میں پھول بگان، تانتی باغ، جان نگر روڈ اور قرب و جوار کے مسلمانوں نے کثیر تعداد میں شرکت کی تھی، اور مولانا کا شایان شان استقبال کیا تھا، مولانا کی تقریر سن کر حاضرین جلسہ جوش ایمانی اور جذبۂ اسلامی میں بار بار اللہ اکبر کے نعرے لگاتے تھے، اور کبھی کبھی علی برادران زندہ باد کے نعرے بھی گونج اٹھتے تھے۔

براہ کلکتہ رنگون کا سفر | 'محمد علی کی ڈائری' میں لکھا ہے کہ مولانا ۳ یا ۴ مارچ ۱۹۲۹ء کو رنگون کے سفر کیلیے کلکتہ آئے تھے، اس وقت ان کے سکریٹری ڈاکٹر ذاکر حسین تھے جو بعد میں ہندوستان کے صدر منتخب ہوئے تھے، مولانا چند روز کلکتہ میں قیام کرنے کے بعد بذریعہ بحری جہاز رنگون روانہ ہوئے تھے۔

کلکتہ میں مولانا کے معاصرین

کلکتہ میں مولانا کے احباب اور قدر دانوں کا حلقہ بہت وسیع تھا، جن میں شیر بنگال جناب اے۔ کے فضل الحق، شہید سہروردی، نواب شمس الہدیٰ، مولانا اکرم خان، ایڈیٹر آزاد بنگلہ، جناب شایق احمد عثمانی مالک و ایڈیٹر روزنامہ عصر جدید، خان بہادر محمد جان، ملا محمد جان، علامہ رضا علی وحشت، جناب شمس الحق عرف بڑے میاں، حاجی یوسف سیٹھ، جناب مولانا محمد یحییٰ، شمس العلما مولانا نذیر احمد سکریٹری انجمن مفید الاسلام، جناب حاجی حیات پنجابی، جناب ایم۔ ایم اصفہانی، عبد الغنی سردار پھول بگان، جناب عبد الحمید سردار مارکل ڈانگا، خان بہادر مومن، سیٹھ عبد الرحیم عثمان، شری سی آر داس، شری بپن چندر پال، سبھاش چندر بوس، اور مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

کلکتہ میں مولانا کی وفات کا سوگ

مولانا نے ۴ جنوری ۱۹۳۱ء بمطابق ۵ ار شعبان المعظم ۱۳۵۰ھ میں خاک وطن سے دور، بہت دور دیار غیر لندن میں اپنے الہامی مصرع "مارا دیار غیر میں مجھ کو وطن سے دور" کی پیشین گوئی کے مطابق وفات پائی، کلکتہ میں اس وحشت اثر خبر مرگ سے کہرام مچ گیا، کاروبار زندگی معطل ہو گیا، دوکانیں، اسکول، کارخانے اور بازار بند ہو گئے، خصوصاً مسلم علاقوں میں صف ماتم بچھ گئی، ہر آنکھ غم سے پرنم اور ہر دل درد سے فگار تھا، مسلمانوں نے غائبانہ نماز جنازہ ہالی ڈے پارک موجودہ محمد علی پارک میں اور کئی اور جگہ ادا کی، محلوں میں قرآن خوانی بھی ہوئی، اور تعزیتی جلسوں کا بھی انعقاد ہوا، کلکتہ کے تمام اخبارات نے ان کی موت کی خبر جلی سرخیوں میں شایع کی اور اڈیٹوریل میں ان کی آزادئ ہند کی تحریک میں خدمات اور قربانیوں کا تذکرہ کیا۔

یادوں کی کہکشاں

مولانا کو کلکتہ سے جو والہانہ محبت اور عاشقانہ تعلق تھا اس کا اظہار ان کے اس شعر سے ہوتا ہے:

مجھ کو بھی اک خفیف سی نسبت ہے امید ؛ میں بھی کبھی تھا ایک مسلمان کلکتہ

انھوں نے جس طرح اس شہر نگاراں کے ساتھ اپنی خفیف سی نسبت سے دامن امید یا منعقد رکھا تھا اور خود کو ایک مسلمان کلکتہ کہہ کر فخر و مباہات کا اظہار کیا تھا، اسی طرح کلکتہ کے مسلمانوں نے بھی اپنی بے پایاں محبت و عقیدت کی صداقت کے ثبوت میں محمد علی پارک، محمد علی لائبریری، محمد علی اسکول، محمد علی ہسپتال جیسے مفید ادارے قائم کر کے اس سرزمین پر ان کی یادوں کی کہکشاں روشن کر رکھی ہے، جس کی ضیا پاشیوں کو مرور زمانہ کی باد صرصر کے تیز و تند جھونکے بھی کبھی بجھا نہ سکیں گے، آج یہ مجلس مذاکرہ علمی محمد علی جوہر کی یاد کو زندہ، تابندہ اور درخشندہ کرنے کے لیے منعقد کی گئی ہے، ان کی اس لافانی روح کے لیے مسرت و طمانیت اور جمعیت کا باعث ہوگی، جو اسلام کے قبلۂ اول بیت المقدس کی خاک کے نیچے اور مسجد عمر کے زیر سایہ اپنے حسن المآب سے ہمیں دیکھ دیکھ کر یہ شعر پڑھ رہی ہوگی ؎

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے ‎ ‎ مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

مولانا محمد علیؒ
کی
یاد میں

مصنف اس کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ ملک کے سیاسی لیڈروں میں سب سے زیادہ مولانا محمد علی جوہر سے متاثر ہوا، میں نے اپنی اس وقت تک کی زندگی میں بہت سے سیاسی رہنماؤں کو دیکھا، مگر مولانا محمد علیؒ میں جو غیر معمولی خوبیاں تھیں، ان میں کسی کو بھی ان کا ہمسر نہیں پایا، محمد علی جوہر پر یہ کتاب ان کے انھی عقیدت مندانہ تاثرات اور سرشارانہ کیفیات کی آئینہ دار ہے، اس سلسلہ میں مولانا محمد علیؒ کی ہنگامہ خیز اور طوفان انگیز سیاسی زندگی کے حالات بھی آگئے ہیں،

مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمن۔ ‎ ‎ (زیر طبع)

مولانا سید سلیمان ندویؒ

کی

صد سالہ یادگار ولادت

(۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ جمعہ تا ۱۴ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ اتوار، مطابق ۱۲ دسمبر ۱۸۸۴ء تا ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء)

از ڈاکٹر حمید اللہ، پیرس

"یہ تحریر حضرت مولانا محمد اشرف صاحب سلیمانی کے رسالہ "البیان" (پشاور) میں شائع ہوئی تھی، ہم معارف کے ناظرین کی خدمت میں اس کو پیش کر رہے ہیں"۔ ——— "معارف"

جشن قرآن مجید میں حکم ہے: "وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ"۔ اس کا اولین اطلاق جشن میلاد النبیؐ پر ہوگا کہ کسی نبی کی بعثت سے بڑھ کر کسی قوم کے لیے کیا چیز نعمت ہو سکتی ہے، (اور اس تحدیث نعمت کا اک طریقہ بھی قرآن مجید نے بتا دیا ہے:

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ، يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا)

قرآن مجید میں ___ کے سالانہ "یوم الزینۃ" کا بھی ذکر ہے، اور مدین کے "ثمانی حجج" میں بھی سالانہ جشنوں کا ذکر ہے، اور ان کی قرآن نے تقبیح نہیں کی ہے۔

العلماء ورثۃ الانبیاء" کے مطابق تحدیث نعمت کے استحقاق میں علما کی علمی خدمتیں بھی لازماً داخل ہو جاتی ہیں۔

مرحوم مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اردو کے علاوہ عربی میں بھی بہت کچھ لکھا ہے، معلوم نہیں عرب ممالک میں کسی کو ان کی یاد تازہ کرنے کی توفیق ہوئی یا نہیں، البتہ فرانس میں ان کی پیدایش کی صد سالہ یادگار منائی گئی ہے، اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ جامعہ پیرس نے ڈیڑھ سو سال سے زیادہ عرصہ سے اردو کی کرسی قائم کر رکھی ہے، اور گارسین دتاسی سے لیکر وہاں اب تک اردو کی تدریس جاری ہے، علی گڑھ، پٹنہ، دہلی اور کراچی میں بھی یادگاری جلسے ہوئے ہیں، اور اعظم گڈھ میں ہونے والا ہے۔

فرانس میں ۲۵ نومبر ۱۹۸۴ء اتوار کو صبح کے نو بجے سوا نو بجے تک پندرہ منٹ فرانسیسی ٹیلی ویژن نے مولانا سید سلیمانؒ کی ولادت کی صد سالہ یادگار منانے کے لیے مختص کیے تھے، شروع میں چند منٹ قرآن مجید کی تلاوت مع ترجمہ عمل میں آئی، پھر افغانستان کے ایک سابق سفیر و وزیر عبدالغفور فرہادی صاحب نے مرحوم کے متعلق کچھ باتیں بتائیں، اور ان کے مزار کی چند تصویریں دکھائیں، اور انکی اہم تالیفوں کے سرورق (ٹائٹل) دکھلائے، بعد ازاں چند منٹوں کا ایک مضمون فرانسیسی میں جناب سید سالار الدین محمد نے (جو کاریکال کے باشندے اور مدرسۃ السنۃ شرقیہ میں فہرست نگار ہیں) سنایا، اس کے لکھنے میں غالباً ان کی فاضل بیوی بھی شریک رہیں۔

اسی دن ظہر کی نماز کے بعد پیرس کے محلہ اشالن گراڈ کی جامع مسجد میں (جو یہاں کے تقریباً تین ہزار مصلیوں کی گنجایش رکھنے والی سب سے وسیع مسجد ہے) رابطۃ الطلاب الاسلامیین کی طرف سے میرا کوئی دو ڈھائی گھنٹے طویل لکچر فرانسیسی میں ہوا اسکا جملہ بہ جملہ عربی میں ترجمہ بھی ہوتا رہا، آخر میں حاضرین نے کچھ سوالات بھی کیے کہ انھوں نے پہلی دفعہ یہ نام سنا اور ان علمی کارناموں سے واقفیت حاصل کی، اس میں گورے، کالے، سانولے ہر ملک کے مسلمان مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔

اس کے چند دن بعد ۱۲ دسمبر ۱۹۵۳ء کو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں جلسہ ہوا، صدر شعبہ جناب محمد عبدالماجد صاحب کے علاوہ اس ناچیز نے بھی فرانسیسی میں مرحوم کے حالات بیان کیے، اور ٹیلی ویژن والی تصویریں یہاں بھی دکھائی گئیں

بریلوی بھائیوں کی ایک تبلیغی انجمن ہے، جس کی شاخیں لندن اور پیرس میں بھی ہیں، آخر الذکر نے بھی اسی زمانہ میں ایک جلسہ کیا، جس میں مجھ سے بھی اردو میں ایک تقریر کرائی گئی، اس سے اہل ہند و پاکستان کو بھی بہت سی چیزیں نئی معلوم ہوئیں،

یہاں جامعات میں چونکہ سیاسیات کی تعلیم بھی ہوتی ہے، اس کے لیے ایک "مرکز تحقیقات بین الممالک" نامی بڑا ادارہ معلومات جمع کرنے کے لیے قائم ہے، اس نے بھی طے کیا ہے کہ ماہ آیندہ یعنی فروری میں حضرت ممدوح کے حالات پر ایک جلسہ کرائے، ان شاء اللہ کار آمد ہی ہوگا۔

<u>شخصیت</u>| ان کے والد بزرگوار جناب سید ابوالحسن اور دادا سید محمد شیر تھے، یہ علاقۂ بہار کے ایک گاؤں دیسنہ میں پیدا ہوئے، جو شہر پٹنہ کے قریب ہے، اور بڑا مردم خیز خطہ رہا ہے، نالندہ کی پرانی یونیورسٹی کے آثار قدیمہ اور گوتم بدھ کی تپسیا کا مقام بھی اسی نواح میں بتایا جاتا ہے۔

وہ جمعہ ۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ کو پیدا ہوئے، اس کی معادل فرنگی تاریخ بعض لوگوں نے ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء لکھی ہے جو غلط ہے، جیسا کہ ابھی نیچے عرض ہوگا، ان کی تاریخ ولادت پر ایک قطعہ ان کے دادا کی طرف منسوب ہے جس میں کہا ہے: ؎

بگفتا کہ بے داد شد مصرع ــــــــــــ شدہ مہر تاباں ز برج کمال

$$\begin{array}{r} 1311 \\ -9 \\ \hline 1302 \end{array}$$

فرنگیوں نے تقابلی تقویموں کی جدولیں کئی صدیوں سے تالیف کرنی شروع کی ہیں، قدیم ترین لاطینی میں ہے، اب مغرب کی ہر بڑی زبان میں موجود ہیں، اور ان ہی کا عربی اور اردو میں ترجمہ بھی

ہوا ہے، اور فرنگیوں کی غلطیوں کا اعادہ بھی ہوا ہے، بات یہ ہے کہ ان فرنگی جاہلوں نے سال بسال، ماہ بماہ کی حقیقی رویت ہلال کی جگہ ایک من گھڑت اصول بنا کر اس پر عملدرآمد کیا ہے، ان کے نزدیک محرم، ربیع الاول، جمادی الاولیٰ، رجب، رمضان، ذی القعدہ ہمیشہ تیسے ہوتے ہیں، اور صفر، ربیع الآخر، جمادی الاخریٰ، شعبان، شوال ہمیشہ انتیسے اور ذی الحجہ حسب حساب کبھی انتیسا اور کبھی تیسا ہوتا ہے، یہ اس لیے غلط ہے کہ ایسا نہیں ہوتا، بچہ بچہ جانتا ہے کہ رمضان کبھی انتیسا ہوتا ہے، کبھی تیسا، مشاہدہ ہے کہ کبھی چار چار مہینے مسلسل تیسے ہوتے ہیں، تو تین تین مہینے انتیسے بھی ہوتے ہیں، فرنگی جدولوں میں دو تین دن کی غلطی ہو سکتی ہے، مثلاً تاریخ وفات ۱۴ ربیع الاول مطابق ۲۲ نومبر ان جدولوں میں نہیں ملے گی، ایک دن کا فرق ملے گا، یعنی ۲۱ نومبر سنیچر بیان ہوگا:

جو بھی ہو، ایک فرنگی جدول میں جو سامنے ہے، لکھا ہے کہ ۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ واقعی جمعہ کے دن ہوا، اور یہ معادل تھا ۱۴ دسمبر کا (اتفاق سے پیرس یونیورسٹی کا جلسہ ۱۴ دسمبر ہی کو ہوا) جو عیسوی تقویم کے لحاظ سے ٹھیک سو سالہ جشن کا دن تھا، ہجری حساب سے تین سال قبل صفر ۱۴۰۲ھ میں یادگار منانے کی ضرورت تھی، کسی کو تب وہ بات ذہن میں نہ آئی، ورنہ پیرس میں جو اب ہوا وہ تب بھی ہو سکتا تھا، مرضیٔ مولیٰ۔

سوانح | ان کی تعلیم وطن میں ہوئی، پھر دارالعلوم ندوہ (لکھنؤ) میں ہوئی، وہ اس زمانہ کی پیداوار ہیں جب ۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعد انگریز نئے نئے حاکم بنے تھے، ان کو اسلام سے دشمنی بھی تھی اور تبلیغ عیسائیت کا شوق بھی، ایک طرف اسلامی اوقات ضبط ہونے لگے، جس کے باعث اسلامی درسگاہیں بند ہونے لگیں، اور دوسری طرف انگریزی زبان اور مشنری کالجوں اور کارکردگیوں کا اضافہ ہوا، اللہ جزائے خیر دے ان مسلمانوں کو جنہوں نے مسلمانوں کے دین و ایمان کو بچانے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں کیں، دیوبند، علی گڑھ، ندوہ، دارالعلوم حیدرآباد دکن، مجلس ... ...

یہ سب اسی کوشش کی زنجیر کی کڑیاں ہیں، ندوہ کی تعلیم کے باعث عربی فارسی ہی نہیں، سید صاحب نے انگریزی بھی سیکھی، کہتے ہیں کہ کچھ عبرانی بھی پڑھی، اچھے مقرر تھے، اور طالب علمی کے زمانہ ہی سے عربی کے خطیب بھی تھے۔

وہ جامع الکمالات تھے، صاحب دل بلکہ صاحب سلسلہ صوفی بھی تھے، ادیب اور شاعر بھی، علوم دینی (قرآن، حدیث، فقہ، کلام) کی تعلیم پائی، تاریخ ہی نہیں، طب اور ہیئت سے بھی خاصی واقفیت تھی، ان کے علاوہ سیاسیات سے بھی دلچسپی تھی، مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار "الہلال" کی ادارت میں بھی شریک رہے، تحریک خلافت کے سلسلہ میں مسلمانان ہند کے وفد میں شریک ہوکر لندن گئے، پھر ترکی میں جمہوریت قائم ہوئی تو انقرہ میں "بیوک ملت مجلسی" یعنی پارلیمنٹ نے قرار دیا کہ چونکہ خلیفہ کے وظائف منصبی اب پارلیمنٹ انجام دیتی ہے، اس لیے اب کسی ایک فرد کو خلیفہ بنانے یا رکھنے کی ضرورت نہیں، اس کے نتیجہ کے طور پر مکہ معظمہ میں ایک عالمگیر کانفرنس ہوئی کہ اب خلیفہ کسے سمجھیں، کسے بنائیں؟ اس میں ہندوستان کا جو وفد گیا اس میں سید صاحب بھی شریک تھے۔

ان کے علم کی شہرت دور دور تک پھیلی، اسی لیے شاہ نادر خان مرحوم نے ان کو کابل بلایا، کہ وہاں کی تعلیم کی تنظیم جدید کے لیے مشورہ دیں، پونا کی یونیورسٹی میں استاد بھی رہے، بھوپال میں مفتی بنائے گئے، انگنت انجمنوں اور اداروں کی طرف سے لکچروں کے لیے بلائے جاتے رہے، یہاں تک کہ مدرسۂ طبیہ جیسے فنی ادارے کے جلسۂ تقسیم اسناد کے لیے مدعو ہوئے، آخر میں خود اپنے ہی قائم کردہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے ہوکر رہ گئے اور اس کے شہرۂ آفاق ماہنامہ معارف کے ایڈیٹر بھی رہے۔

ان کی تالیفوں میں تنوع اور اُپج نظر آتی ہے، قرآن مجید سے آغاز اسلام ہی سے ہر مسلمان عالم کو دلچسپی رہی، مگر ارض القرآن، یعنی قرآن میں جن مقامات کا ذکر ہے ان کے جغرافیہ کی طرف کسی کی توجہ نہیں گئی، اور اس پر ان کی تالیف تا حال دنیا میں یگانہ ہی ہے، حدیث میں ایک طرف اس کی

دین و تحریر کی تاریخ پر نئی راہیں کھولیں، اور دوسری طرف سیرت النبی پر چھ پانچ جلدیں لکھیں (اور جنوز ناتمام ہی کہی جا سکتی ہیں) وہ اردو میں مایۂ ناز ہیں۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ صرف احادیث صحیحہ پر مبنی واقعات کو درج کیا ہے اور دوسری چیزوں کو نہیں۔

فقہ میں وہ حنفی تھے، لیکن وسعت قلبی کا یہ عالم کہ سوانح عمری لکھی تو امام مالکؒ کی، جو معلومات سے لبریز ہے۔

ہمالیہ تلے کے برعظیم میں مسلمان عورتیں کس بیکسی کے عالم میں تھیں، سید صاحب کو ان پر بڑا غم آتا تھا، اور ہر طرح ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے، اور پرانی مسلمان عورتوں کے کارناموں کو اب اجاگر کرتے تھے، طالب علمی کے زمانہ ہی میں سیرت عائشہؓ لکھی اور ایسی کہ بعد میں اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہ ہوئی، اور تا حال اپنے موضوع کی بڑی مستند کتاب شمار ہوتی ہے۔

طبقات الارض، طب اور علم ہیئت میں مسلمانوں کی خدمات ان کے خاص موضوع تھے، عرب و ہند کے تعلقات پر ظاہر ہے کہ ایک ہندی مؤلف ہی زیادہ بہتر لکھ سکتا تھا، جسے انھوں نے انجام دیا، لیکن "عربوں کی جہاز رانی" ایک ایسا اچھوتا موضوع تھا، جس پر خود عربی میں بھی کم ہی کچھ لکھا گیا ہے، قرآن مجید میں جہاز رانی کا بکثرت ذکر ہے، فرنگی غیر مسلم مؤلف جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کا نعوذ باللہ مؤلف سمجھتے ہیں، قرآن میں عام اور طوفانی وقت کی جہاز رانی کے ذکر سے یہ یقین کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ کے شخصی تجارب کا آئینہ دار ہے، زمانۂ رسالت میں نہ صرف فوجی حمل و نقل کے لیے (موکہ؟ ... میں) بلکہ بحری ڈاکوؤں کو سزا دینے کے لیے (ساحل جدہ پر) جہازوں کا استعمال ہو چکا تھا، عہد فاروقی میں مسلمان جہازوں نے ہی مسلمانوں کو عمان سے مغربی ہند کے ساحلوں پر پہونچایا تھا۔

ان کے سینکڑوں مضامین علمی رسالوں میں چھپے، مخزن لاہور، علی گڑھ منتھلی اور الندوہ کے ناموں سے اب نئی نسل ناواقف ہو گئی ہے، ان کے چند دلچسپ مضامین یہ ہیں:

(۱) اندھوں کی تعلیم کا طریقہ پہلے مسلمانوں نے ایجاد کیا۔ (الندوہ ۱۹۱۱ء) (۲) انجیل برنابا (ایضاً ۱۹۰۶ء) (۳) علمائے روس اور اصلاح نصاب عربی (ایضاً ۱۹۰۹ء) (۴) مستشرقین یورپ، چار قسطیں (ایضاً ۱۹۱۱ء تا ۱۹۱۲ء) (۵) ملک حبش میں ایک اسلامی حکومت، تین قسطیں۔ (الہلال ۱۹۱۳ء) (۶) ہندوؤں کی علمی اور تعلیمی ترقی مسلمانوں کے عہد حکومت میں، نو قسطیں، (معارف ۱۹۱۶ء) (۷) سلطان ٹیپو کی چند باتیں۔ (ایضاً ۱۹۱۶ء) (۸) جاپان اور اس کا نظام تعلیم (ایضاً ۱۹۲۲ء) (۹) کیا رومن حروف ہیروگلیفی سے ماخوذ ہیں؟ (ایضاً ۱۹۲۳ء) (۱۰) عرب اور امریکہ (ایضاً ۱۹۳۹ء) (۱۱) معراج منامی یا جسمانی (ایضاً ۱۹۴۳ء) (۱۲) خطبۂ اسناد طبیہ اسکول پٹنہ (ایضاً ۱۹۴۶ء) (۱۳) کیا خلقی معذورین کی پیدائش انصاف الٰہی کے خلاف ہے؟ (ایضاً ۱۹۴۹ء) (۱۴) برمک اور برکی (ہارون الرشید کے زمانہ والے کا ہندی "پرکھو" سے ماخوذ)، (ایضاً ۱۹۴۳ء) (۱۵) ایک غلطی کا اعتراف (ایضاً ۱۹۴۰ء) (۱۶) رجوع و اعتراف (ایضاً ۱۹۴۳ء)

ان میں سے آخری دو پر خاص کر ناظرین کی توجہ منعطف کرتا ہوں، غلطی ہر کسی سے ہو سکتی ہے لیکن اس کا برملا اعتراف کرنے کیلئے بڑی اخلاقی بہادری کی ضرورت ہوتی ہے، اس سلسلہ میں ایک لطیفہ بھی پیش آیا، انھوں نے جب اپنی شہرۂ آفاق کتاب "عربوں کی جہاز رانی" شایع کی تو میں نے فوراً خرید کر پڑھی اور اپنے ذاتی معلومات جو اس میں اضافہ طلب معلوم ہوئے، مرتب کر کے محترم سید صاحب کو بھیجے، مجھے حیرت ہوئی کہ انھوں نے ان کو علی الفور رسالۂ معارف میں چھاپ دیا اور مجھے بہت ہی محبت سے ایک خط لکھا کہ "تم نے ہماری داد نہ دی کہ بحر عرب میں ہم نے کاغذی کشتی چلا دی" میں بہت شرمندہ ہوا، اور عریضہ لکھا کہ وہ مضمون اعتراض کے لیے نہ تھا، بلکہ طالب علمانہ سوال کی حیثیت رکھتا تھا۔

وہ بڑے بذلہ سنج بھی تھے، ایک بار وہ حیدرآباد دکن آئے، اور جامعۂ عثمانیہ میں ایک لکچر دیا، انھیں علم اشتقاق سے بڑی دلچسپی تھی، لکچر میں ضمناً ایک جگہ فرمایا کہ انگریزی لفظ "جار" اصل میں عربی لفظ "جرہ" سے ماخوذ ہے، میں

سامنے ہی قریب ہی بیٹھا ہوا تھا، اٹھ کر کہا: مولانا! میری دانست میں تو وہ بعد لفظ گھڑا شے لیا گیا ہوگا۔ فوراً فرمایا: ممکن ہے اسی سے گڑھا ہو۔" ان ہی دنوں میں ایک اور ملاقات کا موقع ملا، اور میں نے کچھ علمی سوال کیے جواب کے بعد فرمایا: میں چاہتا ہوں کہ تم سیرت النبیؐ پر ایک کتاب لکھو، اور ہم بتائیں گے کہ کس نہج پر۔ میں نے کہا: کیا آپ کی سیرۃ النبیؐ کے بعد اس کے لیے کوئی جگہ باقی ہے؟ فرمایا: وہ بہت بڑی ہے۔ میں نے کہا آپ نے رحمت عالمؐ بھی لکھی، فرمایا: "وہ بہت چھوٹی ہے۔" میں نے عرض کیا: "سیرت پاک ایک ایسا موضوع ہے جو کسی ایک آدمی کے بس کی چیز نہیں" اس پر وہ چپ ہو گئے اور دوسرے لوگوں نے ان سے گفتگو شروع کر دی۔ مجھے بعد میں بہت افسوس رہا کہ ان کے تصور کی کتاب سیرۃ النبیؐ کا خاکہ کیوں نہ معلوم کیا، لیکن یہ اب بعد از وقت ہے، اللہ کی مرضی۔

مجھے حال میں جنوبی افریقہ جانے کا موقع ملا، جہاں مرحوم کے فرزند ارجمند سید سلمان ندوی ڈربن یونیورسٹی میں شعبۂ اسلامیات کے صدر ہیں، انھوں نے ایک بات یاد دلائی جو میں بھول گیا تھا، وہ یہ کہ جب میں ۱۹۵۲ء میں ایک سالہ قیام کے بعد پاکستان سے فرانس واپس ہو رہا تھا تو سید صاحب کے ہاں جو اس وقت کراچی آ چکے تھے، الوداعی ملاقات کیلئے گیا، صبح سویرے کا وقت تھا، وہ ناشتے پر بیٹھے تھے، نام سنا تو فوراً اندر بلا لیا اور نوجوان بیٹے (سید سلمان صاحب) سے فرمایا: ان کیلئے ناشتہ لے آؤ، میں نے عذر کیا کہ ناشتہ کر چکا ہوں، پھر بھی اصرار کیا، میں نے کہا: کیا یہ ایک حکم ہے یا کوئی اور چیز؟ فرمانے لگے جی نہیں حکم ہے ناشتہ پر محبت سے فرمایا: کیوں جا رہے ہو؟ یہیں رہو، مجھے علمی نشریات میں تمھاری مدد کی ضرورت ہے۔" میں نے عرض کیا نشریات کے مالی اور انتظامی حصے سے نپٹنے کا مجھے تجربہ نہیں، رہا علمی عنصر، اس کیلئے خدا ڈاک کو زندہ رکھے، پیرس کے کتب خانے پاکستان سے زیادہ کارآمد و ضروری ہیں، اس پر وہ چپ ہو گئے، اللہ انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین

ضروریات | یہ صد سالہ یا دیگر جلسے نشستند و گفتند و برخاستند ہو کر نہ رہیں، ضرورت ہے کہ ان کا علم پھلے پھولے، اولاً ان کے مقالات کا مجموعہ شایع ہونا چاہیے جو اب آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے ہیں، اس کے بعد ان کے عربی اور انگریزی ترجمے ہونے چاہئیں، فرانسیسی اور جرمن میں بھی ہو سکیں تو کیا کہنے، تراجم میں مقالے ہی نہیں کتابیں بھی ہوں، (جن میں سے چند کے انگریزی ترجمے ہو بھی چکے ہیں) وفقنا اللہ لما فیہ رضاہ۔

تلخیص وتبصرہ

ڈاکٹر سیّد محمودؒ

ایک تاثر

از جناب جیوتی سروپ سنگھ

ڈاکٹر سید محمود مرحوم دارالمصنفین کے بڑے مربی، ہمدرد اور سرپرست تھے، وہ اس کی مجلس انتظامیہ کے صدر بھی رہے۔ عرصہ ہوا کہ جناب جیوتی سروپ سنگھ نے ان پر ہندی کے ہفتہ وار اخبار سینک آگرہ میں ایک تحریر لکھی تھی، اسی کی تلخیص ان کی یاد کو تازہ کرنے کے لیے پیش کی جارہی ہے۔ "معارف"

ڈاکٹر سید محمود سے ملنے کی بڑی تمنا تھی، اس لیے نہیں کہ وہ ان دنوں بہار کے ایک لائق وزیر تھے، میں تو ان کے اخلاق و شرافت سے متاثر تھا، اور ان کو شریف النفس انسان کی حیثیت سے جانتا تھا،

ان سے خط و کتابت ہوتی رہتی تھی، انگریزی اور اردو کے چند علمی رسالوں میں ان کے مضامین بھی پڑھ چکا تھا، لیکن دیدار سے محروم تھا،

آخر وہ دن بھی آیا جب مشہور انقلابی لیڈر جناب راجہ مہیندر پرتاپ سنگھ نے مجھ سے کہا: مدناپور، مغربی بنگال کے دورہ سے لوٹتے ہوئے پٹنہ بھی آنے کا ارادہ ہے، آپ مہربانی کرکے ڈاکٹر

سید محمود کو ایک خط لکھ دیجیے، میں نے ڈاکٹر صاحب کو ایک خط اپنے دستخط کے ساتھ لکھ دیا، کوئی دس دن کے اندر ہی ان کا ایک بہت مفصل خط آ گیا، خط کی زبان بڑی ہی بے تکلفانہ تھی، اور اس سے انسیت و شفقت کی مہک محسوس ہوتی تھی۔

مدنا پور سے کلکتہ ہوتے ہوئے صبح کے آٹھ بجے پٹنہ جنکشن پہونچ گئے، ڈاکٹر صاحب کی کار سے سیدھے ہم ان کی قیام گاہ پر پہونچے، برساتی کے سامنے کھڑے ہوئے ایک بزرگ نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا، اس کے بعد وہ صاحب راجہ صاحب سے بغلگیر ہوئے، لمبا قد، دوہرا بدن، گندمی رنگ، سر کے بال بالکل سفید، چہرہ بے ریش و بروت، شیروانی، علی گڑھ کٹ پاجامہ اور سلیم شاہی مخملی جوتے پہنے ہوئے، بائیں ہاتھ کی سب سے چھوٹی انگلی میں کالے اور آسمانی نگ کی دو انگوٹھیاں، یہی ہیں وہ بزرگ ڈاکٹر سید محمود۔

ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے پہلے تو انھوں نے میری جانب ایک نظر کی اور پھر بولے کہ آپ کی تعریف؟ قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں راجہ پرتاپ جی بول اٹھے: "آپ ہیں میرے پرائیویٹ سکریٹری ....." بات ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ڈاکٹر صاحب اپنی جگہ سے اٹھے اور میری طرف بڑھتے ہوئے فرمایا: اوہو! بڑی خوشی ہوئی جناب، آپ سے تو بڑی باتیں کرنی ہیں، پھر انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا، میں نے دل ہی میں کہا: ع تھا ان کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں۔ میں نے جیسا پڑھا اور سنا تھا اس سے بھی کہیں زیادہ ان کو بلند و بالا پایا، وہ آج کل کے وزیروں کی طرح صرف کاغذی تعلقات نہیں رکھتے، بلکہ محبت سے ملتے ہیں، دل کھول کر باتیں کرتے ہیں۔ آپ کو ذرہ برابر بھی احساس نہیں ہوگا کہ آپ کسی اجنبی اور غیر سے گفت گو کر رہے ہیں، ان کے ساتھ بیٹھ کر نہ تو احساس کمتری کی شکایت ہوگی اور نہ ہی آپ کو جھوٹی سنجیدگی اور بے ضرورت وقار کی نمائش کرنے کی ضرورت ہوگی، تعصب کا ان میں نام نہیں، سبھی ان کے لیے یکساں ہیں، ان کا تو کہنا ہے ؎

کعبہ میں، کلیسا میں، ہم نے تو جہاں دیکھا   اے قصر وفا تیری تعمیر نظر آئی

کھانے کے بعد وہ مجھے اپنے ساتھ مہمان خانہ لے گئے، ایک کمرہ میں پہونچ کر کہا: قبلہ! یہ کمرہ آپ کے لیے صاف کرا دیا ہے، آپ یہیں قیام کریں، راجہ صاحب میرے ساتھ رہیں گے، آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ جب مہاتما گاندھی بہار تشریف لائے تھے تو اسی کمرہ میں مقیم ہوئے تھے، ان کے ساتھ کیپٹن شاہ نواز اور میرا بین بھی تھیں، میں نے کہا: زہے قسمت، میرے لیے یہ جنت ہے ڈاکٹر صاحب اب ڈاکٹر صاحب میرے پاس ہی اطمینان سے بیٹھ گئے، میں نے پھر پوچھا: ڈاکٹر صاحب! اس کا مطلب ہے کہ گاندھی جی سے آپ کے تعلقات کافی اچھے تھے، ڈاکٹر صاحب نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا: محمود کے منھ میں خاک، میرے پاس الفاظ نہیں ہیں جو میں بیان کرسکوں کہ وہ مجھے کتنا مانتے تھے، میں اُن چند لوگوں میں تھا جن سے وہ اپنے دل کی باتیں کہتے تھے، مجھے تو اپنے بیٹے کی طرح مانتے تھے، یہاں آتے تو میرے ہی یہاں قیام کرتے، ابھی ان کی شہادت سے کچھ دن پہلے ہی میں ان سے دلی میں ملا تھا وہاں کے حادثہ کے بارہ میں ان کی بات پکی ہوئی، انھوں نے ایک غم آلود آواز میں کہا تھا: محمود! مجھے بڑے بُرے آثار نظر آرہے ہیں، نہ جانے کیا ہونے والا ہے اس ملک کا، یہ کہتے کہتے ڈاکٹر صاحب کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئے، پھر کہنا شروع کیا، یوں تو سبھی لوگ ہیں، لیکن گاندھی جی کے بغیر محفل سونی ہوگئی ہے، سچ تو یہ ہے کہ بزم کی شمع گل ہوگئی ہے، اور ہم اندھیرے میں بھٹک رہے ہیں، میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب کا گلا بھر آیا ہے، آنکھیں بھی پُرنم ہیں، موضوع کو بدلتے ہوئے میں نے پوچھا کہ ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ مجھے تو بڑا دکھ ہوتا ہے جب ملک کے مستقبل کے بارے میں سوچتا ہوں، ہم وہیں ہیں جہاں پہلے تھے، سچ تو یہ ہے کہ ملک کے لوگوں میں آگے بڑھنے اور ترقی و بہبود کے لیے کچھ سوچنے کی قطعی طاقت نہیں، ہندوستان شروع ہی سے تلسی داس جی کی اس کہاوت پر چلتا آیا ہے کہ "کو نرپ ہو ہمیں کا ہانی"، آج بھی لوگوں کی ذہنیت وہی ہے

میں نے فرطِ جوش میں کہا کہ آپ نے راماین کا خوب مطالعہ کیا ہے، انھوں نے کہا، اور خوب یاد کیا، اس کی بھی ایک تاریخ ہے، جب میں برلن میں ڈاکٹریٹ کی تیاری کر رہا تھا، میرے ایک جرمن پروفیسر تھے ہراسمتھ، ایک شام انھوں نے چہل قدمی کے دوران کہا کہ محمود تم تو انٹلکٹ مسلمان ہونا، کیا تم نے ہندو مذہب کے بارے میں کچھ پڑھا ہے؟ میرے نفی کے جواب میں انھوں نے ہلکی سی سرزنش کی اور کہا کہ اپنے ہم وطنوں کے مذہب، رسم و رواج کو جانے بغیر نہ تو قوم کے بارے میں کچھ معلوم ہوگا اور نہ تم سچے انٹلکٹ بن سکتے ہو، لوٹتے وقت وہ گھر لے گئے، اور گیتا پڑھنے کیلیے دی۔

میں نے تکلف کرتے ہوئے عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب! معاف کریں، میں نے آپ کا کافی وقت لیا اور سر مغزنی کی، انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا: نہیں نہیں! آپ شوق سے اور پوچھیں، میں نے ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا کہ جی! آپ تو پہلے ہی فرما چکے ہیں کہ آپ سے بڑی باتیں کرنی ہیں، ڈاکٹر صاحب نے ہنستے ہوئے کہا کہ یقیناً، پھر گفت گو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے میں نے کہا: ملک کے سامنے جو موجودہ خطرات ہیں ان پہ کیسے قابو پایا جا سکتا ہے، ڈاکٹر صاحب نے بڑے مدلل اور دلنشین انداز میں دس منٹ تک اس کا جواب دیا، اور آخر میں کہا کہ سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کا ایک مشترک دفاع ہو اور ایک ایشین فیڈریشن قائم کیا جائے جس میں سبھی مسلم ممالک کے علاوہ پاکستان، برما، چین وغیرہ ممالک بھی شریک ہوں، مجھے پوری امید ہے کہ اسلامی ممالک بھی ہندوستان کو اپنا رہبر تسلیم کریں گے، اس طرح روس اور انگلینڈ کا خطرہ ہمیشہ کے لیے دور ہو جائے گا، میں نے کہا کہ اسلامی ممالک، پاکستان کو رہنما مانیں گے یا ہندوستان کو؟ ڈاکٹر صاحب نے زور دیتے ہوئے کہا کہ جی نہیں! ہندوستان اب بھی سارے ایشیا کی رہنمائی کر سکتا ہے، پاکستان پہ تو ایران اور افغانستان وغیرہ اعتماد نہیں کر سکتے، بھلا کمزور کا بازو پکڑ کر کیسے کوئی چلے۔

ڈاکٹر صاحب سے باتیں کرنے میں بڑا مزہ آرہا تھا، ان کے انداز بیان کے کیا کہنے ۔

کسی کے بھنگ کی مستی تمہارے بیان میں ہے　　کسی کی آنکھ کا جادو ترے بیان میں ہے

ڈاکٹر سید محمود بچوں کی طرح معصوم ہیں، ہنستے ہیں تو آنکھیں مُند جاتی ہیں، اور ایسے وقت بڑا اچھا لگتا ہے،

ہم لوگ رات کے کھانے کے بعد کافی پی رہے تھے کہ ان کا نواسہ آگیا، انھوں نے اس کو پکڑ لیا اور اس کے منھ سے اپنا منھ رگڑنے لگے، پہلے تو وہ کھل کھلاتا رہا، پھر رونے لگا اور ڈاکٹر صاحب سے ہاتھا پائی ہونے لگی، میں تو خاموش دیکھتا رہا، لیکن راجہ صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا: یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ ڈاکٹر صاحب نے بچوں کی طرح بڑی سادگی سے کہا: شروع سے ہی میں نے کسی کھیل میں دلچسپی نہیں لی، یہ بچے ہی میرے کھیل کا سامان ہیں، جب کام کرتے کرتے تھک جاتا ہوں تو بچوں سے کھیلنے لگتا ہوں، انھیں خوب تنگ کرتا ہوں، وہ چلاتے ہیں تو مجھے مزہ آجاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب مہمان نوازی کرنے میں یکتا ہیں، بہت اچھے میزبان ہیں، ایک دن دوپہر کے کھانے پر بہار کے کئی وزیر بیٹھے تھے، مجھے آنے میں دیر ہوگئی، جب آیا تو راجہ صاحب نے کہا: سکریٹری صاحب دیکھیے! ڈاکٹر صاحب ۲۵ منٹ سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں، انھوں نے کہا کہ آپ آجائیں تو کھانا شروع کیا جائے، میں اپنی حرکت پر بڑا شرمندہ ہوا، جلدی میں کہا: معاف کریں، دفتر میں تاخیر ہوئی، آپ نے شروع کیوں نہیں کر دیا، ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ کوئی بات نہیں، یہ تو ہوتا رہتا ہے، اور پھر اپنے ہی پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا، میرے پاس ہی بہار کے ایک وزیر جناب جگ لال چودھری بیٹھے تھے، راجہ صاحب نے کہا کہ چودھری صاحب! آپ بکرے کا مغز کھائیں، مزہ آجائے گا، چودھری صاحب سبزی خور تھے، انھوں نے کہا: شیو شیو، مجھے تو بس سادہ کھانے میں ہی مزہ آتا ہے، ڈاکٹر صاحب نے میری جانب اشارہ کرکے کہا کہ کیوں جناب! آپ کی کیا رائے ہے، میں نے کہا ڈاکٹر صاحب! میں یقین تو جانتا نہیں، ہاں ہوٹلوں میں بکرے کا مغز خوب کھایا ہے، لیکن اچھا ہو کہ

ہمارے چودھری صاحب کسی کا مغز نہ کھائیں، ہندوستان میں مغز کھانے والے بہت ہیں، چودھری کو تو کسی کا بھی مغز نہیں کھانا چاہیے، بیچارے چودھری صاحب تو چپ چاپ کھاتے رہے، ڈاکٹر صاحب نے قہقہہ لگا کر کہا کہ بھئی! خوب تم نے تو ایک لاکھ کی بات کہہ دی، پھر تو سبھی ہنس پڑے، میں نے دل ہی دل میں کہا: کیا میں اور کیا میری بات، یہ تو ڈاکٹر صاحب کی ذرہ نوازی اور دریا دلی ہے، کہ انھوں نے اس معمولی مذاق کو ایک لاکھ کی بات بتایا، مجھے غالب کا ایک شعر یاد آگیا ؎

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے،

ڈاکٹر صاحب سے رخصت ہونے کا وقت' غم ویاس کا وقت تھا، جب میں نے جھک کر آداب کیا تو انھوں نے کہا: یوں نہیں' اور میرے سر پر ہاتھ سہلاتے ہوئے انھوں نے مجھے سینہ سے لگا لیا، اور کہا: جیتے رہو، میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

اب ڈاکٹر صاحب نے وزارت سے استعفیٰ دے دیا ہے، مجھے یہ بھی خبر نہیں کہ وہ کہاں رہتے ہیں، پٹنہ کی ملاقات کے بعد میں نے ان کو پھر خط بھی نہیں لکھا، یقیناً یہ میری کوتاہی بلکہ احسان ناشناسی ہے، میں بہار کے وزیر ڈاکٹر سید محمود کو بھول بھی جاؤں، لیکن ڈاکٹر محمود کو بھلانا نا ممکن ہے، کبھی ان سے ملاقات ہوئی تو کہوں گا:

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

ان کے دیدار کو ایک زمانہ گذر گیا، لیکن ان کی یاد آتے ہی ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اس کا سبب خود مجھے بھی نہیں معلوم، میں تو صرف اتنا ہی جانتا ہوں

کچھ کھٹکتا تو ہے پہلو میں مرے رہ رہ کر
اب خدا جانے تری یاد ہے یا دل میرا

مطبوعات جدیدہ

حقائق السنن شرح جامع السنن للامام الترمذیؒ، جلد اوّل از افادات مولانا عبدالحق صاحب، ترتیب: مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب، تقطیع کلاں

کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۵۳۶، مجلد، قیمت ۱۲۵ روپے، پتہ: موتمر المصنفین، دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ، خٹک، پاکستان۔

مولانا عبدالحق صاحب بانی و مہتمم دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک (پاکستان) مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ارشد تلامذہ و مسترشدین میں ہیں، تقسیم سے قبل وہ دارالعلوم دیوبند میں درس و تدریس کی خدمت پر مامور تھے، اس کے بعد انھوں نے اپنے وطن میں دارالعلوم حقانیہ کو فروغ دیا، جو پاکستان میں دارالعلوم دیوبند کا ترجمان ہے، اب مولانا کے افاداتِ درس و امالی کو جو تقریباً نصف صدی سے سینہ بہ سینہ منتقل ہو رہے تھے، سفینہ میں منتقل کرنے کا پروگرام بنایا گیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلہ کی کڑی ہے، اور ابواب الطہارۃ کی حدیثوں کی شرح و توضیح پر مشتمل ہے، اس میں بعض مستعد طلبہ کی کاپیوں اور ٹیپ رکارڈر کی مدد سے صحاح ستہ کی مشہور و مقبول کتاب جامع ترمذی کے متعلق مولانا کے امالی مرتب کرکے شائع کیے گئے ہیں، اس سے پہلے بھی بعض ممتاز علمائے دیوبند کے جامع ترمذی کے افاداتِ درس و امالی شائع ہو چکے ہیں، جو عموماً عربی میں ہیں، لیکن زیر نظر مجموعہ اردو میں ہے، اس کی نوعیت کا اندازہ کرنے کے لیے یہ مثال کافی ہوگی کہ شارحؒ نے امام ترمذیؒ کے

پہلے عنوان ابواب الطہارۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ضمن میں مندرجہ ذیل بحثیں کی ہیں: پہلے عام فقہا و محدثین کے برخلاف امام صاحبؒ کے کتاب کے بجائے ابواب کا عنوان قائم کرنے کی وجہ بتائی ہے، پھر طہارت کا لغوی و اصطلاحی مفہوم اور طہارت و نظافت کا فرق واضح کیا ہے، اور جامع ترمذی کی ترتیب یعنی عبادات کو معاملات پر مقدم کرنے اور عبادات میں نماز اور نماز سے بھی قبل طہارت کے ابواب لانے کی حکمت بیان کی ہے، اور اس اشکال کو بھی دور کیا ہے کہ شروط نماز میں اس شرط یعنی طہارت کو مقدم کرنے کا سبب کیا ہے، پھر عن رسول اللہ کی قید کی وجہ بتائی ہے، اس کے بعد امام ترمذیؒ کے ابواب میں ایک، دو یا تین حدیثوں ہی پر اکتفا کرنے کی وجہیں تحریر کی ہیں، اور ترجمۃ الباب میں ان کا طریقہ و قاعدہ بتایا ہے، پھر حدیث کی سند اور رجال اسناد پر بحث کے ضمن میں حدثنا و اخبرنا یا حدثنی و اخبرنی کا فرق، اور "ح" یعنی تحویل کی طویل بحث ہے، اس کے بعد متن کے الفاظ اور حدیث کے مفہوم کی وضاحت کی گئی ہے، صلوٰۃ کی وضاحت میں اس امر پر خاص طور سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ اس سے صرف رکوع و سجود والی نمازیں ہی مراد ہیں، یا بلا رکوع و سجود کی بھی مراد ہیں، اور نماز جنازہ و سجدۂ تلاوت کے لیے وضو شرط ہے کہ نہیں؟ اسی انداز سے حدیث کے دوسرے جزء پر بھی بحث کی ہے، جس کا ترجمۃ الباب سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس سلسلہ میں یہ بھی بتایا ہے کہ کسی حدیث کے تمام اجزاء یا مکمل مضمون کا ترجمۃ الباب سے ربط و تعلق ضروری نہیں ہے، آخر میں نفس حدیث پر امام ترمذیؒ کے حکم اور ان کی دوسری مخصوص اصطلاحوں اور حدیث کے اقسام کے علاوہ فی الباب عن فلان و عن فلان کہہ کر اس مضمون کی اور حدیثوں کی جانب اشارہ کرنے پر بحث و گفتگو کی ہے، فاضل شارح نے فقہاء و محدثین کے اقوال و دلائل بیان کرکے ہر مسلک میں حنفی مذہب کو مؤید و مرجح قرار دیا ہے، اور اسی کو حدیث و سنت سے اقرب بتایا ہے، جس سے دوسرے مسلک کے لوگوں کو

اختلاف ہو سکتا ہے، مگر حنفی مذہب کی تائید کے ضمن میں انھوں نے دوسرے فقہاء کی تنقیص سے پرہیز کیا ہے، یہ کتاب مفید حدیثی، فقہی اور کلامی مباحث پر مشتمل اور علمائے دیوبند کی تشریح و توضیح کے انداز و معیار کی حامل ہے، لیکن ہر زمانہ کے حالات اور تقاضے مختلف ہوتے ہیں، اس لیے احادیث کی نئی شرحوں میں جہاں قدیم شروح و حواشی کی مفید باتوں کا تذکرہ ضروری ہے، وہاں ان بحثوں میں زیادہ کدو کاوش کی ضرورت نہیں ہے جو اب زیادہ اہمیت کی حامل نہیں رہ گئی ہیں بلکہ نئے مسائل کے بارے میں حدیثوں سے جو رہنمائی ملتی ہے اس کو نمایاں کرنے کی ضرورت ہے، جیسے ص ۱۶۵ و ۱۶۶ پر کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کی رخصت و ممانعت کی حدیثوں کے متعلق قدیم فقہاء کا یہ اختلاف نقل کیا ہے کہ بعض کے نزدیک ممانعت کا تعلق آداب معاشرت سے ہے اسلیے یہ تنزیہی ہوگی، مگر بعض اسے تحریمی قرار دیتے ہیں، شارح نے اس مسئلہ پر نئے حالات کے لحاظ سے بحث کی ہے، اور لکھا ہے کہ چونکہ اس زمانہ میں کھڑے ہو کر پیشاب کرنا کفار کا طریقہ اور معمول ہوگیا ہے اس لیے رخصت باقی نہیں رہی اور تشبہ بالکفار سے بچنے کیلئے اب ممانعت کو مکروہ تحریمی پر محمول کیا جائیگا، کیونکہ شارح کے بقول زمانہ اور حالات کے بدلنے سے فتاوی کا حکم بدل جاتا ہے، اگر اس شرح میں اسی طرز و انداز کو اختیار کیا جاتا تو اس کا فائدہ دوچند ہو جاتا، شروع میں ایک عالمانہ مقدمہ میں حدیث کے مبادی و مباحث پر گفتگو کی گئی ہے اور حدیث کی فضیلت و حجیت، تحریر و کتابت، مصنفاتِ حدیث کی قسموں، امام ترمذیؒ کے حالات، ان کی جامع کی خصوصیات و شرائط اور شارح کے استاذ و استاذ الاستاذ کے حالات اور خود ان کے سوانح درج ہیں، دارالعلوم حقانیہ کے استاذ مولانا عبدالقیوم نے شارح کے خلف الرشید مولانا سمیع الحق اڈیٹر الحق کی نگرانی میں اس شرح کی ترتیب و تسوید کی ہے، اور جابجا مفید حواشی بھی لکھے ہیں، شارح و مرتب کا تعلق ایسے علاقہ سے ہے جو اردو کے مرکزوں سے دور ہے اس لیے زبان و بیان اور کہیں کہیں طریقۂ ادا کی خامیاں

رہ گئی ہیں، مگر ان سے کتاب کی خوبی میں کوئی فرق نہیں آتا۔

نفسیاتی زاویے:۔ مرتبہ ڈاکٹر محمد محسن صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۴۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت پندرہ روپیے، پتے:۔ (۱) کتاب منزل سبزی باغ پٹنہ ۴ (۲) نقش محل، امین الدولہ پارک، لکھنؤ۔

ڈاکٹر محمد محسن فلسفہ و نفسیات کے ماہر ہیں، وہ کالج و یونیورسٹی میں اسی کے استاذ بھی رہے اور نفسیات پر برابر کتابیں اور مضامین بھی لکھتے رہے، گو ان کی قلمی فیاضیوں سے انگریزی زبان زیادہ مالا مال ہوئی، تاہم اردو میں بھی جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اس کا وزن محسوس کیا جاتا ہے، زیر نظر کتاب ان کے اکیس نفسیاتی مضامین کا مجموعہ ہے، ابتدا کے چودہ مضامین مختلف رسالوں میں چھپے تھے، اور آخر کے سات مضامین دراصل ریڈیائی تقریریں ہیں، شروع کے چار مقالے خود آزاری، اخلاقی قدروں کی نفسیات، جبر و اختیار کے ارتقائی مراحل، نفرت کی گرم بازاری اہم ہیں، ان کے متعلق خود ان کا بیان ہے کہ ان میں اس نظریے کی ترجمانی ہے جس کی بنیاد فرائڈ کی نفسیات کی آخری دور کی تصنیفات میں ملتی ہے پہلے مضمون میں نفسیاتی طور پر انسانی زندگی کا جائزہ لے کر دکھایا ہے کہ پیدایش کے وقت ہی سے آدمی پر دوسرے مشق ستم کرتے رہتے ہیں، اور وہ ان کی سزائیں برداشت کرتا رہتا ہے، خود آزاری کے ثبوت میں اردو کے غزل گو شعراء کا تذکرہ کیا ہے، جنھوں نے اپنی ذات اور شخصیت کی دھجیاں اڑانے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا ہے، اس کے علاوہ یہ بھی بتایا ہے کہ خود انسان کے اوہام و وساوس بھی اسے کرب و اذیت میں مبتلا رکھتے ہیں، اس سلسلہ میں اس کی دیگر آزاری بھی زیر بحث آگئی ہے، پانچویں مضمون میں نظریات کے تصادم پر دلچسپ نفسیاتی بحث کی ہے مصنف نے بعض اصناف ادب کا نفسیاتی جائزہ بھی لیا ہے، ایک مضمون میں نفسیاتی ادب پر گفتگو کی ہے، ایک

روشنی میں اچھی طرح کی گئی ہے، اور غالب کی شاعری میں استہلاک ذات کے تصور پر دلچسپ بحث ہے، شخصیت کی تشکیل میں حافظہ کی کرشمہ سازی دکھاتے ہوئے اس کا نمونہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کو قرار دیا ہے، اور غبار خاطر کو موضوع بحث بنایا ہے، ایک مضمون میں اسلوب اور شخصیت کا تعلق اور رشتہ واضح کرکے اسلوب میں شخصیت کی جلوہ گری دکھائی ہے، دو مضامین پروفیسر کلیم الدین احمد مرحوم کے لیے مخصوص ہیں، ایک میں ان کے مشہور قول "غزل نیم وحشی صنف شاعری" کا نفسیاتی تجزیہ کرکے یہ بتایا ہے کہ نہ ان کے اس قول کا کوئی جواز ہے اور نہ انھیں یہ توقع رکھنی چاہیے کہ دوسرے بھی اسے قبول کرلیں گے، یہ قول دراصل ایک انگریزی فقرہ کا ترجمہ ہے، دوسرے مضمون میں ان کی شخصیت کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے، اس میں ان کے سماجی شعور کی ناپختگی دکھائی ہے، اور طالب علمی کے زمانہ کے بعض دلچسپ واقعات کا تذکرہ بھی کیا ہے، مصنف کے نزدیک کلیم صاحب کی مقبولیت کا راز ان کے سکوت میں پنہاں ہے، وہ ان کے انگریزی کے اچھے استاذ ہونے کے معترف ہیں، مگر ان کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ "نہ کسی کو ان کی دوستی کا فخر حاصل ہوا اور نہ دشمنی کی شکایت، اور ان کی ذات سے جس طرح ان کے ہواخواہوں کو فائدہ پہونچا اسی طرح ان کے بدخواہوں کو بھی"، آخر میں حسب ذیل ریڈیائی تقریریں درج ہیں، نفسیات کا مطالعہ، فرقہ پرستی ایک بیماری، فرائڈ کا نظریۂ خواب، سادیت، قیادت یا لیڈرشپ کی نفسیات، طرز تحریر اور شخصیت، میں اور میری تخلیق، آخری مضمون میں اپنی مختصر سرگذشت اور آپ بیتی لکھی ہے، اس میں اپنی علمی و تعلیمی زندگی اور تصنیفات وغیرہ کا ذکر کرکے اپنی نفسیات پر روشنی ڈالی ہے، ان سب مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے انسانی نفسیات، انسان کی زندگی، ذات، سماج اور ماحول کا گہرا مطالعہ کیا ہے، موضوع کی خشکی کے باوجود ان کے قلم کی شگفتگی اور دلچسپ طرز تحریر نے اس میں تروتازگی پیدا کردی ہے، اور انھوں نے روزمرہ کی زندگی کے مشاہدات و واقعات سے مثالیں پیش کرکے ان مضامین کو

بڑی حد تک عام فہم اور دلچسپ بنا دیا ہے، ایک جگہ اپنے بارہ میں لکھا ہے "میرا وجود نہایت مذہبی گھرانے کا فرد ہونے کے صوم و صلوٰۃ کا تارک ہو گیا" ان کے اس ذاتی فعل پر کسی کو شکایت کا چاہے حق نہ ہو، مگر جب وہ مذہب اور اس کے اعمال و مناسک کا اس انداز سے ذکر کرتے ہیں کہ "ان سزاؤں کے علاوہ ایک اور سزا بھی ہے، جس کا تعلق ایک ایسی ذات کے تصور سے ہے جس کی طاقتیں بے پایاں اور جس کا اقتدار زمان و مکان کی بندشوں سے آزاد سمجھا جاتا ہے، جن قوموں، یا جماعتوں پر مذہب کا عمل درآمد باقی ہے ان کے نزدیک سب سے اہم سزائیں اسی عظیم الشان ذات کی نافذ کردہ ہوتی ہیں، یہ سزائیں کبھی تو پاداش گناہ کی صورت میں ادی تکالیف یا آفات ارضی و سماوی کی شکل اختیار کرتی ہوئی اور کبھی دوسری زندگی میں جہنم کی اذیتیں بن کر ظاہر ہوتی ہوئی باور کی جاتی ہیں، اس ذات عظیم پر ایمان رکھنے والے اسے ایک خارجی شخصیت، ماسوائے ذات تصور کرتے ہیں، اور اس طرح ان مذہبی سزاؤں کا سرچشمہ بھی ایک خارجی ذات ہی سمجھی جاتی ہے" (ص ۴) اسی طرح وہ قربانی کی ایذا رسانی پر بھی بحث کرتے ہیں، لیکن معلوم نہیں یہ تجزیہ ایک ماہر نفسیات کا ہے یا اس میں ان کا ذاتی عقیدہ بھی شامل ہے، بہرحال ایسی بحث سے مذہب کے استخفاف کا پہلو نکل آتا ہے، جس کی ان جیسے نیک نفس اہل قلم سے توقع نہیں کی جا سکتی، کہیں کہیں تذکیر و تانیث اور املا کی غلطیاں بھی نظر آئیں، جو ممکن ہے کہ کتابت کی ہوں، امید کہ یہ آئندہ ایڈیشن میں درست کر لی جائیں گی۔

انتخاب ذکاء اللہ مرتبہ ڈاکٹر اصغر عباس صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۳۰، قیمت دو روپیے، پتہ اتر پردیش اردو اکاڈمی، ایس ایس ۔ قیصر باغ، لکھنؤ۔

اتر پردیش اردو اکاڈمی نے اردو کے اہم نثر نگاروں کا انتخاب شائع کرنے کا جو مفید پروگرام بنایا ہے یہ کتاب اسی سلسلہ کی کڑی اور مولوی ذکاء اللہ دہلوی کی تحریروں کا انتخاب ہے، [illegible] "ض"

حیات سلیمان

یہ محض جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندویؒ کی سادہ سوانح عمری ہی نہیں ہے، بلکہ ان کے گوناگوں مذہبی، علمی، قومی، ملی، سیاسی حالات اور کارناموں کا ایک دلآویز مرقع ہے جس میں سید صاحبؒ کے دور کی نصف صدی کی ملی و قومی سیاسی و علمی، ادبی و لسانی تحریکوں مثلاً ہنگامۂ مسجد کانپور، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، جنگ آزادی، مسئلۂ ملوکیت حجاز وغیرہ کی تفصیل بھی ضمناً آگئی ہے، اسی کے ساتھ دارالمصنفین جو سید صاحبؒ کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اس کی تاسیس سال بہ سال اس کی ترقی کی روداد کے ساتھ ان کے قیام بھوپال، سفر پاکستان، قیام پاکستان کے دوران کی علمی خدمات کا تذکرہ اور پھر مختلف وفود کے رکن و صدر کی حیثیت سے سفر یورپ، سفر حجاز، سفر افغانستان وغیرہ کی مفصل روداد بھی سید صاحبؒ کے خطوط اور تحریروں کی روشنی میں قلمبند ہوگئی ہے، یہ کتاب اپنے اسلوب و طرز انشاء کے لحاظ سے بالکل حیات شبلی کا مثنیٰ ہے، ویسی ہی دلکش، دلچسپ اور دلنشین۔

مولفہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی قیمت ۴۲ روپیے

سلوک سلیمانی

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے عزیز ترین پاکستانی مسترشد مولانا سید سلیمان اشرف خان صاحب سلیمانی صدر شعبۂ عربی پشاور یونیورسٹی نے "سلوک سلیمانی پر ایک اجمالی نظر" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا تھا جو معارف میں ستمبر ۱۹۵۵ء سے جنوری ۱۹۵۶ء تک مسلسل نکلتا رہا، یہ علمی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، اسی مضمون کو مزید اضافوں کے ساتھ مولانا اشرف صاحب نے کتابی صورت میں سلوک سلیمانی کے نام سے دو جلدوں میں شائع کیا ہے، ان میں حضرت سید صاحبؒ کی سلوک و معرفت سے متعلق تعلیمات کو مرتب کی توضیحات و تعبیرات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے، ان دونوں جلدوں کو افادۂ عام کی خاطر دارالمصنفین نے بھی چھاپ کر شائع کیا ہے۔

قیمت جلد اول ۳۰ روپیے — قیمت جلد دوم ۲۵ روپیے

تصنیفات مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

۱۔ سیرۃ النبی جلد سوم : معجزہ کے امکان، وقوع پر علم کلام اور قرآن مجید کی روشنی میں مفصل بحث ۔ ۴۴/ روپے

۲۔ سیرۃ النبی جلد چہارم : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ فرائض ۔ ۴۸ "

۳۔ سیرۃ النبی جلد پنجم : فرائض خمسہ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد پر سیر حاصل بحث ۔ ۲۲ "

۴۔ سیرۃ النبی جلد ششم : اسلامی تعلیمات، فضائل و رذائل اور اسلامی آداب کی تفصیل ۔ ۴۸ "

۵۔ سیرۃ النبی جلد ہفتم : معاملات پر مشتمل متفرق مضامین و مباحث کا مجموعہ ۔ ۱۷ "

۶۔ رحمت عالم : مدرسوں اور اسکولوں کے چھوٹے بچوں کے لیے سیرت پر ایک مختصر اور جامع رسالہ ۔ ۵ "

۷۔ خطبات مدراس : سیرت پر آٹھ خطبات کا مجموعہ جو مسلمانان مدراس کے سامنے دیے گئے تھے ۔ ۱۱ "

۸۔ سیرۃ عائشہؓ : حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حالات، مناقب و فضائل ۔ ۱۹ "

۹۔ حیات شبلیؒ : مولانا شبلیؒ کی بہت مفصل اور جامع سوانح عمری ۔ ۴۸ "

۱۰۔ ارض القرآن ج ۱ : قرآن میں جن عرب اقوام و قبائل کا ذکر ہے ان کی اثری اور تاریخی تحقیق ۔ ۱۸ "

۱۱۔ ارض القرآن ج ۲ : بنو ابراہیم کی تاریخ، قبل از اسلام عربوں کی تجارت اور مذاہب کا بیان ۔ ۱۳ "

۱۲۔ خیام : خیام کے سوانح و حالات اور اس کے فلسفیانہ رسائل کا تعارف ۔ ۳۴ "

۱۳۔ عربوں کی جہاز رانی : بمبئی کے خطبات کا مجموعہ ۔ ۱۲ "

۱۴۔ عرب و ہند کے تعلقات : ہندوستان اکیڈمی کے تاریخی خطبات (طبع دوم عکسی) ۔ ۴۰ "

۱۵۔ نقوش سلیمانی : سید صاحبؒ کے منتخب مضامین کا مجموعہ، جن کا انتخاب خود موصوف نے کیا تھا ۔ ۳۴ "

۱۶۔ یاد رفتگاں : ہر شعبۂ زندگی کے مشاہیر کے انتقال پر سید صاحبؒ کے تاثرات ۔ (زیر طبع) (طبع دوم عکسی) ۰۰۰۰

۱۷۔ مقالات سلیمان اول : ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر مضامین کا مجموعہ ۔ ۲۶ "

۱۸۔ مقالات سلیمان دوم : تحقیقی اور علمی مضامین کا مجموعہ ۔ ۲۳ "

۱۹۔ مقالات سلیمان سوم : مذہبی و قرآنی مضامین کا مجموعہ (بقیہ جلدیں زیر ترتیب ہیں) ۔ ۲۳ "

۲۰۔ بریدِ فرنگ : سید صاحب کے یورپ کے خطوط کا مجموعہ ۔

۲۱۔ دروس الادب حصہ اول و دوم : جو عربی کے ابتدائی طالب علموں کے لیے مرتب کیے گئے ۔ ۴-۳

رجسٹرڈ نمبر اے۔ زیڈ۔ ایم۔ این۔ پی ۱۶۰ — جون ۱۹۸۵ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

قیمت تیس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ
(پن ۲۷۶۰۰۱)

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

تاریخ ہندوستان کا سلسلہ ایک اہم قسم کی کتابوں تک پہونچ چکا ہے، اس ضمن میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے، جس کی اب تک تین جلدیں شایع ہو چکی ہیں۔

جلد اوّل

اس میں مغل دور سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی اور وطن دوستی، رعایا پروری کے دلچسپ واقعات مستند ماخذوں کی مدد سے پیش کیے گئے ہیں، قیمت ۱۲ روپے۔

جلد دوم

اس میں مغل فرماں روا بابر، ہمایوں، سوری خاندان کے شیر شاہ اور اسلام شاہ، پھر مغل شہنشاہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی، وطن دوستی، رعایا پروری کے سبق آموز واقعات پیش کیے گئے ہیں، قیمت ۲۳ روپے۔

جلد سوم

اس میں جدو ناتھ سرکار کی کتاب کا جواب خود اس کی کتاب کے حوالوں سے اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اورنگزیب عالمگیر اور اسکے بعد کے مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی، وطن دوستی اور رعایا پروری کی تفصیلات آگئی ہیں۔ مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن۔ قیمت ۳۰ روپیہ

جلد ۱۳۵ ماہ رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ مطابق ماہ جون ۱۹۸۵ء عدد ۶

مضامین

مقالات

وفیات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

گذشتہ دنوں ہمارے ملک میں مسلمانوں کو ان کے خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے دو اہم واقعات ہوئے، ایک تو ایک مسلمان کے لیے اپنی مطلقہ بیوی کو نان نفقہ دینے میں سپریم کورٹ کا فیصلہ ہے، دوسرا کلکتہ ہائی کورٹ میں دو ہندوؤں کی طرف سے قرآن مجید کی طباعت و اشاعت پر پابندی لگانے کی درخواست ہے۔

ان دونوں واقعات کی وجہ سے مسلمانوں میں جو ہیجان پیدا ہوا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی دینی دولت سے مالا مال ہیں، ۱۹۴۷ء کے بعد شعوری یا غیر شعوری طور پر عام مسلمانوں کے سوچنے کا یہ سیاسی انداز ہو گیا ہے کہ جب ملک کی تقسیم کا ان کا مطالبہ پورا ہو گیا تو پھر وہ اس ملک میں کسی بڑے سیاسی مطالبہ کا حق نہیں رکھتے، دستور ہند میں ایک عام شہری کو جو حقوق دیے گئے ہیں ان ہی پر اکتفا کر کے وہ پر امن شہری کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے رہیں، مگر بعض حلقوں میں مسلمانوں کا وجود ہی گوارا نہیں، اسی لیے ان سے نفرت کا اظہار بلوے فسادات کے ذریعہ سے ہوتا رہتا ہے، پھر ان کے شرعی قوانین اور اب تو قرآن مجید کو بھی نعوذ باللہ سے ناب دول میں غرق کرنے کی کوشش ہے، ایسے حلقوں کے انتہا پسند افراد سے کچھ کہنا نہیں، لیکن ہماری حکومت تو ہمارے حقوق کی بھی پشتیبان اور نگہبان ہے، جب اس کی طرف سے بار بار یقین دہانی کرائی جا چکی ہے کہ مسلمانوں کے پرسنل لا میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی، تو مشترکہ سول کوڈ کی خوبی بیان کر کے یا کسی ایسے فیصلہ کی حمایت کر کے جس سے صریحاً مسلمانوں کے پرسنل لا میں مداخلت ہوتی ہو ان کے جذبات کو مجروح کرنے کا کیا جواز ہے۔

حکومت اچھی طرح جانتی ہے کہ مسلمان اس سلسلہ میں بہت حساس واقع ہوئے ہیں کوئی فرقہ پرست اور رجعت پسند مسلمان رہنما نہیں بلکہ مولانا ابو الکلام آزاد جیسے انتہا درجہ کے سیکولرسٹ اور بے مثال

محب وطن کانگریس ہی کے پلیٹ فارم سے یہ اعلان کر گئے ہیں کہ میں ایک مسلمان ہوں، اور اس خیال سے مجھ کو فخر محسوس ہوتا ہے کہ گذشتہ تیرہ سو برس کی جو اسلامی روایات ہیں وہ میری وراثت ہیں، میں اس کو بال برابر بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں، اسلامی تاریخ، اسلامی تعلیم اسلامی آرٹ اسلامی سائنس اور اسلامی کلچر میری دولت کے اجزاء ہیں، اور ایک مسلمان کی حیثیت سے میں تہذیبی اور مذہبی حلقوں میں ایک مخصوص حیثیت رکھتا ہوں، اور یہ میں برداشت نہیں کر سکتا ہوں کہ میرے اس روحانی ورثہ میں کوئی مداخلت کرے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے جو کچھ کہا وہ نہ صرف ان کے احساسات ہیں، بلکہ عام مسلمانوں کے جذبات کی صحیح ترجمانی ہے، پھر وہ نکاح، طلاق، مطلقہ بیوی کے نان نفقہ کے متعلق کسی ایسے فیصلہ کو کیسے گوارا کر سکتے ہیں، جو ان کے شرعی قوانین کے خلاف ہو، کسی قانون کے بنانے یا کسی کورٹ کے فیصلہ کو عمل کرنے میں حکومت کی نیت کتنی ہی اچھی اور بلند ہو، لیکن اس سے مسلمانوں کے پرسنل لا میں مداخلت ہوتی ہو، تو یہ مداخلت فی الدین سمجھی جائے گی، جو ان کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتی ہے، حکومت کی حکمرانی کی لازمی شرط یہ ہے کہ اس کے شہری خوش اور مطمئن رہیں، لیکن اس کے کسی فیصلہ یا قانون سے آزردگی اور بے چینی پیدا ہو تو کیا یہ اچھی حکمرانی کی دلیل ہوگی۔

کلکتہ ہائی کورٹ میں ایک درخواست دی گئی کہ قرآن مجید کی طباعت اور اشاعت قانونی طور پر ہندوستان میں روک دی جائے، اس لیے کہ جیسا کہ اخباروں میں شائع ہوا تھا اس میں کفار کے خلاف تشدد کی تعلیم ہے، درخواست دہندے قرآن کو صحیح معنوں میں سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھنے کی وجہ سے اس کے متعلق جو چاہیں رائے قائم کریں، لیکن اگر ان کو کافر اور کفار کے لفظ سے برہمی ہے تو کافر کم از کم ملیچھ کے مقابلہ میں ہلکا لفظ ہے، کافر کے معنی اللہ کے منکر کے ہیں، ہندو اپنی مورتی پوجا کے باوجود اپنے کو اللہ کا منکر نہیں کہتے ہیں، بلکہ ان کے یہاں تو ایشور کے وجود کا اتنا اونچا تخیل ہے کہ

ہندو عوام اس کو نہیں سمجھ پاتے ہیں تو مورتی پوجاری کو اصل پوجا سمجھتے ہیں، قرآن میں کافر کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مخاطب اگر ہندو اپنے ہی کو قرار دیتے ہیں تو یہ ان کے احساس کمتری کی دلیل ہے۔

اگر ہندو کھلے ذہن سے قرآن مجید کا گہرا مطالعہ کریں تو وہ اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ قرآن مجید میں ایک دین رحمت کا پیام ہے، انسانیت کی تکمیل کے لیے جتنے فضائل اخلاق کی ضرورت ہے، ان سب کی تعلیم اس میں ہے، ایمان، تزکیۂ نفس، زہد، تقویٰ، عفت، پاکبازی، دیانتداری، شرم، رحم، عدل، عہد کی پابندی، احسان، عفو و درگذر، خودداری، شجاعت، استقامت، حق گوئی، استغنا، محبت اور شفقت وغیرہ کی جو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیمات ہو سکتی ہیں، وہ اس میں ہیں، جتنے رذائل اخلاق ہیں، ان سب کی مذمت اور ممانعت کی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو یہ کہنے میں فخر محسوس ہوتا ہے کہ قرآن کا رب، رب المسلمین ہی نہیں بلکہ رب العالمین ہے، اور اس میں اپنے رسولؐ کے ذریعہ جو پیام دیا گیا ہے، اس بنا پر آپ رحمۃ للمسلمین کے بجائے رحمۃ للعلمین ہیں، اگر کوئی اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے گریز کرے تو یا تو یہ اس کا مذہبی تعصب ہے یا قرآن کی تعلیمات سے ناواقفیت اس کے بیچ میں حائل ہے، یا وہ غلط رائے قائم کرنے کی منفیانہ ذہنیت میں مبتلا ہے۔

قرآن کی پہلی سطر اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ہے، اس کی ہر سورہ کی ابتدا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوئی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ بہت مہربانی کرنے والا بہت رحم کرنے والا ہے، قرآن مجید میں رحمان کے نام کی تکرار ۵۲ دفعہ کی گئی ہے، پھر بے شمار طریقے سے اپنے کو ستار، غفار، غفور، کریم، ذوالجلال والاکرام کہا ہے، ہاں وہ قہار اور جبار بھی ہے، اسی طرح جس طرح ہماری کیا دنیا کی ہر حکومت اپنے مجرموں اور غداروں کو پھانسی دیتی ہے، باغیوں، منکروں اور شورش پسندوں کے پورے علاقے کو اپنی پولیس کی گولیوں اور فوج کے توپ و تفنگ سے ہلاک اور برباد کر دیتی ہے،

قرآن مجید میں اللہ کی قہاری کے مقابلہ میں اس کی رحیمی، کریمی، ستاری اور غفاری کی کوئی حد نہیں، قرآن مجید ہی میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کا پیام دے کر اس دنیا میں بھیجا تو آپ کو مخاطب کر کے بار بار ارشاد فرمایا: "میں نے تم کو سارے جہاں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے" (الانبیاء: ۱۰۷) "اے پیغمبر ہم نے تجھ کو گواہی دینے والا، نیکوں کو خوشخبری سنانے والا، غافلوں کو ہشیار کرنے والا، اللہ کی طرف اس کے حکم سے پکارنے والا اور ایک روشن کرنے والا چراغ بنا کر بھیجا ہے" (احزاب: ٦) "ہم نے نہیں بھیجا ہے تم کو اے محمد، لیکن تمام انسانوں کے لیے خوشخبری سنانے والا، اور ہشیار کرنے والا بنا کر" (سبا: ۲۰) "بے شک اللہ سب کے ساتھ عدل، احسان اور سلوک کا حکم دیتا ہے، تم دوسروں کے ساتھ نیکی کرو اور بھلائی کرو، جیسا کہ اللہ تمہارے ساتھ بھلائی کرتا ہے" (قصص: ۷۷) "جو چاہے ایمان لائے، جو چاہے کفر اختیار کرے" (کہف: ۲۹)۔ "دین کے بارے میں کسی قسم کا جبر نہیں ہونا چاہیے" (بقرہ: ۲۵٦) "اپنے رب کے راستہ کی طرف دانشمندی اور اچھی اچھی باتوں کے ذریعہ بلاؤ، اور بہت پسندیدہ طریقے سے بحث کرو" (نحل: ۱۲۵) "تمہارے ذمہ تو صرف اللہ کا پیام پہونچا دینا ہے" (شوریٰ: ۴۸) "پھر اگر لوگ اعراض کریں تو تمہارے ذمہ تو صاف صاف پہونچانا ہے" (نحل: ۸۲) "تم ان پر مسلط نہیں ہو" (غاشیہ: ۲۲) "اور نہ تم ان پر مختار ہو" (بنی اسرائیل: ۵۴) "ہم نے تم کو ان کا نگراں کر کے نہیں بھیجا ہے" (نساء: ۸۰) ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ اس کے پیام سے روگردانی کرنے والوں سے کوئی تعرض نہ کیا جائے، ان پر کوئی زور، جبر اور زبردستی نہیں۔

یہ باتیں تو ان کے لیے ہیں جو افہام و تفہیم اور مہر و محبت کے جویا ہیں، ان کے لیے نہیں

جو آنکھوں کو بند کر کے اور کانوں میں روئی دے کر ایسی باتیں سوچتے ہیں جن سے خلقِ خدا کو دھوکہ دیں، اور اپنی خودسرائی اور خودنمائی کا راگ الاپ کر اپنے کو حقیقی اور صادق رہنما سمجھیں۔

ایسے رہنماؤں کو یہ بھی سوچنا ہے کہ ان ہی کی سرزمین میں ایسی مقدس کتاب ہے جس میں اشرف المخلوقات انسان کے ایک بہت بڑے طبقہ کو شودر کہا گیا ہے، ان کے ساتھ ہزاروں برس تک جو نفرت انگیز، اخلاق سوز اور شرمناک سلوک کیا گیا ہے اس سے انسانیت کی گردن ذلت سے جھکی ہوئی ہے، ان کو ملیچھ کہا گیا، جس کے معنی غلیظ، ناپاک، اگھوری اور جن سے لوگوں کو گھن آنے کے ہیں، ان کو کسی عبادت گاہ میں جانے کی اجازت نہیں دی گئی، ان کے کانوں میں مقدس وید کے کسی اشلوک کی صدا پہونچ جائے تو ان کے کانوں میں سیسہ پلا دینے کا حکم دیا گیا ہے، وید صرف برہمن اور کشتر سیکھ سکتے ہیں، کیونکہ ان ہی کے لیے نجات ہے، کسی اور کے لیے نہیں، ایسی مقدس کتاب پہ کسی ہائی کورٹ میں بحث ہو سکتی ہے؟ پھر ملاپ جیسے اخبار میں ۳۰ راکتوبر ۱۹۲۹ء کی اشاعت میں یہ تحریر شائع ہوئی تھی کہ گئو ہتیا رے کو سیسے کی گولی سے اڑا دینے کے لیے شاستروں میں آگیا ہے، چاہے گئو گھاتک کوئی گورا ہو یا کالا، اگر یہ صحیح ہے تو کیا ایسے شاستروں کے خلاف بھی کسی ہائی کورٹ میں درخواست دی جاسکتی ہے؟

کلکتہ ہائی کورٹ میں قرآن مجید کے خلاف درخواست دینے والوں کو یہ معلوم رہا ہوگا کہ ان کی درخواست رد کر دی جائے گی، لیکن اس سے تو وہ مسلمانوں کی اہانت چاہتے تھے، ان کی یہ مراد شاید پوری نہیں ہوئی، اس کے بجائے مسلمان اپنے خواب غفلت سے اس طرح جھنجھوڑ دیے گئے کہ ان کا بڑے سے بڑا رہنما نہیں جھنجھوڑ

سکتا تھا، عدو کے شر میں بعض اوقات خیر کی بے پناہ قوت پیدا ہو جاتی ہے۔

اس درخواست کے بعد اسلامی ممالک میں قرآن مجید سے بے پناہ احترام کا جذبہ پیدا ہوا، ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی اور ملی وجود کے خطرات کا بھی احساس ہوا، اور ان کے بقاء کی فکر بھی دامن گیر ہوئی، کلکتہ کے مسلمانوں کے ساتھ وہاں کے ہائیکورٹ کے مسلمان وکلاء کی ایمانی حرارت اور مذہبی غیرت پورے طور پر بروئے کار آئی، جیسا کہ وہاں کے مشہور اور ممتاز ایڈووکیٹ جناب خواجہ محمد یوسف کے ایک دوسرے مکتوب سے معلوم ہوا، انھوں نے اس درخواست کے خلاف اپنے اور رفقاء کے ساتھ اس کی پیروی کرنے میں سربراہی کی خدمت انجام دی، وہ اور ان کے رفقاء ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے مبارکباد اور شکریہ کے مستحق ہیں، یہ بھی معلوم ہوا کہ اس درخواست کے رد کرانے میں مغربی بنگال اور مرکز کی حکومتوں نے بڑی فراخ دلی، رواداری اور مآل اندیشی کا ثبوت دیا، جو یقیناً قابل تحسین ہے

جس طرح ریاستی اور مرکزی حکومتوں نے اس درخواست کو رد کرانے میں رواداری پیش قدمی کی، اسی طرح ہماری مرکزی حکومت مسلمانوں کے پرسنل لا میں عدم مداخلت کر کے اپنی حکمرانی کا صحیح جوہر دکھائے تو پھر اس کو بھی اندازہ ہو جائے گا کہ مسلمان ملک کی جذباتی ہم آہنگی اور وطن دوستی میں کیسے قیمتی راس المال ثابت ہوتے ہیں کسی ایک عورت یا تھوڑے سے تجدد پسند، مذہب سے بیزار، مفاد پرست، ریاکار اور حکومت کے عہدوں کے طلبگار مسلمانوں کی خاطر مسلمانوں کے سارے سواد اعظم کو ناراض اور برگشتہ کرنا رموز حکمرانی سے ناآشنا اور بیگانہ ہونے کا ثبوت دینا ہے۔

ملک کے مشہور مورخ جدو ناتھ سرکار نے اپنی تحریروں میں برابر یہ الزام رکھا کہ اورنگ زیب نے ہندوؤں کی زندگی کو ناقابل برداشت بنا دیا تھا، ان کے علوم و فنون کو منتشر کیا، ان کے میلوں اور تہواروں کو روک دیا، انھیں ہر لحاظ سے نیچا دکھایا گیا، ان کو حکومت کی ملازمتوں سے محروم کر دیا گیا، اورنگ زیب کے ماتحت جو ہندو تھے وہ اپنے علوم و فنون سے بے خبر، مذہبی روایات سے بے گانہ، معاشرتی ارتباط سے ناآشنا ہو کر زندگی بسر کر سکتے تھے، دولت اور خود اعتمادی سے بھی جو موقع اور آزادی کے نتائج تھے' وہ محروم تھے، ان کی زندگی مستقل معاشرتی اور سیاسی مذلت ہو کر رہ گئی تھی۔ (اورنگ زیب، از جدو ناتھ سرکار، ج ۵، ص ۴۹۵)

ان واقعات کی برابر تردید کی جا رہی ہے، لیکن عام ہندو اسی کو حقیقت سمجھتے ہیں جو جدو ناتھ سرکار لکھ گئے، اگر اس دور میں کوئی مسلمان جدو ناتھ سرکار اس قسم کے تمام واقعات قلمبند کر دے جن سے آج کل کے ہندوستانی مسلمانوں کا سامنا ہے تو حکومت ضرور اس کی تردید کرے گی، لیکن جس طرح اورنگ زیب کے زمانہ کے واقعات کی تردید کرنے سے کوئی ہندو مطمئن نہیں ہوتا، اسی طرح آج یا آیندہ کے مسلمان حکومت کی تردید کو صحیح نہ سمجھیں تو کیا وہ مورد الزام قرار دیے جائیں گے؟

مقالات

سر سیّد احمد خاں اور مستشرقین

از عبید اللہ کوٹی ندوی رفیق دار المصنفین

(۵)

سر ولیم کے خیال میں روایت کے معتبر ہونے کے لیے ایک عجیب قاعدہ

روایات کے معتبر قرار دینے کے لیے سر ولیم میور نے ایک اور قاعدہ ایجاد کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ جب کسی روایت میں محمد صاحبؐ کی تحقیر کے کلمات ہوں، مثلاً بہ ہجرت اگر ان کے متبعین میں سے کسی نے بے ادبی یا ان کے دشمنوں نے گستاخی کی ہو، یا کارِ خیر میں ناکام ہونا، یا کسی واقعہ یا عقیدہ میں اصول اور منشائے اسلام سے اختلاف اور انحراف پایا جائے تو اس کے تسلیم کرنے کی دلیلیں قوی ہیں، کیونکہ یہ قیاس میں نہیں آتا کہ ایسی روایتیں ایجاد کرلی جائیں، یا ایجاد ہو کر محمد صاحبؐ کے تبعین میں رواج پاسکیں۔

مگر سر سید کے خیال میں "درحقیقت کسی روایت کی صحت کو ثابت کرنے کا یہ ایک عجیب طرز ہے"۔ وہ فرماتے ہیں کہ کیا ہم کو ان تمام روایات کو صحیح اور مستند مان لینا چاہیے جن کو مخالفین اسلام نے وضع کیا، یا اسلام کے نام پر گھڑ لیا تھا۔ اور جن کو مسلمان عالموں نے اپنی کتابوں میں اسی غرض سے نقل کیا ہے کہ ان کی تردید کریں۔ اور ان کو موضوع اور بے اصل ثابت کریں، یا وہ کسی کی غلطی کے سبب سے مسلمانوں میں رواج پاگئی تھیں، اور جن کی نسبت علماء نے تحقیق کی اور بتایا کہ یہ روایتیں ملحدوں اور کافروں کی پھیلائی ہوئی روایتیں ہیں، دراصل یہودیوں نے اور بالخصوص عیسائیوں نے اس قسم کی بیہودہ روایتیں اور قصے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت اس حاسدانہ ارادے سے کہ نئے مذہب اور اس کے بانی پر عیب لگائیں، اختراع کرلی تھیں، اس لیے ان تذکرہ بالا وجوہ سے مسلمانوں کی کتابوں میں ذکر ہوتا ان کی صحت کی دلیل نہیں ہوسکتی، تعجب ہے کہ سر ولیم میور ان روایات کے معتبر ہونے کی یہ دلیل بیان کرتے ہیں کہ "قیاس میں نہیں آتا کہ ایسی روایات بنائی جائیں، یا گھڑ لیے جانے کے بعد مسلمین محمد صاحب میں رواج پاسکیں" ان کی یہی دلیل اس بات کی کافی دلیل ہے کہ وہ روایتیں جھوٹی اور مخالفین اسلام اور یہودیوں اور عیسائیوں کی ایجاد کردہ ہیں"

(خطبات احمدیہ ص ۲۹۹)

سر ولیم میور نے اسلامی روایات میں اختراع اور جعل سازی ثابت کرنے کے لیے مضحکہ خیز طریقے اختیار کیے ہیں ان میں سے ایک کا نام انھوں نے "کون آمیز اختراع" رکھا ہے، اور پھر اس کی مثالیں بھی ذکر کرتے ہیں، مثلاً ان ہی کے بقول "بعض گواہ تو یہ بیان کرتے ہیں کہ محمد صاحب خضاب کیا کرتے تھے اور خضاب کی دوا کا نام بھی بتاتے ہیں، بعض صرف اسی قدر دعویٰ نہیں کرتے کہ ہم نے بچشم خود اس امر کو پیغمبر صاحب کی زندگی میں دیکھا تھا، بلکہ انھوں نے آپ کی وفات کے بعد وہ بال جن پر رنگ محسوس ہوتا تھا دکھلا دیا تھا، اور بعض گواہ جن کو واقفیت کے ویسے ہی ذرائع حاصل تھے بیان کرتے ہیں کہ پیغمبر صاحب نے کبھی خضاب نہیں کیا، اور ان کو خضاب کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی، کیونکہ ان کے سفید بال اس قدر تھوڑے تھے کہ شمار میں آسکتے تھے" (ایضاً ص ۳۰۰)

لیکن خضاب کے بارے میں راویوں کے اس اختلاف سے یہ کیسے ثابت ہوگیا کہ بیانِ واقعہ میں کسی جعل سے کام لیا گیا ہے، جب کہ معمولی غور و فکر سے اختلاف کی اصل وجہ اور واقعہ کی اصلیت سمجھ میں آسکتی ہے، چنانچہ سر سید احمد خان لکھتے ہیں کہ:

"اس میں کچھ شک نہیں کہ جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سفید بال نہایت تھوڑے تھے (ابن سعد وغیرہ کی روایت کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی اور سر مبارک میں صرف سترہ بال

سفید تھے) آنحضرتؐ نے تمام عمر کبھی خضاب نہیں لگایا، جو لوگ ہمیشہ حاضر باش رہتے تھے، ان کا یہی بیان ہے، اور چونکہ بال سفید ہونے سے پہلے اکثر بھورے ہو جاتے ہیں اس لیے جن لوگوں نے ان بھورے بالوں کو دیکھا تو یہ خیال کیا کہ خضاب کیے ہوئے ہیں، اور ان ہی بھورے بالوں سے استدلال کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خضاب کرنا بیان کیا، خضاب کی ہوا کا ذکر کسی معتبر حدیث میں نہیں ہے. بلکہ اس چیز کا ذکر ہے جس کو پیغمبرؐ صاحب غسل کے وقت اپنے سر پر ملا لیتے تھے. پس ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان روایات کا اختلاف مذکورۂ بالا سبب سے، قدرتی طور پر خود بخود ہو گیا. اس کو دیدہ و دانستہ حیا مانہ بناوٹ نہیں کہا جا سکتا، ان کو یا اسی قسم کی اور روایتوں کو جن کا ذکر سر ولیم میور نے اپنی کتاب کے حاشیہ میں کیا ہے متناقض یا بناوٹی روایتیں نہیں کہا جا سکتا۔" (خطبات ص ۴۰۱)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشتریِ مبارک کے بارے میں بھی سر ولیم میور نے یہی طریق استدلال اختیار کیا ہے، ان کے خیال میں خاتم نبوی کے باب میں عقیدہ یا خاندان کا کوئی مفاد ایسا نہ تھا جس کی وجہ سے جانبداری کے رجحانات پیدا ہوتے لیکن پھر بھی اس سے متعلق روایتوں میں جو تناقض ہے میور ولیم کے نزدیک وہ صرف جعل اور اختراع کا نتیجہ ہے. "ایک فریق یہ کہتا ہے کہ پیغمبر صاحبؐ نے اپنے مراسلات پہ مہر لگانے کی ضرورت کی وجہ سے خالص چاندی کی ایک انگوٹھی بنوائی تھی، دوسرے فریق کا یہ کہنا ہے کہ خالد بن سعید نے اپنے لیے ایک لوہے کی انگوٹھی جس پر چاندی کا خول چڑھا ہوا تھا بنوائی اور محمدؐ صاحب نے اس انگوٹھی کو پسند کر کے اپنے پاس رہنے دیا. ایک تیسری روایت یہ ہے کہ اس انگشتری کو عمرو بن سعد حبش سے لائے تھے، چوتھی روایت یہ ہے کہ معاذ بن جبلؓ نے اس مہر کو اپنے لیے یمن میں کھدوایا تھا، اور بعض روایتوں میں یہ ہے کہ محمد صاحبؐ اس انگشتری کو سیدھے ہاتھ میں پہنا کرتے تھے، اور کچھ روایتوں میں یہ ہے کہ الٹے ہاتھ میں، کچھ روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مہر کا رخ اندر کی طرف رہتا تھا اور

بعض میں یہ ہے کہ باہر کی طرف رکھتے تھے، بعض روایتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس مہر پر... "صدق اللہ" نقش تھا، اور دوسری روایتوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ "محمد رسول اللہ" نقش تھا، سر ولیم کے بقول "یہ سب روایتیں ایک ہی انگشتری کی طرف اشارہ کرتی ہیں، کیونکہ یہ متواتر بیان کیا گیا ہے کہ محمد صاحب کی وفات کے بعد اسی انگشتری کو ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ نے بھی زیب انگشت کیا تھا اور عثمانؓ کے ہاتھ سے چاہِ غریس میں گر پڑی تھی، ایک روایت یہ بھی ہے کہ پیغمبر صاحب یا ان کے خلفائے راشدین نے کوئی بھی انگشتری نہیں پہنی تھی۔ (ایضاً ص ۴۰۲) سر ولیم میور نے روایات میں تضاد ثابت کر کے جس پُر فریب طریقے سے اصل حقیقت ہی کو مشتبہ بنانے کی کوشش کی ہے اس سے ان کی زنگ خوردہ طبیعت کا راز فاش ہو جاتا ہے، جس پر سرسید احمد خان یہ تبصرہ کرتے ہیں:

(سر ولیم میور نے) جس طبیعت سے ان روایتوں کو بیان کیا ہے وہ نہایت افسوس کے قابل ہے، یہ بیان سر ولیم میور کا کہ "یہ سب روایتیں ایک ہی انگشتری کی طرف اشارہ کرتی ہیں" محض غلط ہے، اور جو دلیل اس کی بیان کی ہے وہ اس سے بھی زیادہ غلط ہے، کیا یہ ممکن نہیں کہ چاندی کے خول کی انگشتری کو کسی دیکھنے والے نے چاندی کی انگوٹھی خیال کیا ہو، یا چاندی کی انگوٹھی علیحدہ اور خول والی انگوٹھی علیحدہ ہو، کیا یہ بات ممکن نہیں ہے کہ معاذ بن جبلؓ والی انگوٹھی پر "صدق اللہ" اور جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی بنوائی ہوئی انگوٹھی پر محمد رسول اللہ کندہ ہو؟ کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انگوٹھی کو سیدھے ہاتھ میں پہنا ہو اور کبھی الٹے ہاتھ میں، اور کبھی اس طرح پہنا ہو کہ مہر کا رخ اندر کی طرف ہو اور کبھی باہر کی طرف، اس انگوٹھی کو آنحضرتؐ اور خلفائے راشدین ہمیشہ اور ہر وقت پہنے نہیں رہتے تھے، جس شخص نے ان کو ایسی حالت میں دیکھا اس نے بیان کیا کہ کبھی انگوٹھی نہیں پہنی تھی، سر ولیم میور نے چونکہ غلطی سے یا عادتاً ان سب روایتوں کو ایک ہی انگشتری سے متعلق خیال کیا ہے، اس لیے اپنی دلیل میں کسی تفصیل کے بغیر یہ بیان کرتے ہیں کہ وہی

انگشتری صحابہ تک پہونچی تھی، حالانکہ وہ صرف وہی انگشتری تھی جس پر "محمد رسول اللہ" کندہ تھا، پس ان روایتوں میں کوئی تضاد نہیں، لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ سر ولیم میور نے اپنے ذہنی خیالات کو اس قدر آزادی دے دی ہے کہ جس سے وہ حجت و برہان کی صراط مستقیم سے منحرف ہوگئے، اور اسلام سے متعلق ہر چیز کو جو کیسی ہی سادہ اور قرین قیاس کیوں نہ ہو وہ شک و شبہہ کی نظر سے دیکھنے پر مائل ہوگئے، اور ان کو وہ جعل سازی اور ایجاد اور اختراع وغیرہ کہکر بدنام کرتے ہیں، سر ولیم میور کو ان کی تجربہ کاری کی وجہ سے اس حقیقت سے باخبر ہونا چاہیے تھا کہ وہ بیانات جن کی تائید میں کوئی دلیل و ثبوت نہ ہو، ہمیشہ اسی مقصد کی خرابی کا باعث ہوتے ہیں، جس کی حمایت کی (ان کے پادریوں کی جانب سے) ان سے توقع کی گئی ہو"

(خطبات احمدیہ ص ۴۰۳)

اسلامی روایات میں عیسائیوں کے "مقدس جھوٹ" کی تلاش،

عیسائیوں کے یہاں مذہبی روایات کا زیادہ تر دار و مدار اس "مقدس جھوٹ" پر ہے، جس کا اعتراف خود انھوں نے کیا ہے، اور اس کے کچھ شواہد کا تذکرہ آیندہ صفحات میں بھی کیا جائے گا، تعجب کی بات یہ ہے کہ سر ولیم میور نے اسلامی روایات میں بھی "مقدس جھوٹ" کی جستجو کی ہے، اور اس بارے میں انھوں نے اسلامی روایات کو ان کے اصل مفہوم سے ہٹا کر اپنی مذہبی روایات کے معیار سے قریب تر لانے کی "سعادت" حاصل کی ہے، اگر قواعد تصنیف میں اس قدر انحراف کو دیکھکر ہر صحیح الدماغ اور ذی ہوش شخص کو یقینی طور پر ملال ہوگا کہ وہ دین اسلام پر الزام تراشی کرتے ہوئے یہ فرماتے ہیں کہ "مقدس جھوٹ" کی رسم اصول اسلام سے منحرف نہیں ہے، دینیات اسلام کی رو سے بعض حالتوں میں فریب روا ہے، خود پیغمبر صاحب نے اپنے احکام کے ذریعہ اس عقیدہ کی ترغیب دی ہے، کہ بعض مواقع پر جھوٹ بولنا جائز ہے" پھر وہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے یہاں عام عقیدہ یہ ہے کہ چار موقعوں پر جھوٹ بولنا جائز ہے، کسی شخص کی جان بچانے کے لیے ......

صلح و اتفاق کرانے کیلئے، محبت کی ترغیب کے واسطے اور سفر یا کسی خاص مہم کے موقع پر" سر ولیم ان چار موقعوں کے لیے اپنے خاص انداز میں مثالیں بھی پیش کرتے ہیں، چنانچہ ان کے خیال میں "اول کی نسبت تو پیغمبرؐ صاحب کا صریح منظر بھی موجود ہے۔" وہ لکھتے ہیں کہ "عمارؓ بن یاسر کو کفار مکہ نے بہت اذیت پہونچائی اور اسلام سے انکار کرنے پر انھوں نے رہائی پائی، پیغمبرؐ صاحب نے اس فعل کو پسند کیا، اور فرمایا کہ " اگر وہ پھر ایسا کریں تو پھر اسی طرح انکار کر دینا۔" (واقدی ص ۲۲۷) ایک اور روایت خاندانِ یاسر میں چلی آتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ مشرکین نے عمار کو پکڑ لیا، اور جب تک کہ ان سے محمدؐ صاحب کی مذمت اور اپنے معبودوں کی تعریف نہ کرالی ان کو نہ چھوڑا، جب وہ پیغمبرؐ صاحب کے پاس آئے، اور انھوں نے حال پوچھا تو کہا کہ یا نبی اللہ بڑی خرابی کی بات ہوئی، جب تک کہ میں نے آپ کی مذمت اور ان کے معبودوں کی تعریف نہ کی مجھ کو نہ چھوڑا، پیغمبر صاحب نے پوچھا کہ تمھارے دل کا کیا حال ہے تو جواب دیا کہ ایمان میں مستقل اور مطمئن ہے، تب محمدؐ صاحب نے فرمایا کہ اگر وہ پھر ایسا کریں تو پھر بھی کہہ دینا، محمد صاحبؐ نے یہ بھی فرمایا کہ عمار کا جھوٹ ابوجہل کے سچ سے بہتر ہے۔"

سر ولیم میور کی اس نکتہ چینی کے جواب میں سرسید کو شکسپیر کا یہ قول یاد آ گیا کہ "دیکھو کہ ایک سادہ قصہ کس طرح تم کو دھوکہ دیتا ہے۔" اس کے بعد وہ اس "نکتہ چینی" کا تجزیہ کرتے ہیں:

> "اول تو ان روایتوں کی جن کو سر ولیم میور نے بیان کیا ہے معتبر سند درکار ہے، دوسرے جن الفاظ میں موصوف نے اس مضمون کو بیان کیا ہے وہ درست اور ٹھیک نہیں ہیں، سر ولیم اول موقع جھوٹ بولنے کے جواز کا کسی کی جان بچانا بیان کرتے ہیں، اول تو یہی غلط ہے، جو روایتیں انھوں نے بیان کی ہیں، ان کے مطابق ان پر لازم تھا کہ "اپنی جان بچانا لکھتے" اور اس بے دھڑک اور جرأت آمیز بیان کے بجائے سر ولیم کو لازم تھا کہ تمام شرطیں قیدیں اور مواقع جو سچ سے اس طرح انحراف کو جائز ٹھہراتے ہیں واضح کر دیتے، جس فریب وہ اور عیب دار پوشاک میں سر ولیم نے اس مضمون کو

آراستہ کیا ہے، اگر وہ آمادہ کی جائے تو جائز، منصفانہ دلیل اور صحیح اصول و مقدمات کے ذریعہ یہ نتیجہ نکلے گا کہ "اگر اہل کفر بے رحم اور جفاکار لوگ جبر و اذیت یا قتل کی دھمکی سے کسی آدمی سے اس چیز کا انکار کرالیں جس کو وہ اپنے دل سے اپنے ایمان سے برحق سمجھتا ہو اور جس پر ایسی مصیبت میں بھی وہ یقین رکھتا ہو تو ایسے وقت میں "اپنے انکار" سے وہ سزائے ارتداد کا ہرگز مستحق نہیں ہوگا۔ (خطبات احمدیہ، ص ۴۰۵)

وہ عہد و پیمان جن کی تکمیل و توثیق ظلم اور جبر کے زور سے کی گئی ہو ان سے انحراف کا جواز سرسید کے الفاظ میں "فرانسس اول بادشاہ فرانس کی مشہور و معروف نظیر سے بھی ثابت ہوتا ہے" اس بادشاہ کو چارلس خامس نے جنگ پادیا (۱۵۲۵ء) میں قید کرکے ماڈرڈ کے ذلت آمیز صلح نامہ پر بزور منظوری حاصل کرکے دستخط کرالیے تھے، بادشاہ فرانس نے اس قید سے چھوٹتے ہی زور و زبردستی کا عذر ظاہر کرکے اپنے قول و قرار پر قائم رہنے سے انکار کیا، اور پوپ کلیمنٹ سابع نے اس کو اس جبریہ حلف سے بری کر دیا۔"

سرسید ظلم اور جبر سے لیے ہوئے "عہد و پیمان" کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بھی بیان فرماتے ہیں کہ "آدمی کے افعال میں جرم اور بے جرمی کا مدار نیت اور اختیار پر ہوتا ہے، اور اسی بنا پر تمام لوگ افعال کو نیک و بد قرار دیتے ہیں، کیا وہ کلمات اور حرکات جو کسی شخص سے اس کو اذیت دے کر اور قتل کی دھمکیوں کے بعد زبانی طور پر یا تحریر کی صورت میں حاصل کر لیے گئے ہوں، اسی قدر سزا کے مستحق ہوں گے، جیسے کہ اس آدمی کے کلمات اور حرکات جو کسی جبر اور زبردستی کے بغیر اس سے سرزد ہوئے ہوں،

سرسید نے اس موقع پر یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ:

"یہ اصول جس سے اسلام کی پاکیزگی اور سچائی ظاہر ہوتی ہے، اور جو محض ایک بے خطا اصول اور قدرتی فطرت کا سچا نمونہ ہے، اور جس کو سر ولیم میور نے قابل اعتراض انداز

اور خراب صورت میں پیش کیا ہے، قرآن مجید میں صاف اور سادہ طریقے سے یوں بیان کیا گیا ہے کہ جس نے خدا کے ساتھ کفر کیا ایمان لے آنے کے بعد۔ سوائے اس آدمی کے جو مجبور کیا گیا ہو اور اس کا دل، ایمان پر مطمئن ہو۔ اور جس نے کفر سے اپنے دل کو مطمئن کر لیا، تو ان پر خدا کا غصہ ہے، اور ان پر بڑا عذاب ہے (نحل ۱۰۸) اس آیت پر فقہاء نے غور کیا ہے اور دو صورتیں بیان کی ہیں، اول عزیمت کی، یعنی آدمی اہل کفر کی طرف سے اذیتوں، تکلیفوں اور قتل کے خوف کے باوجود ظاہر میں بھی اسی سچ پر قائم رہے، جس پر وہ ایمان رکھتا ہے، دوم رخصت کی صورت یعنی ایسی صورت میں اس کو یہ اجازت ہے کہ اس ایمان کا انکار کر دے جس کی تصدیق اس کے دل میں موجود ہے، اور اس طرح وہ دشمنوں کی ایذا سے اپنے آپ کو بچا لے، یہ عجیب بات ہے کہ اس صاف اور سیدھی بات سے سر ولیم میور نے وہ "مقدس جھوٹ" ثابت کرنا چاہا ہے جس کا رواج عیسائیوں میں تھا، پھر انھوں نے اپنے مقصد اور مفہوم کے لیے یہ چند الفاظ "کسی کی جان بچانے کے لیے" کافی سمجھے جو گمراہ کن ہیں، جبکہ قرآن میں بھی جو اپنی فصاحت اور اختصار میں بے مثل ہے اس مفہوم کو بیان کرنے کے لیے ایک پوری آیت درکار ہوتی ہے۔ (خطبات ۴۰۷)

دوسرا موقع جوازِ کذب کا بقول سر ولیم میور وہ ہے جب کہ کوئی شخص صلح و آشتی کرانا چاہے اور جس روایت سے انھوں نے یہ استدلال کیا ہے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے اور اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ "وہ شخص جو دو شخصوں کے مابین صلح کرائے اور ان کے رفع نزاع کے لیے کلماتِ خیر کہے جھوٹا نہیں ہے، گو وہ کلمات جھوٹ ہوں"۔ مگر سرسید کے نزدیک:

"یہ ترجمہ جو سر ولیم میور نے کیا ہے محض غلط ہے، اصل حدیث جو بخاری اور مسلم میں ہے اور جس کو مشکوٰۃ میں بھی نقل کیا گیا ہے ہم بجنسہ اس کو درج کرتے ہیں، اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ

"ام کلثوم نے کہا: رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

لیس الکذاب الذی یصلح بین	وہ شخص جھوٹا نہیں ہے جو آدمیوں کے درمیان
الناس فیقول خیرا و ینمی خیرا	صلح کرا دے، ایسی بھلی بات کہدے اور
(متفق علیہ)	بھلائی پہنچا دے۔"

قاضی بیضاوی نے اس حدیث کی شرح اس طرح کی ہے کہ "وہ اس کے پاس ایسی باتیں پہنچا دے جن کو سن کر وہ مان جائے اور اپنی شر کی باتوں کو چھوڑ دے۔"

سر ولیم میور کی عربی دانی کا خیال کر کے ہم کو افسوس ہوتا ہے کہ نہ بجائے اس کے کہ خود اصل حدیث پر غور کرتے، اور خود اس کا صحیح ترجمہ کرتے، انھوں نے کپتان اے۔ این میتھیو کے غلط ترجمۂ مشکوٰۃ کو اختیار کیا، اور کپتان میتھیو نے دانستہ یا نادانستہ کیسی غلطی کی ہے کہ الفاظ "گو وہ کلمات دروغ ہوں" اپنے ترجمے میں بڑھا دیے، جبکہ وہ الفاظ حدیث میں نہیں۔

"ہمارے مذہب میں اگر کوئی شخص کسی ماجرے کے حالات پورے پورے نہ بیان کرے اور قصداً کسی بدنیتی سے اس ماجرے کی کوئی بات کہے اس پر بھی کذاب کا لفظ بولتے ہیں، اس لیے جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر صلح کروانے کی حالت میں صرف اچھی ہی باتوں کا تذکرہ کرے تو وہ کذابوں میں داخل نہیں، یعنی جو سزا ایسے شخص کے لیے ہے جس نے بدنیتی سے کچھ باتوں کو چھوڑ دیا ہے، اس سزا کا مستحق یہ آدمی نہ ہوگا جس نے صلح کی غرض سے صرف اچھی باتوں کا تذکرہ کیا ہو۔" (خطبات احمدیہ: ۳۰۸)

تیسرا اور چوتھا موقع جس میں سر ولیم میور اسلام میں جھوٹ بولنا جائز قرار دیتے ہیں وہ ہے کسی عورت کو ترغیب دینے میں یا سفر یا مہم میں، کسی عورت کو ترغیب دینے کے الفاظ بھی سخت گمراہ کن ہیں، جبکہ سر ولیم میور کی مراد "اپنی بیوی کو ترغیب دینے" اور اس کی دلداری کرنے سے ہے،

وہ لکھتے ہیں کہ تیسرے موقع کیلئے "ہمارے پاس ایک افسوسناک نظیر موجود ہے کہ محمد صاحبؐ نے تاویلیہ کے معاملہ میں اپنی (دوسری) ازواج سے جھوٹے وعدے کرنے کو معیوب نہ سمجھا" اور چوتھے موقع کی مثال یہ دی ہے کہ پیغمبر صاحبؐ کا معمول تھا کہ "ترتیب مہمات کے وقت (تبوک کی مہم کو مستثنیٰ کرکے) اپنے اصل مدعا کو پوشیدہ رکھتے تھے، اور کسی سمت غیر کی جانب روانگی کا عزم مشتہر کردیتے تھے"۔ سرسید نے ان دونوں موقعوں کی جو وضاحت کی ہے وہ درج ذیل ہے:

"سر ولیم میور نے تیسرے موقع کی جو نظیر پیش کی ہے وہ محض غلط ہے، کوئی صحیح روایت اس معاملہ میں قابل اعتبار موجود نہیں ہے، اور حدیث کی معتبر کتابوں میں اس کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں پایا جاتا، اور چونکہ بنیاد کے استحکام اور ضعف ہی سے اوپر کی عمارت کے استحکام اور ضعف کا حال کھل جاتا ہے، پس کوئی بات قابل اعتبار نہیں ہوسکتی، جب تک کہ اس روایت کی صحت کا جس پر وہ مبنی ہو، کافی ثبوت نہ ہو۔

ترتیب مہمات کے وقت غیر سمت کو عام کرنے کی تائید میں بھی کوئی معتبر روایت نہیں ہے، لیکن اگر ہم اس کو صحیح بھی تسلیم کرلیں تو کیا سر ولیم میور قوانین جنگ سے بھی واقف نہیں ہیں جو اس پر نکتہ چینی کرتے ہیں؟ جب تک کہ کسی فریق سے اعلان جنگ نہ ہوجائے اس وقت تک کوئی ایسا کام کرنا جس سے فریق ثانی کو دھوکہ ہو، بلاشبہ اخلاق اور صداقت کے خلاف ہے، لیکن جب جنگ کا اعلان اور اشتہار دے دیا جائے تو اس وقت کوئی ایسا حیلہ کرنا جس سے فریق ثانی مغلوب ہو اور اس سے اپنے عزائم اور جنگی منصوبوں کو مخفی رکھنا صداقت کے خلاف نہیں ہے"۔ (خطبات ص ۴۰۹)

اسلامی روایات میں "مقدس جھوٹ" کی جستجو کے لیے سر ولیم میور نے جو جانفشانی کی ہے، سرسید احمد خاں اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تعجب یہ ہے کہ سر ولیم میور اس الزام کو جو عیسائی مذہب پر قدیم سے چلا آتا ہے مذہب اسلام پر عائد کرنا چاہتے ہیں، مقدس جھوٹ کا تو مسلمانوں کو خواب

خیال نہیں آیا ہوگا، کیونکہ صدق حقیقی اسلام کا لب لباب اور جوہر ہے، اور سچائی اس کی ہر سطر میں نمایاں ہے' جبکہ مقدس جھوٹ کا تصور قرآنی سچائی کے برخلاف ایک دوسری چیز ہے، اصل بات یہ ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے یہاں جیسا کہ تاریخ میں سے صاف صاف ثابت ہوتا ہے، ارکان مذہبی میں ایک رکن "مقدس جھوٹ" بھی تھا، اور ہم کو تعجب ہے کہ مقدس پال حواری اس کو گناہ تو کیا سمجھتا، برا بھی نہیں جانتا تھا، اس بات کو عیسائی عالموں نے خود مقدس پال کے اس کلام سے ثابت کیا ہے کہ "اگر میرے جھوٹ کے سبب خدا کی سچائی ظاہر ہوئی اور اس کی بزرگی زیادہ ہوئی تو کس لیے میں گنہگار گنا جاتا ہوں" (پال کا خط رومیوں کو، باب ۳ درس ۷) سرسید تاریخی کتابوں سے اس مقدس جھوٹ کا جو عیسائیوں میں رائج تھا، ذکر کرتے ہوئے یہ بھی بتلاتے ہیں کہ "کرسچین میتھالوجی ان فیلڈ" نامی کتاب میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ "کلیسا کا شریف اور راست باز فرزند موشیم جس کی سند اور تسلیم شدہ سچائی پر پادریوں نے کبھی شبہہ نہیں کیا' وہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ پیروان افلاطون وفیثا غورث کا یہ اصول تھا کہ صدق و پرہیزگاری کی صفات کو ترقی دینے کی غرض سے دھوکہ دینا یا بوقت ضرورت جھوٹ کا استعمال کرنا جائز ہی نہیں، بلکہ مستحسن ہے، حضرت عیسیٰ سے بہت پہلے ہی مصر کے یہودی پیروان افلاطون وفیثا غورث سے یہ اصول سیکھ چکے تھے جیسا کہ بے شمار تحریروں سے کسی حجت اور اعتراض کے بغیر یہ بات ثابت ہو چکی ہے، عیسائیوں میں یہ غلطی دونوں راستوں سے در انداز ہوئی، چنانچہ ان کے یہاں نامی گرامی اشخاص کی طرف بے شمار کتابوں کو غلط طور پر منسوب کیے جانے سے یہ بات اب کوئی راز نہیں رہی، موشیم کے بیان کے مطابق صرف دوسری صدی ہی میں بے شمار انجیلیں اور خطیط گھڑے گئے اور دوسروں کی طرف غلط طریقہ سے منسوب کر دیے گئے' چوتھی صدی میں دینی مقاصد کی ترقی کیلئے دھوکہ اور مقدس جھوٹ پچھلے زمانوں سے بھی بڑھ گیا تھا، گبن نے یہ لکھا ہے کہ "دین عیسوی کے ابتدائی زمانہ میں مجھے یہ معلوم کر کے رنج ہوا کہ بہت سے لوگ کلام ربانی میں اپنی طرف سے باتیں ملا دیتے

ناموری سمجھتے تھے، صرف اس لیے کہ ان کے نئے عقیدوں کو عقلاء کفار (غیر مسیحی فضلاء) گوش دل سے سنیں گے (کرشچین میتھالوجی ان فیلڈ، ص ۷۴ ـ ۸۰) اسی کتاب میں یہ بھی ہے کہ جب کبھی یہ معلوم ہوتا کہ انجیل کی کوئی بات دین داروں یا ملکی حاکموں کے اغراض کے موافق نہیں ہے تو اس میں ضروری تبدیلیاں اور تحریفات کر لی جاتیں، اس کے علاوہ طرح طرح کے اور مقدس جھوٹ اور جعل سازیاں جو رائج تھیں، ان کو بہت سے پادریوں نے جائز قرار دیا تھا، (ایضاً ص ۵۲) اسی کتاب میں یہ بھی صراحت کی گئی ہے کہ "اول کی تین صدیوں کے لحاظ سے ہم کو اپنے دین کی صحیح تاریخ کا کچھ علم نہیں، اور جو کچھ علم ہے وہ نہایت خراب اور بگڑے ہوئے ذریعوں سے حاصل ہوتا ہے، کیونکہ ان روایتوں اور حکایتوں کے بیان کرنے والے جو اس زمانہ میں گذرے تھے ذرا بھی اعتبار کے قابل نہیں ہیں، یہ محض مقدس جھوٹ اور جعل سازیوں کی وجہ سے مشہور ہیں مگر ان موروثی کرتبوں اور ہنروں میں بھی یوسی بیس بشپ قیصریہ ان سے بھی سبقت لے گیا، وہ خود فخریہ بیان کرتا ہے کہ "جس بات سے ہمارے دین کی عظمت اور نام آوری بڑھے میں نے بیان کر دیا ہے اور جو اس کی تحقیر و تذلیل کی طرف مائل ہو، میں نے سب چھوڑ دیا ہے (ایضاً ص ۶۶) مندرجہ بالا مثالوں کو نقل کرنے کے بعد سرسید نے مقدس جھوٹ کے بارے میں یہ رائے دی ہے کہ:

> (دور اول کے عیسائی مورخین) کی تحریروں میں ایک عجیب ملاوٹ پائی جاتی ہے، جسمانی خواہش اور خوف ایمانی کے درمیان غلبہ حاصل کرنے کی مضحکہ خیز کوششیں ..... اور انجیل کی بے شرمانہ تحریفات اور تصرفات کی مدد سے کلیسائے روم نے عجیب و غریب بیہودگیوں اور بدعتوں کا ایک جم غفیر پھیلا دیا تھا جس نے اخلاق کی بنیاد کو کھوکھلا کر دیا، انھوں نے اس مقولہ کی تلقین کی جو جرومیم کے الفاظ میں یہ ہے کہ "دھوکہ دینا اور جھوٹ بولنا جب کہ اس سے مطالب دین ترقی پذیر ہوں، کار ثواب ہے" کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ اس بے قید اصول نے دروغ گوئیوں اور جعل سازیوں کے چشمے کا دہانہ کھول دیا جس کا پانی ابتدائے دین عیسوی کی سرزمین پر طوفان کی طرح چھا گیا، اور جس نے ان زمینوں

اور باطنی صفات کو رواج دیا، جو اس زمانہ میں عیسائیان رومن کیتھولک کی بدنامی کا سبب ہیں (دور اول کے یہ عیسائی مورخین) اور اول سے آخر تک ان کے سوانح نگار کفر آمیز مسلکی عقیدہ میں خوش فہمی تعصب اور فریب دہی کے حامی تھے، لیکن اس کے باوجود پطرس حواری کے جانشینوں نے ایسے لوگوں کو پاک اور مقدس لوگوں کی فہرست میں جگہ دی ہے۔

سر ولیم میور کے لیے یہ مناسب تھا کہ مذکورۂ بالا حالات کو دھیان میں رکھتے ہوئے اسلام پر مقدس جھوٹ کا الزام لگانے کی بے جا طور پر کوشش نہ فرماتے، اسلام سر تا پا صدق ہے، وہ نہایت درجہ کی سچائی اور راست بازی کا دین ہے، اور اسی حیثیت سے اس کو یہ حق ہے کہ دوسرے دینوں پر جن میں کسی نہ کسی قدر جھوٹ کی آمیزش پائی جاتی ہے، اپنی فوقیت اور برتری کے لیے دعویدار ہو۔" (خطبات ص ۴۱۳)

اختلاف قراءت' قرآن اور بائبل میں

بخاری و مسلم کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن سات حرفوں پر اترا ہے، جس طرح آسان ہو پڑھو" اختلاف قراءت، فن تجوید قرآن کی ایک اصطلاح ہے جس کے سمجھنے میں عیسائی مصنفوں کو سخت دھوکہ ہوا، اور وہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح بائبل (عہد عتیق اور عہد جدید کی کتابوں) میں اختلاف قراءت ہے، اسی طرح قرآن مجید میں بھی اختلاف قراءت ہے، حالانکہ یہ دونوں بالکل مختلف ہیں، اور جو اسباب عہد عتیق اور عہد جدید میں مختلف قراءتوں کے پیش آتے ہیں، ان میں اور قرآن مجید کی قراءت سبعہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے، اگر ہم قرآن مجید کی قراءت سبعہ یا اختلاف قراءت کو ان ہی معنوں میں لیں جن معنوں میں عیسائیوں نے لیا ہے تو یہ بات واضح طور پر کہی جا سکتی ہے کہ ہم مسلمانوں کے قرآن مجید میں اس قسم کا اختلاف قراءت سرے سے پایا ہی نہیں جاتا، مسلمانوں میں اختلاف قراءت کی تمام صورتیں صحیح اور درست ہیں، لیکن بائبل کے اختلاف قراءت کی نوعیت بقول رورنڈ مسٹر ہارن یہ ہے کہ دو یا زائد مختلف قراءتوں میں سے صرف ایک ہی قراءت صحیح

ہو سکتی ہے اور باقی کاتب کی عمداً تحریفات یا غلطیاں ہوں گی۔" وہ عہد عتیق و عہد جدید میں اختلاف قرات کے درج ذیل اسباب بیان کرتے ہیں:

(۱) ناقلوں کی چوک اور غلطیاں (۲) جن نسخوں سے نقل کیا گیا ہے ان میں پہلے سے سقم اور غلطیوں کا پایا جانا۔ (۳) کسی معتبر سند کے بغیر کاتبوں کی طرف سے متن کی عبارت میں اصلاح کی خواہش (۴) وہ تحریفات جو کسی فریق کے حصول مدعا کے لیے قصداً کی گئی ہوں۔

بائبل میں اختلاف قرات کی مندرجۂ بالا صورتوں میں سے کوئی ایک صورت بھی قرآن کے اختلاف قرات کی اصطلاح سے تعلق نہیں رکھتی، قرآن مجید میں اختلاف قرات کی ایک صورت جو دور اول میں پائی گئی تھی وہ یہ تھی کہ لوگوں نے جتنا قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، مختلف سورتیں یا آیتیں وہ اپنی بیاضوں میں چمڑوں کے ٹکڑوں پر یا اور دوسری چیزوں پر بغیر کسی ترتیب کے لکھ لیا کرتے تھے لیکن چونکہ قرآن کی تلاوت کا رواج تھا، تراویح میں پورا قرآن پڑھا جاتا، قرآن کے حافظ موجود تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق قرآن کی سورتوں اور آیتوں میں ترتیب طے شدہ تھی، اس لیے حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے زمانہ خلافت میں تمام صحابہ کی رائے سے حافظوں اور دوسری تحریروں کی مدد سے، حضرت زیدؓ بن ثابت کی نگرانی میں قرآن کو ایک جلد میں مرتب کر لیا گیا، اس لیے نامکمل بیاضوں کی وجہ سے جن میں ادھر ادھر بے ترتیب آیتیں لکھی ہوئی تھیں قرآن کی سورتوں اور آیتوں میں ناواقفیت کی بنا پر اب بے ترتیبی کا امکان ختم ہو گیا، اور جب حضرت عثمانؓ کے عہد میں زیدؓ بن ثابت کے جمع کیے ہوئے قرآن مجید کی نقلیں مسلمانوں میں تقسیم کر دی گئیں تو اختلاف قرات کی مذکورۂ بالا نوعیت کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہ گیا۔

دنیا کی ہر ایک زبان کی طرح عرب کے مختلف قبیلوں میں بھی بعض لفظوں کا تلفظ کئی طرح کیا جاتا تھا، قرآن مجید کی سات قراتوں کا مطلب یہ ہے کہ ایسے الفاظ کو مختلف قبیلے اپنے اپنے تلفظ کے

مطابق پڑھ سکتے ہیں، لیکن جہاں تک قرآن مجید کی کتابت کا تعلق ہے، تحریر کی حد تک الفاظ قرآن کے تلفظ کا یہ اختلاف بھی قریب قریب معدوم ہو گیا ہے، چنانچہ سرسید احمد خاں لکھتے ہیں کہ:

"قریش کے تلفظ کو حمیراور ... کا میابی ہوئی ہے، قریش ہی کے لہجہ اور زبان میں قرآن مجید نازل ہوا تھا، اور اسی لہجہ اور زبان میں جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پڑھا کرتے تھے، لیکن چونکہ اس زبان میں بعض حروف ایسے ہیں جن کا تلفظ دوسرے قبیلوں سے ادا نہیں ہو سکتا تھا، اس سبب سے اس اختلاف سے بالکل پیچھا نہیں چھوٹا، مثلاً اگر ہم کسی ایک عجمی اور کسی بدوا اور کسی تربیت یافتہ عرب کو قرآن پڑھتے ہوئے سنیں تو فوراً پہچان لیں گے کہ یہ اختلاف اب بھی موجود ہے، مگر یہ اختلاف صرف قرآن مجید پڑھنے میں محسوس ہوگا، نہ کہ اس کے املا میں، اور اسی لیے وہ اختلاف ضبط تحریر میں نہیں آسکتا، اس کا اندازہ کرنے کو ان لوگوں سے قرآن مجید کے سننے کی ضرورت ہے"

(خطبات ص ۴۳۵)

حاضر و غائب کے صیغوں یا اعراب و ابواب کا اختلاف جو پایا جاتا ہے وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے، اور پھر چند ہی جگہوں میں ہے جس سے قرآن مجید کے اصلی مطلب یا احکام میں کوئی بنیادی فرق نہیں پڑتا، اور قرآن مجید کے حاشیوں میں ان کو بھی ذکر کیا گیا ہے اور تفسیروں میں ان کی پوری بحث موجود ہے، اس لیے:

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، ان اختلافات سے قرآن مجید کے اصلی معنی اور مقصد پر کچھ اثر نہیں پڑتا، اور جو الزام عیسائیوں پر اپنی کتابوں میں تحریف کرنے کا ہے اس قسم کا الزام مسلمانوں پر قرآن کی آیات میں تصرف کرنے اور کمی بیشی کرنے کا یا آیتوں کو چھپا ڈالنے کا عائد نہیں ہو سکتا علم ادب کی یہ شاخ جو قرآن مجید کی عبارت پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے اور جس کا نام علم تجوید ہے، اس کی بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں اور علماء نے شرح و بسط سے اس کی شرحیں لکھی ہیں۔" (ایضاً ص ۴۳۶)

ناسخ و منسوخ کے بارے میں

حالات اور موقع و محل کی مناسبت سے احکام شریعت میں تبدیلی انبیائے کرام کے ذریعہ بحکم خداوندی ہر زمانہ میں ہوتی رہی ہے، اس تبدیلی کو نسخ کہتے ہیں، حکم اول کو منسوخ اور حکم ثانی کو ناسخ کہا جاتا ہے، فقہائے اسلام کے یہاں ناسخ و منسوخ کے مفہوم میں مزید وسعت پیدا کر دی گئی، مثلاً انھوں نے دیکھا کہ قرآن مجید کی ایک آیت میں کسی معاملہ کی نسبت ایک عام حکم ہے اور پھر کوئی خاص آیت ان کو ایسی ملی جس سے اس عام حکم میں کسی حالت میں استثناء پایا جاتا تھا تو انھوں نے اس خیال سے کہ وہ پہلی آیت اپنی عمومیت پر باقی نہیں رہی اس کو منسوخ اور دوسری آیت کو اس کا ناسخ قرار دیا، حالانکہ یہ صرف ایک فرضی اصطلاح ہے، اور بقول سرسید احمد خاں فقہاء نے یہ رائے اپنے مسائل کے استنباط کے طریقوں کو آسان بنانے کے لیے اختیار کی ہے، مگر اس سے یہ بات کہ درحقیقت قرآن میں ناسخ و منسوخ ہے، لازم نہیں آتی۔

قرآن مجید کی آیت نسخ اور فقہاء کی اصطلاح ناسخ و منسوخ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے عیسائی عالموں نے دانستہ یا نادانستہ غلطی کی ہے، اور ان کو صریح مغالطہ ہوا ہے، جس کا اندازہ درج ذیل جملوں سے ہوتا ہے:

"مرضی الٰہی کے دائمی اور کامل اندازے کے بجائے قرآنی آیات محمدؐ کی سمجھ کے مطابق مرتب ہوئی تھیں، ہر وحی ان کی حکمت عملی یا خواہش کے مناسب ہے، اور آیتوں کا تناقض اس وسیع قول کے ذریعہ رفع ہو گیا کہ کسی پہلی آیت میں کسی پچھلی آیت سے تبدیلی یا ترمیم ہو گئی ہے۔" (گبن)

"اگرچہ تنسیخ کا آسان عقیدہ قرآن میں تسلیم کیا گیا ہے، مگر مسلمان اس اجتماع ضدین میں تطبیق کی تا بہ امکان کوشش کرتے ہیں، تاہم مجبوراً ان کو اعتراف کرنا پڑا ہے کہ کم سے کم دو سو پچیس آیتیں [۲۲۵] آیتیں منسوخ ہیں۔" (سر ولیم میور)

(باقی)

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے؟

از

سید صباح الدین عبدالرحمن

"یہ مقالہ بہار اردو اکادمی، پٹنہ کے اس سمینار میں پڑھا گیا جو ۲۲/۲۳ دسمبر ۱۹۸۴ء میں استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی صد سالہ سالگرہ کی تقریب منانے کے لیے منعقد ہوا تھا"

اس خاکسار سے اگر کوئی یہ پوچھے کہ تم نے اپنی زندگی میں اپنی آنکھوں سے کس انسان کو سب سے بہتر دیکھا، اور کس کو سب سے اچھا ماہر قرآنیات، سب سے اچھا ماہر حدیث، سب سے اچھا متکلم، سب سے اچھا مورخ، سب سے اچھا سیرت نگار، سب سے اچھا انشا پرداز پایا تو میں یہی عرض کر دوں گا کہ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو۔

کسی کو حق ہے کہ اس رائے سے اختلاف کرے، لیکن اس کے بعد اس کی اور اس خاکسار کی راہیں الگ الگ ہوں گی۔

اس خاکسار نے حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی نجی، خانگی، بیرونی، علمی اور روحانی زندگی کے مختلف جلووں کو برسوں تک دیکھا ہے، ان کی تھوڑی سی بھی عکاسی کرنا اپنی کم مایگی کی بنا پر ممکن نہیں پھر بھی لکھنے کو جی چاہتا ہے کہ ان کے چہرہ پر نظر پڑتی تو سنجیدگی و متانت کے پھول بکھرے نظر آتے، اس کی سپیدی ایسی تھی جیسے کنول کا وہ رنگ ہو جو ابھی بالکل کھلا نہیں ہے، بلکہ کھلنے والا ہے، اس کے اوپر

داڑھی ایسی دکھائی دیتی جیسے کسی صناع نے ریشم کے خوبصورت، نرم اور باریک دھاگوں میں اپنی پوری صنعت گری دکھائی ہو، آنکھوں کی پلکیں کہتیں کہ کسی فسق و فجور کی طرف بھولے سے نہ اٹھی ہوں گی، لب ایسے تھے جیسے شاید کسی ناروا بات کے لیے کبھی نہ کھلے ہوں گے، پیشانی کشادہ تو دہ تھی لیکن دیکھنے والے کہہ سکتے تھے کہ حقیقت منتظر کو لباس مجاز میں دیکھنے کے لیے شاید سجدوں میں ہزار بار تڑپتی رہی ہوگی، کاندھے جھکے جھکے تھے، جیسے کسی بار کو اٹھائے ہوئے ہیں، اور اس سے ان کا جسم دب گیا ہے، ان کے ہمنشین اور جلیس کہتے کہ یہ بار علم کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، ان کی انگلیاں دیکھ کر بے ساختہ یہ کہنا پڑتا کہ یہ صرف قلم پکڑنے کے لیے ہی بنائی گئی ہیں، وہ چلتے تو معلوم ہوتا کہ وزن و وقار ان کے قدموں کو چوم رہے ہیں، وہ کھانا تناول فرماتے تو لقمے اٹھاتے وقت ایسا معلوم ہوتا کہ اللہ کی دی ہوئی نعمت کے شکر گذار ہو کر یہ لقمے منہ میں ڈال رہے ہیں، کھاتے وقت کام و دہن کی ستر پوشی کا خیال رکھتے، کبرسنی پر عینک لگانے لگے تھے، عینک کی کمانی پسند کرنے میں اپنے حسن ذوق کا ثبوت دیتے، اور جب وہ آنکھوں پر لگاتے تو ان کے رخِ زیبا کی وجہ سے خود عینک میں زیبائش پیدا ہو جاتی، لباس آخر آخر وقت تک بہت ہی صاف، مطہر اور پاکیزہ زیب تن کرتے، کبھی ان کے جسم پر شکن بھرے یا میلے کپڑے نہیں دیکھے گئے، شیروانی بہت اچھی سلی ہوئی پہنتے، جیسے وہ ان کے جسم پر ڈھال دی گئی ہو، شیروانی کے کپڑے ہی کی کشتی نما ٹوپی ہوتی اس کے اوپر خود صافہ باندھتے، تو ایسا معلوم ہوتا کہ اس کی بدولت حسن، متانت اور وقار کا تاج ان کے سر پر رکھ دیا گیا ہے، پٹنہ ہی کے ایک جلسہ میں مغرب کے وقت صافہ اتار کر وضو کرنے لگے، وہاں مولانا ابو الکلام آزادؒ بھی تشریف فرما تھے، جب سید صاحبؒ نے صافہ اتارا تو اس کے اندر سے کشتی نما ٹوپی جو نظر آئی تو مولانا ابو الکلام آزادؒ نے دیکھ کر فرمایا: اچھا مولانا! آپ نے مذہب اور قومیت دونوں کو ساتھ جمع کر رکھا ہے، حضرت سید صاحب نے برجستہ جواب دیا: مگر مذہب اوپر ہے، اور قومیت نیچے ہے، یہ سن کر مولانا ابو الکلام آزادؒ اور دوسرے لوگ ہنس پڑے، سید صاحبؒ کی سیاسی

زندگی کا بھی مسلک رہا، ان کو اپنے آبائی گاؤں سے بھی بڑی محبت رہی، اس کے کوچے ان کے لیے کوچے نہ تھے، بلکہ اوراق مصور تھے، یہاں کی ہر شکل ان کو تصویر نظر آتی، چھٹیوں میں یہاں آتے اور جب جانے لگتے تو دیکھنے والے ان کی آنکھوں کو اشکبار پاتے، ان کا آبائی گھر قدیم وضع کا بنا ہوا تھا، لیکن اس سے بڑی محبت کرتے اس کے اندر داخل ہوتے تو ان پر وہی کیفیت طاری ہوتی جو شاہجہاں کو اپنے دہلی دروازہ سے اپنے لال قلعہ میں داخل ہونے میں ہوتی ہوگی، بچپن میں ان کے بڑے بھائی گاؤں کی عورتوں کی اصلاح کی خاطر پردے کی آڑ سے وعظ کیا کرتے، اس موقع پر وہ ان سے مولوی اسماعیل شہید کی تقویۃ الایمان بھی پڑھوایا کرتے تھے، اس کتاب کی افادیت کا اثر ان کے ذہن پر آخر وقت تک چھایا رہا، اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں کہ "اس کو پڑھ کر جن باتوں نے جڑ پکڑ لی تھی، وہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکیں، علم کلام کے مسائل، اشاعرہ اور معتزلہ کے نزاعات، غزالی، رازی اور ابن رشد کے دلائل یکے بعد دیگرے نگاہوں سے گذرے، لیکن حضرت مولانا اسماعیل شہید کی تلقین بہرحال اپنی جگہ قائم رہی۔"

دیسنہ سے نکل کر اپنی ابتدائی تعلیم کے لیے پھلواری شریف کی خانقاہ کے مدرسہ میں پہونچے، اپنی آیندہ زندگی میں اس کو اس طرح یاد کرتے رہے، جیسے کوئی دلگیر نہیں بلکہ عاشق بامراد کوچۂ یار کو یاد کرتا ہے، حضرت مولانا شاہ محی الدین مرحوم کے ساتھ ان کا قیام تھا، اور زیر درس کتابوں میں شاگردی کی سعادت بھی حاصل کی، اس نسبت پر ہمیشہ ان کو بڑا فخر رہا، وہ فرماتے کہ ان کا بزرگانہ تبسم ان کی آنکھوں کے سامنے برابر رہا، یہیں شاہ سلیمان پھلواروی سے منطق کے ابتدائی درس بھی پڑھے، ان کی وفات پر معارف میں جو نوحہ کیا تو انھوں نے ان کے وعظ، نغمۂ پرشور، اعتزال سے ان کی برہمی، اہل بیت سے ان کی محبت، ان کے سنجیدہ چٹکلے، ظریفانہ نکتے، ان کی شیریں بیانی وغیرہ کا جس طرح ذکر کیا ہے، اس کو پڑھ کر اس کے ناظرین ایک دلآویز افسانہ کی افسانویت اور تغزل کی موسیقیت کا لطف اٹھائیں گے

انھوں نے دربھنگہ میں کچھ دن قیام کیا تو اسی زمانہ میں پٹنہ کے ہفتہ وار اخبار اپنچ (۱۸ جون و ۲۵ جولائی ۱۹۰۶ء) میں خاتونوں کی تعلیم کے متعلق انکا ایک مضمون کیا شایع ہوا کہ اس سے انکی دبی ہوئی مضمون نگاری کی صلاحیت جو ابھری تو ابھرا بھرتی چلی گئی، پھر ندوہ میں داخل ہوگئے، بہار کی محبت یوپی سوغات میں پالے گئے، اس لیے اپنے نام کے ساتھ بہت دنوں تک بہاری لکھتے رہے، اور گو ان کی پوری زندگی یوپی میں گذری، لیکن وہ بہار کو کبھی نہ بھولے جب کبھی یہاں کی کوئی قابل قدر شخصیت دنیا سے رخصت ہوئی تو آنسو بہا کر اپنی سوگواری کا اظہار کیا، اسی لیے مولوی عبدالغنی صاحب وارثی، مولانا شاہ بدرالدین صاحب سجادہ نشین پھلواری، مولوی ابوالحسنات ندوی، جناب شاد عظیم آبادی، مسٹر مظہر الحق بیرسٹر، صلاح الدین خدا بخش، سر علی امام، سرفراز الدین، جناب شاہ سلیمان صاحب پھلواروی، مولانا سجاد، حافظ فضل حق آزاد عظیم آبادی، شاہ محی الدین پھلواروی اور مولانا عبدالرؤف دانا پوری پر جو تعزیتی تحریریں لکھی ہیں ان کے قلم کے جواہر ریزے کہے جا سکتے ہیں۔

بہار کے نوجوان ادیبوں کے نام ان کا جو پیام ہے اس سے کیسی دلسوزی اور بہار سے شیفتگی کا اظہار ہوتا ہے۔

دارالعلوم ندوہ آئے اور علامہ شبلی پر ان کی نظر پڑی تو ان کو علم کی موج ہوا پکاں نظر آئی اور ان کا دل کہہ رہا تھا کہ شاید کہ علم کی بہار آئی اور اپنے ساتھ علم کی زنجیر بھی لائی رفتہ رفتہ مولانا شبلی پر ان کی نظر اس طرح پڑنے لگی جیسے افلاطون پر ارسطو کی نظر پڑی ہوگی، مولانا شبلی کی افلاطونیت سے ان کی ارسطوئیت کی چنگاری سلگتی رہی، یا یوں کہیے کہ ان کو ایک ساقی مل گیا، جو جام خلمانی کی مے پلانے لگا، اس طرح کہ اسی کے ساتھ چراغ نور ایمانی سے ان کی خرد میں نور پیدا ہونے لگا۔

علامہ شبلی کی نگاہ جوہر شناس دیکھ رہی تھی کہ اس علم کے عالم ناسوت میں ایک طائر نظر آرہا ہے جو کیا عجب علم کا لاہوتی بن کر اس فضا میں جبروتی و ملکوتی بھی بن جائے، ایک جلسہ میں اپنے اس شاگرد کی

ایک برجستہ تقریر سے ایسے مسحور ہوئے کہ غایت محبت میں اپنے سر سے عمامہ اتار کر شاگرد کے سر پر باندھ دیا، باندھتے وقت زبان حال سے کہہ رہے تھے کہ اس کو علم کی کلاہ مہر عالم تاب ہونا ہے اور یہ ہو کر رہی خود حضرت سید صاحبؒ اس کے بارے دبے رہے، اور انھوں نے اپنی شاگردی کا حق جس طرح ادا کیا وہ غزل کے تغزل سے کم نہیں رہا۔

ندوہ کی طالب علمی کے زمانہ میں لاہور کے رسالہ مخزن (دسمبر سنہ ۱۹۰۲ء) میں آخر وقت کے عنوان سے ایک مضمون لکھا، پھر علی گڑھ منتھلی میں مذہب (نومبر سنہ ۱۹۰۳ء) اہل اندلس کے اخلاق اور عہد سے (نومبر سنہ ۱۹۰۵ء) کلیلہ دمنہ (اگست سنہ ۱۹۰۶ء) طبعیات (اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ء) کے عنوانات سے جو ان کے مضامین چھپے تو پھر باب علم اور وا ہوتا گیا، مولانا شبلیؒ کی نگرانی میں الندوۃ میں مضامین لکھنے شروع کیے، طرح طرح کے نئے نئے عنوانات منتخب کر کے اپنے علمی دماغ کی زرخیزی اور ذہن کی بلند پروازی کا ثبوت دیا، ان علاوہ اور کچھ نہ لکھتے تو ان ہی مضامین کے سبب وہ با عظمت اہل قلم کی صف میں کھڑے کیے جانے کے لایق تصور کیے جاتے، مگر اپنی زندگی میں عام مقالہ نگاروں کی طرح کبھی ان کے مجموعے شایع کرنے کی خواہش ظاہر نہیں کی، اگر وہ شایع کیے جاتے تو کئی جلدوں پر مشتمل ہوتے، اسی طرح جب مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ کچھ دنوں الہلال میں کام کیا تو اس میں بھی بہت سے مضامین الہلال کے رنگ میں لکھے البلاغ میں بھی ان کے مضامین شایع ہوتے رہے، ان کے مجموعے بھی شایع نہیں ہوئے، حالانکہ وہ چاہتے تو یہ آسانی سے شایع ہو سکتے تھے، کیونکہ دارالمصنفین کے قیام میں اس کے پریس کا عملہ ان ہی کے ماتحت کام کرتا رہا، مگر ان کو یہ خیال رہا کہ ان چیزوں سے بہتر چیزیں ابھی پیش کرنی ہیں، اس لیے اپنے اس ابتدائی دور کی چیزوں کی اشاعت پسند نہیں کی۔

سنہ ۱۹۱۵ء میں جب اپنے استاد کی وصیت کے مطابق دارالمصنفین آئے اور اس کی مسند پر بیٹھے ہوئے دکھائی دیے، تو لوگ اپنی چشم بینا سے دیکھتے کہ وہ علم و فن کے تخت طاؤس پر بٹھا دیے گئے ہیں،

اسلام کا مینا محمد اعد میں کا تاج ان کے سر پر رکھ دیا گیا ہے، ان کے دائیں طرف تلاش و تحقیق کے ماہی مراتب، بائیں طرف محنت و ریاضت کے علم ہیں، سامنے عالمانہ نکتہ رسی، مورخانہ دیدہ وری اور ناقدانہ ژرف نگاہی کی نہر بہشت بہہ رہی ہے، اور ہاں ان کی نظروں کے سامنے علامہ شبلی ایک بساط نشاط پر جلوہ افروز ہیں، اور شراب علم کا شیشہ و ساغر لیے ساری فضا میں کیفیت میخانہ پیدا کر رہے ہیں، اپنی نظر و فکر کی رنگارنگی کا چتر بھی انکے سر پر ڈالے ہوئے ہیں، اور اپنی تحریر کے اسلوب اور انداز بیان کا کوکبہ بھی دکھا رہے ہیں۔

حضرت سید صاحبؒ اپنی میز پر سے اٹھ کر اپنے معاصروں ہم جلیسوں، ہم نشینوں اور شاگردوں کے بیچ میں آکر بیٹھ جاتے تو معلوم ہوتا کہ طہارت، نظافت، شرافت، تمکنت، عظمت، پاکیزگی، سنجیدگی، احترام کا پیکر محسوس سامنے ہے اور فضا میں یہ آواز گونج رہی ہے کہ نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی اور یہ سارے اوصاف ان کی تحریروں اور کتابوں میں نظر آئیں گے۔

۱۹۱۶ء سے ان کی ادارت میں معارف کا نکلنا شروع ہوا، معارف میں ان کے شذرات سے ان کی تحریروں کے اسلوب کی بوقلمونی دکھائی دیگی، شذرات کے معنی سونے کے ٹکڑے ہیں، اور یہ واقعی شذرات ہیں، انھوں نے معلوم نہیں کس کس طرح نظر و فکر، جذبات و احساسات، علم و فن اور حکمت و معرفت کا سونا پگھلایا، ان میں کہیں دل کی دھڑکنیں ہیں، کہیں ان کے سینہ کے اندر جو کھٹک سی رہی وہ جس طرح غم منزل بنتی رہی اس کا پرتو بھی ان میں دکھائی دے گا، ان تمام چیزوں کو قلمبند کرتے وقت ان کی کوشش رہتی کہ کہیں سے انا کی بو نہ آنے، وہ اپنی تحریروں کو کبھی الاماشاء اللہ نیش خار سے آلودہ نہیں کرتے ان کو شرافت اخلاق کے موتیوں سے جھلاتے دیکھنا پسند کرتے، البتہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کوئی تحریر دیکھتے تو پھر اس کا جواب لکھنے میں ان کا قلم بے قابو ہو جاتا، پھر اس سے ایسی زہریلی تحریر نکل پڑتی جو بقول ان کے سات سمندر کا پانی بھی اس زہر

زائل نہیں کر سکتا تھا، عام طور سے ان کے شذرات ان کی تحریر کے اعجاز کے اعلیٰ نمونے بھی ہیں۔

معارف میں انھوں نے شذرات کے ۱۱۹۲ اور مضامین کے ۱۰۰۰ صفحات لکھے، ان میں قرآن مجید اور حدیث، تاریخ، کلام، فقہ، ادب اور شعر و شاعری سب پر مضامین ہیں، قرآنی علوم پر جب کوئی مضمون لکھتے تو معلوم ہوتا کہ ان کے علم و فن کے شالیمار میں قرآن پاک کی آیتوں کی نہر بہشت بہہ رہی ہے، احادیث پر کوئی تحریر قلمبند کرتے تو ظاہر ہوتا کہ اس شالیمار میں حدیث کے رموز و نکات کے گلکدے دکھائی دے رہے ہیں، کلامی رنگ کی کوئی چیز لکھتے تو ان کے خیالات کے سوسن و یاسمین کھلتے نظر آتے، تاریخ کا کوئی موضوع اختیار کرتے تو تحقیق و تدقیق کے سرو و شمشاد نظر افروز ہوتے، شعر و ادب کچھ لکھنے کی طرف مائل ہوتے تو نکتہ سنجی اور نکتہ وری کے پھول بکھرے دکھائی دیتے، معاصر مشاہیر کی موت پر نوحہ کرتے تو ان کی سوگواری اور غم ناکی کی گھٹائیں چھائی دکھائی دیتیں، کسی کانفرنس کے لیے خطبہ لکھتے تو یہ ان کے نظر و فکر کا شیش محل بن جاتا۔

دارالمصنفین کے اشاعتی کاموں کے سلسلہ میں اپنی مختصر تصنیف حیات امام مالک شائع کی، یہ ان کی اپنی طالب علمی کے زمانہ میں وہ مضامین ہیں جو الندوہ میں لکھے تھے، یہ ان کی کوئی باضابطہ تصنیف نہیں بلکہ ایک نامکمل کتاب ہے، لیکن اس کی مانگ اب تک جاری ہے، اس میں امام مالکؒ سے جو اپنی عقیدت ظاہر کی ہے، اس سے بعض لوگوں کو غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی کہ وہ مالکی ہو گئے ہیں، لیکن آخر وقت تک وہ حنفی ہی رہے، یہ ان کی رواداری اور فراخ دلی تھی کہ دوسرے مسلک کے ائمہ میں جو خوبیاں تھیں ان کا اعتراف برابر کرتے رہے، انکو امام مالک سے عقیدت اس لیے ہوئی کہ وہ فقیہ مدینۃ الرسول، امام دارالہجرۃ، اور بانیٔ اول فن حدیث تھے، اسی کے ساتھ مسلک حنفی کے علاوہ فقہ کے بقیہ تین مذاہب کے سلسلے ان ہی کی شاخیں ہیں، اسی کے ساتھ ان کو امام مالک کی موطا سے بدرجۂ غایت عقیدت رہی، اس لیے ان پر ایک مضمون لکھنے بیٹھے تو یہ اتنا پھیل گیا کہ پورا ایک کتاب بن گئی۔

۱۹۱۸ء میں اپنے استاد مرحوم کی سیرۃ النبیؐ جلد اول مرتب کرکے ملک کے سامنے پیش کیا، استاد کو آخر وقت تک اس کا غم رہا کہ اپنے حسن عقیدت کے جو پھول سیکڑوں چمن کدوں سے چن کر ان کے ہاتھ میں آئے تھے ان کو آستانۂ نبوت پر وہ خود نہیں چڑھا سکے تھے لیکن لائق شاگرد نے اپنے استاد کی طرف سے اس کو شایع کرکے آستانۂ نبوت پر استاد کی عقیدت کا گلدستہ چڑھایا، اور وہ خوش تھے ؎ شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم۔

اس کا مسودہ پھیل رہا تھا اس لیے اس کی دو جلدیں کر دیں،

اس کی دوسری جلد کی اشاعت سے پہلے سید صاحب کی مشہور کتاب ارض القرآن کی پہلی جلد شایع ہوئی جو انھوں نے پونا کے قیام میں لکھی تھی، ارض القرآن کا موضوع بڑا خشک ہے، اس کے اندر جو عنوانات لکھے ہوئے ہیں، ان کو دیکھ کر ہمارے وہ ناظرین جو فسانۂ آزاد اور فسانۂ عجائب کے پڑھنے کے عادی ہیں ان کا ہاتھ تو اس کتاب کو چھونے کے لیے بھی تیار نہیں ہوگا، یا ایسے ناظرین جو ذرا بہتر ذوق رکھ کر مقدمۂ شعر و شاعری یا سخندان فارس یا آب حیات پڑھتے ہوں، ان کی نظریں بھی اس کی طرف اٹھ کر کسی اور طرف مائل ہو جائیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں، یا ان سے اونچے ذوق رکھنے والے ناظرین اس کے اوراق کو الٹ پلٹ کرکے اس کو چھوڑ دیں تو ان سے بھی کوئی شکایت نہیں، یا وہ ناظرین جو مولانا شبلیؒ کی تصانیف کی شیوہ بیانی اور شیریں گفتاری سے متاثر ہیں، وہ ان ہی کے شاگرد کی اس کتاب کو ایک بھاری پتھر سمجھ کر چوم کر چھوڑ دیں تو بھی ان سے کوئی گلہ نہیں، مگر جب کبھی اس کی تلاش ہوگی کہ دنیا کی مختلف زبانوں میں تحقیق کی دیدہ وری، نظر کی پہنائی، فکر کی گہرائی اور محنت کی جگر کاوی سے کون کون سی کتابیں لکھی گئیں تو ارض القرآن کی دونوں جلدیں اس فہرست میں ضرور شامل کی جائیں گی۔

سید صاحبؒ کو اپنی اسلامی حمیت و غیرت کی وجہ سے دکھ تھا کہ جرمن، فرانسیسی، اطالوی اور

انگریز مستشرقین تاریخ عرب قبل از اسلام پر محققانہ کتابیں لکھ رہے ہیں اور غلط قسم کے نتائج اخذ کرکے لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں، مثلاً نولدیکی نے یہ لکھا کہ قرآن میں جن قوموں کا ذکر ہے وہ غیر تاریخی ہیں، رابرٹسن اسمتھ اور ڈُکمن نے عربوں کے ادعائے نسب سے انکار کیا اور بعض سبک مغز مصنفوں نے جرأت کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ قرآن کے پہلے کا عرب قرآن کے بعد کے عرب سے ہزار درجہ بہتر تھا، سید صاحبؒ نے اپنی ان دونوں کتابوں میں ان مصنفوں کی تاریخی تحقیقات اور تلبیسات کا پردہ چاک کیا اور خود ان ہی کے کارخانوں سے بنے ہوئے ہتھیاروں سے ان کے حملوں کا جواب دیا۔

اس کتاب میں سید صاحب بڑی حد تک ابن حنیفہ دینوری، ابن قتیبہ اور ابن جریر طبری نظر آتے ہیں، جنھوں نے تیسری صدی اور چوتھی صدی ہجری میں یہودی اور ایرانی مورخوں کی اسی قسم کی فتنہ پردازی کا مقابلہ کیا تھا، کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے، یہ نہیں معلوم ہوگا کہ کسی عربی مدرسہ کے سند یافتہ کی یہ لکھی ہوئی ہے، بلکہ تحقیق و تحریر دونوں کا انداز وہی ہے جو آج کل بڑی سے بڑی یونیورسٹیوں کے محققوں کا ہوتا ہے، انھوں نے اپنی اس ابتدائی تصنیف میں یہ ظاہر کر دیا تھا کہ تحقیق و تلاش میں سہل انگاری تن آسانی اور گریز پائی، علم کے دین و مذہب میں معصیت ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ اس علمی معصیت سے وہ اپنے دامن کو برابر بچاتے رہے۔

اپنی علمی زندگی کی بے پناہ مصروفیتوں کے ساتھ ہندوستان کی ملی اور سیاسی تحریکوں میں بھی برابر حصہ لیتے رہے، جن میں ان کی ایمانی حرارت اور ملی غیرت زیادہ کارفرما رہی ہے، ہندوستان میں خلافت تحریک شروع ہوئی تو اس میں اور رہنماؤں کے ساتھ برابر کے شریک رہے، لیکن ان کی شرکت کی نوعیت یہ تھی کہ وہ اپنے قلم سے اس میں علمی اور تاریخی جلا دیتے، اور اس زمانہ میں خلافت عثمانیہ اور خلافت اور ہندوستان کے نام سے جو رسالے لکھے وہ تحقیقی اور تاریخی رنگ کے تھے، مگر اس تحریک میں بہت ہی معاون ثابت ہوئے، اور جب وفد خلافت کے ساتھ لندن گئے اور وہاں سے جو خطوط لکھے

وہ تحریریں "فرنگ" کے نام سے شایع ہوئے ہیں، ان کو اب بھی کوئی پڑھے گا تو ان سے ان کی گہری سیاسی نظر، اور عمیق ملی فکر اور زمانہ کے حالات سے ان کے مضطربانہ جذبات اور بے قرارانہ احساسات کا اندازہ ہوگا۔

وہ لندن ہی میں تھے تو ان کے استاد کی سیرۃ النبیؐ کی جلد دوم شایع ہوئی، سیرۃ النبیؐ کی پہلی جلد میں سعید شاگرد نے اپنے استاد کے مسودہ میں کسی قسم کی ترمیم کرنا پسند نہیں کیا تھا، لیکن جب یہ بار بار چھپنے لگی تو اپنے استاد کے تمام ادب و احترام کے ساتھ ہمت کر کے اس میں کہیں کہیں ترمیم و اضافہ کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کا اہتمام کیا کہ جہاں کہیں کوئی اضافہ کیا تو اس کو ہلالین میں درج کیا۔

وہ لندن ہی میں تھے کہ ان کی کتاب سیرت عائشہ شایع ہوئی، مولانا شبلیؒ کا اصرار تھا کہ وہی یہ کتاب لکھیں، اس زمانہ میں ان کی اور مشغولیتیں تھیں، اس لیے انھوں نے استاد محترم کو اس کتاب کے لکھنے کیلئے کسی اور کا نام تجویز کیا، مولانا شبلیؒ نے ان کو یہ لکھ کر جواب دیا کہ ان کا قلم ادب شناس نہیں (مکاتیب شبلی حصہ دوم ص ۱۲۹) ان ہی سے یہ کتاب لکھنے کا اصرار کیا، یہ مولانا شبلیؒ کی بہت بڑی تحسین تھی، سید صاحب نے پہلی اس کتاب میں اپنے قلم کی اسی ادب شناسی کا ثبوت دیا ہے، پوری کتاب میں ادب و احترام بچھا اور ہوتا ہوا دکھائی دے گا، تمکنت قلم کو جو سمتی نظر آتی ہے، وہ قاری ہر سطر میں سر تسلیم خم کیے ہوئے ہے۔

یہ زمانہ خلافت کی تحریک اور ترک موالات کا تھا، ہندوستان کے اندر بڑا انتشار پھیلا ہوا تھا، برطانوی حکومت کی تہاری اپنی انتہا پر تھی، اسی کے ساتھ ہندو مسلمانوں کی محبت، یگانگت اور حب الوطنی کا سیلاب بھی رواں دواں تھا، سید صاحب سیاسی جلسوں کی صدارت کے لیے بلائے جاتے، اس کیلئے گرانقدر خطبات بھی لکھتے، لیکن سیرۃ النبیؐ کی تدوین میں بھی مشغول رہے، ۱۹۲۴ء میں ان کی سیرۃ النبیؐ جلد سوم شایع ہوئی، اس کے کچھ صفحے تو مولانا عبدالباری ندوی کے لکھے ہوئے ہیں، بقیہ سب سید صاحبؒ کے ہیں، اس کا موضوع معجزات ہے، یہ کوئی دلآویز موضوع نہیں، بلکہ خشک، مشکل اور سنگلاخ ہے، اس کے بعض مباحث میں اغلاق، اشکال اور ابہام کے پیدا ہونے کا خیال تھا، لیکن ان کو پیش کرنے میں سید صاحبؒ نے

بھی ایسا طاقت ور انداز بیان اختیار کیا جس کو پڑھتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت تک سید صاحب کی علمی معرفت اور تحقیقی نظر اپنے اوج پر پہونچ رہی تھی، ان کو قلمبند کرنے میں بھی ان کے قلم کی شگفتگی اور تحریر کی روانی ان کا پورا ساتھ دے رہی تھی، اس کا مطالعہ کرتے وقت یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ اردو زبان کو ایسا پیرایۂ بیان مل رہا تھا جس سے اور دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی طرح اس میں بھی غوامض اور دقائق کو شگفتہ اور شستہ پیرایہ میں پیش کیا جا سکتا ہے، پوری کتاب میں کہیں تو متکلمانہ انداز ہے، کہیں فلسفیانہ رنگ ہے، کہیں تاریخی کوائف ہیں، کہیں منطقیانہ مباحث ہیں، لیکن شروع سے آخر تک ان کے قلم کی گلکاریاں اور تحریر کی معجز طرازیاں اپنی جگہ پر قائم رہتی ہیں اور اس کو پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جدید ذہن کو جن چیزوں کی تلاش ہے وہ سب اس کتاب کے اوراق میں مل رہا ہیں، اور خیالات کے انوار حلے بہشتی بن کر دلوں کے اندر روحانی جلوس کی شکل میں چلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، اس کتاب کی ترتیب، واقعات کی تفتیش و تلاش اور مسائل و نظریات کی بحث و تحقیق میں جو محنت و کاوش اور دیدہ ریزی کی گئی ہے اس سے سید صاحب کا علمی پایہ بہت بلند ہوا، اس میں کہیں ابن سینا، کہیں ابن رشد، کہیں ابن تیمیہ، کہیں ابن مسکویہ، کہیں مولانا رومی، کہیں شاہ ولی اللہ اور کہیں ارسطو اور افلاطون کی کتابوں کی ورق گردانی کرتے نظر آتے ہیں، لیکن اپنی ساری فکری اور نظری بحثوں کی اساس قرآن مجید اور احادیث پر رکھی ہے۔

وہ ۱۹۲۵ء میں وفد حجاز کے صدر بن کر ابن سعود اور شریف حسین میں مصالحت کرنے کیلئے گئے، لیکن کامیابی نہ ہو سکی، ندوہ کے کاموں میں بھی مشغول رہے، لیکن اس سال ان کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی وہ تصنیف ہے جو خطبات مدراس کے نام سے مشہور ہے، یہ ان کے آٹھ خطبات کا مجموعہ ہے، اس وقت تک سیرت نبویؐ پر ان کا بڑا گہرا مطالعہ ہو چکا تھا جس سے اس کے سارے پہلوؤں کے نہ صرف رمز شناس بلکہ عارف ہو گئے تھے، اس لیے جب ان خطبات کو لکھنے

بیٹھے اور ان کو ختم کیا تو یہ کتاب ان کے مطالعہ کا عطر مجموعہ بن گئی اور شاید اس کو لکھتے وقت ان کو یہ احساس ہوا ہو گا کہ کوئی روحانی قوت بلکہ یزدانی طاقت ان سے یہ لکھوا رہی ہے، انداز بیان کے معیار کے لحاظ سے دنیا کی بہترین کتابوں کی فہرست تیار کی جائے تو اس میں یہ کتاب ضرور شامل کی جائے گی، یہ سیرۃ النبیؐ کے سلسلہ کی ہی ایک تصنیف ہے، لیکن جس انداز بیان اور انشاپردازانہ خوبیوں کے ساتھ یہ لکھی گئی ہے، وہ اس کا امتیازی وصف ہے، اس کو پڑھتے وقت بڑے سے بڑا انشاپرداز بھی یہ محسوس کرے گا کہ کہیں اس میں انشاپردازی کی قوس قزح نظر آرہی ہے، کہیں اس کی مہتابی چھٹکی ہوئی ہے، کہیں اس کی کوثر و تسنیم بہہ رہی ہے، کہیں زبان قلم کو چوم رہی ہے، کہیں زور بیان صاحبقرانی دکھا رہا ہے، کہیں نظم سحری کا لطف دکھائی دے رہا ہے، ان خوبیوں کی بدولت پوری کتاب میں نبوت کا چمنستان آباد ہو گیا ہے، جس میں رسالت کے پھولوں کی روش لگی ہوئی ہے جو روح کو معطر کرتی رہتی ہے۔

ان علمی کارگذاریوں کے ساتھ سیاسی مشغولیتیں بھی رہیں، کلکتہ میں اس سال جمعیۃ العلماء کا جو جلسہ ہوا اس کی صدارت بھی کی، اسی سال ہندو مسلمان کے تعلقات کی نسبت دہلی میں مجلس خلافت کے خاص اجلاس میں مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا، اس سے فراغت کے بعد وہ وفد خلافت کے ساتھ حجاز گئے، اس کے ممبر مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی اور شعیب قریشی بھی تھے، وہاں ایک موتمر ہوا تو اس کے نائب رئیس منتخب ہوئے اور صدر محترم کی غیر حاضری میں اس کی صدارت بھی کی، حجاز کے کتب خانہ کی سیر بھی کی اور معارف کے کئی نمبروں میں اس عنوان سے ایک طویل مضمون بھی لکھا، وہاں سے واپسی کے بعد بعض مستشرقین کے خلاف قلمی جہاد میں مصروف ہوئے، عیسائی مضمون نگار مارگولیتھ سے زبردست علمی معرکہ بھی کیا، جو واقدی کا بڑا قائل تھا، لیکن سید صاحب نے سنہ ۲۷ء کے معارف میں متعدد مضامین لکھ کر یہ ثابت کیا کہ واقدی کی حیثیت ایک داستان گو سے زیادہ نہیں، اور اس کا شمار معتبر مورخین میں نہیں، تاریخ و سیر میں اس کا حوالہ دینا

ایسا ہی ہے جیسا ملکہ ایلزبتھ کی سوانح میں رینالڈس کا حوالہ دینا ہے۔

۱۹۲۹ء میں ایک سور دوپین اہل قلم نے لکھا تھا کہ مسلمان ارسطو کی گاڑی کے قلی تھے، اس کا ایک مدلل جواب دیا، پھر مسلمان عورتوں کے حقوق کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا جس میں بتایا کہ عورتوں کے ساتھ جتنی بے انصافیاں تھیں ان سب کا خاتمہ آخری ربانی پیغام اور تکمیل دین نے کیا، اوران کے واجبی حقوق دے کر ان کا درجہ بلند کیا۔

اسی کے ساتھ ہندوستان کے مختلف گوشوں کا سفر بھی کرتے رہے، ۱۹۲۶ء کے وسط اپریل میں انجمن حمایت اسلام لاہور کی دعوت پر عہد رسالت میں اشاعت اسلام پر تقریر کی، پھر مجلس العلما کی صدارت کے لیے ترچناپلی تشریف لے گئے، پھر ندوہ کا ایک اجلاس بھاولپور میں ہوا تو نواب صاحب بھاولپور سے پندرہ ہزار کی رقم منظور کرائی، جمعیۃ العلماء کے ایک جلسہ کی صدارت کے لیے پشاور بھی گئے، پھر حیرت ہوتی ہے کہ ریل کی پیہم مسافرت کے باوجود ان کے قلم کا مسافر بھی برابر رواں دواں رہا، معارف میں ان کی قلمی سرگرمیاں جاری رہیں، سیرۃ النبی ؐ کی تدوین کا سلسلہ بھی قائم رہا، پھر ملی کاموں میں اپنے قلم کے ذریعہ سے اپنی ملی حمیت کو بھی بروئے کار لاتے رہے

۱۹۲۸-۲۹ء میں سارداایکٹ کے خلاف سخت علمی جنگ کی، اوراپنے مضامین سے برابر یہ ظاہر کرتے رہے کہ کسی غیر اسلامی حکومت کو مسلمانوں کے نکاح وطلاق کے سلسلہ میں قانون بنانے کا حق نہیں، اور یہ صدا شاید پہلی بار اٹھائی کہ اگر آسمان کو دیکھ کر موسم کے انقلاب کی پیشین گوئی کی جاسکتی ہے تو موجودہ حالات کو دیکھ کر مجھ کو یقین ہے کہ اگر مسلمانوں نے اپنے مذہبی حقوق کی اور ٹونی کی تدبیر نہیں کی تو ان کی ممتاز ہستی اس ملک میں باقی نہیں رہ سکتی۔

۱۹۲۹ء کے مارچ میں ہندوستانی اکیڈمی کی دعوت پر الہ آباد جاکر عرب وہند کے تعلقات پر لیکچرز دیے، جن میں ہندو مسلمان دونوں کو وہ زریں عہد یاد دلایا جو دونوں کو بین الاقوامی

اور دوسرے گوناگوں تعلقات کے رشتہ میں جکڑے ہوئے تھا، اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ہندوستان اور عرب کے درمیان تجارتی تعلقات کا دجلہ، علمی تعلقات کا فرات اور مذہبی تعلقات کی گنگا جمنا کس طرح بہتی تھی، یہ کتاب ہندو مسلمان کے خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کا ایک موثر ذریعہ ہے، انگریزوں نے جو یہ سبق پڑھایا ہے کہ مسلمان ہندوؤں کو کافر سمجھتے تھے، ان کو تلوار کے زور سے مسلمان بناتے تھے، ان سے جزیہ وصول کرتے تھے، ان کی عبادت گاہوں کو منہدم کرتے تھے، اس زہر کا تریاق اس کتاب میں ہوگا اور بعد اجانے اس کے سہارے سے کتنی اور کتابیں تیار ہوگئیں۔

حضرت سید صاحب وقت اور قلم دونوں کے ایلق پر اس طرح سوار رہے کہ کبھی ان کو وقت کی کمی اور قلم کی سستی کی شکایت نہیں ہوئی، وقت اور قلم دونوں ان کے قابو میں رہے، عرب و ہند کے تعلقات کی ترتیب کے دو سال کے بعد ان کی کتاب عربوں کی جہازرانی شایع ہوئی، یہ بمبئی کے شعبۂ تعلیم کی سرپرستی میں جو چار خطبے دیئے گئے ان ہی کا مجموعہ ہے، اس میں پہلے لغات عرب اور کلام مجید سے عربوں کی بحری واقفیت اور ان کی جہازرانی کا ثبوت دیا گیا ہے، اسلام کے شروع دور کے علاوہ بنو امیہ، بنو عباس، فاطمیین مصر اور بنی امیہ اندلس کے زمانہ میں جو بحری لڑائیاں ہوئیں ان کی تفصیل ہے، اسی کے ساتھ مغربی ہند کی بندرگاہوں کے علاوہ افریقہ کے سواحل یعنی بحر روم کے جزائر، اس کے ساحلی ملکوں سسلی، اسپین، مصر اور شمالی افریقہ میں عربوں کی جہازرانی اور ان کے کارناموں کا ذکر ہے، اسی کے ساتھ بحر پیمائی اور فن جہازرانی میں عربوں کی علمی سرگرمیوں، ان کے ایجادات و اکتشافات، سمندروں کے بارہ میں ان کے علم، ان کی پیمائش، ان کی کتابوں میں بحری نقشوں، لائٹ ہاؤس، میل کے نشانات، جہازرانوں کے رہنما ستاروں، سمندری ہواؤں کی کیفیت، قطب نما کی ایجاد و ترقی، ان کے ایجاد کردہ فلکی آلات، جہازرانی کے کارخانوں، مصنوعی بحری لڑائیوں، ڈوبے ہوئے جہازوں کے نکالنے، جہاز کے سازوسامان کی پوری تفصیلات وغیرہ

اس کتاب میں پڑھی جا سکتی ہیں، جہاز رانی کے سلسلہ میں عربوں نے جو چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے ہیں ان کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔

ان تصنیفی سرگرمیوں کے ساتھ معارف میں مضامین کے ذریعہ ان کا قلمی جہاد بھی رہا، انگریزی اخبار اسٹیٹسمین میں واقعۂ کربلا پر ایک نہایت قابل اعتراض مضمون نکلا تو سید صاحبؒ نے اس کے خلاف احتجاج کیا، پنجاب یونیورسٹی کے نصاب میں ڈاکٹر وائل کی کتاب تاریخ اقوام اسلامیہ اور ڈاکٹر نکلسن کی تاریخ ادبیات عربی داخل ہوئی تو انھوں نے وہاں کے ارباب علم کو اس کی طرف توجہ دلائی، ان دونوں کتابوں میں اسلام، پیغمبر اسلامؐ اور صحابۂ کرامؓ کے متعلق نہایت گمراہ کن نظریات اور لغو اعتراضات ہیں، جن کو ایک مسلمان سننا بھی گوارا نہیں کرتا، اس احتجاج پر یہ کتاب پنجاب یونیورسٹی سے نکال دی گئی، اسی طرح جب رسالہ نگار لکھنؤ نے مذہب پر دلآزار مضامین لکھے تو اس کے خلاف بھی آواز بلند کی، جس کے بعد ایڈیٹر نگار کو توبہ نامہ لکھنا پڑا۔

۱۹۳۲ء میں ان کی کتاب سیرۃ النبیؐ جلد چہارم شایع ہوئی، یہ ۸۸۸ صفحات پر مشتمل ہے یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سید صاحبؒ کے قلم کی تیز روی اور سبک خرامی کسی طور پر کم ہوتی نظر نہیں آتی تھی، اس وقت ان کی عمر ۵۲ سال ہو چکی تھی، لیکن قلم پہلے سے زیادہ جوان اور رعنا ہو گیا تھا، اس لیے کہ ؎ عشق ہم راست و ہم خود منزل است۔

اس عشق میں منزل تک پہونچنے میں اپنی ساری عمر گذار دی، اس کے ٹائٹل پر تو یہ لکھا ہے کہ یہ منصب نبوت پر مشتمل ہے، لیکن اس میں پیغمبر اسلامؐ کی بعثت کے وقت دنیا اور عرب کی مذہبی و اخلاقی حالت، تبلیغ نبوت کے اصول اور اس کی کامیابی کے اسباب رسول اللہؐ کے پیغمبرانہ کام کی تفصیل بتائی گئی ہے، اور ان کے بعد اسلام کے عقائد یعنی ایمان کے مختلف پہلو، برزخ، قیامت، جزا، سزا، دوزخ، جنت، قضا، قدر پر مباحث ہیں، یہ مباحث بڑے نازک ہیں، اس خارزار سے

گذرنا آسان نہیں، لیکن ان کے لکھنے میں سید صاحب نے اپنی محتاط طبیعت کی وجہ سے کسی خاص فرقہ کی ترجمانی نہیں کی ہے، بلکہ اس کے لکھنے میں ہر موقع پر قرآن پاک سے استناد کو سب سے آگے رکھا ہے، احادیث صحیحہ سے پورا فائدہ اٹھایا ہے، مناظرانہ پہلو سے احتراز کیا ہے، اور پھر اسلام کا موازنہ دوسرے مذاہب سے اس غرض سے کیا ہے کہ اسلام کی تکمیلی شان نمایاں ہو، یہ سارے مباحث بالکل نئے نہ تھے، لیکن سید صاحبؒ نے ان کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے بیسویں صدی کا ذہن جس زبان، اسلوب اور طرز ادا کا طلبگار ہے وہی پیرایہ اختیار کرکے اس کو مطمئن کیا۔

سیرۃ النبیؐ کی تدوین کے ساتھ ان کی اور قلمی سرگرمیاں بھی جاری رہیں، مارچ ۳۳ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی انجمن اردوئے معلیٰ کی دعوت پر 'ہندوستان میں ہندوستانی' پر ایک خطبہ دیا، جس میں تاریخی حوالوں سے بتایا کہ اردو کا نام دراصل ہندوستانی تھا، انگریزوں کے آنے سے بہت پہلے دسویں صدی میں یہ زبان اسی نام سے پکاری جاتی تھی، اس لیے اگر اردو کے بجائے 'ہندوستانی' نام رکھا جائے تو بہت سے لسانی قضیے دور ہو جائیں، پھر دہلی طبیہ کالج کے ہال میں 'اسلامی طب کی تاریخ' پر ایک تقریر کی، پھر اپریل ۳۳ء میں ادارہ معارف اسلامیہ لاہور کے پہلے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لیے لاہور تشریف لے گئے، اس کی صدارت ڈاکٹر اقبال نے کی، اس میں انھوں نے اپنا ایک مقالہ پیش کیا جس کا عنوان 'لاہور کا ایک مہندس خاندان' جس نے لال قلعہ اور تاج محل بنایا تھا' اس میں مستند شہادتوں سے یہ ثابت کیا کہ تاج محل اور لال قلعہ کے معمار درحقیقت استاد احمد معمار شاہجہانی لاہوری ہے، جو ہندسہ ہیئت اور ریاضیات کا بہت بڑا عالم تھا، اس انکشاف کے بعد اور تمام دعوے جو تاج محل کے کاریگروں اور معماروں سے متعلق مشہور تھے، بے سروپا ہوکر رہ گئے،

جولائی ۳۳ء میں جنوبی ہند میں سیرۃ النبیؐ پر مختلف تقریریں کیں، اور اسی سال نظام حیدرآباد کی حکومت کے لیے 'ضابطہ جنایات قتل و قصاص' کی ترتیب دی، ان چیزوں کے ذکر کرنے کا

مقصد یہ ہے کہ سید صاحبؒ کے ذوق کی جامعیت اور کاملیت کا اندازہ ہو، ان میں کیسی رنگا رنگی اور بوقلمونی تھی۔

اسی سال ان کی مشہور و معروف تصنیف "خیام" شایع ہوئی، اس کتاب کی ترتیب میں انھوں نے سنین کی تحقیق اور تطبیق، واقعات کی تلاش و تفتیش، ماخذوں اور سندوں کے حوالوں اور خیام کی فلسفیانہ تصانیف کی جستجو میں جو فکر اور کاوش کی ہے وہ ایک اہم علمی کارنامہ ہے، اس کتاب کی اشاعت سے اہل یورپ کے اس خیال کی بالکل تردید ہوگئی کہ خیام ایک عیاش، بدمست، رند لاابالی شاعر تھا، جو ہمہ تن شاہد و شراب میں غرق رہتا تھا اور جس کے لیے زندگی رندی و عیش پرستی کے سوا کچھ نہ تھی، اس کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کا ایک بڑا فلسفی، ہیئت و نجوم و ریاضیات کا بہت بڑا عالم اور فلسفی قسم کا صوفی تھا، مذہبی حیثیت سے ایک دیندار مسلمان تھا، اور مذہبی علوم میں پوری دستگاہ رکھتا تھا، اس کی زندگی زاہدانہ تھی، اس کتاب کی اشاعت کے بعد اہل نظر نے یہ تسلیم کیا کہ اس میں جو کچھ لکھ دیا گیا اس پر کوئی مستشرق یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا۔

اسی سال وہ نادر شاہ افغانستان کی طرف سے ایک علمی تعلیمی دعوت پر ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، سر راس مسعود وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کے ساتھ افغانستان گئے، اور وہاں کے تراجم اور تالیف کے ادارہ کو وسیع کرنے کے سلسلہ میں مفید مشورے دیے، اس سفر میں علامہ محمد اقبالؒ اور حضرت سید صاحبؒ ایک دوسرے سے جس طرح متاثر ہوئے وہ اس برصغیر کی علمی اور دینی تاریخ کا بہت ہی رومانی اور دلکش باب ہے،

اس سفر کے سلسلہ میں سید صاحب نے "سفرنامۂ افغانستان" بھی مرتب کیا، جو علمی، ادبی، تاریخی اور معلوماتی لحاظ سے ایک مستقل تصنیف بن گیا اس میں وہ ابن بطوطہ کے ساتھ ابوزید سیرافی بھی نظر آتے ہیں۔

سید صاحبؒ سفر کے بعد دارالمصنفین کے گوشۂ عافیت میں آکر تصنیف و تالیف میں لگ جاتے لیکن پورے ہندوستان کی نظریں ان کی طرف اٹھی رہتیں، اور ان کو اپنے یہاں مدعو کرکے اپنی عزت میں لوگ اضافہ کرتے، فروری ۳۳ء میں جامعہ ملیہ میں ڈاکٹر بہجت رہبی توسیعی خطبات دینے کے لیے آئے تو ان کے دو خطبوں کے جلسوں کی صدارت سید صاحب نے ہی کی، پھر جون ۳۴ء میں صوبۂ بہار کے وزیر تعلیم جناب سید عبدالعزیز کی دعوت پر عربی مدارس کے نصاب کی ترتیب کے لیے رانچی تشریف لے گئے، اسی سال دسمبر ۳۴ء میں معارف میں یہ تجویز پیش کی کہ مسلمانوں نے ہندوستان کو جو سیاسی، قومی، علمی، تمدنی حیثیت سے ترقی دی ہے، اس کی مفصل تاریخ لکھی جائے اور اس کی پندرہ جلدوں کا خاکہ پیش کیا، اور یہ کام دارالمصنفین میں شروع کرا دیا، جنوری ۳۵ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کی دعوت پر اس کی طلائی جوبلی میں شریک ہوئے تو وہاں ڈاکٹر اقبالؒ کے ساتھ مل کر ایک زنانہ جامعہ کا خاکہ تیار کیا، پھر اسی سال حیدرآباد کے ضابطۂ فوجداری پر نظر ثانی کیلئے اس کی ایک کمیٹی کی پوری مدد کی۔

اپنی ان تمام مشغولیتوں اور سرگرمیوں کے باوجود اسی سال ۳۴ء میں سیرۃ النبیؐ کی جلد پنجم شائع کرائی، اس کا موضوع عبادات ہے، یعنی اسلام میں عبادت کی حقیقت کیا ہے اور اس کے اقسام کتنے ہیں، اور ان میں کیا مصلحت و حکمت رکھی گئی ہے، ان ہی چیزوں کی تشریح اس جلد میں کی گئی ہے ان میں نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج کے ابواب بھی ہیں، یہ موضوعات بھی نئے نہیں ہیں، لیکن ان موضوعات پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا انداز کچھ ایسا نیا ہے کہ اس میں سید صاحب مفسر، محدث، فقیہ اور متکلم سب کچھ نظر آتے ہیں، کلام پاک کی چھوٹی سی چھوٹی آیتوں کا بھی ذکر کرتے ہیں، تو وہ اپنی تحریروں میں موتی کی طرح جڑی دکھائی دیتی ہیں اور جب لمبی آیتیں نقل کرتے ہیں تو وہ اپنی تحریروں کی موتیوں کا کوئی ہار پہناتے نظر آتے ہیں، وہ جب مفسر بن کر اس کی تشریح دلنواز طریقہ پر کرتے ہیں،

تو معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر میں اردو زبان کا خوان نعمت بچھا رہے ہیں، اسی طرح احادیث کا ذکر کر کے ان پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ اب تک محدثوں کے جو خیالات اور جذبات دبے ہوئے تھے ان کی تحریروں میں ابھر رہے ہیں، ان موضوعات پر نقاد میں بڑا اختلاف رہا ہے، ان دشوار گذار راہوں کو بھی سید صاحب نے جس طرح طے کیا ہے اور اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے اس سے بڑے بڑے متقشف نقاد کو بھی اختلاف نہیں ہوا ہے، اور ان کے لکھنے میں جو کلامی رنگ پیدا کر دیا ہے اس سے بڑا سے بڑا متکلم بھی لطف اندوز ہو سکتا ہے،

اکتوبر ۳۵ء میں اردو ہندی کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا، تو اس کے روز افزوں جھگڑوں سے ان کو بہت دکھ پہونچا، معارف کے شذرات کے ذریعہ سے ان دردمندانہ خیالات کا اظہار کیا کہ ہندی اردو دونوں کے لیے الگ الگ ترقی کی راہیں کھلی رہنا چاہئیں، نہ اردو ہندی کو مٹا سکتی ہے، نہ ہندی اردو کو، دونوں اپنی اپنی راہ چلتی رہیں گی، انھوں نے یہی خیالات علی گڑھ میں آل انڈیا کانفرنس میں ظاہر کیے جو اکتوبر ۳۶ء میں ہوئی، اسی زمانہ میں یہودیوں اور انگریزوں کی سازش سے فلسطین کا جو نقشہ بننے کو تھا، اس سے ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی بڑا سیاسی ابال اور مذہبی جوش پیدا ہوا، سید صاحب نے بھی فلسطین کے مسئلہ میں اپنی آواز بلند کی اور مولانا شوکت علیؒ اور مفتی کفایت اللہؒ کے اصرار پر ۳۶ء کی آل انڈیا فلسطین کانفرنس کی صدارت کی، اس میں ان کا خطبہ نہ صرف سیاسی تھا، بلکہ علمی تاریخی اور مذہبی رنگ بھی لیے تھا، جس کی وجہ سے یہ پورے عالم اسلام میں مشہور ہوا۔

جنوری ۳۷ء میں لکھنؤ کی نمایش گاہ میں ہندستانی اکیڈمی کی ایک کانفرنس ہوئی، اس اکیڈمی کا مقصد ہندوستان کو ادب کی راہ سے ایک کرنا تھا، اسی لیے اس نے اردو اور ہندی کے نام کے بجائے اپنا نام ہندستانی اکیڈمی رکھا تھا، مگر اس کانفرنس میں اردو اور ہندی کے دو خیمے علیحدہ علیحدہ کر دیے گئے، ایک کے ادیب نے دوسرے کی صورت تک نہ دیکھی، اس سے سید صاحب کو

بڑا دکھ ہوا، اسی وقت ان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید ہندو مسلمانوں کے دل ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہیں، اور اس کا اظہار انھوں نے فروری ۱۹۳۶ء کے معارف میں بھی کیا، مارچ ۱۹۳۶ء میں مسلم ایجوکیشنل کی طلائی جوبلی علی گڑھ میں ہوئی تو اس کے شعبۂ علوم و فنون اسلامی کی صدارت کی، اس میں خطبۂ صدارت کے لیے اپنا ایک مقالہ "عرب و امریکہ" کے عنوان سے پیش کیا، اور اس میں یہ دکھایا کہ کولمبس سے پہلے عرب جہاز ران امریکہ پہونچ چکے تھے، کیونکہ ان کو زمین کی گولائی اور اس کے تحتانی و فوقانی حصوں کا علم تھا، اسی لیے ماورائے ظلمت کی تہہ تک پہونچنے کی انھوں نے کوشش کی ،

۱۹۳۸ء میں سی۔ پی میں ودیا مندر کے نام سے جبری تعلیم شروع ہوئی تو اس میں اردو پڑھانے کا کوئی انتظام نہیں تھا، اس سے مسلمانوں میں ہیجان پیدا ہوا تو سید صاحبؒ نے بھی اس کے خلاف احتجاج کیا، اور معارف کے ذریعہ یہ اعلان کیا کہ مخالفت اور دشمنی کی اسپرٹ سے نہیں بلکہ اپنے صحیح حق کو حاصل کرنے اور ملک میں اپنی پوزیشن کو باقی رکھنے کے لیے اردو زبان سے قطع نظر کرنا ہمارے لیے قطعاً محال ہے"

۱۹۳۹ء میں ان کی سیرۃ النبیؐ کی چھٹی جلد شایع ہوئی جس کی ضخامت ۸۸۰ صفحے ہے، اس وقت تک سید صاحب کی عمر پچپن ۵۵ سال کی ہو چکی تھی، مگر اس کتاب کی ضخامت' اس کے اندر قلم کی روانی، تحریر کی شگفتگی اور مسائل کے نکتہ درانہ اور دیدہ ورانہ مباحث سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تصنیفی زندگی میں کہولت کے بجائے پہلے کی طرح رعنائی اور دلآویزی قائم اور برقرار تھی، انداز تحریر یہ بتاتا ہے کہ پہلے ہی کی طرح زبان کا تلاطم اور تموج باقی تھا، اور پھر اس تلاطم و تموج کے اندر سے ادب انشاء کے دربائے شہوار سطح پر آکر رولتے نظر آتے، طرز ادا میں فکر کی گہرائی کے ساتھ گیرائی بھی ہے، قلم میں متانت اور سنجیدگی پہلے سے اور بھی زیادہ بڑھی ہوئی دکھائی دیتی ہے، اس جلد میں اسلام میں اخلاق کی اہمیت بتائی گئی ہو اور اس پر زور دیا گیا ہے کہ تعلیم محمدیؐ نے اخلاق کی اہمیت کو عبادات سے زیادہ بڑھا دیا ہے، اس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ جو بھی بات کہی گئی ہے اس کی تائید کے لیے قرآن کی آیتیں

اور حدیثیں پیش کر دی گئی ہیں اور وہ اس لیے خشک نہیں ہونے پائی ہیں کہ رسول اللہؐ کی عملی زندگی کے واقعات اس کے ساتھ اس طرح پیش کر دیے گئے ہیں کہ شروع سے آخر تک کتاب پڑھتے وقت یہ نہیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم پند و موعظت کی کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں، بلکہ لذیذ حکایتوں کی ایک کتاب سے لذت آشنا ہو رہے ہیں، یہ نہ صرف مسلمانوں کے خیر امت ہونے کے لیے ایک دستور حیات ہے، بلکہ اسلام کا رب، رب العالمین ہے، رب المسلمین ہی نہیں اور اس کے رسول بھی رحمۃ للمسلمین ہونے کے بجائے رحمۃ للعالمین ہیں، اس لیے مسلمانوں کے رب سے جو تعلیمات ملی ہیں، وہ انسانیت کا پیام رحمت اور انسانوں کے لیے نصاب زندگی ہیں اور ان ہی کو حاصل کر کے دنیا کی زندگی کے موتی، ہیرے اور لعل، سیرت کے یاقوت اور عقیق، کردار کے نیلم اور پکھراج اور لاجورد سے جگمگائی جا سکتی ہے۔

سیرۃ النبیؐ جلد ششم کی اشاعت کے بعد سید صاحبؒ کا یہ سلسلۃ الذہب یہیں آکر ختم ہو جاتا ہے، آگے چل کر ان کے نام سے جلد ہفتم بھی شایع ہوئی، مگر وہ ان کی ایک نامکمل اور ادھوری تصنیف ہے، وہ اپنی جلد ششم کے بعد اسلام میں معاملات اور سیاسیات کی جو تعلیمات دی گئی ہیں، ان پر وہ ایک مستقل جلد لکھنا چاہتے تھے، لیکن ان کی نجی اور عملی زندگی میں بعض اسباب کی بنا پر کچھ ایسا انتشار پیدا ہو گیا کہ وہ اس کو مکمل نہ کر سکے، جو چند ابواب لکھے ہیں، ان ہی کو جمع کر کے شایع کر دیا گیا ہے اس میں پہلے تو معاملات کے عنوان سے ایک مقدمہ ہے، پھر یہ عنوانات ہیں: (۱) اسلام میں حکومت کی اہمیت اور حیثیت (۲) عہد نبویؐ میں نظام حکومت (۳) سلطنت اور دین کا تعلق اور امت مسلمہ کی بعثت (۵) قوت عاملہ یا قوت آمرہ (۶) حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے، ان چند ابواب سے سید صاحبؒ کے اسلامی سیاست کے افکار کا اندازہ ہو جاتا ہے، سیاست کی اسلامی روح کو جس پر زور، موثر اور خوبصورت انداز میں قلم بند کیا ہے وہ موجودہ دور کے مسلم حکمرانوں کے لیے مشعل ہدایت ہے، لکھتے ہیں:

"اصل یہ ہے کہ سیاسی مفکرین کی نظریں حکومت کے ظاہری اشکال کے گورکھ دھندوں میں الجھ کر رہ گئی ہیں، اور اسلام کی نظر اس کی حقیقت پر ہے، اس کے نزدیک حکومت کی ظاہری شکل، یعنی انتخاب کا طریقہ، ارباب شوریٰ کی ترتیب و تعیین، ان کے فرائض و حقوق، ان کے انتخاب، اظہار رائے کے طریقے، اور دیگر متعلقہ مسائل اہمیت کے قابل نہیں، اصل چیز حکومت کے امیر و رئیس اور اس کے ارکان و عمال کا طریقہ ہے۔"

سید صاحبؒ کی علمی زندگی کا اصلی راس المال یہی سیرۃ النبیؐ کی جلدیں ہیں، ہمیں یہ لکھنے میں تامل نہیں کہ ان میں وہ ابن اسحاق اور ابن ہشام سے بہت آگے ہیں، ان سیرت نگاروں نے زیادہ تر مغازی اور شمائل نبویؐ پر زور دیا ہے، حضرت سید صاحبؒ اپنی پانچوں جلدوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو جس انداز میں پیش کیا ہے وہ سیرۃ النبیؐ کے لیے ایک بالکل نئی چیز تھی، ایسے مباحث کسی اور سیرۃ النبیؐ میں نہیں قلمبند کیے گئے، ان میں جب کبھی وہ قرآن مجید کی آیتوں کے رموز و نکات بیان کرتے ہیں تو ان میں امام رازی اور امام ابن تیمیہ کی روح حلول کر جاتی ہے، اور کبھی ان کی بعض گتھیوں کے سلجھانے میں شاہ ولی اللہ کی نگاہ ان میں پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی حدیث کی روایت و درایت کے پرکھنے میں ان کے سامنے ابن حجر عسقلانی نمودار ہو جاتے ہیں، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تفسیر کبیر، تفسیر ابن جریر، تفسیر طبری اور تفسیر زمخشری کا وہ ذکر کرتے ہیں، لیکن ان کی حیثیت ماخذ کی نہیں بلکہ زیر مطالعہ کی رہتی ہے اور وہ قرآن پاک کے معانی و مطالب کے سمجھنے میں اپنے ہی ادراک و بصیرت پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں جن کی روشنی ان کے قلم میں منتقل ہو کر کاغذ کے صفحات پر پھیل جاتی ہے۔

ان ہی کارناموں کی بدولت انھوں نے جوئے شیر اسلامیہ کے فرہاد کا لقب حاصل کیا، مگر اس لقب کے ساتھ انھوں نے ان جلدوں کے ذریعہ سے ان میں اپنی انشا پردازی کا جو قصر شیریں تعمیر کیا ہے، وہ ان کا دوسرا اہم کارنامہ ہے، ان میں جو انداز بیان ہے وہ دنیا کے کسی عظیم ترین مصنف کے اسلوب کے

مقابلہ میں رکھا جا سکتا ہے، کسی حسین صبح، کسی رنگین شام یا کسی عنبریں رات یا کسی گلشن کے گل و سرو و صنوبر کی منظر نگاری یا بلبل کی نغمہ سرائی، سبزہ زاروں کی لہلہاہٹ، دریا کی موجوں کی روانی، ایک عاشق نامراد کی تپش دل اور دردِ جگر یا کسی عیش کی محفل میں پروانوں کے ماتم کی مرقع آرائی کرنے میں قلم خوب رہبری کرتا ہے، مگر مفسر یا محدث یا فقیہ یا متکلم بن کر انشا پردازی کا جوہر دکھانا، یا نثر نگاری کی رنگارنگی کا اظہار کرنا تلوار کی دھار پر چلنا ہے، سید صاحبؒ اسی تلوار کی دھار پر چلتے دکھائی دیتے ہیں

ایک بات یہ بھی عرض کرنا ہے کہ مصنفوں کی کچھ قسمیں ہوتی ہیں، عنکبوتی[1]، نملی[2]، نحلی[3]، عنکبوتی تو وہ ہیں جو عنکبوت یعنی کڑی کی طرح اپنی تحریروں کے جالے تن کر اپنے کو مطمئن کر لیتے ہیں، نملی وہ ہیں جو اپنی تحریروں میں چیونٹیوں کی طرح ادھر ادھر سے اپنے خیالات کے ریزے جمع کر کے ایک انبار لگا دیتے ہیں، نحلی وہ ہیں جو شہد کی مکھیوں کی طرح اپنی تحریروں میں خیالات کا شہد جمع کر دیتے ہیں، سید صاحبؒ اپنی تحریر میں محقق بھی ہیں، مفسر بھی ہیں، محدث بھی ہیں، متکلم بھی ہیں، اپنی تحریر میں عنکبوتی نظر نہیں آتے، نہ محدث و مفسر بن کر نملی دکھائی دیتے ہیں بلکہ محدث ہوں، مفسر ہوں، متکلم ہوں، یا فقیہ ہوں، نحلی بن کر اپنے ناظرین کو یہ محسوس کراتے ہیں کہ اسلامی علوم و فنون سے رس چوس کر اپنی میٹھی تحریر کے ذریعہ سے تحقیق، تفسیر، حدیث اور کلام کے شہد کا انبار ہی نہیں لگا دیتے بلکہ اس کا آبشار جوئے بار اور رودبار بہاتے رہتے ہیں۔

جس سال سیرۃ النبی جلد ششم شائع ہوئی اسی سال ان کی کتاب نقوش سلیمانی بھی شائع ہوئی، یہ ان خطبوں تحریروں اور مقدموں کا مجموعہ ہے جو اردو ادب و زبان سے متعلق ان کے قلم سے نکلے، ان کو پڑھ کر آج بھی اردو زبان کا بڑا سے بڑا ادیب، انشا پرداز اور نقاد اردو ادب پر ان کی گہری نظر کا قائل ہوگا، اس میں اردو کے مولد کی تعیین و تشخیص بھی کی گئی ہے، اس کے آغاز اور اس کے عہد بہ عہد ترقی کی تفصیلات بھی ہیں، اس کی بقا کی ضرورت اور اہمیت پر زور بھی ہے، اردو، ہندی اور ہندوستانی پر مباحث بھی ہیں، سنسکرت آمیز

ہندی کو راشٹریہ بھاشا بنانے کے خطرات کی تنبیہ بھی ہے، ہندی اور اردو کے ناگوار قضیہ کا بھی ذکر ہے، لکھنؤ والوں کی لسانی اور ادبی خدمات کا بھی ذکر ہے، پرانے لفظوں کی نئی تحقیق بھی ہے، تہنید کے عنوان سے نہایت ہی دلچسپ لسانی گفتگو بھی ہے، اکبر کے ظریفانہ کلام کی نکتہ دری بھی ہے، مکاتیب شبلی پر گلفشانی بھی ہے، کلام شاد پر تبصرہ بھی ہے، محبت کے متوالے، عشق حقیقی کے جویا، مجازی راہ سے حقیقت کی منزل تک اور بت خانہ کی گلی سے کعبہ کی شاہراہ اور خم خانہ کے بادۂ کیف سے بے خود فراموش ہو کر بزم ساقی کوثر تک پہونچنے والے جگر مرادآبادی کی شاعری کا تجزیہ بھی ہے، پھر گداز طبیعت رکھنے والے، ازل سے درد مند دل لے کر آنے والے، مزاج سدا کا اوس رکھنے والے، عالم کی نیرنگی، زمانہ کی سازگاری اور پھر اپنی قوم کی پستی کو دیکھ کر خود بھی اکثر رونے اور دوسروں کو رلانے والے حالی کی مسدس کی وہ آئینہ داری بھی ہے جس میں ہر مسلمان اپنا چہرہ دیکھ سکتا ہے۔

سنہ [illegible]ء میں ان کا سفر دکن، سرحد، پنجاب میں ہوتا رہا جس میں وہ مسلمانوں کو شرف امم ہونے کی حیثیت سے خیر امم ہونے کا شوق دلاتے رہے، یہ گویا تبلیغی سفر تھا اسی سال انھوں نے بچوں کیلئے رحمت عالم لکھی، جس میں سلیس اور آسان زبان میں رسول اللہ صلعم کی سیرت پاک ہے، وہ بچوں کیلئے لکھی گئی ہے، لیکن جوان اور بوڑھے سب اس سے مستفید ہو رہے ہیں، اور اس وقت تک شاید لاکھوں کی تعداد میں شایع ہو چکی ہے

سنہ [illegible]ء میں ایک بڑا روحانی انقلاب پیدا ہوا۔ ان کی نجی زندگی بڑی پاک صاف رہی اور ان کے نزدیک رہنے والوں کو یہ کہنے میں تامل نہ ہوتا کہ ع دامن دم پاک ہے تو میری نظر میں۔ لیکن اپنی دینی عظمت و علمی جلالت کا لحاظ کیے بغیر حضرت مولانا تھانوی کے آستانہ پر جا کر اپنا سر نیاز جھکا دیا، حضرت مولانا کو بھی علم و فن کے ایک شہباز اور گلستان رسالت کے ایک عندلیب خوشنوا، اسلام کے ایک سفیر اور ضمیر کو اپنے سایۂ عاطفت میں لینے میں بڑی مسرت ہوئی، عبادت و ریاضت میں ذکر خفی اور جلی بھی ہونے لگا، ان کی تقریر و خطابت میں علمی و تاریخی رنگ کے بجائے تبلیغی انداز پیدا ہو گیا، زیادہ وقت رشد و ہدایت میں

صرف ہونے لگا، پہلے کبھی کبھی شعر کہہ لیا کرتے تھے، اب عارفانہ اور صوفیانہ رنگ کے اشعار اور غزلیں زیادہ کہنے لگے، اس زمانہ میں ان کی طبیعت کا رنگ ان دو شعروں سے ظاہر ہوگا۔

ہم ایسے رہے یاں کہ ویسے رہے — وہاں دیکھنا ہے کہ کیسے رہے

خیالِ دو روزہ کا کیا عیش و غم — سفر کا بھی کیا، جیسے تیسے رہے

مگر اس رنگ کے باوجود ان کے اپنے استاد کی اس وصیت کا خیال برابر غالب رہا کہ جب تم اور دنیا کے کاموں سے فارغ ہونا تو تم ہی میری سوانح عمری لکھ دینا، سنہ ۱۹۴۰ء میں اس کام کو شروع کر دیا تھا، اور تین برس کی جانکاہ محنت کے بعد سنہ ۱۹۴۳ء میں ۸۴۶ صفحے کی حیات شبلی لکھ کر اہل علم کے سامنے پیش کی، یہ ایک جلیل القدر، عالی مرتبت اور شفیق استاد کی خدمت میں ایک فاضل شاگرد کی دلی محبت، شیفتگی، وارفتگی کا نذرانہ ہے، اس میں مولانا شبلیؒ کے علمی کمالات و اجتہادات اور ان کے زمانہ میں تمام تعلیمی، اصلاحی، ملی اور قومی تحریکوں میں ان کی دلچسپیوں کا ایسا دلکش مرقع کھینچا ہے کہ ان کے نہ صرف خط و خال نمایاں ہوگئے ہیں بلکہ مسلمانان ہند کے پچاس برس کے علمی، ادبی، سیاسی، تعلیمی، مذہبی واقعات کی تاریخ بھی قلمبند ہوگئی ہے، اس کے مقدمہ میں یوپی کے مشرقی اضلاع کی کئی صدیوں کی جو علمی، دینی، اخلاقی اور روحانی تاریخ لکھی گئی ہے، وہ اس کتاب کا شاہکار ہے،

ان کی طبیعت کا رنگ بدل جانے کے باوجود ملک کے ہر حصہ سے ان کے پاس علمی، تاریخی اور مذہبی جلسوں کیلئے دعوت نامے آتے رہے، سنہ ۱۹۴۳ء میں انڈین ہسٹاریکل کانگریس کا جلسہ مدراس میں ہوا، تو ان کو شعبۂ تاریخ ہند ازمنۂ وسطی کی صدارت کیلئے دعوت دی گئی، اس میں انھوں نے جو خطبہ دیا، وہ مورخوں کیلئے شمع ہدایت ہے، اس میں انھوں نے مورخوں کو مخاطب کرکے فرمایا:

"انگریزوں نے مسلمانوں کی تاریخ الٹ پلٹ کر ایسی سمجھائی اور پڑھائی کہ جو دل ان سے ٹوٹے وہ اب تک نہ جڑ سکے، لیکن اب جن کی نظر میں اس ملک کا مستقبل ہے، اور جن کے ہاتھوں میں اس کے مستقبل کا بنانا بگاڑنا ہے ان کو اپنی ذمہ داری کو سمجھنا چاہیے، اور اس حالت میں جبکہ ہم سب کو معلوم ہے کہ ہم کو اب اسی ملک میں جینا اور مرنا ہے تو عداوت اور نفرت کی پچھلی باتوں کو اس طرح دہراتے رہنا جس سے یہ جذبہ اس طرح جیتا اور بڑھتا رہے اور پھولتا رہے، اپنے ملک کے ساتھ بڑی بے وفائی ہے،

...... ہندوستان کی جو تاریخ لکھی جائے اس کا مقصد ہندوستان کے متفرق اجزاء کو باہم جوڑنا ہو توڑنا نہ ہو، حال کو ماضی کی ناگواری کی تلخی کو بڑھا کر کیوں برباد کیا جائے، اور کیوں مستقبل کیلئے یہ کوشش جاری ہے کہ وہ کبھی خوش آیند نہ ہو سکے۔"

اسی سفر میں مدراس کے دوسرے مقامات وِیشاکھاپٹنم، عمرآباد میں مذہبی تقریریں کرتے ہوئے بمبئی پہونچے، وہاں جمعیۃ العلماء کی دعوت پر سورہ الحمد کی تفسیر شہر کی انجمن اسلام ہال میں 'اردو' اور صابو صدیق ہال میں 'ہندوستان میں علوم عربیہ کی خدمت' اور ایک خاص مجمع میں 'توبہ و انابت' پر تقریریں کیں، بمبئی سے حیدرآباد ندوۃ العلماء کے کام سے گئے اور وہاں سے گاندھی جی نے ان کو واردھا بلایا، وہاں جو جلسہ ہوا تو گاندھی جی کے سامنے اپنی تقریر میں ایک ملکی زبان کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے فرمایا:

"ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبان میں اسی حد تک فرق ہونا چاہیے جس حد تک ان کے مذہبوں اور تمدنوں میں ہے، اس لیے جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ان کی مذہبی و تمدنی اصطلاحوں اور لفظوں کا ماخذ عربی، فارسی اور ترکی ہونے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، ایسی ہی اجازت ہندوؤں کو بھی ان کے مذہبی اور تمدنی خصوصیات کے لیے ہونی چاہیے، اس کے بعد لفظوں کا مدار لغت کی کتابوں کے بجائے بازار کے چلن اور عوام کے رواج پر ہونا چاہیے، اور اس وقت ہماری زبان میں عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت اور انگریزی کا جو لفظ جس صورت میں بولا جاتا ہے اس کو برقرار رکھنا چاہیے۔"

اسی کی ترویج وہ زندگی بھر کرتے رہے، اور اگر اس پر عمل کیا جاتا تو ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

اسی سفر میں وہ راندیر اور سورت گئے، اور راندیر کی جامعہ حسینیہ میں الجہد والجہاد العلمی المعاش والمعاد کے عنوان سے ایک تقریر کی، اور مدرسہ اشرفیہ میں خشیت الٰہی پر ایک خطبہ دیا۔

وہاں سے واپس آئے تو بہت سخت علیل ہو گئے، اچھے ہوئے تو ڈاکٹروں نے علمی کام چھوڑ دینے کو کہا مگر عمر بھر کی اس عادت کا چھوڑنا مشکل تھا، معارف کے لیے شذرات لکھتے رہے، جس میں دینی اور ملی احیاء کی تلقین کے ساتھ تہند اور تفرنج دونوں کے خطرات سے آگاہ کیا۔

ندوہ ان کی زندگی کے رگ و ریشہ میں رچا بسا ہوا تھا، زندگی بھر اس کے لیے مفید کام انجام دیتے رہے،

آخر میں وہیں منتقل ہوجانے کا خیال تھا لیکن نواب حمید اللہ نے اصرار کر کے بھوپال بلالیا، تاکہ وہ ریاست کے دار القضا اور عربی مدارس کو اپنی نگرانی میں لے کر خالص مذہبی اور شرعی رنگ میں کر دیں، ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں بڑا انقلاب آگیا، دیسی ریاستوں کے لیل و نہار بھی بدل گئے، وہاں کے قیام کے زمانہ ۱۹۴۹ء میں حج کے لیے گئے، مدینہ منورہ میں ایک مہینہ قیام فرمایا، اور بارگاہ نبوی کے سیرت نگار نے اپنے زور دعشق، عقیدت و محبت، عجز و نیاز، لطف و سرور کا اظہار ایک نعتیہ غزل میں کیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد وہ کوئی مستقل مضمون نہ لکھ سکے، معارف میں وفیات کے عنوان سے کبھی کبھی لکھتے، یا شذرات لکھ بھیجتے، جون ۱۹۵۰ء میں معارف میں ان کے آخری شذرات شایع ہوئے جس کا آخری ٹکڑا یہ ہے:

"ہم ہندو مسلمانوں کے میل ملاپ اور میل جول پر دل سے یقین رکھتے ہیں، لیکن یہ قطعی ضروری نہیں کہ اس غرض کو دین و قوم کا فرق مٹا کر ہی حاصل کیا جا سکتا ہے، بلکہ ہندو ہندو اور مسلمان مسلمان رہ کر بھی اس غرض کو حاصل کر سکتے ہیں، جس کی مثالیں انگریزوں کی دی ہوئی تعلیم سے پہلے ہندوستان میں کثرت سے تھیں۔"

یہ گویا ہندوستان والوں کے لیے ان کا آخری پیغام تھا،

۱۸ جون ۱۹۵۰ء میں کراچی پہونچ گئے، کیوں گئے؟ کیسے گئے؟ اس کی بڑی دردناک کہانی ہے، وہاں پہونچ کر اپنے ایک مکتوب مورخہ ۱۵ر جنوری ۱۹۵۱ء میں راقم کو تحریر فرماتے ہیں:

"یہاں کیا آیا کہ دنیا ہی بدل گئی، ہندوستان بھلائے سے نہیں بھولتا،..... خدا جانے چمن پہ کیا گذری۔"

کراچی ہی میں ۲۲ر نومبر ۱۹۵۳ء کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، پاکستان میں ان کی مشغولیتوں اور سرگرمیوں کو سردست نظر انداز کیجئے۔

ان کی زندگی پر یہ محض ایک طائرانہ نگاہ ہے، اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ ان کی زندگی

علم وفن کی اضطراری، اضطرابی اور سیمابی کیفیت کا ایک پیکر بنی رہی، جس میں حرکت، سرگرمی اور کثرت کار ایسی کارفرما رہی کہ یہ ساری چیزیں ان کی زندگی کی لازم وملزوم بنی رہیں، شاید ہی ان کا کوئی دن یا کوئی گھنٹہ بیکار گذرا ہو، وہ لکھتے نہیں تو کچھ پڑھتے، اور اگر لکھتے پڑھتے نہیں تو کچھ سوچتے، یہ کہنے میں تامل نہیں کہ وہ خالد بن ولیدؓ کی طرح علم کے میدان کارزار میں اترے، سعد بن ابی وقاصؓ کی طرح اقلیم علم کی فتوحات کیں، عبیدہؓ ابن جراح کی طرح علم کے قلعوں کے کنگروں پر اپنا پرچم لہرایا، معاذ بن جبلؓ کی طرح علمی خطہ پر فرماں روائی کرنے میں قرآن اور حدیث کو سینے سے لگا کر اپنی اصابت رائے سے علمی اجتہادات بھی کیے، ہندوستان میں اپنی قلمی رواداری اور علمی فراخدلی دکھا کر علم وفن کے محمد بن قاسم بھی بنے رہے۔

۲۲ر نومبر ۱۹۵۳ء کو ان کا جنازہ کراچی میں اٹھا تو اس کا آنکھوں دیکھا حال وہاں کے ریڈیو سے نشر کیا جا رہا تھا، دارالمصنفین کے لوگ اس کو سن رہے تھے تو ان کو محسوس ہو رہا تھا کہ اسلام کا ایک تابندہ ضمیر اور بے چین سفیر اپنے علم کی گہرائی، فن کی دیدہ وری، تحقیق کی گہرائی، قلم کی شگفتگی، تحریر کی زوربیانی، طرز ادا کی دلنشینی اور انداز بیان کی خوبی کے ساتھ سپرد خاک ہو رہا ہے، دارالمصنفین کے لوگ اب تک دلگیر ہیں کہ بزم شبلی کا صدرالصدور، اس کی علمی مجلس کا سرو جب سے ان سے رخصت ہوا تو ان کے ساتھ یہاں کی علمی سحر کی سپیدی اور علمی شام کی رنگینی بھی چلی گئی، انھوں نے ایک علمی تاج محل بنایا جس پر وہ چودھویں رات کی چاندنی کی طرح پھیلے رہے، وہ گئے تو پھر اس پر وہ چاندنی چھٹکی ہوئی نہیں دکھائی دی، ان کی یاد میں جب آنسو کے قطرے گرتے ہیں تو اس کا ہر قطرہ یہ کہتا ہوا گرتا ہے کہ

ع ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

تاریخ اسپین کا ایک ورق

از

ڈاکٹر صلاح الدین ندوی، قاہرہ،

تاریخ کی تند و تیز گردش کے باعث کچھ شخصیتیں پس پردہ ہو جاتی ہیں، یا قصداً ان پر نقاب ڈال دی جاتی ہے، پھر کچھ دیگر شخصیتیں تاریخ کے صفحات پر رونما ہوتی ہیں، مگر وہ اپنی کم مائیگی کے باعث اس دنیا کو کچھ نہیں دے سکیں، بلکہ ان کی خوں ریز اور انسانیت سوز بداعمالیوں کے نتیجے میں ان کے روئے سیاہ بشریت کی تاریخ میں شامل کر لیے گئے، لیکن درحقیقت وہ انسانیت کی سفید پیشانی پر سیاہ دھبے ہیں،... بہر حال ہم اس تحریر میں اُن بہادروں کے عزائم اور عظیم الشان کارناموں پر روشنی ڈالنے جا رہے ہیں جنھیں مصلحت خسرواں نے ابھرنے نہ دیا، اور جنھیں غیر منصف مزاج مورخین نے بالقصد نظر انداز کر دیا ہے۔

قارئین! اسپین کے عرب بہادروں کی عظیم الشان داستان کا آغاز اس خبر سے ہوتا ہے جو ساتویں دہائی میں قاہرہ سے شایع ہونے والے ایک مشہور و مقبول روزنامہ "الجمہوریہ" میں شایع ہوئی تھی اس خبر میں یہ بتایا گیا تھا کہ اسپین کی کسی یونیورسٹی میں زیر تعلیم ایک امریکی طالب علم عربوں اور مسلمانوں کی تاریخ کی جستجو میں تھا، اسے جزیرہ "ٹرینڈاڈ" میں ایک قدیم کھوکھلے درخت کے اندر عربی زبان میں نوشتہ ایک مخطوطہ دستیاب ہوا، اس کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے اس امریکی طالب علم نے اسے اپنے ایک مستشرق استاذ کے سامنے پیش کیا، اس امید پر کہ اس کے تاریخی حقائق کچھ روشنی میں

آجائیں گے، مگر اس کے مستشرق استاد نے بھی اُس تاریخی حقایق سے لاعلمی کا اظہار کیا، چنانچہ انھوں نے اس مخطوطہ کو قدیم تاریخی مصادر اور دستاویزات پر اہتمام سے تحقیق کرنے والے ایک غیر ملکی تحقیقاتی ادارہ کے حوالہ کر دیا۔

وہ امریکی طالب علم اور اس کے وہ مستشرق استاذ اچانک اسپین سے روپوش ہو گئے یا کر دیئے گئے، پھران کا کہیں پتہ نہ مل سکا، وہ دونوں کہاں گئے، انھیں زمین کھا گئی، یا آسمان نگل گیا، عالمی صحافت اس عربی مخطوطہ کی تہ تک پہونچنے کے لیے بحث ومباحثہ اور تحقیقات کرنے لگی۔

اس مخطوطہ میں ایک بہادر عرب شہسوار مرسی بن ساطع کی بہادری کی داستان ہے۔

عرب شہسوار مرسی بن ساطع ایک اسلامی مجاہد تھا جس نے اپنی ہی جیسی چند غیر معروف بہادر شخصیتوں کے باہمی تعاون سے ایک جدید سلطنت اسلامیہ کی بنیاد رکھنے یا جزیرہ ٹرینڈاڈ میں ایک دوسری اندلسی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔

مذکورۂ بالا مخطوطہ میں اسی ابن ساطع کی یہ تحریر ہے:

"اے ابن قتیبہ! بخدا میں تمھاری یاد میں تمھاری قبر پہ یہ عبارت تحریر کرنے کی کتنی تمنا رکھتا تھا کہ (اس دور افتادہ مقام پہ ایک ایسا انسان محو خواب ہے جسے اس کے عقیدے نے مار ڈالا، جس پہ وہ شدت کے ساتھ ایمان رکھتا تھا ..... وہ شہید ہو گیا..... مگر عقیدہ باقی ہے اور تا ابد زندہ رجاوید رہیگا) لیکن میں جسے لوگ مرسی بن ساطع کہتے ہیں کون میری قبر پہ کچھ لکھے گا؟ کون؟ کون؟"..... ابن ساطع۔

ان ہی کلمات کے ساتھ اس عرب شہسوار مرسی بن ساطع نے جس سمندر میں اپنا گھوڑا دوڑایا تھا، اپنے اس مخطوطہ کی عبارت ختم کر دی ہے، اس کے بعد اس نے اپنے زخموں سے نڈھال

جسم کو زمین پر ڈال دیا، اور بیہوش ہو گیا، اور جب دوبارہ ہوش و حواس میں آیا تو اس نے خود کو جزیرۂ ٹرینیڈاڈ کے چند باشندوں کے ہاتھوں میں پایا، ہوش میں آتے ہی اس نے یہ دریافت کیا کہ "کیا ہوا؟ کیا سبھی مر گئے؟ کیا ہر شے مٹ گئی؟ دنیا بیحد ظالم ہے، بیشک خدا گواہ ہے کہ میں نے کوشش کی اور میرے ساتھ دوسرے لوگوں نے بھی تعاون کیا۔۔۔ برق جیسی تیز رفتاری کے ساتھ حوادث گذر گئے۔۔۔۔ مجھے اپنی خبر نہیں،۔۔۔۔ اے مجاہدین شہدا! بخدا تمھاری یاد میں یہ میں تحریر کر رہا ہوں کہ تمھاری قبریں جو تمھاری شہادت کی خونیں داستان کی گواہ ہیں، چیخ چیخ کر ظلم و ستم اور جابرانہ سرشت کی مذمت کریں گی۔"

پھر ابن ساطع نے اپنی آنکھیں ان لوگوں کے چہرے پر گاڑ دیں جو آس پاس ہی کھڑے تھے، اس نے ان لوگوں کے چہروں پر رنج و الم اور حزن و ملال کے گہرے تاثرات دیکھے، ان کی آنکھیں خون کے آنسو بہا رہی تھیں، ہر جگہ تباہی و بربادی سی تھی،۔۔۔۔ ابن ساطع نے ان لوگوں سے درخواست کی کہ "جہاں پر میرا دوست ہانی بن قتیبہ، جو زندگی بھر میرے ساتھ رہا، دفن کیا گیا ہے وہیں مجھے منتقل کیا جائے۔"

ابن ساطع نے ان لوگوں کو وصیت کی کہ وہ ان کے اس مخطوطہ کو کسی محفوظ جگہ پر رکھ دیں، جسے انھوں نے تاریخ کے لیے لکھا ہے۔

ابن ساطع نے پھر کہا کہ "اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنے برسوں کے بعد اس تاریخی دستاویز کی بازیابی ممکن ہو گی، میں نے یہ مخطوطا اپنے خویش و اقارب کے لیے لکھا ہے۔۔۔۔ اپنے عرب خاندانوں کے نام لکھا ہے۔۔۔۔ جو اس بحر بیکراں کے اس طرف رہتے ہیں۔۔۔۔ تاکہ انھیں معلوم ہو جائے کہ میں اور کتنے ہی میرے مسلمان بھائی بہن ایک ایسی دور افتادہ پاک سرزمین پر زندگی گذارنا چاہتے تھے جہاں پر خدا تعالیٰ کی برحق شریعت کا نفاذ ہو، اور ہم خون و جنگ اور نفرت سے

دور، بہت دور پرامن زندگی بسر کرسکیں۔

اس تحریک کے لکھنے کا جو سبب ہوا، اس کے لیے یہ تاریخی واقعات جاننے کی ضرورت ہے:

اسپین میں فرنگی ظلم وستم سے تنگ آکر ہزاروں مسلمان وہاں سے فرار ہوگئے تھے، اور نجات کے لیے کوئی ایسی مامون جگہ ڈھونڈ رہے تھے جہاں پہ انھیں اس وقت تک پناہ مل سکے جب تک ان کی مشکلات کا کوئی حل نہیں نکلتا، کیونکہ شاہ فرڈیننڈ کی ظلم وزیادتی کے باعث سرزمین اندلس ان کے لیے تنگ ہوگئی تھی، وہاں پہ زندگی کی تمام راہیں ان کے لیے مسدود نظر آتی تھیں، انجام کار، ہزاروں مسلمانوں نے راہِ فرار اختیار کی، اور اس دور افتادہ جزیرہ پر قدم رکھا، اس امید پر کہ یہ باقی ماندہ مسلمان جو موت کے منھ سے بچ نکلے ہیں، اپنی قوت کو یکجا کر کے اپنی ہستی قائم رکھ سکیں اور پُرامن زندگی گذار سکیں۔

ان ہی میں ابن قتیبہ تھا، جو اپنے مذہب پر پختہ عقیدہ رکھتا تھا، اسے یہ توقع تھی کہ کسی امن پسند طاقت یا مشرق کے مسلمانوں سے اس کو مدد مل جائیگی، اور وہ ایک ایسا جہان تعمیر کرلے گا جو سرزمین اندلس کی مانند بن سکے یا گمشدہ اندلس کا نعم البدل ثابت ہوسکے۔ وہ ٹرینڈاڈ پہونچا، لیکن فرنگیوں نے ہر جگہ اندلس کے مسلمانوں کا تعاقب کیا، تاکہ وہ کہیں متحد نہ ہوسکیں، یہ بھیڑیے اپنے خون کی پیاس بجھانے کے لیے جزیرۂ ٹرینڈاڈ پر چڑھ دوڑے، انھوں نے بوڑھوں، بچوں، اور عورتوں سب کو بلا امتیاز مار ڈالا، جب کہ وہ بھی انسان تھے، فرق صرف اتنا تھا کہ وہ اللہ کا نام لیتے تھے۔

مرسی بن ساطع بھی ان ہی میں تھا، وہ زخمی ہوکر بے ہوش ہوگیا، اس کو جب ہوش آیا، تو اس کے خواب کا شیرازہ بکھر چکا تھا، اس لیے کہ اس وقت اس کا سب کچھ لٹ چکا تھا۔

جزیرے کے جو مسلمان باشندے اُن انسانی بھیڑیوں کے ہاتھوں سے بچ گئے تھے، انھوں نے مرسی بن ساطع کو بتایا کہ شہداء کی اسلامی طرز پر تدفین کی گئی ہے، تو انھیں کچھ قلبی سکون میسر ہوا۔

پھر مرسی بن ساطع اس جزیرہ میں تنہا ہی افتاں و خیزاں اِدھر سے اُدھر سرگرداں و پریشان رہا، دراصل تنہائی میں وہ ایک تحریر لکھ رہا تھا، جو تاریخی حقایق پر مشتمل تھی، اس نے اپنے مخطوطہ میں یہ لکھا کہ:

" اے تاریخ! میں تجھے گواہ بناتا ہوں، تو اس بات کی گواہی دینا کہ میں نے اپنے رفقاء و مجاہدین کے ساتھ بھیڑیوں کے بھٹ میں ایک پر امن جہان تعمیر کرنے کی کوشش کی تھی،..... مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ ایک سراب تھا"

اور پھر ابن ساطع وہیں ہانی بن قتیبہ کی قبر پر گر پڑے اور ان کی روح جسد خاکی سے پرواز کرگئی، مگر ابن قتیبہ کی قبر زبان حال سے یہ کہہ رہی تھی، کہ " نہیں، نہیں، ہرگز نہیں، اے ابن ساطع وہ سراب نہ تھا بلکہ راہ خدا میں ایک جہاد تھا"

ندوۃ العلماء لکھنؤ میں "ملتقی ادب اسلامی"

از

عبید اللہ کوٹی ندوی رفیق دار المصنفین

ندوۃ العلماء نے آج سے کوئی چار برس پہلے اپریل ۱۹۸۱ء میں اسلامی ادب پر ایک بین اقوامی کانفرنس منعقد کی تھی، جس میں عالم اسلام سے آئے ہوئے نمایندوں نے اپنی تقریروں اور مقالات کے ذریعہ ادب اسلامی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی، اس کانفرنس نے دنیائے اسلام کے دانشوروں اور ادیبوں کو اپنی طرف متوجہ کیا، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے ادبی اجتماع میں ندوہ کی ان کوششوں کو سراہا گیا، مئی ۱۹۸۴ء میں مصر، سعودی عرب اور یمن کے اہل علم ادیبوں نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی حجاز میں موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ایک اور ادبی نشست رکھی، جس میں رابطۃ الادب الاسلامی کے نام سے مستقل انجمن کے قیام پر اس کے مستقل صدر کی حیثیت سے مولانا ندوی کے نام پر اور مستقل مرکز کی حیثیت سے ندوۃ العلماء میں اس کے صدر دفتر کے قائم کیے جانے پر اتفاق کیا گیا، اور یہ بھی طے ہوا کہ فروری یا مارچ ۱۹۸۶ء میں رابطۃ الادب الاسلامی کی طرف سے ندوہ میں ایک دوسری بین اقوامی کانفرنس منعقد کی جائے، کانفرنس کے اغراض و مقاصد کا بھی تعین کیا گیا۔

رابطۃ الادب الاسلامی کے اغراض و مقاصد کے تعارف اور ہندوستان میں ادب اسلامی کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر کے لیے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی طرف سے

۱۰/۱۱ اپریل ۱۹۸۵ء کو ندوۃ العلماء کے عباسیہ ہال میں ایک مجلس مذاکرہ ہوئی، جسے ملتقی ادب اسلامی کا نام دیا گیا، بحث و مناقشہ کے لیے تین موضوعات متعین کیے گئے:

(۱) ادب اسلامی میں سوانحی ادب کے مسائل و معیار۔

(۲) ادب اسلامی میں تنقیدی قدریں۔

(۳) ادب اسلامی میں افسانوں اور کہانیوں کے حدود و امکانات۔

اس کانفرنس میں دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ دہلی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد، دارالمصنفین اعظم گڈھ، لکھنؤ یونیورسٹی، فلاح دارین سورت، سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف فارن لنگویجز حیدرآباد، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ، اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے نمائندوں نے شرکت کی، پہلی نشست کا آغاز ۱۰ اپریل کی صبح کو ۱۰ بجے تلاوت کلام پاک سے ہوا، سکریٹری ادب اسلامی مولانا محمد رابع ندوی کی طبیعت اچانک خراب ہو جانے کی وجہ سے اجلاس کی نظامت مولانا نور عظیم ندوی کے سپرد ہوئی، جس سے وہ بحسن و خوبی عہدہ برآ ہوئے، انھوں نے سکریٹری رابطہ کی مرتب کردہ رپورٹ پڑھ کر سنائی، جس میں رابطۃ الادب الاسلامی کے اغراض و مقاصد کی وضاحت کے ساتھ ہی ادب اسلامی کے بارے میں چند غلط فہمیوں کے ازالہ کی کوشش کی گئی تھی، ۱۹۸۱ء سے لے کر اب تک رابطہ کی کارکردگی کا جائزہ اور اسکی طرف سے شایع ہونے والی کتابوں کا ذکر کرنے کے ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اسی ادارہ کے ایک شعبہ کے طور پر ادارۂ صحافت اسلامیہ کا قیام بھی عمل میں آیا ہے، جس کی طرف سے ہندوستان اور عالم اسلام کی ادبی و ثقافتی خبریں اور فیچرس اردو اور عربی اخبارات کو فراہم کیے گئے۔

رپورٹ کے بعد صدر اجلاس مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے شعر و ادب کو نیا رخ

مدینے میں اقبال کا تاریخی کردار" کے موضوع پر اپنا مقالہ پڑھا، مولانا نے فرمایا کہ یہ مقالہ دراصل اس تقریر کا ترجمہ ہے جو ابھی کچھ ہی دنوں قبل مسجد نبوی کے متصل مدینہ طیبہ میں ادیبوں اور دانشوروں کے ایک اجتماع میں کی گئی تھی، اس میں ادب اسلامی کے امتیازی پہلوؤں پر بھی گفتگو تھی

بعد ازاں محترم جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب ناظم دارالمصنفین نے اختصار کے ساتھ "ملتقی" کے تینوں موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا، اور یہ بتایا کہ دارالمصنفین اعظم گڈھ میں تنقید ادب اور سوانح نگاری پر جو کام ہوا ہے وہ اپنے معیار و مباحث، اپنے اسلوب اور انداز تحقیق کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے، خاص طور پر علامہ شبلیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ اور مولانا عبد السلام ندویؒ کی کتابیں اس بارے میں کام کرنے والوں کے لیے دلیل راہ ہیں، افسانوی ادب کے سلسلہ میں بھی انھوں نے ہندوستانی علماء کے قائدانہ کردار کی تعریف کی اور یہ بھی فرمایا کہ ڈپٹی نذیر احمد، مولانا عبد الحلیم شرر اور راشد الخیری وغیرہ نے ناقابل فراموش کردار دیے ہیں اور نئے افسانہ نگار اپنی فنی مہارت اور وسعت مطالعہ کے جتنے بھی دعوے کریں وہ ابھی تک ایسے کردار نہیں دے سکے جن کو پڑھنے والے یاد رکھ سکیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے ادب میں اسلامیت اور اخلاقی قدروں پر زور دیا، اس کے بعد مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے صدر ڈاکٹر راشد ندوی نے تفصیل کے ساتھ ہندوستان میں عربی ادب کا جائزہ لیا اور یہ وضاحت کی کہ ہندوستان کے عربی ادیبوں میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ کا یہ امتیاز ہے کہ انھوں نے عربی نثر نگاری کا ایک خاص اور ممتاز اسلوب دیا، جس کی بہت سے عربی ادیبوں اور انشاء پردازوں نے بھی پیروی کی ہے، اسی طرح انھوں نے عربی لکھنے والوں کی ایک جماعت بھی پیدا کر دی ہے۔

دوسرا اجلاس | ملتقی کا دوسرا اجلاس شام ۶ بجے ہوا، اس کا موضوع تھا" اسلامی ادب میں سوانح نگاری"

سب سے پہلے نور عظیم ندوی صاحب نے ناظم اجلاس کی حیثیت سے اس موضوع کی اہمیت، فن سوانح نگاری میں مسلمانوں کے کارناموں اور سوانح نگاری کی مختلف اصناف پر روشنی ڈالی، اس کے بعد مولانا ابو العرفان صاحب ندوی صدر شعبۂ دینیات دار العلوم ندوہ نے سیرت و سوانح نگاری اور ادب کے باہمی رشتہ و تعلق پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بتایا کہ سوانح نگاری میں اگر زبان و بیان کی خوبیاں موجود ہیں تو وہ ادب ہے، اس سلسلہ میں انھوں نے علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کی کتابوں کا حوالہ دیا جو سوانحی ادب کے بہترین نمونے ہیں، جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب (ناظم دار المصنفین) نے ایک بار پھر بحث میں حصہ لیا، اور ادیب اور انشاء پرداز کے بارے میں اپنے خیالات کا بھی اظہار کیا، لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے یہ بحث تشنہ رہ گئی، ڈاکٹر یٰسین مظہر ندوی (ریڈر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کو اسلامی ادب میں سوانح نگاری اور اس کے مسائل کے موضوع پر مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی گئی، موصوف نے شخصیت کی تعمیر میں تاریخی عناصر کی اہمیت پر زور دیا، انھوں نے ناقص یا نامکمل معلومات کی بنیاد پر سوانحی خاکہ مرتب کرنے پر سخت تنقید کی، اسی طرح جانب داری اور غیر معروضی نقطۂ نظر سے بھی جس میں کبھی تو بے جا مدح و تحسین کی جاتی ہے اور کبھی طعن و تشنیع کا انداز اختیار کیا جاتا ہے، اپنی بیزاری کا اظہار کیا، ان کے نزدیک یہ بھی درست نہیں کہ چند جزئی واقعات کی بنیاد پر کوئی اصول تجویز کر لیا جائے، یا چند روایتوں کی بنیاد پر تعمیم کا رویہ اختیار کیا جائے، سوانح نگاری اور تاریخ نویسی میں مآخذ کے انتخاب کا مسئلہ بھی بڑا اہم ہے، اس لیے قدیم ترین مآخذ کی طرف رجوع ضروری ہے، بعد کے مآخذ پر اعتماد کو سہل نگاری کی علامت سمجھا جانا چاہیے۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی (رفیق دار المصنفین) نے اسلامی ادب میں سیرت و سوانح نگاری کی ایک اہم کتاب الشفا مؤلفہ قاضی عیاض پر مقالہ لکھا تھا، مگر وقت کی کمی کی وجہ سے انھوں نے اس کے

اقتباسات سنائے، اس کتاب کے تاریخی اور ادبی امتیازات کی نشاندہی کی، اور اس کے ماخذ کی خوبیوں اور خامیوں پر بھی روشنی ڈالی۔

اس دوسرے اجلاس کے آخر میں صدر جلسہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی زیر طبع کتاب "شخصیات و کتب" کے مقدمہ کا خلاصہ بیان کیا جس میں انھوں نے سوانحی شخصیتوں سے متعلق تاریخی عوامل پر نظر رکھنے اور دوسرے آداب تحقیق کا لحاظ کرنے کے ساتھ ہی زیر بحث شخصیت کیساتھ جذباتی وابستگی اور ذوقی مناسبت کی اہمیت کو واضح کیا، اور یہ بتایا کہ اس کے بغیر تحریر میں گرمی اور قوت پیدا نہیں ہوتی، اور نہ ہی اس کے بغیر تلاش اور تحقیق کی دشوار گذار گھاٹیوں کو طے کیا جاسکتا ہے۔

تیسرا اجلاس | اس اجلاس کا موضوع "اسلامی ادب کے لیے تنقیدی قدروں کی تلاش و جستجو تھا"،

۱۱ر اپریل صبح ۸ تا ۱۰½ بجے کے اس اجلاس میں سب سے پہلے تو مولانا نور عظیم ندوی نے ادب میں تنقیدی قدروں پر روشنی ڈالی اور یہ بتایا کہ اسلامی نظریۂ ادب اور تنقیدی قدریں ادب میں ایک نئی قوت اور نیا اعتماد فراہم کرسکتی ہیں، جن کی تلاش کے لیے ہم اس وقت جمع ہوئے ہیں، اس کے بعد پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے اپنا مقالہ "اسلامی ادب میں تنقید کا معیار" پڑھا جس میں انھوں نے ادب کے مختلف اسکولوں کے معیار نقد و نظر کا جائزہ لیتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا کہ ادب کو مقصدی اور مذہبی اور اخلاقی قدروں کا تابع ہونا چاہیے، مقالہ کی صدر اجلاس نے بطور خاص تحسین فرمائی۔

اسلامی ادب میں تنقید سے متعلق ایک مقالہ ڈاکٹر راشد ندوی صدر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا تھا، جس کے اہم نکات انھوں نے زبانی بیان کیے، ان کے خیال میں زمانۂ جاہلیت یا عہد صحابہ میں تنقیدی اصول و ضوابط کا وجود نہیں ملتا، انھوں نے عہد اموی و عباسی کا جائزہ لے کر یہ بتایا کہ تنقیدی فلسفہ، نظریات اور مدارس نقد بعد کی پیداوار ہیں، اور آج ہمارے زمانہ میں ایسے ادبی

و تنقیدی مکاتبِ فکر موجود ہیں، جو خیر کے بجائے شر کی اشاعت کو اپنا مقصد بنائے ہوئے ہیں، اس لیے ہمیں ادب کو صحیح رخ پر لانے کے لیے اسلامی ادب کی قدروں اور معیاروں کی تلاش اور تعیین کی ضرورت پیش آرہی ہے۔

مذکورۂ بالا مقالہ پر بحث کرتے ہوئے مولانا ابو العرفان ندوی استاذ دار العلوم ندوہ نے کہا کہ یہ کہنا محل نظر ہے کہ دور جاہلیت یا اس کے بعد عہد اموی اور اوائل عہد عباسی میں تنقید کے نمونے نہیں ملتے، انھوں نے بعض اہم ادبی کتابوں کے حوالہ سے متعدد شعراء کے اشعار اور ان پر ارباب ذوق کی تنقیدوں کے نمونے پیش کیے، ڈاکٹر راشد ندوی نے اپنے مقالہ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے یہ کہا کہ ان کا مقصد یہ تھا کہ کسی فلسفہ یا ادبی مکتبِ فکر کی تابع تنقید کا نمونہ موجود نہیں تھا، ورنہ اس دور میں ذوقی تنقید کے نمونے تو بکثرت مل جائیں گے۔

عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے پروفیسر سید ابراہیم ندوی نے "النقد الاسلامی" کے عنوان سے اپنا مقالہ عربی میں تیار کیا تھا، مگر چونکہ اب تک ملتقی کے تمام مقالے، تقریریں، اور مناقشے اردو میں تھے، اس لیے انھوں نے اپنے مضمون کا خلاصہ اردو میں پیش کیا جس میں عہد اسلامی میں تنقید اور اس کی خصوصیات کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا تھا،

اس مجلس کے آخر میں راقم الحروف نے اپنے زیر ترتیب مقالہ کے اہم نکات پر زبانی گفتگو کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ ادبی اور تنقیدی قدریں ہمیں قرآن مجید اور حدیث شریف ہی سے اخذ کرنا چاہیے، اس لیے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دور جاہلیت کے بعد جس ادب کی اساس رکھی اس میں ادب کے معیار و مقصد اور اسلامی ادب کی تنقیدی روایات کا بھی تعین کیا گیا ہے، دور جاہلیت میں صرف حسن ہی کو نقد و نظر کے واحد معیار کی حیثیت حاصل تھی، اس کے ساتھ ہی حکمت کو بھی کبھی اہمیت دے دی جاتی، لیکن صداقت کو تنقید ادب میں متفقہ معیار کی حیثیت

حاصل تھی، اسلامی ادب نے حسن صداقت اور خیر کو تنقید ادب کی اساس قرار دیا جس میں مسرت، بصیرت اور افادیت کا پہلو بھی ہو، اس بارے میں ارشادات رسولؐ سے ہمیں واضح طور پر رہنمائی ملتی ہے چنانچہ مختلف تنقیدی اصول و روایات کا ذکر کرنے کے بعد ہر ایک کی قرآن و سنت رسولؐ سے مثالیں بھی پیش کی گئیں۔

اسی نشست میں تجاویز اور سفارشات مرتب کرنے کیلئے کمیٹی بنا دی گئی کہ اچانک دار العلوم ندوۃ العلماء کے ایک سابق استاد اور ادیب مولانا عبد الماجد ندوی کے جدہ میں انتقال کر جانے کی خبر ملی، چنانچہ تجاویز میں تعزیت کی تجویز کا اضافہ کیے جانے کی سفارش کی گئی اور اس نشست کا اختتام ہوا۔

چوتھا اجلاس نصف گھنٹہ کے وقفہ کے بعد چوتھا اور آخری اجلاس ہوا، جس میں جناب سید حامد حسن صاحب سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اس ملتقی میں اب تک زیر بحث آنے والے مسائل پر بلیغ اسلوب میں اظہار خیال کیا، انھوں نے اسلامی ادب میں کہانیوں کے موضوع پر بھی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ تعمیری انداز کی حامل معیاری کہانیوں کی ضرورت سے انکار کی مجال نہیں، انھوں نے خاص طور سے بچوں کیلئے کہانیاں لکھنے کی طرف متوجہ کیا اور عربی مدارس کے بارے میں چند مشورے بھی دیے۔

آخر میں صدر اجلاس مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے ادیب اور انشا پرداز کے فرق کے مسئلہ کو اٹھاتے ہوئے یہ فرمایا کہ مولانا شبلی ادیب و انشا پرداز دونوں تھے اور ان سے بہتر اسلوب ابتک ہم کو کوئی نہیں دے سکا مولانا نے اجلاس کے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا، اجلاس میں پیش کردہ تجاویز باتفاق آرا منظور ہوئیں ملک کے اہم اخبارات نے اجلاس کی پوری کارروائی کی تفصیل دیتے ہوئے ان تجاویز کو بھی شایع کر دیا ہے اس لیے ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

یہ واضح رہے کہ ملتقی ادب اسلامی کی یہ نشست رابطۂ ادب اسلامی کی طرف سے اس کی بین اقوامی کانفرنس کی تمہید کے طور پر منعقد کی گئی تھی اور توقع ہے کہ ادب اسلامی کی یہ بین اقوامی کانفرنس شایان شان طریقہ سے ندوہ ہی میں فروری یا مارچ ۱۹۸۲ء کو ہوگی۔

وفیات

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی رحلت

از ڈاکٹر محمد اسلم، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

علم و حکمت کا وہ آفتاب جو گذشتہ نصف صدی سے برصغیر پاک و ہند کو منور کر رہا تھا، مورخہ ۲۴ر مئی مطابق ۳ر رمضان المبارک بروز جمعہ افطار سے تھوڑی دیر پہلے غروب ہوگیا، یعنی حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا کی علالت کا سلسلہ طویل رہا، گذشتہ سال مئی کے وسط میں حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کا انتقال ہوا تو ان پر اس سانحہ کا بڑا اثر ہوا، اس کے دو ماہ بعد ان کے بڑے بیٹے عمر سعید آناً فاناً وفات پا گئے، ان کی طبیعت پر اس کا بھی بڑا اثر ہوا، بیٹے کی وفات کے روز انھوں نے ان کو کسی وجہ سے خوب ڈانٹا تھا، وہ گولیاں کھا کر سونے کے عادی تھے، مولانا کا خیال ہے کہ اس روز آزردہ ہو کر انھوں نے مقررہ مقدار سے زائد گولیاں کھالیں، اور اس لحاظ سے وہ اپنے آپ کو قصور وار سمجھنے لگے تھے، گذشتہ اگست میں میرے قیام علی گڑھ کے دوران میں انھیں کتے نے کاٹ لیا، ڈاکٹر نے ان کے شکم میں متعدد انجکشن لگائے لیکن چند روز بعد وہ جگہ متورم ہوگئی، اور انھیں بخار آنے لگا، ڈاکٹروں نے ملیریا بخار کی تشخیص کی اور انھیں کونین کھلانا شروع کر دیا، ضرورت سے زیادہ کونین کے استعمال سے ان کا جگر خراب ہوگیا، اور خون پیدا ہونا بند ہوگیا، خرابی جگر سے یرقان ہوگیا، علی گڑھ یونیورسٹی کے ہسپتال میں بغرض علاج داخل ہوگئے، لیکن افاقہ نہ ہوا، حکیم انعام اللہ خاں صاحب اور حکیم عبد الحمید صاحب کے ہی زیر علاج رہے لیکن کمزوری دن بدن بڑھتی چلی گئی، ان کی علالت بڑھتی گئی ان کی بیٹی مسعودہ سعید کراچی سے علی گڑھ پہونچیں اور ہفتہ عشرہ میں تمام انتظامات کر کے انھیں اپنے ساتھ کراچی

نے آئیں، کراچی میں ڈاکٹروں کے ایک بورڈ نے ان کا معائنہ کیا، حکیم محمد سعید صاحب نے تمام رپورٹیں ملاحظہ کرکے سرطان کا خدشہ ظاہر کیا، ان کے مثانے میں پتھر پیدا ہو چکی تھی اور متاثرہ جگہ پر سرطان نمودار ہو گیا تھا، جسمانی کمزوری اس حد تک پہونچ گئی تھی کہ مرحوم آپریشن کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے، میں وسط اپریل میں ان کی عیادت کیلیے کراچی گیا، چھ روز ان کے پاس ٹھہرا، لوٹتے وقت دل میں بار بار یہی خیال آ رہا تھا کہ کہیں یہ ان کے ساتھ آخری ملاقات نہ ہو۔

۲۴ مئی کو افطار سے ذرا قبل موصوف غسل خانے سے وضو کرکے اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے کہ راستہ ہی میں حرکت قلب بند ہو گئی، لاہور میں یہ اطلاع عشاء سے قبل ملی بھاگ دوڑ اور سفارشوں کے بعد ہوائی جہاز میں ایک سیٹ مل سکی، میری اہلیہ ان کے آخری دیدار کے لیے پہلے ہی کراچی پہونچ چکی تھیں۔

۲۵ مئی کو دوپہر کے وقت ان کے جنازہ کی نماز ہوئی جس میں کراچی کے علماء، اہل علم اور عمائدین نے شرکت کی، گورنر سندھ کی نمایندگی ان کے اے ڈی سی نے کی اور ان کی طرف سے پھولوں کی چادر چڑھائی۔

ان کو دار العلوم کورنگی میں حضرت مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ کے ذاتی احاطۂ قبور میں ان کے قریب ہی ابدی آرام کیلیے جگہ ملی ہے، اس مختصر سے قبرستان میں صرف علماء و صلحاء ہی کی قبریں ہیں۔

ان کی وفات کے ساتھ تاریخ کا ایک زریں باب ختم ہو گیا، ۱۹۳۸ء میں مرحوم ندوۃ المصنفین کی تاسیس میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے ساتھ شریک تھے، سینتالیس برس تک برہان کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے، برعظیم کے علمی حلقوں میں ان کے اداریے کی بڑی قدر کی جاتی تھی، اور ان کی ذات گرامی کی وجہ سے ندوۃ المصنفین اور دار العلوم دیوبند کا علمی وزن قائم تھا۔

مولانا اب جہاں پہونچ گئے ہیں، وہاں صرف ہماری دعائیں ہی ان کے کام آ سکتی ہیں، میرے خیال میں ان کی مغفرت کیلیے صدیق اکبرؓ اور عثمان ذو النورینؓ جیسی بلند پایہ تصانیف ہی کافی ہیں۔

وہ آخری سانس تک فرائض شریعت کی ادائیگی میں کوشاں رہے، آخر وقت کمزوری اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ گھر سے باہر نہیں جا سکتے تھے، بلکہ گھر میں بھی بمشکل چلتے پھرتے تھے، اس کے باوجود نماز کھڑے ہو کر ہی ادا کرتے تھے، میرے استفسار پر فرمایا کہ ان دنوں ظہر عصر اور مغرب عشاء ملا کر نماز پڑھتا ہوں، امام ابن تیمیہؒ نے مریض کیلیے بھی مسافر کی طرح

آہ! حضرت مولانا شاہ امان اللہ پھلورویؒ

از

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

یہ خبر نہایت غم والم سے سنی گئی کہ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ کے سجادہ نشین حضرت مولانا شاہ امان اللہؒ ۲۵ر شعبان کو دن گذار کر شب جمعہ کو دو بجے عالم جاودانی کو سدھارے، ان کے خاندان، خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف، پوری ریاست بہار، بلکہ اس سے باہر ان کے جاننے والے حلقوں میں غمناکی اور سوگواری کی جو کیفیت چھا گئی، اس کا صحیح اندازہ ہے، وہ ہزاروں کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنے ہوئے تھے جو بھی ان سے ملا ان کی نیک نفسی اور پاک باطنی کا نقش اپنے دل پر بنا کر اٹھا، ان کے مریدین تو ان میں ان کے بزرگوں کے زہد و اتقاء کی ساری نشانیاں پاتے، خانقاہ مجیبیہ کی وجہ سے پھلواری شریف کی بڑی اہمیت ہوگئی ہے یہ پٹنہ ہی کا ایک محلہ ہے، بہار شریف پہلے پٹنہ ہی ضلع میں تھا، اب نالندہ کا صدر مقام ہے، یہاں بڑے بڑے اولیائے کرام مدفون ہیں، ان کی روحوں کی برکتوں سے پوری ریاست کے مسلمان اب بھی سیراب ہو رہے ہیں، پھلواری شریف موجودہ دور کا بہار شریف بنتا جا رہا ہے، یہاں کے بزرگوں کی روحیں بھی بہار کے مسلمانوں کی دینی حمیت اور ایمانی غیرت کی ضامن بنی ہوئی ہیں، انہی روحوں میں اب جناب مولانا شاہ امان اللہ کی روح شامل ہوگئی ہے، بہار کے لوگ معلوم نہیں ان کی کن کن باتوں کو یاد کر کے کب تک غمزدہ رہیں گے۔

یاد آتا ہے کہ تقریباً ۳۹ سال پہلے دارالمصنفین کے احاطہ میں ایک صاحب چکن کی شیروانی زیب تن کیے ہوئے

لے آئیں، کراچی میں ڈاکٹروں کے ایک بورڈ نے ان کا معائنہ کیا، حکیم محمد سعید صاحب نے تمام رپورٹیں ملاحظہ کر کے سرطان کا خدشہ ظاہر کیا، ان کے مثانے میں پتھر پیدا ہو چکی تھی اور متاثرہ جگہ پر سرطان نمودار ہو گیا تھا، جسمانی کمزوری اس حد تک پہونچ گئی تھی کہ مرحوم آپریشن کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے، میں وسط اپریل میں ان کی عیادت کیلیے کراچی گیا، چھ روز ان کے پاس ٹھہرا، ملتے وقت دل میں بار بار یہی خیال آ رہا تھا کہ کہیں یہ ان کے ساتھ آخری ملاقات نہ ہو،

۲۴ مئی کو افطار سے ذرا قبل موصوف غسل خانے سے وضو کر کے اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے کہ راستہ ہی میں حرکت قلب بند ہو گئی، لاہور میں یہ اطلاع عشاء سے قبل ملی، بھاگ دوڑ و سفارشوں کے بعد ہوائی جہاز میں ایک سیٹ مل سکی، میری اہلیہ ان کے آخری دیدار کے لیے پہلے ہی کراچی پہونچ چکی تھیں۔

۲۵ مئی کو دوپہر کے وقت ان کے جنازہ کی نماز ہوئی جس میں کراچی کے علماء، اہل علم اور عمائدین نے شرکت کی، گورنر سندھ کی نمایندگی ان کے اے ڈی سی نے کی اور ان کی طرف سے پھولوں کی چادر چڑھائی۔

ان کو دارالعلوم کورنگی میں حضرت مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ کے ذاتی احاطۂ قبور میں ان کے قریب ابدی آرام کیلیے جگہ ملی ہے، اس مختصر سے قبرستان میں صرف علماء و صلحاء ہی کی قبریں ہیں۔

ان کی وفات کے ساتھ تاریخ کا ایک زریں باب ختم ہو گیا، ۱۹۳۸ء میں مرحوم ندوۃ المصنفین کی تاسیس میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے ساتھ شریک تھے، سینتالیس برس تک برہان کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے، برعظیم کے علمی حلقوں میں ان کے اداریے کی بڑی قدر کی جاتی تھی، اور ان کی ذات گرامی کی وجہ سے ندوۃ المصنفین اور دارالعلوم دیوبند کا علمی وزن قائم تھا۔

مولانا اب جہاں پہونچ گئے ہیں وہاں صرف ہماری دعائیں ہی ان کے کام آ سکتی ہیں، میرے خیال میں ان کی مغفرت کیلیے صدیق اکبرؓ اور عثمان ذوالنورینؓ جیسی بلند پایہ تصانیف ہی کافی ہیں۔

وہ آخری سانس تک فرائض شریعت کی ادائیگی میں کوشاں رہے، آخر وقت کمزوری اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ گھر سے باہر نہیں جا سکتے تھے، بلکہ گھر میں ہی بمشکل چلتے پھرتے تھے، اس کے باوجود نماز کھڑے ہو کر ہی ادا کرتے تھے، میرے استفسار پر فرمایا کہ ان دنوں ظہر عصر اور مغرب عشاء ملا کر نماز پڑھتا ہوں، امام ابن تیمیہؒ نے مریض کیلیے بھی مسافر کی طرح جمع صلوٰۃ کے جواز کا فتویٰ دیا ہے، اور اسی پر ان کا عمل ہے، اللہ اللہ کیا لوگ تھے۔

آہ! حضرت مولانا شاہ امان اللہ پھلواروی

از

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

یہ خبر نہایت غم والم سے سنی گئی کہ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ کے سجادہ نشین حضرت مولانا شاہ امان اللہ ۲۵ر شعبان کو دن گذار کر شب جمعہ کو دو بجے عالم جاودانی کو سدھارے، ان کے خاندان، خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف، پوری ریاست بہار، بلکہ اس سے باہر ان کے جاننے والے حلقوں میں غمناکی اور سوگواری کی جو کیفیت چھا گئی، اس کا صحیح اندازہ ہے، وہ ہزاروں کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنے ہوئے تھے جو بھی ان سے ملا ان کی نیک نفسی اور پاک باطنی کا نقش اپنے دل پر بنا کر اٹھا، ان کے مریدین تو ان میں ان کے بزرگوں کے زہد و اتقار کی ساری نشانیاں پاتے، خانقاہ مجیبیہ کی وجہ سے پھلواری شریف کی بڑی اہمیت ہو گئی ہے، یہ پٹنہ ہی کا ایک محلہ ہے، بہار شریف پہلے پٹنہ ہی ضلع میں تھا، اب نالندہ کا صدر مقام ہے، یہاں بڑے بڑے اولیائے کرام مدفون ہیں، ان کی روحوں کی برکتوں سے پوری ریاست کے مسلمان اب بھی سیراب ہو رہے ہیں، پھلواری شریف موجودہ دور کا بہار شریف بنتا جا رہا ہے، یہاں کے بزرگوں کی روحیں بھی بہار کے مسلمانوں کی دینی حمیت اور ایمانی غیرت کی ضامن بنی ہوئی ہیں، ان ہی روحوں میں اب جناب مولانا شاہ امان اللہ کی روح شامل ہو گئی ہے، بہار کے لوگ معلوم نہیں ان کی کن کن باتوں کو یاد کر کے کب تک غمزدہ رہیں گے۔

یاد آتا ہے کہ تقریباً ۳۹ سال پہلے دار المصنفین کے احاطہ میں ایک صاحب چکن کی شیروانی زیب تن کیے ہوئے

ایک خوشنما ٹوپی، پاؤں میں سلیم شاہی جوتے پہنے اور جوانی نہیں بلکہ نوجوانی کی رعنائی بکھیرتے ہوئے داخل ہوئے، جن کی آنکھیں سرمگیں تو نہیں لیکن سرمگیں ضرور تھیں، چہرہ کا رنگ گوری چنبیلی کا سا تھا، جس سے درویشانہ جمال عیاں ہو رہا تھا، وہ خراماں خراماں بلکہ معطر معطر بڑھتے چلے آ رہے تھے، تو آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ حسن کا نور پیکر بن کر متحرک ہو گیا ہے، جناب شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم سابق ناظم دارالمصنفین کا مسکن سامنے تھا، وہ اس کے برآمدہ میں داخل ہوئے تو کسی ایک شخص نے کہا یہ ہیں خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے جناب مولانا شاہ امان اللہ صاحب، اس وقت وہ سجادہ نشین نہیں ہوئے تھے، ہم لوگوں نے ان کی مخلصانہ تواضع کی، دامن دل ان کی طرف بہ صد کرشمہ و ناز کھنچتا چلا جا رہا تھا۔

ان کے خانوادہ سے دارالمصنفین والوں کا بڑا لگاؤ رہا، ہم سب کے استاذ محترم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے کچھ دنوں اپنی ابتدائی تعلیم اس خانقاہ میں حاصل کی، حضرت مولانا شاہ محی الدینؒ کے زیر تربیت رہے، ان سے بعض کتابیں بھی پڑھیں، نجی صحبتوں میں ان کا جب ذکر آ جاتا تو ان کا تذکرہ بڑی محبت اور احترام سے کرتے، ان کی وفات پر اپنے تعزیتی مضمون میں لکھا کہ مجھے خانقاہ (خانقاہ مجیبیہ) میں خاص حضرت شاہ صاحب مرحوم کے قریب قیام اور ایک ساتھ طعام کی اور زیر درس کتابوں میں شاگردی کی جو سعادت حاصل ہوئی مجھے اس نسبت پر فخر اور انہیں اس پر مسرت تھی، انہیں جب دیکھتا تھا عہد اول یاد آ جاتا تھا اور ان کو بھی خوشی ہوتی تھی، افسوس کہ اس بزرگانہ تبسم کا منظر ہمیشہ کیلیے آنکھوں سے پنہاں ہو گیا، (یاد رفتگان ص ۳۴۸)

مولانا شاہ امان اللہ ان ہی کے اکلوتے صاحبزادے تھے، وہ دارالمصنفین آئے تو ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، ہم لوگ ایک دوسرے سے اس طرح مل رہے تھے جیسے ایک خاندان کے لوگ ملا کرتے ہیں، وہ مل کر چلے گئے، تو برابر خیال رہا کہ ان کے ساتھ اچھے لمحات گذرے، گو وہ ہم لوگوں سے عمر میں بہت چھوٹے تھے۔

استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے مولانا شاہ محی الدین پھلواروئیؒ پر اپنے درد و غم کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہاں یعنی خانقاہ مجیبیہ میں ظاہر و باطن اور علم و عمل دونوں کے سرچشمے آ کر ملتے ہیں

شروع سے اس کے سجادہ نشین علم شریعت و طریقت دونوں کے جامع رہے ہیں یعنی ہر صاحب سجادہ صوفی صافی ہونے کے ساتھ عالم دین بھی ہوتے آئے ہیں دستار فضیلت اور خرقہ مشیخت دونوں یہاں ایک جسم پر آکر سجتے ہیں" (یادرفتگان ص ۳۹۳) مولانا شاہ امان اللہ میں بھی یہ سارے اوصاف تھے پھلواری شریف میں تعلیم پانے کے علاوہ اعظم گڈھ، فرنگی محل اور اجمیر شریف جاکر بھی تحصیل علم کی، سند حاصل کرنے کے بعد خانقاہ مجیبیہ مدرسہ میں درس بھی دیتے رہے چار چار حج بیت اللہ کے شرف سے مشرف ہوئے، رسالہ المجیب میں بھی کچھ نہ کچھ تحریر فرماتے رہتے اپنے حلقہ میں مذہبی استفسارات کے جوابات بھی دیتے رہتے، وہ راقم سے علمی خط وکتابت برابر کرتے رہے، اس راقم کی حقیر تالیف بزم صوفیہ شایع ہوئی تو اس کو خاص طور سے منگوایا، اس میں حضرت جلال الدین جہانیاں جہاں گشت کے ملفوظات کے ایک مجموعہ سراج الہدایہ کا ذکر تھا، یہ غیر مطبوعہ ہے اسکو خاص طور سے نقل کراکے اپنے لیے منگوایا۔

یہ راقم ۱۹۶۷ء میں ایک آپریشن کیلیے پٹنہ کے محلہ راجندر نگر کے ایک نرسنگ ہوم میں داخل ہوا، جناب شاہ صاحب کو اس کی خبر ہوئی تو پہلے اپنے صاحبزادہ کو بہت سے پھلوں کے ساتھ عیادت کیلئے بھیجا پھر ان کے چچا اور خسر حضرت مولانا شاہ نظام الدینؒ اور ان کے بعد محب مکرم مولانا شاہ عون احمد عیادت کیلئے تشریف لائے، اس عزت افزائی سے یقین ہو گیا کہ میرا آپریشن کامیاب ہوگا، اور واقعی رہا، خانقاہ مجیبیہ کے آداب میں ہے کہ اس کے سجادہ نشین معمولی ضرورتوں کیلئے باہر نہیں جاتے، اس لیے حضرت شاہ صاحب نے خود تو قدم رنجہ نہیں فرمایا مگر اپنے عزیزوں کو بھیج کر ہر قسم کی کرم فرمائی اور عنایت گستری کرتے رہے، میرے لیے دعائیں بھی جاری رکھیں، یہ پیام بھی برابر پہونچتا رہا کہ آپریشن کے بعد میری حاضری خانقاہ میں ضرور ہو، آپریشن کے بعد چلنے پھرنے کی اجازت ملی تو قدم بوسی کے انتہائی جذبۂ شوق کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا، وہاں ان سے ملنے ملانے کے بڑے آداب ضوابط ہیں مگر انھوں نے فوراً اپنے حجرہ میں طلب کیا، جہاں ایک تخت پر مصلی رکھا ہوا تھا، فضا معطر ہو رہی تھی، چاروں طرف کتابوں کا انبار تھا، اندازہ ہوا،

ایک خوشنما ٹوپی، پاؤں میں سلیم شاہی جوتے پہنے اور جوانی نہیں بلکہ نوجوانی کی رعنائی بکھیرتے ہوئے داخل ہوئے، ان کی آنکھیں سرمگیں تو نہیں لیکن شرمگیں ضرور تھیں، چہرہ کا رنگ گوری چنبیلی کا سا تھا، اس سے درویشانہ جمال عیاں ہو رہا تھا، وہ خراماں خراماں بلکہ معطر معطر بڑھتے چلے آ رہے تھے، تو آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ حسن کا نور پیکر بن کر متحرک ہے، جناب شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم سابق ناظم دار المصنفین کا مسکن سامنے تھا، وہ اس کے برآمدہ میں داخل ہوئے تو کسی ایک شخص نے کہا یہ ہیں خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے جناب مولانا شاہ امان اللہ صاحب اس وقت وہ سجادہ نشین نہیں ہوئے تھے، ہم لوگوں نے ان کی مخلصانہ تواضع کی، دامن دل ان کی طرف بہ صد کرشمۂ ناز کھنچتا چلا جا رہا تھا۔

ان کے خانوادہ سے دار المصنفین والوں کا بڑا لگاؤ رہا، ہم سب کے استاذ محترم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی نے کچھ دنوں اپنی ابتدائی تعلیم اس خانقاہ میں حاصل کی، حضرت مولانا شاہ محی الدینؒ کے زیر تربیت رہے، ان سے بعض کتابیں بھی پڑھیں، نجی صحبتوں میں ان کا جب ذکر آ جاتا تو ان کا تذکرہ بڑی محبت اور احترام سے کرتے، ان کی وفات پر اپنے تعزیتی مضمون میں لکھا کہ مجھے خانقاہ (خانقاہ مجیبیہ) میں خاص حضرت شاہ صاحب مرحوم کے قریب قیام اور ایک ساتھ طعام کی اور زیر درس کتابوں میں شاگردی کی جو سعادت حاصل ہوئی مجھے اس نسبت پر فخر اور انھیں اس پر مسرت تھی، انھیں جب دیکھتا تھا عہد اول یاد آ جاتا تھا اور ان کو بھی خوشی ہوتی تھی، افسوس کہ اس بزرگانہ تبسم کا منظر اب ہمیشہ کیلیے آنکھوں سے پنہاں ہو گیا، (یاد رفتگاں ص ۳۴۸)

مولانا شاہ امان اللہ ان ہی کے اکلوتے صاحبزادے تھے، وہ دار المصنفین آئے تو ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، ہم لوگ ایک دوسرے سے اس طرح مل رہے تھے جیسے ایک خاندان کے لوگ ملا کرتے ہیں، وہ مل کر چلے گئے، تو برابر خیال رہا کہ ان کے ساتھ اچھے لمحات گذر رہے گو وہ ہم لوگوں سے عمر میں بہت چھوٹے تھے۔

استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے مولانا شاہ محی الدین پھلواروی پر اپنے درد و غم کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہاں یعنی خانقاہ مجیبیہ میں ظاہر و باطن، اور علم و عمل دونوں کے سرچشمے آ کر ملتے ہیں

شروع سے اس کے سجادہ نشین علم شریعت و طریقت دونوں کے جامع رہے ہیں یعنی ہر صاحب سجادہ صوفی صافی ہونے کے ساتھ عالم دین بھی ہوتے آئے ہیں دستار فضیلت اور خرقۂ مشیخت دونوں یہاں ایک جسم پر آراستہ ہے" (یاد رفتگان ص ۳۹۳) مولانا شاہ امان اللہ میں بھی سارے اوصاف تھے، پھلواری شریف میں تعلیم پانے کے علاوہ اعظم گڈھ، فرنگی محل اور اجمیر شریف جاکر بھی تحصیل علم کی، سند حاصل کرنے کے بعد خانقاہ مجیبیہ کے مدرسہ میں درس بھی دیتے رہے، چار چار حج بیت اللہ کے شرف سے مشرف ہوئے، رسالہ "المجیب" میں بھی کچھ نہ کچھ تحریر فرماتے تھے اپنے حلقہ میں مذہبی استفسارات کے جوابات بھی دیتے رہتے، دارالمصنفین سے علمی خط و کتابت برابر کرتے رہے، اس راقم کی حقیر تالیف بزم صوفیہ شایع ہوئی تو اس کو خاص طور سے منگوایا، اس میں حضرت جلال الدین جہانیان جہان گشت کے ملفوظات کے ایک مجموعہ سراج الہدایہ کا ذکر تھا، یہ غیر مطبوعہ ہے اس کو خاص طور سے نقل کرا کے اپنے لیے منگوایا۔

یہ راقم ۱۹۶۷ء میں ایک آپریشن کیلئے پٹنہ کے محلہ راجندر نگر کے ایک نرسنگ ہوم میں داخل ہوا، جناب شاہ صاحب کو اس کی خبر ہوئی تو پہلے اپنے صاحبزادہ کو بہت سے پھلوں کے ساتھ عیادت کیلئے بھیجا، پھر ان کے چچا اور خسر حضرت مولانا شاہ نظام الدین اور ان کے بعد محب مکرم مولانا شاہ عون احمد عیادت کیلئے تشریف لائے، اس عزت افزائی سے یقین ہو گیا کہ میرا آپریشن کامیاب ہوگا، اور واقعی رہا، خانقاہ مجیبیہ کے آداب میں ہے کہ اس کے سجادہ نشین معمولی ضرورتوں کیلئے باہر نہیں جاتے، اس لیے حضرت شاہ صاحب نے خود تو قدم رنجہ نہیں فرمایا مگر اپنے عزیزوں کو بھیج کر ہر قسم کی کرم فرمائی اور عنایت گستری کرتے رہے، میرے لیے دعائیں بھی جاری رکھیں، یہ پیام بھی برابر پہونچا رہا کہ آپریشن کے بعد میری حاضری خانقاہ میں ضرور ہو، آپریشن کے بعد چلنے پھرنے کی اجازت ملی تو قدم بوسی کے انتہائی جذبۂ شوق کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا، وہاں ان سے ملنے ملانے کے بڑے آداب ضوابط ہیں مگر انھوں نے فوراً اپنے حجرہ میں طلب کیا، جہاں ایک تخت پر مصلیٰ رکھا ہوا تھا، فضا معطر ہو رہی تھی، چاروں طرف کتابوں کا انبار تھا، اندازہ ہوا،

کہ یہاں مصلی اور وہاں کتابوں کے ساتھ تزکیۂ نفس اور طہارت طبع کیلئے معلوم نہیں کیا کیا منزلیں طے ہو چکی ہونگی اور اسکا حجرہ میں ان کے بزرگوں نے انوار ایزدی کے سہارے حقیقت و معرفت کے کیا کیا جلوے نہ دیکھے ہوں گے، ان کے چہرے پر نظر پڑی تو ان میں پہلے سا جمال یوسفی نہ تھا، مگر عبادت کے تب و تاب اور ریاضت کی گرم نفسی سے ان کی داڑھی سے تقدس اور چہرے سے درویشانہ بزرگی کے پورے آثار عیاں تھے، وہ گذشتہ بیس سال سے اپنے والد بزرگوار کی مسند پر بیٹھ کر خاندانی روایات کو سینے سے لگائے ہوئے تھے، اپنی عمر سے کچھ زیادہ معلوم ہوئے، شاید نعمان نیم شبی اور آہ سحر گاہی کا اثر ہو، کچھ اونچا بھی سننے لگے تھے ان کے پاس مودب ہو کر بیٹھنے پر مجبور تھا، باتیں شروع ہوئیں تو عرض کیا کہ بزم صوفیہ کے حقیر مصنف ہونے کے باوجود دل جاری نہ ہو سکا، جہاں پہلے تھا اب بھی وہی ہوں، آپ کی نظر کیمیا اثر کی بھیک مانگنے آیا ہوں، جو جواب ملا اس سے قلب میں تلاطم پیدا ہو گیا، فرمایا اس کی طلب فضول ہے، وہ اس گدی پر بیٹھا کیے گئے، ہم اس لیے بیٹھ گئے ہیں ورنہ اپنے میں نظر کیمیا اثر کہاں، اب جو کچھ حاصل ہوتا ہے اپنی محنت سے ہوتا ہے، گفتگو کچھ آگے بڑھی تو اپنے خانوادہ کا ایک درود شریف عطا کیا، فرمایا اس کو باوضو روزانہ بلا ناغہ پڑھا جائے، یہاں تک کہ سوا لاکھ کی تعداد ہو جائے، تو شاید دل جاری ہو جائے، عرض کیا کہ دعا فرمائیں کہ اس ورد کی توفیق ہو، گفتگو میں دیر ہو رہی تھی تو خادم نے خبر دی کہ دستر خوان لگا دیا گیا ہے، وہاں پہونچا تو یہ بہت پر تکلف تھا، پھلواری شریف کی مخصوص روٹیوں اور مٹھائیوں سے سجا تھا، کھانے کے بعد جناب مولانا شاہ نظام الدین اور جناب مولانا شاہ عون احمد سے مل کر رخصت ہوا تو ایسا محسوس ہوا کہ زندگی کی بہترین ساعتیں یہاں گذریں۔

پٹنہ جب جاتا تو خانقاہ مجیبیہ میں ضرور حاضری دیتا، اگر بے وقت پہونچتا تو حضرت شاہ صاحب اپنے حجرے میں طلب کر لیتے، وہ نماز باجماعت کے لیے حجرے سے نکلتے تو خدام اور حاضرین دورویہ باادب کھڑے ہو جاتے، نقیب مسجد میں ان کی تشریف آوری

کی صدا دیتے، مسجد میں ان کی مخصوص جگہ بنی تھی، نماز باجماعت ادا کرتے، پھر حجرے میں واپس ہوجاتے، عصر کی نماز کے بعد مغرب تک ایک مخصوص جگہ پر آکر بیٹھ جاتے، تسبیح پڑھتے رہتے مریدین، معتقدین اور مستفیدین اس وقت رجوع کرتے، اور معلوم نہیں اپنے دل و دماغ کیلئے کیا تحفے اور سوغات لے جاتے، کبھی یہ عاجز عصر کے وقت پہونچ جاتا تو اسی مسجد میں ان سے فیض حاصل کرتا، بے تکلفی میں کچھ کہہ جاتا تو ہنس دیتے، جس سے ان کی پان سے آلودہ عقیقی رنگ کی بتیسی کھل جاتی، اس میں بھی ایک خاص کیفیت ہوتی۔

ابھی کچھ دنوں پہلے ان کے چچا اور خسر جناب مولانا شاہ نظام الدینؒ کی وفات ہوئی، جس سے حضرت شاہ صاحب بہت متاثر تھے، ان کے متوک فیوض و برکات سے پورا بہار فیض یاب ہو رہا تھا، وہ درویشانہ اخلاق و صفات کے اعلیٰ نمونہ تھے، ان کا غم غلط نہ ہوا تھا کہ جناب شاہ عون احمد کے بڑے لڑکے مولوی نصر احمد ندوی جوانی کے عالم میں اللہ کو پیارے ہوگئے، ان سے ہم لوگوں کا عزیزانہ تعلق اس لیے بھی ہوگیا تھا کہ وہ دارالمصنفین آکر یہاں تین سال تک رہے، اپنی کم عمری کے باوجود غیر معمولی علمی صلاحیت اور اچھی مضمون نگاری کا ثبوت دیا، معارف میں ان کا مضمون "امام الحرمین" پر شایع ہوا تو لوگوں کو یقین نہیں آیا کہ کسی کمسن لڑکے کا لکھا ہوا ہے اس کم عمری میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے جوار رحمت میں لے لیا۔ ۱۹؍ دسمبر ۱۹۸۵ء کو راقم رفقائے دارالمصنفین کے ساتھ ان کی تعزیت کے لیے خانقاہ مجیبیہ میں حاضر ہوا تھا، تو جناب مولانا شاہ عون احمد کے علاوہ حضرت شاہ صاحبؒ سے بھی ملنے کا شرف حاصل ہوا تھا، عصر کی نماز کے بعد اپنے مصلے پر فروکش تھے، ان کے پاس جاکر بیٹھا تو جب جب ان کی طرف نظر اٹھی، بنوع دیگر اٹھی،

کیا معلوم تھا کہ یہ ان سے آخری ملاقات ہے۔

عزیزی نصر احمد کی جوانمرگی کا غم حضرت شاہ صاحبؒ کے دل سے ابھی بلند نہ ہوا تھا کہ خود نہ صرف اپنے خاندان کے لوگوں بلکہ خدا جانے کتنے مداحوں اور عقیدت مندوں کو بسمل کی طرح تڑپنے کے لیے چھوڑ کر عالم جاودانی کو سدھارے، رحلت کے وقت ان کی عمر عیسوی سنہ کے لحاظ سے ۴۶ سال تھی، ان کی ولادت مسعود ۱۹۲۱ء میں ہوئی تھی۔

ان کا حجرہ سونا ہو گیا، ان کے خدام ان کو حجرہ سے نکل کر مسجد میں آتے نہ دیکھ سکیں گے، ان کے متبعین اور خانقاہ کے زائرین عصر کی نماز کے بعد مسجد میں ایک مصلیٰ پر بیٹھا ہوا دیکھ کر اپنے دلوں کو سرور نہ پہنچا سکیں گے، بہار ایک پاکیزہ اخلاق رکھنے والے شیخ سے محروم ہو گیا، لیکن انھوں نے اپنی درویشانہ صفات کی بدولت اپنے خاندانی بزرگوں کی روایت، عزت اور وقار کو قائم رکھ کر اپنے خرقۂ طریقت کا وزن جس طرح قائم رکھا، اس کی یاد آئے گی اور اکثر آئے گی،
اللہ تبارک و تعالیٰ ان کو اپنی رحمت کے کوثر اور مغفرت کی تسنیم سے اعلیٰ علیین میں سیراب رکھے، اور ان کے غمزدہ اور سوگوار پسماندگان کو اپنی نصرت بیکراں سے سرفراز کرے۔ آمین۔ ثم آمین۔

باب التقریظ والانتقاد

قاموس الفاظ القرآن الکریم

ایک مبصر کے قلم سے

مرتبہ ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی، شائع کردہ دار الشروق جدہ، طبع اول ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء

صفحات ۸۹۶ ۔ قیمت درج نہیں، ملنے کا پتہ: دار الشروق، ص۔ ب ۲۱۴۳۶، جدہ،

المملکۃ العربیۃ السعودیۃ

قرآن مجید کو سمجھنے سمجھانے کی کوششوں کا سلسلہ زمان ومکان کے مختلف احوال، ظروف میں مختلف محرکات کے تحت، مختلف مناہج سے، مختلف سطحوں پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سعادت آثار سے لے کر آج تک بلا انقطاع مسلسل جاری رہا ہے، اور آیندہ قیامت تک جاری رہے گا، اسلام کی دعوت جب جزیرۃ العرب کے دائرہ میں محدود تھی، قرآن مجید کو سمجھنے سمجھانے کے طریقے اور تقاضے بھی محدود تھے، وقت کے ساتھ جوں جوں یہ دعوت اقصائے عالم میں پھیلتی گئی، اس کے سمجھنے سمجھانے کے طریقوں اور تقاضوں میں بھی وسعت، پھیلاؤ اور تنوع آتا گیا، رفتہ رفتہ دنیا کی مختلف زبانوں میں قرآن مجید کے ترجمے اور تفسیریں لکھنے کا رواج عام ہوا، اور یہ سلسلہ نہ صرف آج تک باقی ہے بلکہ روز افزوں ترقی کے ساتھ جاری ہے، نت نئے ترجمے اور تفسیریں آئے دن

منظر عام پر آرہی ہیں، اور قرآنی علوم اور قرآنی ادب میں اضافہ ہو رہا ہے، زیر نظر کتاب اسی اضافہ کی ایک عمدہ مثال ہے،

اس کے مؤلف ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندوۃ العلماء لکھنؤ جیسے علمی ادارہ کے فارغ التحصیل ہیں، جس کا ایک شاندار ماضی، خوشنما حال اور روشن مستقبل ہے، اور جس کی علمی و دینی روایات اس کے فیض یافتہ کسی عالم کے حق میں شاہد عادل ہیں، ان جیسے عالم کے حسن نیت، فکر و نظر اور سلامت فکر کی ضمانت کے لیے یہی کافی ہے کہ ان کی اٹھان ندوہ میں ہوئی ہے، اور ان کی سند فضیلت پر ندوہ کی مہر تصدیق ثبت ہے، مستزاد یہ کہ انھوں نے حرمین شریفین کے مقدس علمی مناہل سے بھی جرعہ کشی کی ہے، یہی نہیں، وہ آج کل مکہ معظمہ کی جامعہ ام القریٰ میں بحیثیت استاذ عربی درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں، یہ ضخیم کتاب انھوں نے جامعہ ام القریٰ میں رہ کر لکھی ہے، اور اس کی طباعت بھی وہیں کے ایک ادارہ میں ہوئی ہے، جس کے باعث کتاب اپنے صوری محاسن کے اعتبار سے بھی جاذب نظر ہے، کاغذ اعلیٰ درجہ کا لگایا گیا ہے، طباعت جدید ترین خودکار مشینوں پر ہوئی ہے، اور جلد بندی میں جن تکلفات کا اہتمام کیا گیا ہے، اس نے کتاب کی ظاہری سج دھج کو ایسا دیدہ زیب اور دلفریب بنا دیا ہے کہ پہلی نظر پڑتے ہی اس کو اپنی ملکیت میں لینے کو جی چاہتا ہے، جلد کی نفاست خوش الوانی، نزاکت کے ساتھ مضبوطی کا حسین امتزاج پہلی نظر میں دامن دل کو کھینچتا ہے، ظاہری محاسن میں یورپ اور امریکہ کا اب تک جو بلند معیار رہا ہے، ان ممالک کے زیر اثر ہی ابھی اس کے مظاہر اب مشرق میں بھی نظر آنے لگے ہیں، اور زیر تبصرہ قاموس اس کا عمدہ نمونہ ہے، مطبعہ دار الشروق اس کے لیے یقیناً مبارکباد کا مستحق ہے۔

اس کتاب کا موضوع اس کے نام سے عیاں ہے، قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی الہامی کتاب ہے، اس کے ہر چھوٹے بڑے کلمہ کی، خواہ وہ اسم ہو، خواہ فعل یا حرف کے قبیل کے، اس کی لغوی تشریح

معنوی سیاق و سباق کو ملحوظ رکھ کر محض عربی زبان دانی کی بنیاد پر نہیں، بلکہ اس کے فن کی متعلقہ امہات الکتب کے قدیم وجدید ماخذ سے مدد لے کر اس طرح کی گئی ہے کہ فی الجملہ قرآن میں مستعمل الفاظ کا ایک سیدھا سادہ مفہوم طالب علم کے سامنے آجائے۔ جس کے ذریعہ وہ ترجمہ یا تفسیر کی مدد کے بغیر بلا واسطہ براہ راست قرآن کو پڑھ کر اس کے مطالب کو سمجھنے کے قابل ہو جائے، اس کتاب کی زبان انگریزی ہے، یعنی قرآن مجید کے الفاظ کی لغوی اور معنوی تشریح انگریزی زبان میں اختصار سے کی گئی ہے، یہ قاموس خصوصیت سے ان لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو قرآن کو پڑھ کر سمجھنا چاہتے ہیں، مگر وہ عربی نہیں جانتے اور ان کی زبان انگریزی ہے، یا ان کی زبان انگریزی تو نہیں مگر ایک بین الاقوامی زبان کی حیثیت سے انگریزی زبان سمجھنا ان کے لیے نسبتاً آسان ہے۔

قرآن مجید کو خود پڑھ کر سمجھنے کا رجحان روز افزوں ہے، دنیا کی چھوٹی زبانوں میں اس طرح کی کسی کتاب کی موجودگی اس کے دائرۂ استفادہ کو محدود کر دیتی ہے، فاضل مؤلف نے انگریزی کی عالمی اور بین الاقوامی حیثیت کو محسوس کر کے ہی اپنی اس کتاب کو انگریزی میں مرتب کیا ہے، ہم اس لحاظ سے اس کتاب کا خیر مقدم کرتے ہیں کہ ایک مسلمان عالم نے تبلیغ دین اور اشاعت قرآن کے مشن کو سامنے رکھ کر علمی دنیا کی ایک اہم ضرورت کو علیٰ وجہ البصیرت پورا کرنے کی سعی کی ہے، اس طرح کی کاوشوں کا سلسلہ علمائے اسلام کی طرف سے جاری رہا تو ایک وقت آئے گا کہ انگریزی کے ذریعہ سے قرآن اور اسلام کے سمجھنے کے خواہاں طالب علم انگریزی کی ان کتابوں سے بے نیاز ہو جائیں گے جو غیر مسلم اسکالروں نے اپنے منفی مقاصد کے لیے تحریر کی ہیں۔

اس کتاب کی ترتیب میں عربی لغات کے اصول و طریق کار کو اختیار کیا گیا ہے، جو ایک معروف و مروج طریقہ ہے، اس کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ اس طریقے سے مانوس ہونے کے بعد طالب علم عربی لغات سے رجوع کرنے میں دقت محسوس نہیں کرے گا، فاضل مؤلف نے مبتدیوں کی ضرورت اور مبلغ علم کو

مد نظر رکھتے ہوئے مادہ، مصدر، مشتقات فعلیہ و اسمیہ کی مختلف شکلوں، رفع، نصب، جر کی مختلف حالتوں کو حتی الوسع یکجا کر دیا ہے، مصادر، ابواب، مشتقات اور صیغوں کی بدلی ہوئی شکلوں کی وجہ سے عربی میں بسا اوقات جو حیرانی ہوتی ہے اس کے لیے فاضل مؤلف نے کتاب کے آخر میں ایسے الفاظ کی ایک فہرست بطور ضمیمہ شامل کر دی ہے، اور ان کے ساتھ ان کے اصل مادوں کو درج کر دیا ہے، تاکہ جہاں کسی لفظ کی تلاش میں اس کی بدلی ہوئی شکل کی وجہ سے دشواری ہو وہاں انڈکس کی مدد سے اس کو تلاش کر سکے، عربی قواعد کے مسائل کو بھی جابجا اشارات کی شکل میں بتانے کی طرف ضروری توجہ صرف کی گئی ہے، جس سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوتا ہے، اور قاری نہ صرف بسہولت اپنا مسئلہ حل کر سکتا ہے، بلکہ مزاولت، مشق و تمرین کے بعد عربی قواعد سے بھی وہ رفتہ رفتہ روشناس ہو کر اس قابل ہو جائے گا کہ براہ راست عربی گرامر کی درجہ بدرجہ اہم کتابوں کی طرف رجوع کر سکے، اہم مقامات اور شخصیات کا جہاں ذکر آیا ہے وہاں قدرے تفصیل کے ساتھ تعارف کرایا گیا ہے، اور کتاب کو مفید معلومات سے آراستہ کیا گیا ہے،

کتاب کی ترتیب میں فاضل مؤلف نے محض اپنی عربی دانی یا قرآن فہمی پر اعتماد نہیں کیا ہے بلکہ متعلقہ علوم کی اہم کتابوں اور مراجع سے استفادہ کر کے پہلے خود اطمینان حاصل کر لیا ہے، صحیح اور غلط، صواب اور خطا میں امتیاز پیدا کرنے کی کوشش کے بعد اپنے نتائج کو درج کتاب کیا ہے، اس اعتبار سے اس کتاب میں تحقیق کا عنصر شامل ہو گیا ہے، ممکن ہے کہ کسی کی نظر میں مؤلف کے اخذ کردہ نتائج یا بیان کردہ معانی صد فیصد صحیح نہ ہوں، لیکن بحیثیت مجموعی ان کی یہ کاوش ایک علمی کوشش ہے، اور اس کی افادیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

فاضل مؤلف نے اس قاموس کی ترتیب و تالیف میں عربی اور انگریزی کی جن کتابوں سے استفادہ کیا ہے اس کی فہرست بہت طویل ہے، ان کی اس طویل فہرست میں جہاں قدیم و جدید

مسلمان علماء کے نام بکثرت نظر آتے ہیں، مستشرقین کی بھی اچھی خاصی تعداد اس میں شامل ہے۔

مؤلف کے عربی مراجع میں چند معروف اور نمایاں نام یہ ہیں: ابن تیمیہؒ، ابن جریرؒ، ابن قیمؒ، ابن قتیبہؒ، ابن کثیرؒ، ابن منظور، بغوی، راغب، زمخشری، فراء لغوی وغیرہ، انگریزی مراجع میں عبداللہ یوسف علی، آربری، محمد اسد، کارلائل، عبدالماجد دریابادی، مارماڈیوک پکتھال اور سیل کے نام قابل ذکر ہیں۔

قاموس الفاظ القرآن الکریم' لغات القرآن میں ایک گراں قدر اضافہ ہے، وقت کی اہم ضرورت پورا کرنے میں مدد دے گی، قرآن مجید جو اس زمین پر اللہ کا آخری صحیفۂ ہدایت ہے، اس کا پیغام آفاقی اور ابدی ہے، اور امت مسلمہ اس کی حامل و امین ہے، اس حیثیت سے اس پر جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے علمائے امت کو مختلف جہتوں میں ابھی کام کرنے کی بڑی ضرورت ہے، اعدائے اسلام قرآن مجید کے پیغام کے متعلق شکوک وشبہات کی فضا پیدا کرنے کے لیے دن رات کوشاں ہیں، عصر حاضر میں ان کی طریقۂ واردات بہت پُرپیچ ہیں، علمی جہت سے قرآن کا دفاع کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مثبت انداز سے ملت کے باشعور افراد اپنی مساعی کو بروئے کار لائیں۔

سلسلہ اسلام اور مستشرقین

جلد اول

اس موضوع پر ۱۹۸۲ء کے سمینار کے بعد تالیفات کا جو سلسلہ شروع کیا گیا ہے وہ کئی جلدوں پر مشتمل ہے جو بتدریج شائع ہوتی رہیں گی، یہ جلد ۱۹۸۲ء کے سمینار کی روداد پر مشتمل ہے، جس میں اس کی مختلف نشستوں میں جو مقالات پڑھے گئے ہیں ان کا خلاصہ بھی دیدیا گیا ہے، مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن

مطبوعات جدیدہ

اُسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مرتبہ ڈاکٹر محمد عبدالحیٔ عارفی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۵۳۶، قیمت بیس روپے، پتہ: صدیقی ٹرسٹ نسیم پلازہ، نزد بسیلہ چوک نشتر روڈ، کراچی

اردو میں سیرت و شمائل نبویؐ پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، اس نئی کتاب میں زندگی کے مختلف امور و مسائل کے بارہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو اسوہ اور طریقہ رہا ہے اس کی تفصیل و وضاحت کی گئی ہے، یہ کئی حصوں پر مشتمل ہے، شروع میں آپؐ کے محاسن اخلاق اور شمائل و عادات کے ضمن میں آپؐ کی بشریت، زہد و اتقاء، فقر اور مقام عبدیت وغیرہ کا تذکرہ بھی آگیا ہے، پھر مجلس، گھریلو زندگی، کھانے پینے، لباس و آرائش اور سفر وغیرہ کے بارہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات اور اسلامی آداب بیان کیے گئے ہیں، کتاب کے بڑے حصہ میں ایمان و عقائد، عبادات، اخلاق، معاملات اور معاشرتی زندگی کے بارہ میں اسوۂ نبویؐ کی تفصیل پیش کی گئی ہے، ایک حصہ میں اس کا ذکر ہے کہ رات اور دن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کون سی مسنون نماز ادا کیا کرتے تھے، آخر میں نکاح، نومولود، مریض کی عیادت اور میت کی تجہیز و تکفین وغیرہ کے سلسلہ میں آپ کی تعلیمات و ہدایات قلمبند کی گئی ہیں، لائق مصنف ایک صاحب دل اور حکیم الامت مولانا تھانویؒ کے خلیفہ مجاز ہیں، اس لیے یہ کتاب بڑی موثر اور دلنشین ہے اور اس سے زندگی کے مختلف شعبوں کے بارہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ اور نمونۂ عمل سامنے

ہے، جس کو اختیار کر کے ہر مسلمان فلاح دارین کا مستحق بن سکتا ہے، افادۂ عام کے لیے کتاب کا
ورانگریزی ایڈیشن بھی شایع کیا گیا ہے، اور وہ بھی مذکورۂ بالا پتہ سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

غایۃ الامکان فی معرفۃ الزمان والمکان :۔ از شیخ تاج الدین محمود بن

خداداد اشنوی تصحیح و تعلیق و مقدمہ از جناب نذر صابری صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ عمدہ،

طباعت ٹائپ، کل صفحات ۴۸، قیمت درج نہیں، پتہ: مجلس نوادرات علمیہ اٹک کیمبل پور
شیخ تاج الدین محمود بن خداداد اشنوی چھٹی صدی ہجری کے متبحر علماء میں تھے، ان کی علمی
ؤں میں یہ بیش قیمت فارسی رسالہ بھی تھا جس کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ مولانا انوشاہ
کی وساطت سے جب یہ ڈاکٹر محمد اقبال کو ملا تو ان کا خاص مرکز توجہ بنا اور انھوں نے انگریزی
کی تلخیص بھی کی، اور اس پر مبسوط عالمانہ تبصرہ بھی لکھا، اب یہ رسالہ مولانا محمد علی کھڈی (پاکستان)
ب خانہ سے جناب نذر صابری کو دستیاب ہوا، اور انھوں نے بعض نسخوں سے مقابلہ و
کے بعد اسے شایع کیا ہے، رسالہ گو مختصر ہے، لیکن اس کی تین ۳ فصلوں میں توحید اور
و زمان کے موضوع پر بڑی علمی اور فلسفیانہ بحث و گفتگو کی گئی ہے، جو عام لوگوں
سے تو بالاتر ہے، تاہم جن لوگوں کو فلسفہ کا ذوق اور زیر نظر موضوع سے دلچسپی ہے،
لیے یہ نہایت کارآمد ہے، شروع میں لایق مرتب کے قلم سے سلیس و شگفتہ اردو میں
قانہ مقدمہ ہے، اس میں رسالہ اور مصنف کے بارہ میں گوناگوں مفید معلومات کے علاوہ
غلاط کی تردید بھی کی گئی ہے جو دونوں کے تعلق سے مشہور ہو گئی ہیں، آخر میں رسالہ میں درج
قرآنی و احادیث نبویؐ کی تخریج اور اسماء و اعلام کا اشاریہ بھی دیا گیا ہے، اس رسالہ کی
ت ایک مفید علمی خدمت ہے جس کے لیے مصنف تحسین کے مستحق ہیں۔

- - - - - - -

احکام قرآنی :- مرتبہ منشی عبدالرحمٰن خان صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۰۳، قیمت تیس روپیے، پتہ :- صدیقی ٹرسٹ نسیم پلازا نزد لسبیلہ چوک، نشتر روڈ، کراچی ۵ -

اس کتاب میں قرآن کے ضروری احکام اور روز مرہ زندگی سے تعلق رکھنے والے مسائل کو آسان زبان اور عام فہم انداز میں اس لیے پیش کیا گیا ہے کہ معمولی پڑھے لکھے مسلمان بھی قرآنی ہدایات سے واقف ہو جائیں، اور ان پر عمل کر کے دنیا و آخرت میں سرفرازی حاصل کریں، چنانچہ مصنف نے اس کے سات ابواب میں مختلف عنوانات کے تحت قرآنی آیات مع ترجمہ نقل کی ہیں، اور حواشی میں ان کی ضروری تشریح و وضاحت بھی کی ہے جس سے اس کا فائدہ دوچند ہو گیا ہے، پہلے باب میں عقائد سے متعلق آیات نقل کی گئی ہیں، جن میں توحید و الوہیت، رسالت، کتب سماوی، قیامت، تقدیر اور جزا و سزا سے متعلق قرآنی تعلیم بیان کی گئی ہے، دوسرے باب میں اس کا ذکر ہے کہ کس کی اطاعت و اتباع کی جانی چاہیے اور کس کی نہیں، پھر اللہ، رسول، قرآن، والدین، یتیموں، مطلقہ عورتوں، بیواؤں، غلاموں اور لونڈیوں کے حقوق اور عام حقوق العباد کا ذکر اور زوجین، حکام، مجاہدین اور مبلغین کے فرائض سے متعلق آیتیں نقل ہوئی ہیں، چوتھے باب میں اسلامی ارکان ایمان، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور جہاد کی آیتوں کا اردو ترجمہ دیا گیا ہے، اس کے بعد نکاح، وصیت، وراثت اور پردہ کے احکام والی آیتیں درج ہیں، اور آخر میں معاشرتی آداب، ناپ تول، قصاص، قتل عمد و خطا، بدکاری، بغاوت اور چوری وغیرہ کے احکام کا ذکر جن آیتوں میں ہے انھیں تحریر کیا ہے، اس کتاب کی حیثیت مسلمانوں کے دستور حیات کی ہے، اس لیے اس کا مطالعہ ہر مسلمان کیلیے مفید ہے، اس کا پہلا اڈیشن تقریباً چالیس برس پہلے نکلا تھا جس میں استاذ الاساتذہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کی ایک مختصر تقریظ بھی شامل تھی جو اس اڈیشن میں درج ہے۔

" ض "

ٹ

حیات سلیمان

یہ حضرت جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی کی سادہ سوانح عمری ہی نہیں ہے، بلکہ ان کے گوناگوں مذہبی، علمی، قومی، ملی، سیاسی حالات اور کارناموں کا ایک دلآویز مرقع ہے جس میں سید صاحبؒ کے دور کی نصف صدی کی ملی و قومی، سیاسی، علمی، ادبی و لسانی تحریکوں مثلاً ہنگامۂ مسجد کانپور، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، جنگ آزادی، مسئلۂ ملوکیت حجاز وغیرہ کی تفصیل بھی ضمناً آگئی ہے، اسی کے ساتھ دارالمصنفین جو سید صاحبؒ کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اس کی تاسیس، سال بہ سال اس کی ترقی کی روداد کے ساتھ ان کے قیام بھوپال، سفر پاکستان، قیام پاکستان کے دوران کی علمی خدمات کا تذکرہ اور پھر مختلف وفود کے رکن و صدر کی حیثیت سے سفر یورپ، سفر حجاز، سفر افغانستان وغیرہ کی مفصل روداد بھی سید صاحبؒ کے خطوط اور تحریروں کی روشنی میں قلمبند ہو گئی ہے، یہ کتاب اپنے اسلوب و طرز انشاء کے لحاظ سے بالکل حیات شبلی کا ثانی ہے، ویسی ہی دلکش، دلچسپ اور دلنشین۔

مولفہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی قیمت ۴۳ روپیے

سلوک سلیمانی

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے عزیز ترین پاکستانی مسترشد مولانا سید سلیمان اشرف خان صاحب سلیمانی صدر شعبہ عربی پشاور یونیورسٹی نے "سلوک سلیمانی پر ایک اجمالی نظر" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا تھا جو معارف میں ستمبر ۱۹۵۵ء سے جنوری ۱۹۵۶ء تک مسلسل نکلتا رہا، یہ علمی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، اسی مضمون کو مزید اضافوں کے ساتھ مولانا اشرف صاحب نے کتابی صورت میں سلوک سلیمانی کے نام سے دو جلدوں میں شائع کیا ہے، ان میں حضرت سید صاحبؒ کی سلوک و معرفت سے متعلق تعلیمات کو مرتب کی توضیحات و تعبیرات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے، ان دونوں جلدوں کو افادۂ عام کی خاطر دارالمصنفین نے بھی چھاپ کر شائع کیا ہے۔

قیمت جلد اول ۳۰ روپیے　　　　قیمت جلد دوم ۲۵ روپیے